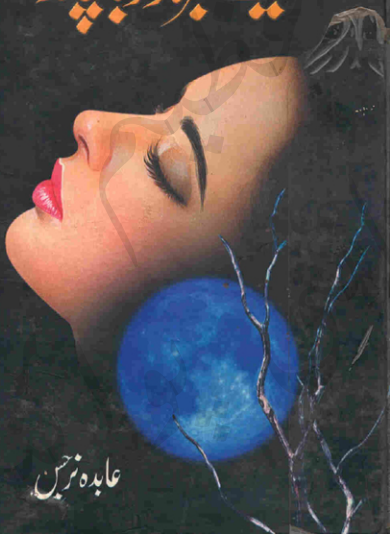


ترے سحر کا دوا چاند



عابدہ رحیم

رات کی سیاہ چادر کو چرتی منظور کی نیلی گھوڑی سر پٹ بھاگتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ بیٹھی ہوئی زبیر کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کا بدن ہولے ہولے کانپ رہا تھا اور اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں سے دور دیرانے میں نکل آئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ صدیوں سے اسی طرح اندھیرے کی دیوار سے سر ٹکرا رہے ہیں۔

زبیر کو کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ کس سمت بڑھے چلے جاتے ہیں۔ اس کے دل میں ہول سے اٹھ رہے تھے اور اسے ہر طرف سے تعاقب کرنے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں کی خوفناک آوازیں سنائی دے رہی تھی۔ اس نے پسینے میں بھیگی ہوئی ہتھیلیوں سے منظور کا کرتا مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔ اونچی نیچی کھنڈڑیوں پر گھوڑی کے دوڑتے ہوئے قدموں سے لگنے والے جھٹکوں نے جیسے اس کی ہڈی ہڈی کو چور چور کر دیا تھا۔

اچانک سر پٹ دوڑتا ہوا گھوڑا خوفناک آواز سے جھپٹتا درختوں کے ایک جھنڈ تلے رک گیا۔ گھوڑے کی آواز سے نئے نئے گمبرا کر اپنے گھولوں میں شور مچانے لگے۔ کچھ نے گھوڑی دہرے پھڑ پھڑائے اور پھر چپ چاپ اپنے آشیانوں میں آن بیٹھے۔ منظور ایک ہی جست میں گھوڑے سے نیچے اترا اور اس نے سہارا دے کر زبیر کو بھی نیچے اتار لیا۔ کالی سیاہ رات چاروں جانب سے امنڈی پڑتی تھی۔ ستاروں کی روشن ٹھیس بھی مگور اندھیرے کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی تھی۔ زبیر نے چاروں طرف ایک سہمی سہمی سی نگاہ ڈالی۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔

”پانچو! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔
منظور نے منہ میں دو انگلیاں ڈال کر ہلکی سی سیٹی بجاتی اور اس کو تسلی دیتے ہوئے بولا۔ ”حوصلہ رکھ بہتا..... دل کو مضبوط کر..... میں جو تیرے ساتھ ہوں تجھے ڈرنے کی ضرورت

دریان کہا۔

”چل اب بس کرنا..... خوشی خوشی شریف کے ساتھ دواغ ہو۔“ منگورے خود سے طبعہ کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے بولا۔ دکھ کی ایک گہری ٹیس اس نے اندر ہی اندر سمجھ لیا۔ اس کی رہی تھی۔ اس کا دل یوں ڈوب سا رہا تھا۔ جیسے اپنی سچی بہن کو دواغ کر رہا ہو۔ اس میں اب وہاں بھرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ کر شریف سے گلے ملا اور اس کا شکرا اور احسان و ممنونیت میں ڈوبا ہو کر کئی لفظ سے بغیر اپنا کچھ گھوڑے پہ سوار ہوا اور تانہوار راستوں پر اڑتا چلا گیا۔

گھوڑے پہ سوار منگور کی شبیہ اندھیرے میں تھیل ہو گئی۔ اس کے گھوڑے کی ٹاپوں کی صدا بھی معدوم ہو گئی تو زیو نے دلوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا اور سکیاں لے لے کر رونے لگی۔ شریف کی چٹکیں بھی بھیک گئیں۔ اس نے ہولے سے زیو کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ہمیشہ کیلئے ایک ہو جانے کی خوشی اس کے لیے پراپے عزیزوں اپنے دوستوں اور اپنے گاؤں کی ہواؤں آغواؤں اور مٹی کی بو اس سے جدا کی گئی تھی۔ زیو نے رندگی ہوئی آواز میں کہا۔

”مجھے پامنگور کی طرف سے ڈر آتا ہے۔ اللہ اسے خیراں رکھے۔“
”اللہ نے چاہا تو اسے سے خیراں ہیں..... تو دعا کر۔“ شریف نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”وہ بڑا جی دار ہے۔ وہ ایسے دیسے جو ہر یوں سے نہیں ڈرتا۔ یار کی یاری بھاتا جانتا ہے۔“

زیو کے ہونٹوں پر اس کے لئے دواغیں چلنے لگیں۔ جو سیاہ تاریک رات میں نیلی گھوڑی پہ سوار دشمنوں کی جوتی طرف بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

.....

پہلے ہی منگورے نے اپنے پہلے ہی منگورے چنے گاؤں میں تھا۔ اس نے گھوڑی تھان پر باندھی اور کچھ محبت سے اس کی ایال پر ہاتھ بھرتا رہا۔ آج اس نے بھی دواغ داری کا حق ادا کر دیا تھا۔ طویل مسافت کی تھکن میں وہ بھی حد درجہ تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اسے کئی بار گھبراہٹ دی اور جتنا قدم اٹھاتا تھن میں سے گزر کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

سفر کی تھکان ایک کیف آور نئے میں بدل گئی تھی۔ حق مندی کا سردی احساس اس

نہیں۔ حوصلہ کر..... حوصلہ.....

زیو اس کے قریب آگئی۔ ”ہائے پامنگور مجھے بڑا ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں کوئی کچھ نہ چل جائے۔ کوئی ہمارے پیچھے آ گیا تو۔“ وہ بے حد گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولی اور اس کے سفید ریشمی کرتے کی آستین پکڑ لی۔

منگور نے تسلی کیلئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اور مضبوط لہجے میں بولا۔ ”کیوں گھبراہٹ ہے بہنا۔ کچھ نہیں ہوگا۔ وہاں تو کسی کا کونوں کان خبر نہیں ہے۔“

”اگر شریف نہ آیا تو؟“ وہ سانس روک کر بولی۔

”شریف آ گیا ہے۔“ اچانک کسی نے مدھم کی سرگوشی کی اور بھاڑیوں میں سے ایک سایہ نکل کر ان کی طرف لپکا۔

”ہائے میں مر گئی..... یہ کون ہے پامنگور؟“ زیو کی جان نکل گئی۔

”چڑی جتنا دل ہے تیرا۔ جھلی نہ ہو تو کہیں کی۔“ منگور نے پیار سے اس کے سر پر چپت جھائی۔ ”خوش سے دیکھ یہ شریف ہے۔“

”زیو پھر بھی کبھی ہوئی سی گھری رہی۔ وہ قریب آ گیا۔ اس نے سر پر بڑی سی پکڑی باندھ رکھی تھی۔ جس کے ایک لڑا سے اس نے آدھا چہرہ چھپایا ہوا تھا۔

”سب ٹھیک خاک ہے نا۔“ منگور نے پوچھا۔

”سب خیر سلا ہے۔“ شریف دلی زبان سے بولا۔ ”جہیں تو کسی نے نہیں دیکھا نا۔“

”بس اللہ نے ہی مدد کی ہے۔ میں کتنی راستے بدل کر آیا ہوں۔ بس تو جی اب پھرتی دکھا اور راتوں رات یہاں سے لٹنے کی کمر۔“ صبح کا سورج چدر یوں کے علاقے سے باہر نکل کر

ہی دیکھنا۔“ منگور نے تاکید کی۔ اور زیو کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

”دیکھ شریف! میں نے زیو کو بہن کہا ہے اور یہ قول میں جان دے کر بھی بھابھوں

گا۔ میں اپنی بہن کو تیرے سپرد کر رہا ہوں۔ تو اس کی آنکھوں میں آنسو نہ آنے دینا۔“

زیو نے پلٹ کر منگور کے گلے میں بائیں ڈال دیں اور ہتھکیاں لے لے کر رونے لگی۔

”حوصلہ کر بہنا!..... حوصلہ۔“ منگور نے محبت سے اس کے بالوں پر ہاتھ بھیرا۔ ”تو

فکرت کر..... اللہ پامنگور ہوا تو جیے لئے آؤں گا۔“

”وہاں ہاگ بھری اور ہاگ بھری ہاگ بھری لے کر آتا۔“ زیو نے سسکیوں کے

کے لیوں پر مسکراہٹ بن کر کھل اٹھا تھا۔ اس کا سارا وجود کنگنہ رہا تھا۔ اس کے مطمئن دل کے قریب کوئی خوف، کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ وہ طمانیت کی گھنٹہ کیفیت میں سانس لیتا احتیاط سے اپنے کمرے کی دالیز تک پہنچا تو اسے باہر اس چوکت پر ہی لگی۔ وہ اس کے انتظار میں رات بھر جاگتی رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اس نے سینے پہ ہاتھ رکھا اور آنکھیں بند کر کے ایک لمبے سانس کے درمیان ہوئی۔

”ہائے رہا..... تیرا شکر ہے۔“

منظور اسے بازو سے پکڑ کر چنگ لایا۔ ”جھٹلے..... تو ابھی تک جاگ رہی ہے۔“
 باہر اس نے بے چارے نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”میں نے تو ایک ایک لمبی مرتے جیتے گزارا ہے منظور! تا سولی پہ بھی کسی کو نیند آتی ہے۔ تو کیوں پرانی معصیت سر لیتا ہے۔ چوہدریوں سے بھر لیتا اچھا نہیں منظور!“

”کیسی باتیں کرتی ہے تو؟“ منظور نے قدرے ترش لہجے میں کہا۔

”تیرا کیا مطلب ہے دوست کی دوستی نہ بھانوں..... زیو کو بہن کہا تھا تو قول سے پھر جاتا۔ اسے چوہدریوں کے ہاتھوں برباد ہوتے ہوئے خاموشی سے دیکھا۔ باہر اس.....
 باہر اس..... اگر ہم سب چوہدریوں کے سامنے یونہی سر جھکاتے رہے تو نہ کسی کی عزت سلامت رہے گی نہ آبرو۔“

”ناراض کیوں ہوتے ہو منظور۔“ باہر اس کے بازو سے لگ گئی۔ ”مجھ سے خفا نہ ہو کرو۔ خدا کے واسطے مجھ سے خفا نہ ہو کرو! وہ نہیں تو میں مر جاؤں گی۔“

محبت کے نرم گرم احساس نے منظور کو شہر اور کر دیا۔ اس کے اندر سرت کی ایک لہری اٹھی۔ وہ احساس ملکیت سے سرشار ہو گیا۔ محبت کی یہ وسیع کائنات تمام دکال اس کی سی۔ جو اس سے دل پر لٹری کے روپ میں اس کے بازو سے لگی ہوئی تھی۔

”جینے کی بات کر باہر اس..... جینے کی.....“ اس نے پیار سے اپنی انگلیاں باہر اس کے ہتھکڑیاں لے لے ہاتھوں میں الجھا کر اس کا جھٹکا ہوا شہر میلہ چہرہ اوپر اٹھایا۔ اس کے جتنے ہوئے لہری مارش فٹن آلودہ ہو رہے تھے۔ اس کی دلوں آنکھوں میں ایک خوبصورت اچھا محبتی۔ اس کی لہری لہری جنش میں لگاؤ اور سرور کی تھی۔ منظور چند لمحوں کے دیکھنے ہوئے چاند جیسا ہو گیا۔ نہ لگاؤ اور نہ ہونے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے ہولے سے اس کے کان میں

گاؤں میں کوئی بات بھی چھپی نہیں رہتی۔ اگلے ہی دن گاؤں کی فضا میں یہ سرگوشی رینگتی پھرتی تھی کہ شریف اور زیو غائب ہیں۔ شریف کی بوڑھی ماں کسی سے لے کر کہہ کر گئی تھی مگر لوٹ کر نہیں آئی تھی۔ وہ اپنا ہونا بیوہ ناگہرا ہی طرح خالی چھوڑ گئی تھی۔

سارے گاؤں میں ہلچل مچ گئی تھی۔ جہاں دہلی زبان میں لوگ یہی کہتے تھے کہ شریف اور زیو کی خبر نہیں۔ وہ دونوں دنیا کے جس کو نے میں بھی ہوئے چوہدریوں کی تیغ سے باہر نہیں نکل سکیں گے۔ نہ جانے کیسے اس تمام قصبے میں منظور کا نام بھی آتا تھا۔ حالانکہ رات کی تاریکی کے سوا اسے کسی نے زیو کو گاؤں سے نکال کر لے جاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر پھر بھی از خود سب نے فرض کر لیا تھا کہ اس فرار میں منظور کا ہاتھ ہے۔ شریف کے ساتھ اس کی دوستی دیکھی چھپی بات نہیں تھی۔

منظور کا باپ ماسٹر ہو کر وضاحت کر کر کے تھک گیا تھا کہ شریف اور زیو کے فرار میں اس کے بیٹے کا کوئی دخل نہیں تھا مگر کوئی بھی اس کی بات پر اعتبار نہیں کرتا تھا۔ گاؤں کی فضا میں پراسراری سرگوشیاں گونجتی رہتی تھیں جو ماسٹر فکھور کو اندری اور پھلانی دیتی تھیں۔ اس کے سارے وجود پر چوہدریوں کے انتقام کا خوف آسب کی طرح چھایا رہتا تھا۔

الصح جب منظور بیٹوں کی جوڑی لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہوتا تو جیسے اس کا دل کوئی ٹھٹھی میں لے لیتا۔ وہ رہ رہ کر ہلے اسی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ اسکول میں تفریح کا وقفہ ہوتا تو وہ کھیتوں میں اسے دیکھنے چل پڑا۔ رات کو بھی اس کی آنکھ کھلتی تو اس کی چارپائی کی طرف دیکھ کر تسلیم کر لیتا کہ وہ آرام سے سو رہا ہے۔

منظور اسے اس طرح سرگرداں دیکھتا تو غصے کر کہتا۔

”بابا! بھلا ہمارا اس معاملے سے کیا تعلق؟ شریف مرد آدمی تھا اسے تو اپنی ٹھیکرے کی مانگ کو بچانا ہی تھا۔ اب چوہدری آپ ہی اسے دھوڑتے پھریں گے۔ بھلا میں ان سے کیا لیتا دیتا۔“

ماسٹر فکھور اس کی اس نا تجربہ کاری پر دل ہی دل میں ہول جاتا۔ اس نے دنیا دیکھی تھی۔ اسی گاؤں کی مٹی سے اس کا خلیہ اٹھا تھا۔ اسے چوہدریوں اور مزدوروں کی پوری تاریخ از بر تھی۔ اسی لئے کوئی ان دیکھا دوسرے اندری اور ڈراتا رہتا تھا

بھاگ بھری کئی بار اس سے پوچھتی کہ وہ اس قدر پریشان کیوں رہتا ہے۔ اس کی

طبیعت تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ انس کرنا چاہتا۔ لیکن اس کے دل کو ڈرانے والے دوسرے اس کے خون کے ساتھ ساتھ اس کے سارے بدن میں گردش کرنے لگتے۔ وہ دلہا چہرے والی دروازہ بھاگ بھگری کو دیکھ کر کچھ اور نہتا سا ہو جا تا اور دل ہی دل میں پکا ارادہ کر لیتا کہ وہ اس فصل پر اس کے ہاتھ ضرور پیلے کر دے گا۔

گھر کیلئے پانی بھاگ بھگری ہی کو نکلیں گے بھر کر لاتی تھی۔ باہر اس اور کرتے گھر کا کام کاج سنبھالتی تھیں۔ لیکن جس روز سے گاؤں کے لوگوں کی پراسرار سرگوشیوں میں منظور کا نام آتا تھا کرتے بھاگ بھگری کو گھڑے اٹھائے دیکھتی تو اس کا دل دہل جاتا۔ وہ گھر مندی ہو کر پوچھتی۔

”نی بھاگ بھگری۔۔۔ تیرے ساتھ اور لڑکیاں بھی پانی بھرنے جاتی ہیں؟“
 ”ہاں ماں۔۔۔ ہم سب اٹھتی جاتی ہیں۔ میں۔۔۔ ناجو۔۔۔ رشتم۔۔۔ زینون۔۔۔ ساری سہیلیاں۔۔۔ وہ اٹھنے پڑنے سے کہتی۔

”ذرا جلدی آ جائی کہ زمانہ بڑا خراب ہے۔“ کرتے بھر بھی تاکید کرتی۔
 ”ماں! میں وہاں کونسا ترجمان میں بیٹھ جاتی ہوں۔ بس گھڑے بھرے اور واہیں۔“ وہ چٹکی بجا کر بولی اور اس نے گھڑوں میں سے پانی دوسرے برتنوں میں اٹھیل کر خالی گھڑے اٹھائے اور گھر سے باہر نکل آئی۔

راستے میں اسے ناجو اور رشتم بھی مل گئیں۔ تھوڑی دیر میں زینون بھی آگئی۔ آپس میں باتیں کرتیں، ہنسنیں ایک دوسرے کے ساتھ میٹھی میٹھی چہلیں کرتیں وہ کونسیں پر پتلیوں تو جھیمماں اور گلابو پانی بھری تھیں۔ وہ باری باری پانی پینے اور گھڑے بھرنے لگیں۔

جھیمماں نے موٹی موٹی آنکھوں کی گھنیری پٹلیں کو جبکہ کرتے بھاگ بھگری کی طرف دیکھا۔ ”بھاگ بھگری۔۔۔ زیو کو کھرمتی ہے۔۔۔ کچھ پتہ ہے تجھے؟“
 ”مجھے کیا پتہ؟“ بھاگ بھگری نے نفی میں سر ہلا کر شائے چکائے۔

”تمہارے گھر اس کا آتا جانا جو بہت تھا۔ پام منظور نے تو اسے بہن بنایا ہوا تھا۔ شریف بھی تو اس کا بھگری یا تھا۔“ ناجو نے کہا۔

جھیمماں قریب آ کر راز داری سے بولی۔ ”سارے گاؤں میں مشہور ہے کہ پام منظور زیو کو لے کر گیا تھا۔ شریف کے ساتھ کلاچ پڑھواتا۔

”دفعہ دور۔۔۔“ بھاگ بھگری ترخ کر بولی۔ ”پام منظور مولوی تو نہیں جو دوسروں کے

کلاچ پڑھواتا پھرتا ہے۔“

”تو قصہ نہ کر بھاگ بھگری۔“ رشتم نے مفاہمت کے انداز میں کہا۔

”پنڈ میں بچے بچے کی زبان پر یہی بات ہے۔ میں تو کہتی ہوں کہ پام منظور سے کہنا ذرا ہوشیار ہے۔ میرا بابا کہتا ہے چوہدری تو بھیمبر ساٹپ ہیں۔ بدلہ لیے بغیر نہیں چھوڑتے۔“
 ”خدا نہ کرے۔۔۔ اللہ بڑے وقت سے پچائے۔“ بھاگ بھگری نے بے ساختہ کہا۔

لیکن اس کا دل اندر ہی اندر ہول مچا تھا۔ اس نے ماں اور بابا کو گھر مند دیکھا تھا۔ خود وہ بھی اتنا مشہور رکھتی تھی کہ ان کی گھر مندی کی تہہ میں جوان جانے اندیشہ پیچھے ہوئے تھے انہیں اپنے وجود پر یکتا ہوا محسوس کر سکے۔

وہ ہمیشہ کی طرح سہیلیوں کے ساتھ خوش گپیاں نہیں کر سکی۔ اس کے دل میں جس کی سی کیفیت بھر گئی۔ اس کا دل چاہا کہ فوراً اپنے گھر کی محفوظ چار دیواری میں چلی جائے۔ کسی کی تسلی لے۔ کسی کا تحفظ محفوظ کرے۔ اس نے جلدی جلدی رشتم کی مدد سے گھڑا سر پر رکھا اور جانے کیلئے مڑی ہی تھی کہ اچانک خود رو جھاریوں کو اپنے بھاری جھیل سے مسلما۔۔۔ چمڑکی آوازیں نکالتا ایک اونچا لمبا مردان کے سامنے آن دکا۔ وہ سب کی سب ٹھک سی گئیں۔ رشتم کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

”ہائے میں مری گئی۔۔۔ چوہدری منور۔۔۔“
 بھاگ بھگری اس نام کو سن کر دھک سے رو گئی۔ لیکن اس نے خود کو سنبھالا اور رشتم کو چلنے کا اشارہ کر کے آگے بڑھی۔

”غصہ نہ۔“ بھاری آواز کی گونج نے اس کے قدم باعہ لے۔ دوسری لڑکیوں نے بھی گھبرا کر اپنی اوڑھنیاں درست کیں اور ان کے بھرے ہوئے گھڑوں سے پانی چٹک گیا۔
 چوہدری منور نے ان سب پر ایک جھپتی ہوئی سی نظر ڈالی اور اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی باریک چھڑی سے اس کی جانب اشارہ کیا۔

”تو ہے بھاگ بھگری؟؟ منظور کی بہن؟؟“

بھاگ بھگری کے سارے بدن میں کچکی سی دودھ گئی۔ جھیمماں اور زینون وغیرہ بغیر کچھ کہے ایک جانب نکل گئیں۔ چوہدری منور نے چھڑی کے اشارے سے رشتم کو بھی جانے کیلئے کہا تو وہ بدک کر اپنے راستے کی طرف بڑھی۔

بھاگ بھگری نے رشتم کا بازو پکڑ لیا۔ ”غصہ نہ کر جی۔۔۔ تو میرے ساتھ جانا۔“

وہ نہ جانے کس طرح گھر تک پہنچی۔ اس کا رنگ فق ہو رہا تھا اور سانس سے سانس نہیں ملتی تھی۔ کرتے اسے اس حال میں دیکھ کر دم بخود رہ گئی۔ گھبراہٹ اور پریشانی میں اس نے بھاگ بھری کوچھوڑ ڈالا۔

”تی بھاگ بھریے۔ تی بھاگو!..... کیا ہوا تجھے؟ کہاں سے آ رہی ہے تو؟ کیا ہوا.....؟ تیرا گھڑا کھر ہے؟ یہ تیرے کپڑے گیلے کیوں ہیں؟“

بھاگ بھری ماں کے سینے سے لگ گئی۔ وہ ایک ہانپ رہی تھی۔ کرتے کا اپنا دل نہیں ٹھہر رہا تھا۔ طرح طرح کے دوسرے اسے پاگل سا کر رہے تھے۔ وہ بار بار اس سے پوچھنے لگی کہ اسے کیا ہوا ہے۔

ہا جراس بھی قریب آگئی اور شکر ہی ہو کہ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ کرتے نے جھنجھلا کر ایک دو جڑا اسے دے مارا۔ ”بتاتی کیوں نہیں کہ کیا ہوا ہے تجھے؟ کہا بھی تھا کہ اکیلی پانی بہرنے نہ جایا کر۔“

”ہاں!.....“ بھاگ بھری آنکھوں میں آنسو بھر کر بولی۔

”تو مجھے کیوں مارتی ہے۔ میرے ساتھ ریشم نا جو..... جھیمیاں تب جسم مگر چوہدری منور نے سب کو بھاگ دیا۔ وہ کہتا تھا..... وہ کہتا تھا.....“ وہ انکی۔

”کیا کہتا تھا وہ مرن جوگا.....“ کرتے نے سانس روک کر پوچھا۔

”وہ کہتا تھا..... وہ کہتا تھا..... تو ہی منگوری بہن ہے۔“ بھاگ بھری نے سب سے ہوئے

لہجے میں کہا۔

”ہائے میں مر گئی۔“ کرتے دہل کر بولی۔

”اس نے منگور کا نام کیوں لیا؟“

بھاگ بھری نے موٹی موٹی آنکھوں میں بھرے ہوئے شفاف موتی صاف کیے اور

بولی۔ ”ماں..... جھیمیاں اور نا جو کہہ رہی تھیں کہ زبیر کو پام منگور نکاح پر چھوٹانے لے کر گیا تھا۔

وہ کہہ رہی تھیں کہ سارے گاؤں والے یہی کہتے ہیں۔“

”بھرتو نے کیا جواب دیا.....؟“ کرتے نے فتن چہرے کے ساتھ کہا۔

”کہیں کوئی انہی سیدی میں تو نہیں بول آئی۔“

ہا جراس نے بھی دل پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ تجزی سے بولی۔ ”نہیں

ماں! میں نے تو ان سے کہا کہ پام منگور کوئی مولوی ہے جو دوسروں کے نکاح پر صوٹا پھرتا

چوہدری منور نے اپنی باریک چھڑی زور سے ہوا میں لہرا کر سڑاک کی آواز نکالی اور سرخ ڈوروں والی آنکھوں سے ریشم کی طرف گھور کر دیکھا۔ اس کی گھٹی مونچھیں خوفناک انداز میں چڑک رہی تھیں۔ ریشم نے سہم کر بھاگ بھری سے اپنا بازو پھڑپھڑایا۔

”تو جاتی ہے یا.....“ چوہدری منور نے لفظ چائے۔

ریشم اپنا بازو چھڑا کر تیزی سے گاؤں جانے والی جگہ بڑی پر مڑ گئی۔ اس کے گھڑوں میں سے پانی چھلک چھلک کر اس کے کپڑے بھگ رہا تھا۔

بھاگ بھری نے بھی چاہا کہ اس کے پیچھے پیچھے چل دے لیکن چوہدری منور نے راہ میں آ کر اپنی چھڑی اس کے شانے سے چھواتے ہوئے اسے روک لیا۔ اس کی جیبٹی ہوئی نگاہیں جیسے اسے حصار میں لپٹے گئیں۔ بھاگ بھری کو اس کے انداز اس کی نگاہوں سے دشت سی ہونے لگی۔ اس کی تانچیں کا پٹنے لگیں۔ اسے سر پہ رکھے ہوئے گھڑے کا کوحہ سہارنا مشکل ہو گیا۔

وہ چند قدم اور قریب آیا اور چھڑی کے ساتھ اس کے سراپے پر پیچھے ایک لکیری کھینچتا ہوا بولا۔

”ہوں..... تو تو ہے بھاگ بھری.....“ اس نے ایک آنکھ دہائی۔ ”ذبیو تو تیرے سامنے کچھ بھی نہیں تھی..... نا ہے تو آنکھ جھانک رہی تھی یا ہے۔“

بھاگ بھری لرز کر پیچھے ہٹ گئی اور اس کی چھڑی کو اپنا آپ چھوٹے نہیں دیا۔ اس کے سر پہ رکھے گھڑے کا پانی چھلک کر اس کے اوپر آ رہا۔ اس کے تسمائے ہوئے عنابی ریشموں پر پانی کے قطرے گلاب کی چٹوں پر شبنم کی طرح دلا دلا معلوم ہونے لگے۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں سیاد دیدہ ہرنی کی کی دشت انہیں اور بھی دکش بنانے لگی۔ وہ خشک لبوں کے ساتھ کانپتی ہوئی آواز میں بس اتنا ہی کہہ سکی۔

”میرا راستہ چھوڑ دے۔“

اس نے مونچھوں کو تازہ دے کر قہقہہ لگایا۔ ”راستہ تو اب نظر آیا ہے۔“

بھاگ بھری کو اس کے لفظوں میں اس کی ہوس کی گند کی جھنجھٹائی ہوئی محسوس ہوئی۔ نہ جانے اس میں اتنی ہست کس طرح آگئی۔ اس نے سر پہ رکھا ہوا گھڑا زمین پر زور سے چٹا اور جس طرف راستہ دکھائی دیا دوڑتی چلی گئی۔

ہے۔

”اللہ اسے سب خیراں رکھے۔“ کہتے تھے زہرا کی بارگاہ۔

ہا جرات شکر ہی ہو کر بڑھائی۔ ”منظور کی بھی پہلی پوچھی۔ مفت میں دوسروں کی

بلا سر ڈال لیتا ہے۔ اماں۔ تم ہی اسے سمجھا کرو تا۔“

”وہ کسی کی سنتا ہی کب ہے۔“ ماں نے کچھ تشویش سے۔ کچھ پیار سے کہا اور نیوں اپنی اپنی لگن اور محبت کے رشتے میں بندھیں۔ منظور کے بارے میں سوچنے لگیں۔ جو اس چھوٹے سے گھر کے چند ہاتھ بھر کے آسان کا چٹکا سورج تھا۔ جس کے چہرے کی منیا سے ان کے کچے گھر کے درو دیار روشن روشن سے رہتے تھے۔ جس کے دم سے گھر بھر پر اعرس ہوتا تھا۔

.....

سجاد جیسے ہی گھوڑی باندھ کر چلا اس نے منحن میں کسی لڑکی کو کھڑے دیکھا۔ ایک لمبے کو وہ ٹھٹک سا گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ اس کے من میں لگدھڑکی ہی ہونے لگی۔ اس کے روئیں روئیں میں ایک اونکی مسرت جاگ اٹھی۔ اسے اپنے کچے آنکھ پر سروں کے کھیت کا گمان ہونے لگا۔ اسے آ جانی پچھائی انجان لڑکی کا دوپٹہ ہنستی رنگ میں رنگا ہوا نظر آنے لگا۔ سارا من بھگتا گئے ہوئے ستاروں سے بھر گیا اور وہ لڑکی چاند کی طرح سب سے الگ اور ممتاز معلوم ہونے لگی۔ اسے یہ دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہو رہی تھی کہ اس کے آ جانے سے اس کا عام سا کچھ کرکتا خوبصورت اور نرالا معلوم ہونے لگا تھا۔

”چاچی..... چاچی!“ لڑکی نے گھبرائی ہوئی آواز میں پکارا۔

مگر سجاد کو ایسا معلوم ہو جیسے اس کی صدا میں نرم کر ایک جبرتا سا پھوٹا ہے۔ اس نے ایک اور حیرت بھری بھر پور نگاہ اس پر ڈالی۔

”وہ لڑکی..... تو وہی تھی..... ہاں! وہی..... سرادرے لوہار کی بیٹی رانی..... جس نے گاؤں کے مولوی صاحب سے اس کے ساتھ ہی قرآن پاک فہم کیا تھا۔ جس کا گھین تصور نہ جانے کب سے اس کے دل کے نہاں خانوں میں چھپا بیٹھا تھا۔ وہ لہجہ راستے میں، کونہیں پر..... کیتوں کے بیچ باندی کے کھات پر ایک بھٹک دکھا جاتی تو اس سے بات کرنے اسے جی بھر کر دیکھنے اس کے قریب ہونے کی بھٹی مناسا اس کے اندر پھل سی چاڑھتی۔ لیکن سن کی یہ لہر..... روح کی یہ پکار اور دیوانے دل کی یہ مصوم سی مند پوری کر دینے کی اسے ہمت نہیں

ہوتی تھی۔

”چاچی..... چاچی.....! بھر جائی جا جرات.....! آ پابھاگ بھری.....!“ اس نے تیز گھبرائی ہوئی آواز میں ان سب کو پکار لیا۔ تاکہ اس کی آدھ کا مقصد واضح ہو جائے۔ اور دزدیدہ نگاہوں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

سجاد اپنے جھلجھلک کرتے خیالات سے چونکا۔ ماں بھر جائی اور بہن میں سے گھر کوئی نہیں تھا۔ ہا جرات ہمایوں کی طرف کسی کام سے تھی مگر ماں بھاگ بھری کے ساتھ کھڑے سے لڑ پانی بھرنے لگی تھی۔ وہ گھر میں تھا تھا اور اس کی سب سے پیاری آرزو کسی پری کی طرح چمن سے اس کے آنگن میں اتر آئی تھی۔

وہ اسے دیکھ کر نہال ہو گیا تھا۔ اسے اس گھر میں اس آنگن میں اسنے قریب سے دیکھنے کی جو آرزو اس کے دل میں کسی ننھے سے بیج کی طرح دہی ہوئی تھی ایک دم پھوٹ کر پھولوں سے لدے ہوئے پودے کی طرح پازا ہو گئی تھی۔ وہ بغیر کچھ سوچے۔ بغیر یہ طے کیے کہ گھبرائی ہوئی رانی سے کیا کہے گا..... ایک لمحہ ضائع کیے بغیر چند قدموں میں ہی اس کے قریب آ گیا۔

وہ کچھ بھگ گئی..... کچھ سٹٹی..... دو قدم پیچھے ہٹی..... چلے جانے کو چلی..... پھر پچھائی اور مڑ کر کن انھوں سے سجاد پر ایک جھپی ہوئی نگاہ ڈالی اور جاتے جاتے یوں رک گئی جیسے وہ خود بھی کسی تذبذب بھری کیفیت میں ہو۔ اس کی کوئی جھکی سی، اجھوری اور چوری شریلی نگاہ میں شناسائی ایک لمبے کو اس طرح چٹکی کر انجیت کا احساس جاتا رہا۔ سجاد کو اسے بے تکلفی سے مخاطب کرنے میں کوئی جھج نہیں ہوئی۔

”تم..... تم رانی ہو تا..... رانی.....“ وہ ہیشل بھی بظاہر بے معنی لیکن حقیقت میں بے حد پر معنی فہرہ کی تھہر سا اور مسرت کے بے پایاں احساس سے اس کا سانس پھول گیا۔ بھی بات تو سب سے اہم اور بہت ہی پیاری تھی کہ وہ رانی تھی اور اس کے آنگن میں اچانک کسی خورد پھولدار پودے کی طرح نمودار ہو گئی تھی اور گھر میں کوئی بھی نہیں تھا۔

رانی نے مسکرا کر یوں اثبات میں سر ملایا۔ جیسے اسے اپنے رانی ہونے پر بہت ناز ہو۔ وہ ابھی تک وہیں اسی انداز میں کھڑی تھی۔ جیسے جانے کو پلٹ رہی ہو۔ اس کے دلکش چہرے کا ایک رخ ہی سجاد کے پیش نظر تھا۔ وہ اس کے گلہانی ملائم رخسار پر کھٹے ہوئے شاداب سرخ گلاب کو دیکھ سکتا تھا۔ وہ اشتیاق سے دوایک قدم اور آگے بڑھا کہ اس کے دلربا

چہرے کے روشن روشن جلووں کو سمیٹ سکے۔ اسے قریب سے اپنے مقابلہ..... اپنے رو بہ رو دیکھے۔

رانی نے گھٹیری پکوں کو ایک سرٹیلی سی جنٹ دی۔ وہ اپنی پھولدار اوزمنی کے ایک کونے کو پوچھی اپنی انگلی پر لیٹنے اور کھولنے لگی۔ انگلیاں حرکت کرتے ہوئے ٹکڑے اور سہرے چٹخ چڑیوں نے ننھے شری پکوں کی طرح ان دونوں کے گرد گھیرا سا ڈال لیا اور پکار پکار کر کہنے لگے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دھوڑا دیا ہے۔

ایک دوسرے کو پہچان کر دونوں گرد و پیش کو بھول گئے۔ رانی کو کچھ یاد نہیں رہا کہ وہ چاچی کر سکتے کے پاس کیا لینے آئی تھی۔ سجاد کو بھی اس کی کوئی پروا نہیں تھی کہ کمر میں کوئی اور بھی آ سکتا ہے۔ وقت آج ان پر مہربان ہوا تھا۔ تو وہ ایسے ہی ان گنت سہانے لمحوں سے اپنی جھولیاں بھر لینا چاہتے تھے۔ وہ محبت کی شناخت کے اس امر لکھے کو چمکتے ہوئے جگنو کی طرح اپنی ٹمٹی میں قید کر لینا چاہتے تھے۔

پھر دروازے پر کسی کی آہٹ نے اس ظلم کو بحیرہ کر رکھ دیا۔ دونوں ہی چونک گئے۔ رانی کچھ گھبرائی گھبرائی سی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اور سجاد پلٹ کر مونیٹیوں کے باڑے کی طرف چلا گیا۔ اسے گرد و پیش ناپا سا معلوم ہونے لگا تھا۔ ان چند لمحوں میں ہی اس کی چھوٹی سی دنیا وسیع جہان میں بدل گئی تھی۔ جس کی ایک ایک شے اس کی اپنی تخلیق تھی۔ بڑی ہی دلفریب اور نرمالی۔ اپنی اپنی سی..... بالکل اپنی مرضی کے مطابق۔

وہ خود بھی جیسے ایک نیا سجاد بن گیا تھا۔ پہلے سے کہیں زیادہ وجہ دلیر اور جی دار..... اسے اپنے جیسا کوئی نظری نہیں آتا تھا۔ رانی کی ایک نگاہ التفات نے اسے جیسے سب سے نمایاں ممتاز اور منفرد بنا دیا تھا۔ اس کی نگاہ میں کوئی کچھ ہی نہیں تھا۔ وہ ایک نوخیز لڑکے سے بھرپور گہرو جوان بن گیا تھا۔

دروازہ کھلا اور منظور اندر داخل ہوا۔ وہ خلاف معمول جلدی گھرا گیا تھا۔ وہ بیلیوں کی جوزی باندھنے کیلئے پاڑے کی طرف آیا تو سجاد کو اسے دیکھ کر خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

”خیر تو ہے یا منظور..... بہت جلدی گھرا گیا تو؟“

منظور خوشدلی سے ہنسا۔ ”ہاں..... ہاں..... سب خیر ہے۔ آج ندیرے کی تیل مہندی ہے نا..... میں نے کہا اس کی طرف جا کر پتہ کروں۔ کوئی کام شام ہو تو.....“ اس نے مہن پر نگاہ ڈالی۔ ”سب کدھر گئے ہیں..... کوئی بھی تو نظر نہیں آ رہا۔“

”بھربھائی تو شاید ہمسائے میں گئی ہے اور اماں آپا بھاگ بھری کے ساتھ پانی بھرے۔“

سجاد نے اطلاع دی۔ اس کے دل میں اب بھی انسانی مسرت کے بھول سے کھل رہے تھے۔ وہ ان شادمان بکیوں کے چمکنے کی صدا دور کہیں اکیلے میں سننا چاہتا تھا۔

”اماں پانی بھرے گئی۔“ منظور نے تعجب آمیز ناگواری سے کہا۔ ”یہ ہاجران کیوں نہیں چلی گئی..... بھاگ بھری کے ساتھ..... سجاد تو ہی دو چار کمرے بھر دیا کر..... اماں کی یہ عمر تو نہیں ہے نا پانی بھرنے کی۔“

سجاد نے تائید میں سر ہلایا اور وہاں سے نکل جانے کو بولا۔ ”میں دیکھتا ہوں انہیں بس آتی ہی ہوں گی۔“ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا دروازے تک پہنچا ہی تھا کہ ماں اور بھاگ بھری دروازے میں داخل ہوئیں۔

”اماں! میں تجھے ہی دیکھنے جا رہا تھا۔“ سجاد نے چھوٹے ہی کہا۔

بھاگ بھری زور سے فہس پڑی۔ ”واہ..... بڑا خیال ہے اماں کا۔“

سجاد چڑ کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ منظور بھی قریب آ گیا اور ماں کے سر سے گھڑا لے کر اترواتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ہی سجاد سے کہا تھا کہ پانی ہی بھرا کرے..... اماں تجھے تو نہ جانتا پڑے گا۔“

ماں نے جیسے ہاتھ اپنی چادر سے خشک کئے۔ ”میں آپ بھاگ بھری کے ساتھ گئی تھی۔ لڑکی کی ذات ہے..... یہ اکیلی جاتی ہے تو مجھے لگ رہی رہتی ہے۔“

منظور نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا اور دہلی زبان سے بولا۔ ”کیوں؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟“ اس کے توجڑے تھے۔

”نہیں..... کسی نے کیا کہا ہے۔“ تیرے ہوئے کسی کی ہمت ہے..... اللہ تجھے سلامت رکھے۔“ ماں نے جلدی سے جواب دیا اور بات بدلنے کو بولی۔ ”منظور..... آج تو تو سویرے ہی گھرا گیا ہے۔ خیر تو ہے۔ تیرا لڑکا اچھا ہے نا۔“

”سب خیر ہے ماں..... بس بھوک بڑے زور کی لگ رہی ہے..... ماں تو گرم گرم روٹی کھلا دے تو میں ذرا ندیرے کی طرف ہواؤں۔ آج اس کی مہندی ہے۔ میں اسی لئے جلدی گھرا گیا ہوں۔“

”ماں صدقے.....“ میں تجھے ابھی تو ہے پر روٹی ڈال دیتی ہوں۔ تندوری تپانے

بڑھ گیا۔ منظور بدحواسی میں تڑپ کر اٹھا اور جوتے پہنے بغیر دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ آگہن میں اس نے جو کچھ دیکھا وہ اس کا خون کھولا دینے کیلئے کافی تھا۔ وہ پھرے ہوئے شیر کی طرح ان دو ہٹے کئے آدمیوں پر پڑا جو سیاہ ڈھانٹوں میں چہرے چھائے چنے سفید دن میں بھاگ بھری کوٹھیت رہے تھے۔ وہ پوری قوت سے چلتی ہوئی اپنا آپ جھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

منظور دیوانہ سا ہو گیا..... طیش اور جنون نے اسے کئی گنا زیادہ طاقت ور بنا دیا تھا۔ وہ دونوں آدمیوں پر بھاری پڑنے لگا۔ اس نے انہی میں سے ایک کی لاشی جھین لی اور وارپ وار کرنے لگا۔

بھاگ بھری کے بال بکھر گئے تھے۔ اس کے کپڑے کہیں کہیں سے پھٹ گئے تھے۔ اس کی اوڑھنی قدموں تلے روندی جا رہی تھی۔ چیخ چیخ کر اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ وہ خود کو آزاد کرانے کی کوشش میں دیوانی ہوئی جا رہی تھی۔

اچانک محن کی دیوار پر سے غائر ہوا۔ گولی منظور کی گردن میں پیوست ہو گئی۔ وہ لڑکھایا اور تیرا کر گر۔ بھاگ بھری خود کو چھڑا کر پاگلوں کی طرح روتی ہوئی اس کی جانب ہلکی لیکن ان میں سے ایک آدمی نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا۔

منظور لڑکھاتا ہوا اٹھا۔ اٹھ کر گرا۔ پھر اٹھا اور بجوتا۔ انداز میں ان کے پیچھے لپکا لیکن سنبھل نہ سکا۔ وہ بار بار اٹھتا پھر کر پڑتا اور انہیں روکنے کی کوشش کرتا۔ اس کے جوان خون کی سرخ کبیر اس کے ساتھ ساتھ گھر کے دروازے تک بدھتی چلی جا رہی تھی۔

○.....○.....○

میں تو ابھی وقت لگے گا۔“ ماں نے محبت سے کہا اور جلدی جلدی اپلوں کی آگ سے چلہا روشن کرنے لگی۔ منظور اس کے قریب ہی بیڑ میں پر بیٹھ گیا۔

ہاجراں بھی ہمسایوں کے یہاں سے آگئی اور منظور کو گھر میں دیکھ کر ایک شاد کام سی حیرت میں ڈوب گئی۔ وہ تو شام ڈھلے اترتے ہوئے اندھیرے کے ساتھ پرندوں کی طرح گھر آتا تھا۔ لیکن آج سورج کی سنہری کرڈوں کے بیچ اسے آگہن میں بیٹھے دیکھنا کتنا اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے آجانے سے گھر کی فضا اجلی اٹھی تھی۔ اس کے ہونے سے ہر طرف ایک روشنی سی ہو گئی تھی۔ اس کے دم سے درددیوار روشن روشن سے نظر آتے تھے۔

وہ کھانا کھا کر ہاتھ صاف کرتا ہوا تھوڑی دیر آرام کرنے چھوڑا اے کے چھوٹے کمرے میں آیا تو ہاجراں کو محسوس ہوا جیسے سورج آکاٹش سے اتر کر بچی چھت والے اس بنم تاریک کمرے میں سا گیا ہے۔ اس کی آنکھیں چند سیال کی گئیں۔ وہ دلہیز پر اس کے ساتھ ہوئی اور اس کے برابر چلتے ہوئے پئی۔

”منظور! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”کیوں؟.....؟ اچھا بھلا تو ہوں..... میری طبیعت کو کیا ہوتا ہے؟“ وہ سکرایا۔

”آج تو جلدی جو گھر آ گیا ہے۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ہنسی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ شگفتگی سے ہنس پڑا۔ ”تو نہ آیا کروں جلدی گھر.....؟“ اس نے چھیڑا۔

ہاجراں نے معنوی ناراضی سے منہ منایا۔ تجھے گھر یاد سی کب رہتا ہے۔ کام کاج میں تو تو گھر مار..... سب بھول جاتا ہے۔“

منظور نے ہولے سے اس کا ہاتھ تھاما اور اس کی چپٹکی ہوئی آنکھوں میں جھانک کر بولا۔ ”جس دن تجھے بھول جاؤں اس دن کیا..... اس دن.....“

ہاجراں کے رخسار شہابی ہو گئے۔ وہ انداز سپردگی سے اپنا ہاتھ چھڑاتی ہوئی ناز آ میر اکھڑنے سے بولی۔ ”ذرا بھول کر دیکھ تو سہی.....“

منظور نے اس کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور ہلکے سے جھٹکے کے ساتھ اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔ ہاجراں کے گلابی ہونٹوں سے مہر نہ ہٹی چھوٹنے لگی۔ وہ اس پر جھک کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ جینوں کی تیز آواز نے دونوں کو چٹکا دیا۔

منظور نے جگمگ میں ہاجراں کو خود سے علیحدہ کیا۔ وہ مگرتے مگرتے بچی..... شور کچھ اور

مجھے پر نفلت سکوت چھا گیا۔ ہاجران دھڑپیں مارتی اس کے گلے سے لگ گئی۔ نہ جانے وہ چیخ چیخ کر کیا کچھ کہتی رہی مگر ماسٹر فکوری کچھ میں کچھ بھی نہ آیا۔ اس نے نفرت سے اسے پرے دھکیل دیا۔

”یہ روئے کا نہیں مر جانے کا مقام ہے۔“ وہ غرایا۔

”منظور غیرت مند تھا۔ اچھا ہوا مرگ گیا۔“ اس نے جیسے خود سے کہا۔

پھر ارد گرد دھما شایوں کی طرح کھڑے ہوئے لوگوں پر ملامت کی نگاہ ڈال کر بولا۔

”اب یہاں تماشہ دیکھنے کو کیوں جمع لگا رکھا ہے۔ جب وہ میری لڑکی کو لے جا رہے

تھے اس وقت تم میں سے یہاں کوئی نہیں پہنچتا۔ جاؤ ڈوب مرو جا کر بے غیر تو۔“

وہ منظور کے خون میں سے چلتا ہوا مچھن کی دوسری جانب گیا جہاں جانور بندھے

تھے۔ اس نے غلت میں گھومی کھولی۔ اچک کر اس پر سوار ہوا۔ اسے چابک پہ چابک رسید

کر تا، سر پٹ دوڑا تا ایک جانب نکل گیا۔

اس کے کھڑے کی ٹاپوں کی آواز بھی رفتہ رفتہ معدوم ہو گئی تو وہاں کھڑے لوگوں نے

جھکے ہوئے سر اٹھائے۔ ماسٹر فکوری ان کے منہ پر کا کھل مل دیتی تھی۔ ان سے نگاہ اٹھانے کا

حوصلہ چین لیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے بھی نظریں چرا رہے تھے۔ بہت کم لوگوں نے ایک

دوسرے سے بات کی۔ کسی میں بازو کھینے کی تاب ہی نہیں تھی۔ وہ آہستہ آہستہ منتشر ہونے

لگے۔

کچھ جو شیلے نوجوانوں نے ماسٹر فکوری کا چچا کرنے کی ٹھانی اور اپنے اپنے کھڑے

لینے کو لپکے۔ عورتوں میں سے کسی نے کرتے کو ہتھوڑا جو چلے کے پاس دیوار سے لگی خاموش

بیٹھی تھی۔ اس کے حیران چہرے پر زردی کھنڈی تھی۔ اس کی کلمی ہوئی وحشت زدہ آنکھیں

آنسوؤں سے خالی تھیں۔

انھہ ہوش کر کرتے۔ تیرا تو سارا گھر گھڑیوں میں اچھا گیا۔“

کرتے ایک جانب لڑھک گئی۔ دوسری عورتوں نے اسے بڑھ کر سنبھالا۔ کچھ نے

اس کی ٹھنسیں ٹٹولیں۔ کچھ نے دل پر ہاتھ رکھا۔ پھر کسی نے بین کے انداز میں چیخ کر دھائی

دی۔

”ہائے۔ ہائے۔ بی۔ کرتے بھی اپنے ہتھ کے ساتھ ہی ٹٹو گئی۔“

.....

یہ کسی نے کیا کہا تھا؟

ماسٹر فکوری نے ہاتھوں کی طرح سوچا اور حیرت سے کہنے والے کی طرف دیکھا۔ جو اس

کے مقابل کھڑا کھڑا تھا کہ منظور قتل ہو گیا ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا کھڑا رہ گیا۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ پھر بے رحم کہنے والے نے بھاگ بھری کا نام بھی لیا اور اس کے

بارے میں نہ جانے کیا کہا کہ وہ صحیح طور پر سن اور سمجھ نہیں پایا۔ نہ ہی اس نے سمجھنے کی کوشش

کی۔ نہ اسے دہرانے کو کہا۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اندھا ہند اپنے گھر کی سمت دوڑ پڑا۔

اسے گھر کا راستہ بھی یاد نہیں رہا تھا۔ نہ ہی اسے کچھ بھانپا دیتا تھا۔ وہ پیر گئیں ڈالتا تھا

اور پڑتا کہیں تھا۔ اس کے قدم اضطراب میں خود بخود ڈھٹے چلے جا رہے تھے۔ وہ اس طرف جا

رہا تھا اسے کچھ اندازہ نہیں تھا۔ راہ میں سے کسی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔

”ماسٹر فکوری کیا۔“ کئی آوازیں آئیں۔

ہجوم میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ سبھی ہوئی آنکھیں ایک دوسرے

کو خاموش اشارے کرنے لگیں۔ تاسف بھری نظریں ماسٹر فکوری کو ہمدردی سے دیکھنے لگیں۔

لوگ ادھر ادھر ہٹ کر اس کے لئے راستہ خالی کرنے لگے۔ کچھ نے اسے سہارا دیا اور منظور کی

خون میں ڈوبی ہوئی جلاں نشان تک لے آئے۔

ہاجران بلند آواز میں بین کر رہی تھی۔ اس کا گھبراہٹ بڑھ گیا تھا۔ اس نے چوڑیاں توڑ کر

اپنی کلاسیاں زنجی کر لی تھیں۔ وہ دیوالی کے پال نوچی پچاڑیں کھا رہی تھی۔ اس کی پشیمانی پر

منظور کا خون تھا۔ اس کی مانگ میں خاک اڑا رہی تھی۔ ماسٹر فکوری نے خود کو لوگوں کی گرفت

سے چھڑایا اور چیخ کر بولا۔

”نی ہاجران!..... بھاگ بھری کدھر ہے؟“ اس کی آواز انجانے اندیشوں سے لرز

رہی تھی۔

ماسٹر فکرو کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ ظلم و بربریت سے بھری ہوئی اس دنیا میں وہ نہ جانے کہاں بھٹکتا تھا۔ مگر در و دیوار پر دھشت برستی تھی۔ کل تک جس کی گرم اور مانوس فضا جاتی تھی آج وہاں قبرستان کا سا ہولناک سا فضا تھا۔ جہاں منظور کے زندہ قہقہے ہاجرہ کی ریلی ہنسی میں گھل کر گیت سا بن جاتے تھے۔ آج وہاں ہاجرہ کی دلدوز چکیاں سنائی دیتی تھیں۔ ماں کی ممتا بھری شبیہ فضا میں کہیں ٹھیک ہو گئی تھی۔ بھاگ بھری کی آواز سننے کو کان ترس گئے تھے۔

سجاد کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اس نے کھلی آنکھوں سے ایک ایک چیز کو لٹتے اور جتاہوتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس نے سکھ کو رخصت ہوتے ہوئے آپ دیکھا تھا۔ اس کے حواس مختل ہو گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس کے ساتھ کیا بیت گئی ہے۔ اس پر کیا گزری ہے۔ وہ تو بھرے پرے خوشحال کنبے کے ساتھ سو یا تھا لیکن آنکھ کی کھلی تو خود کو تھپایا۔ پیچم حادثات نے اسے سہا دیا تھا۔ وہ جیسے مفلون سا ہو کر رہ گیا تھا۔ اسے ایسی چپ گلی تھی جیسے اس کے اندر کوئی جذبہ، کوئی احساس ہی نہیں تھا۔ یا اس گھر سے، اس دانتے سے، گرد و پیش سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔

ہاجرہ نے کئی بار اس کا گریبان پکڑ کر اسے جھجھوڑا تھا۔ اسے بے غبرتی کے طعنے دیئے تھے۔ اسے بدلے لینے کی تھیں دیں تھیں لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ چپ چاپ ایک کونے میں پڑا نہ جانے کیا سوچتا رہتا تھا۔ ہاجرہ آتے جاتے، اس کے قریب سے گزرتے ہوئے کوئی ہر بھر آخر اس کی جانب یوں اچھال دیتی جیسے اس کے منہ پر تھوک دیا ہو۔

”خٹ لخت ہے۔ تیری اوقات پر۔ مگر میں کھسا بیٹھا ہے۔ تو چڑیاں بھی ماہن لے۔“ پورا پورا اس کی جانب لہرا کر وہ عداوت سے کہتی۔

”بھائی کا درد نہیں تو بہن کی غیرت کما۔ جاؤ بدمرکیں جا کر۔ ہم تو کہیں منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہے۔“

سجاد لہرا کر اس کی طرف دیکھتا بھی نہیں۔ نہ ہی کسی رد عمل کا اظہار کرتا۔ بس خاموش بیٹھا اس کے طعنے یوں سنتا رہتا جیسے مامت سے محروم ہو۔ جیسے اپنے ہوش و حواس کو بیٹھا ہو۔ گاؤں کے لوگ اس کے حالت دیکھ دیکھ کر حیران ہوتے تھے۔ اس کے ہمدرد گڑھتے تھے۔ اکثر کا خیال تھا کہ اس کا دماغ ٹھکانے نہیں رہا۔ اس حادثے نے اسے گم کر دیا تھا۔ ہاجرہ ہر لمحے انتظار کی جان لیا کیفیت میں جلتی جھتی رہتی۔ راہ نکلنے کی بے چینی اس

کے ایک ایک میں دوڑتی پھرتی۔ وہ ہر رات سوچتی کہ نئی صبح طلوع ہوگی تو ماسٹر فکرو بھاگ بھری کو لے کر گھر آجائے گا۔ دن وصل جاتا تو وہ خود کو حواس دیتی کہ شام سے پہلے ماسٹر فکرو ضرور آجائے گا اور گاؤں والوں سے منظور کے خون کا حساب مانگے گا۔

وہ ہر صبح ایک نئی امید یا بے رحمی اور ہر شام اس آس کے ٹوٹ جانے کا ملال کرتی۔ وہ چڑ جاتی۔ وہ پریشان ہو جاتی۔ اس کے سارے وجود میں آگ سی لگ جاتی۔ جب اس میں اور ملال کے نکاس کا کوئی راستہ نہ ملتا تو وہ سجاد پر برس پڑتی۔ اسے کسے کسے کوٹنے سناتی، بے غبرتی کے طعنے دیتی۔ اس کی بے بسی پر لعنت بھیجتی۔

اس کا بس چلنا تو منظور کے خون کے ایک ایک قطرے کا حساب چکاتی۔ اپنی ہنستی ہنستی دنیا کو اجاڑنے والوں کو نیست و نابود کر دیتی۔ اپنی ماگ میں راگہ بھر دینے والوں کو راگہ کر دیتی لیکن وہ اکیلے بے بس عورت تھا کیا کرتی؟ کس طرح کرتی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بیچ و تاب کھاتی اور کڑی روتی۔ سجاد کی غیرت جگاتے جگاتے وہ خود بڑھ چلا ہو گئی تھی۔ مگر وہ تو برف کا ایسا ڈھیر تھا جس میں انتقام کی کوئی چنگاری نہیں بھونکتی تھی۔ رفتہ رفتہ گاؤں والے ماسٹر فکرو کو بھول گئے تھے۔ بھاگ بھری کی تلاش میں وہ ایسا ٹکڑا تھا کہ گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔ اکثر لوگوں کا کہی خیال تھا کہ غیرت اسے کھا گئی ہے اس نے خود کو کٹی کر لی ہے یا کہیں منہ چمکا کر بیٹھا ہے۔ اس کے پلٹ آنے کی امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔

پولیس نے بھی اس کیس میں کسی خاص دلچسپی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ شرع میں قاتلہ دار نے جلد جلد گاؤں کے پھیرے کئے تھے۔ بیانات لئے تھے، گواہیاں ہوئیں لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس کے پیچھے کس کا ہاتھ ہے لیکن کسی کو اشارہ کرنے کی جرأت نہیں تھی۔ کوئی گواہی دے کر اپنی جان عذاب میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ بھاگ بھری کے بارے میں یہی مشہور کر دیا گیا تھا کہ اسے اس کے آستانے انواہ کیا تھا جسے اس کے گھر والوں نے رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا۔

.....

ایک روز رانی ادھر ادھر دیکھتی، جھٹلا قدم دھرتی۔ ہولے ہولے گھر کے صحن میں داخل ہوئی تو ہاجرہ کہیں دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنی کونجری میں منہ ڈھانپے پڑی تھی۔ مگر میں ایک کرناک سی خاموشی تیری پھرتی تھی۔ ویرانی اور سناٹا چھایا ہوا تھا صحن کے ایک گوشہ میں

نیم کا بچہ اور اس کھڑا تھا جس کے لئے جھانک سی چارپائی میں سجاد گھڑی بنا لینا ہوا تھا۔

رانی ٹھک گئی۔ شوق اور فس کھ سجاد کی طرح ایک دم کھ میں ڈھل گیا تھا۔ چلیا اور متحرک سجاد جیسے خاموشی اور سناٹے میں شے زندہ فٹن ہو گیا تھا۔ ہمدردی اور دکھ کی ایک شدید جھین نے رانی کی خوبصورت بادامی آنکھوں کو آنسوؤں سے بھر دیا۔ سجاد کے ناطے اسے یہ گھر کتنا پیارا ہو گیا تھا۔ اس کے ذرے ذرے میں اسے محبت کا کس اور چاہت کی خوشبو محسوس ہوتی تھی مگر اب یہاں چاروں طرف دکھ کے بادل اور غم کے سائے منڈلا رہے تھے۔ وہ سوگوار اور مغموم سی ہوئے ہوئے چلتی قریب آئی۔ آٹ کے باوجود سجاد نے آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھا نہ ہی اس نے کوئی جنبش ہی کی۔ بس چپ چاپ اس کی طرح پڑا رہا۔ رانی نے محتاط سے لہجے میں پکارا۔

”سجاد!“ اس کا نام لیکر دکھوں کی تڑپ دل میں سوا ہو گئی۔ جس نے اس کی آنکھوں سے بھرے ہوئے آنسوؤں کو رخساروں پر بہا دیا۔ گھڑی بے ہوئے سجاد کے سراپے میں حرکت ہوئی۔ رانی ایک قدم اور آگے بڑھی اور زار سا جھک کر پھر اسے پکارا۔

”سجاد!“ اس کی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ سجاد نے چہرے سے بازو ہٹا کر اس کے دکھ سے سٹولائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔

رانی نے تاسف سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

”ہائے وے سجاد! یہ سب کچھ کیا ہو گیا؟“

سجاد کو محسوس ہوا جیسے اس نے صدیوں بعد کوئی انسانی آواز سنی ہے۔ ہمدردی اور دکھ سے لبریز۔ اپنائیت سے بھری ہوئی۔ اس کا دھکی دل آپ سے آپ پھٹنے لگا۔ رانی کی محبت بھری آواز میں اسے سب ایڈوں کی صدا سنیں سنائی دے رہی تھی۔ اس کی ذات میں کتنی ہی صحیحوں کا کس تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے قندہ قندہ بیتے آنسو اس کی خاطر بہہ رہے تھے۔ سجاد کو محسوس ہوا جیسے وہ بھی ایک آنسو بن کر رانی کے طلبجہ دامن میں جذب ہو جائے گا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے سر قلم لیا۔

رانی بے حد پریشان گھڑی اضطراب میں ٹوٹے پھوٹے جملے کہہ رہی تھی۔

”ہائے ہائے یہ کیسا اصریر ہو گیا۔ سجاد.....! ہائے میں چر جاؤں۔ یہ کیسا گھر کا گھر اجڑ گیا۔ ہائے میرے مولا۔ اب کیا ہوگا؟“

سجاد سر جھکا بے بیضا ہونٹ چار پار لگا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ابھی دھانڑیں مار مار کر رونے لگے گا۔ جیسے ابھی ٹوٹ کر نکھر جائے گا۔ پھسل کر رہ جائے گا۔ اس نے زور سے سر کو کچی بار جھٹکا۔ پھر ایک دم اٹھ کھڑا ہوا اور پاؤں میں جوتیاں اٹکاتے ہوئے بولا۔

”رانی تو یہاں گھڑی کیوں در رہی ہے۔ جا اپنے گھر جا۔ یہاں اب تیرے لئے کچھ نہیں ہے۔“

رانی دو قدم پیچھے ہٹ گئی اور کم کراس کی طرف دیکھنے لگی۔ لیکن وہ اسے نظر انداز کرتا ہوا تیز قدموں سے کچھوے کی طرح اس کے برابر سے نکل گیا۔

.....

”ہوں۔“ گھنی مونچھوں والے پہلوان نما انسان نے گنگے میں پھنسی ہوئی آواز میں ایسی ہی ہوں کی اور سر ہلا کر بولا۔

”چھا۔ تو یہ قصہ ہے۔“

”ہاں جی۔“ سجاد جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ زوردار تھپڑ نے اس کی زبان دانتوں تلے دبا دی۔ وہ بری طرح ہولکھایا۔ ہونچکا سا رہ گیا۔ اٹھیوں کے نشان اس کے رخساروں پر ابھر آئے۔ وہ ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ایک اور بھرپور ہاتھ نے اس کا منہ پھیر دیا۔ وہ گرے کر رہ گیا۔

وہ گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا اور لڑکھڑا کر بیٹھ گیا۔ اس کا ذہن باؤف ہو گیا تھا اور آنکھوں کے سامنے شرارے سے تاج رہے تھے۔ وہ کسی تیرے حملے کی توقع کر رہا تھا کہ پہلوان زور سے فس پڑا۔ اس کا قہقہہ کرہ میں چاروں طرف گونجنے لگا۔ سجاد کا ہاتھ سمجھ کر اس نے اسے قریب ہی بٹھایا اور بیٹھے ہوئے بولا۔

”بس کا کا اتنا ہی دم تھا تو تو دو درجنوں میں ہی اپنا آپ بھول گیا۔“

سجاد کچھ نہیں سمجھ پایا۔ زمانے دار تھپڑوں سے اس کی کٹنیاں سنسنائے لگیں اور آنکھوں کے سامنے شرارے سے رقص کرنے لگے۔ اگر دکر بیٹھے ہوئے اس کے ہم عمر لڑکے اس کی حالت پر بے تحاشہ فس رہے تھے۔ استاد نے انہیں ڈانٹ کا خاموش ہو جانے کو کہا اور ایک لڑکے سے بولا۔

”اوئے ببولے۔ شہنائی کا ایک ٹھاس لار کر لڑکے کو پلاتا کہ اس میں روح بھرے۔“

”استاد جی۔ یہ تو لغو لگیا۔“ وہ آنکھ دبا کر سسکرایا اور جگ میں سے بادام ملا ہوا دودھ

ایک لمبے بھدے گلاس میں ڈال کر اسے تھادیا۔

سجاد کا حلق خشک تھا۔ اس کے اندر پیاس ہی پیاس تھی لیکن اسے پینے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ استاد نے اس کے شانے پر ہتھی کر کے اپنی جانے کا اشارہ کیا تو وہ ایک ہی سانس میں پورا کا پورا گلاس خالی کر گیا۔

قدرے سنبھل کر اس نے گرد و پیش میں دیکھا۔ لڑکے ہنسی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ استاد کے چہرے پر زنی تھی۔ سجاد کے حواس بحال ہوئے اس کے دل پر چھائی ہوئی خوف کی کیفیت چھٹنے لگی۔ استاد نے وہپ سے اپنا ہماری ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور چر پی میں مضمی ہوئی شکرے بھیجی تیز آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا ہوا ہوا۔
”کا کا! تجھ سے تو بچھڑ بھی ہضم نہیں ہوئے تو آگے جا کر کیا کرے گا۔ یہ کام آسان نہیں ہے۔ سمجھا تو۔ ایک مرتبہ بھروسہ لے۔“

سجاد کچھکا گیا۔ اس کا شانہ پہلوان کی مضبوط گرفت میں تھا۔ وہ غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔ وہ تذبذب سا ہو گیا۔ وہ فیصلہ جو اس نے بڑی سوچ بچار کے بعد کیا تھا اس پر قائم رہتا بہت دشوار سا معلوم ہونے لگا۔ اس کی فطری شرافت اسے لوٹ جانے پر مجبور کرنے لگی۔ ماسٹر گھور کا شریف خون جو انتقام کی آگ میں لاوا بن کر اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا یک لخت سرد ہونے لگا۔ اس کا پیچھا کر اپنے شانے سے استاد کا ہاتھ اٹھا کر یہاں سے بھاگ جائے اور اپنے گھر پہنچ کر ہی دم لے لیکن گھر کے خیال کے ساتھ ہی اسے اس کا اجڑا آنکھن اور سونے درود پوار یاد آ گئے جو اسے گھماں سا کر گئے۔

استاد بڑے غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ، تذبذب کی کیفیت اور کچھکا ہٹ کے بدلتے ہوئے رنگ دیکھتا رہا۔ اس نے ایک بار زور سے اس کا شانہ ہلایا اور بردباری سے بولا۔

”دیکھ جوان! ابھی طرح سوچ لے۔ ہم نے ایک دفعہ تجھ پر محنت کر لی تو پھر نکلنے کا راستہ نہ ڈھونڈنا سوچ لے۔ پھر سوچ لے۔ ابھی بڑا وقت پڑا ہے۔“

سجاد کی پریشانیاں بڑھ گئیں۔ وہ متضاد جہڈوں کی آویزش میں پس کر رہ گیا۔ اسے کچھ نہیں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ کیا سوچے، کیا سمجھے، استاد کو کیا جواب دے؟ اس راہ کو جنن نے یا پیچھے ہٹ جانے۔ ڈیرے پر موجود دوسرے لوگ بڑی دلچسپی سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اسے اپنی اس کچھکا ہٹ اور تذبذب پر بڑی عمامت ہو رہی تھی۔ اس کے ذہن میں

یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ دوسرے لوگ اسے بزدل سمجھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ مگر پھر بھی اس کے لئے کسی حتی فیصلے پر پہنچنا دشوار سا ہو گیا تھا۔

استاد نے پھر ایک بار پوچھا۔ تو وہ جیسے اپنی نجات مٹانے کو مصفا کی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

”استاد جی! میرا پاپ بڑا شریف آدمی ہے۔“

استاد نے زوردار قہقہہ لگایا۔ دوسرے لڑکے ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر یوں فیسے جیسے اس نے کوئی دلچسپ لطیفہ سنا دیا ہو۔ ان قہقہوں سے بیٹھک کے در و دیوار کو بجنے لگے۔ ان میں سے کوئی بڑے مسخرے سے بولا۔

”واقعی یار! تیرا پاپ شریف آدمی تھا جو تجھے بہن کی نہیں شرافت کی فکر ہے۔“

یہ طعنہ سجاد کے سارے وجود کو چھید گیا۔ وہ آگ بگولہ ہو کر اٹھا اور لپک کر اس لڑکے کا کریمان کچڑ لیا اور بے تحاشہ گالیاں بکتے ہوئے دھاڑا۔

”الو کے پٹھے۔ بہن کا نام لیا تو تیری زبان سمجھ لوں گا۔“

دوسرے لڑکے اٹھ کر کچھ بھاڑ کرانے لگے۔ استاد کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے سجاد کا کرتا پکڑ کر کھینچا۔

”اوسے سجاد! بس کر۔ بڑی ہو گئی۔ تیری جی داری نے دل خوش کیا ہے۔ آج سے تو اپنا شاگرد ہے۔ لا اوسے پچھ۔ گڑ۔ سب کا منہ بیٹھا کر۔“

○.....○.....○

”سجاد!“ اسے ناشتہ کراتے ہوئے ہاجرہ نے ایک عرصے بعد اسے زنی سے مخاطب کیا۔ سجاد نے لمبی کا گلاس منہ سے ہٹایا اور اس کی طرف دیکھا اور لمبے بھر کو دیکھتا ہی رہا۔ اس حادثے نے اسے کتا بدل دیا تھا۔ اس کا دلکشا ہو گلا ہوا رنگ سرسوں کی زردی میں ڈھل گیا تھا۔ اس کے سونگوار چہرے پر کرب کی جا بجا لکیروں نے اس کے حسن کو گہنا دیا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے۔

وہ لہو کے گھونٹ پیتے ہوئے بولی۔

”سجاد! ہم کب تک یوں ہاتھ باندھ کر پڑے رہیں گے۔ تو..... تو کچھ نہیں سوچتا۔ تجھے کچھ خیال نہیں آتا۔ کچھ..... شدت جذبات میں وہ بات بھی پوری نہیں کر سکی اور بے ادبی سے ہونٹ چپانے لگی۔

”بھر جائی تو فکر نہ کیا کر۔“ سجاد نے گلا صاف کر کے کہا۔ ”ذرا وقت آلیے دے
بھر دیکھنا۔“

”کون سا وقت؟“ وہ ترخ کر بولی۔ ”جب دنیا والے طے مہنے دے دے کر ہمیں مار
ڈالیں گے اور کون سے وقت کی اڑیک ہے تجھے۔“

سجاد کچھ نہیں بولا۔ وہ اس کے ساتھ ٹھکرار کر کے اسے اور مشتعل نہیں کرنا چاہتا تھا۔
وہ ایک دہی عورت تھی۔ وہ اسے اور دہی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ نقدیر کے ہاتھوں ستانی ہوئی
تھی۔ اسے وقت کی مصیبتوں سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھ کر وقت کو ہاتھ میں لے لینا
چاہتی تھی۔ اس کے جواب کے انتظار میں اسی نے کئی بار سجاد کی طرف دیکھا۔ مگر وہ چپ
چاپ ناشتہ کرنے میں لگا رہا۔

ہاجرہ کو ضبط کرنا محال ہو گیا۔ اس نے غصے سے دانت کچکچائے۔
”تو دفع کیوں نہیں ہو جاتا یہاں سے کہنے! تو بھی بابے کی طرح کسی پائے مندر
لے۔ تجھے تو نہ بھائی کا دکھ۔ نہ بہن کی غیرت۔ تو سمجھتا ہے کہ میں تیرے لاروں پر منہ میں
تھکھنیاں ڈال کر بیٹھی رہوں گی۔ تیری طرح ہاتھ پیر تو ڈر کر لوگوں کے ہنسنے سستی رہوں گی۔
میں منظور کے خون کا بدلہ لے کر رہوں گی۔ میرا نام بھی ہاجرہ نہیں جو۔“

”کیا چڑ لگائی ہوئی ہے بھر جائی۔“ سجاد نے غصے سے اس کی بات کاٹی۔
”ایک پہلے ہی کون سا سکھ میں ہوں جو تیرے طے سانس نہیں لینے دیتے۔ تجھے کیا
پتہ کہ میں کس طرح دن گزار رہا ہوں۔ میں کس کس طرح مرمر کے بیٹا ہوں۔ تو تو بدلہ بدلہ کا
شور مچاتی رہتی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کسی پر ہاتھ ڈالا جاتا ہے۔ کیا ثبوت ہے ہمارے پاس
کہ اس واردات میں جاگیرداروں کا ہاتھ ہے۔ ان کے مقابلے میں کون ہمارا ساتھ دے گا۔
کون کواہیاں بھرے گا؟ تو سمجھتی ہے کہ میں بھول گیا ہوں۔ میں تو وقت دیکھ رہا ہوں۔ ایک
ایک سے گن کر بدلہ نہ لئے تو کہنا۔“

”تو کتنے کٹکے کی باتیں ہی کرتے رہنا اچھا۔“ وہ مختار سے بولی۔
سجاد بات بڑھاتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ ناشتہ اچھورا ہی چھوڑ کر اٹھ گیا۔ ہاجرہ حسب
عادت اسے کون کون کر اپنے دل کی آگ ٹھنڈی کرنے لگی۔ وہ اس کی آواز کی کٹھ سے دوڑ
کھٹنے کے لئے اپنی کونھری میں ٹھس گیا۔

”اوسے منڈیا۔ اتار دے سجاد کو۔ چل اٹھ۔“ استاد نے ہالوں سے بھرے ہوئے
بازو پر بندھی کھڑی دیکھ کر کہا۔

دوڑ کے ایک دوسرے کو چھیڑتے، الجھتے اٹھے اور ساتھ کی کوشی میں اگلے لئے ہوئے
سجاد کو کھولے گئے۔ رسیوں کی گرہیں کھول کر دونوں نے اسے پاؤں پر کھڑے ہونے میں
مدد دی۔ ایک نے اس کے شانے پر دھپ بجائی۔
”کیوں استاد! قائم ہونا؟“

سجاد نے دانت کچکچائے۔ اس میں بولنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ جسم کا سارا خون
جیسے آنکھوں میں بھر گیا تھا۔ کانوں میں سائیں سائیں ہو رہی تھی۔ آنکھوں کے سامنے شرارے
سے تاج رہے تھے لیکن اس نے ان بھی نہیں کی۔

وہ گھر بھری آگھ کا تارا تھا۔ اس کی شرارتوں سے بچ آ کر ماسٹر گھور اس پر ہاتھ اٹھاتا
تو اس ڈھال بن جاتی۔ بھاگ بھری اسے اپنی گود میں چھپا لیتی یا منظور معاملہ رفع دفع کر دیتا
مگر وہ پھر بھی ماں کے گھٹنے سے لگا ہوتا رہتا۔ ماں اسے پکارتی، چکارتی تو وہ ممتا کی
شاداب پھوار میں بیگ جاتا۔ وہ ماسٹر گھور کو کوئی ہوئی اسے پیار کرتی جاتی اور ٹھن اور شکر
کے ساتھ اسے نواہے بنا کر کھلاتی تو اس کی تسلی ہو جاتی۔ ممتا کی مٹاس اس کے ایک ایک
میں ٹھس جاتی۔

گمراہ وہ تہما سب کچھ سہتا تھا۔ منہ سے ایک حرف نہیں نکالتا تھا۔ ماں کا نام کئی بار
اس کے لبوں پر آتا لیکن وہ ہونٹ کھینچ لیتا۔ اس نے سارے کچھ سارے جین بھلا کر استاد کا
سکھایا ہوا سبق یاد کر لیا تھا۔ وہ چمکی طرح بے حس بن گیا تھا۔ وہ استاد کے کہے پر مشین کی
طرح عمل کرتا تھا۔

اس کا ایک ایک عضو جیسے فولاد میں ڈھل گیا تھا۔ اس کا جوڑ جوڑ دھات کا بن گیا تھا۔
اس کا پور پور چٹان کی طرح ٹھنک گیا تھا۔ وہ گھنٹوں مارا کھاسکتا تھا۔ پھر وہ الٹا لٹک سکتا تھا۔ پانی
میں غوطے کھا کر بھی وہ ہشاش بشاش رہتا تھا۔ اس نے خود میں برداشت کی اتنی قوت پیدا کر
لی تھی کہ وہ میر و ضبط کے ان مرحلوں سے اف کے بلیر گزارتا تھا۔

آج اسے استاد نے معمول سے زیادہ دیر الٹا لٹکے رکھا تھا۔ اس لئے جب وہ اپنے
پاؤں پر کھڑا ہوا تو اسے زمین محسوس ہوئی محسوس ہونے لگی۔ آہستہ جیسے منہ کو آ رہی تھیں لیکن
اس نے دونوں لڑکوں پر کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور ان سے ہنس نہس کر باتیں کرتا استاد کی

جھٹک میں آ گیا۔

استاد نے اسے اپنے قریب ہی بٹھالیا اور ایک لڑکے سے بولا۔

”چل اٹنے کا کہے۔ سچاول کے لئے گرم گرم دودھ لا۔ دو چمچے بھی ڈال کر لانا۔“

”ذرا جلدی آ۔“ سچاول نے ہانک لگائی اور اپنی آنکھوں کو مل کر گرد و پیش صاف طور پر دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

استاد نے اس کی پٹ پر دھپ جھا کر اس کی طرف متنی خیر نظروں سے دیکھا تو وہ سنبھل کر زعمہ دلی سے بولا۔

”استاد جی! آج تو مجھے الٹا الٹا لٹکا کرتے ہیں چکاؤڑ ہی بتا دیا۔“

دوسرے لڑکوں نے زور سے قہقہہ لگایا۔ استاد بھی محفوظ ہوا اور ایک غلیظ سی گالی اگل کر

بولا۔

”یہ تو کچھ بھی نہیں۔ بیٹے تو ناراد الٹا لٹکا کر تاک میں مرچوں کی دھونی دیتے ہیں۔

پھر کوئی مرد کا پچر ہی ہوتا ہے جو نہیں بکتا۔“

”بلکہ وہ کچھ بھی بک دیتا ہے جو اس نے نہیں کیا ہوتا۔“ سچاول نے ہنس کر اس کی

بات مکمل کی۔

استاد نے اتنی زور سے قہقہہ لگایا کہ اس کا بھاری پیٹ دیر تک قہقہہ کرتا رہا۔

”اب پولیس والوں کی کیا مجال کہ ہمارے بندے کو ہاتھ لگ جائیں۔ مال لگاتے ہیں

ان کو مال۔ نہیں تو یہ کسے باپ کو نہیں چھوڑتے۔“

”استاد جی! بس تمہاری یہ ذمہ داری کہ قانون میری راہ نہ روکے۔ میں دل کے

سارے ارمان نکال لوں تو پھر چاہے پیسے لگ جاؤں۔ پروا نہیں۔“ سچاول جو شیلے اعزاز میں

بولا۔ اس کے چہرے پر ایسی بے تابی اور جھجک تھی جیسے کوئی بڑا منصوبہ بنا رہا ہو۔

”غم نہ کر کا کا!“ استاد نے بے فکری کی تڑک میں اسے حوصلہ دیا۔

”اپنے رب سوچنے نے چاہا تو ایک ایک کی الٹی کھال اتاریں گے۔“

سچاول کو پیسے ملی ہوئی۔ اس کے دل سے بھاری بوجھ ہٹ گیا وہ ان دیکھے اندیشے جو

اس کے پاؤں کی زنجیر تھے رفتہ رفتہ پس منظر میں چلے گئے۔ وہ پہلے کی نسبت اور دلیر ہو گیا۔

اس کی رگوں میں خون کی گردش تیز ہوئی۔ وہ اسی جذبے میں سرشار دل ہی دل میں بہت کچھ

سوچتا گھر کی سمت روانہ ہو گیا۔

اپنے آپ میں الجھا ہوا۔ ایک نئے راستے کو دیکھتا ہوا وہ چلا جاتا تھا کہ کسی نے اس کا

دامن تھام لیا۔ وہ درک گیا۔ اس نے چونک کر دیکھا۔

رانی اس کے مقابل تھی۔ اس کی روشن بادامی آنکھوں میں اس کا اپنا عکس جھلک رہا

تھا۔ اس کا چاندیسا چہرہ اس کی محبت سے چھلکتی نگاہوں کا والہانہ بین اس کی آستانی ہوئی ہے

آپ و گیاہ زندگی کو ٹھنڈے اور خشک موسم میں بدل دیتی تھی۔ اس کی چمکتی ہوئی دلکش مشرقی

آنکھوں کے سامنے دنیا کی ہر شے نظر آتی تھی۔

سچاول نے دیکھا۔ اس کے ترشے ہوئے گلابی لب کچھ کہنے کیلئے لرز رہے تھے لیکن وہ

کچھ کہہ نہیں پاتی تھی۔ وہ بھی چپ رہا اور استغناء بین نگاہوں سے اس کی جانب بکتا رہا کہ وہ جو

کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ دے۔ اپنے دل کی مٹی سی بات سے اس کی زندگی میں کھلے ہوئے کرب کو

ہلکا کر دے۔

”سچاول!“ وہ دھیرے سے منگوائی۔ اس کے ہونٹوں کی آج نے اس کے نام کو سلگا

دیا۔ اسے اپنی چھڑی ہوئی پھٹیں شدت سے یاد آئیں۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے اسی طرح

پکارتی رہے اور اس کے دھم ایک ایک کر کے بھرتے رہیں۔ اس کی دیران دنیا میں وہی ایک تو

رومی تھی جو اس کا نام لیکر اسے زندگی کا احساس دلاتی تھی۔

رانی نے سر جھٹکا اور چار بھری تنگی سے بولی۔

”سچاول! تو تو کبھی ملتی ہی نہیں۔“ شدت جذبات نے اس کی خوبصورت آنکھوں کو

آنسوؤں سے بھر دیا۔ سچاول نے ان آنسو بھری بادامی آنکھوں کو دیکھا اور زندگی کی تمام تنگیوں

بول گیا۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما اور محبت سے چھلکے لہجے میں بولا۔

”تو آج مل لے۔ دل بھر کے۔“

.....

”ہا جراس! ہا جراس! انی ہا جراس۔“ بیچیں بھیلاری ہا جردہ کو پکارتی ہوئی صحن میں داخل

ہوئی۔

”آ جا ماسی۔ ادھر لٹک آ۔“ ہا جردہ نے آٹا گوندتے ہوئے وہیں بیٹھے بیٹھے پکارا اور

لبے پھڑے صحن کے اس پار بیچیں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں پھٹل کا پھٹکا ہوا ڈول تھا

س کے بوجھ سے جھکی ہوئی وہ ہاتھی کا پتی چلی آتی تھی۔

ہا جردہ کو اسے دیکھ کر جیسے تسلی ہی ہو جاتی تھی۔ وہ دو گھڑی اس کے پاس آ بیٹھتی۔ اس

کے دکھ سن لیتی۔ ہمدردی کے دو ٹھٹھے بول سنا جاتی تو باہرہ وقتی طور پر بہل جاتی تھی۔ بے دل کے پھسپھسے اس کے سامنے پھوڑ کر وہ دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی تھی۔

حیات اس پر عذاب ہو گئی تھی۔ زندگی مسلسل کرب بن گئی تھی۔ اس کے دکھ کی دوا کسی کے پاس نہیں تھی۔ کسی کے پاس ہمدردی کا ایک لفظ نہیں تھا۔ کوئی دکھ بٹانے والا غم ہٹانے والا دلاسا دینے والا نہیں تھا۔ محذور نے اسے بالکل اکیلا کر دیا تھا۔

اس کے سینے میں بھی کوئی ایسا نہیں تھا جو اسے چاہ دے دیتا۔ وہ اس دلہیز پر ڈولی سے اترتی تھی۔ اسی دلہیز سے اس نے زندگی کی ڈور ہاتھ لٹی مگر اس کی مضبوط چھت بھی ڈولنے لگی تھی۔

میلی نظروں نے بند دروازے میں چھید ڈال دیئے تھے۔ بھوکی آنکھیں ہر وقت اس کے در و دیوار کو چاٹتی رہتی تھیں۔ اس کی اجڑی مانگ ہر ایک کیلئے تماشائی تھی۔ ماسٹر فلوری گمشدگی، سہاول کی کم عمری اور لاتعلقی دوسروں کے لئے شبنم بن گئی تھی۔ گاؤں کے ادبائش اسے دیکھ کر فخر سے کتے اور یولیاں مارتے تھے۔ عورتیں کہیں مٹیں تو ان کی مشکوک نظریں معنی خیز سوال کرتیں۔ ہمدردی کا اظہار کرنے کے بہانے وہ فخر سے کتیں۔ بھاگ بھری کا ذکر کر کر کے وہ پیسے اسے ٹھٹھے دیتیں۔ اسی لئے ہاجرہ نے گھر سے لٹکانا اور لوگوں سے ملنا جلنا کم کر دیا تھا۔ اشد ضرورت کے بغیر وہ کسی سے کوئی رابطہ نہیں رکھتی تھی۔ صرف ایک بیگانہ ہی تھی جو اپنوں کی طرح اس کے دکھ سکھ میں شریک رہتی تھی۔

”ہائے نی کڑیے۔“ بیگانہ ہاتھ ہوتی قریب آ گئی۔
”خیرے وہ بڑے میں تو بڑی چلائی ہے۔ میرے جتنے گڈے رہ جاتے ہیں۔“ اس نے پتیل کا چمکا ڈول ہاتھ سے رکھا اور خود کو پکڑ کر نزدیک ہی چار پائی پر بیٹھ گئی۔
ہاجرہ نے دیکھا کہ ڈول کسی سے بھرا ہوا ہے جس پر کھنکھناتے تیر رہا ہے۔ ہاجرہ نے گونہھا ہوا آٹا برتن میں ڈالے ہوئے حیرت سے پوچھا۔

”یہ لی کہاں پھرتی ہے ماسی؟“
”خیرے لے لائی ہوں دے۔“ اس کا سانس اب بھی تیز چل رہا تھا۔ ”میری تو مت ماری گئی یہ ڈول اٹھا اٹھا کر۔“

”کہاں سے لائی ہے ماسی! میں نے کب تجھے لسی لانے کیلئے کہا تھا۔“ ہاجرہ نکلی سے بولی۔

”مجھے پتہ ہے۔“ یہ ماسٹر صاحب کا گھر ہے۔ میں جانتی نہیں کہ وہ کیسے آئے والے بندے تھے۔ میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ یہ تو چوہدری نوازی گھر والی نے آپ بھیجی ہے۔“ وہ جیسے اپنی مٹائی پیش کرتے ہوئے بولی۔

”کیوں؟“ ہاجرہ نے جھکے لہجے میں کہا۔

”کیوں۔“ بیگانہ نے حیرت سے دہرایا۔

”لے بھلا اپنی عزیز داری میں دیتے لیے نہیں۔“

”وہ ہمارے کب سے عزیز ہو گئے۔ ان کا کون سا ناٹھ ہے ہمارے ساتھ۔“ ہاجرہ

نے تپوری چڑھا کر کہا۔

”کڑیے۔ تو تو ایسے ہی لال چلی ہو رہی ہے۔ چوہدری نواز تو محذور کا یار بیلی ہے۔

دونوں نے پانچ جماعتیں اٹھنی پاس کی تھیں۔ پچارا بہت یاد کرتا ہے محذور کو۔ اسے بڑا دکھ ہے۔ ہاتھ ملتا ہے وہ۔“

منور کے ذکر پر ہاجرہ کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو جھلک آئے لیکن وہ ضبط کر گئی اور تپتی سے بولی۔

”اسے دکھ ہے تو کچھ کر کے دکھائے۔ نرے ہاتھ ملنے کا کیا فائدہ۔ وہ محذور کا یار ہے تو آگے کیوں نہیں آتا۔ اس کا دوست ہے تو اس کے قاتلوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے آزاد پھرتے کس طرح دیکھ رہا ہے۔ اللہ محذور کے قاتلوں کو خوار کرے۔ وہ کالے مند والے جس دن پہنچے چڑھیں گے میرے پیچھے میں تو اسی دن غنڈہ پڑے گی۔“

بیگانہ چار پائی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور بڑی راز داری سے بولی۔
”ہاجرہ۔“ چوہدری نواز کہتا ہے کہ اگر ہاجرہ عدالت میں بیان داخل کر دے تو بڑا کج ہو سکتا ہے۔ بڑا کج۔“

”ہیں؟“ ہاجرہ چونکی۔ ”کس طرح؟“ وہ حیرت اور بے یقینی سے اس کی جانب نکلتی گئی۔

بیگانہ اس کے اور قریب ہو گئی اور دھیمی آواز میں بولی۔
”چشم دیدہ گواہ تو ہی ہے۔ اگر تو ہمت کرے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے۔“

”اچھا۔ مگر کیسے؟“ ہاجرہ نے آنکھیں جپکے لگیں اور وہ بے قراری سے بولی۔
”ماسی بتا تو سہی۔ یہ سب کس طرح ہو سکتا ہے؟“

بچوں نے اسے چارپائی پر اپنے قریب بٹھالیا اور بہت دیر تک اس سے چپکے چپکے باتیں کرتی رہی۔

.....

سجاد نے استاد کے گھر کی دلیز پار کی تو ٹھک کر رہ گیا۔ دور صحن میں کچے چھتر تلے دونوں ہاتھوں میں چھانچ لئے وہ اناج پھینک رہی تھی۔ سجاد کی نگاہ حیرت سے چور چور ہو گئی۔ وہ مبہوت سا کھڑا رہ گیا۔ وہ صرف نام کی ہی گلابی نہیں تھی۔ اس کا رنگ روپ، اس کی سنہلی آنکھیں اس کے رسیلے لب بھی گلابی ہی تھے۔ اس کے دلربا چہرے پر ایسا غرور اور تکنت تھی جیسے گرد و پیش پر اسی کی حکومت ہو۔

اس کی پھولدار اوزنی اس کی پشت پر جمول رہی تھی۔ اس کے جادو بھرے ہیکر نے اس کی ریشمی قمیص کو آتش گلابی رنگ دے دیا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی مسلسل حرکت سے اس کی سرسریں گلابیوں میں چڑیا بن رہی تھیں وہ شاید کچھ مگلتا بھی رہی تھی۔ اناج پھینکنے کے شور میں اس کی مگلتا بہت واضح طور پر سنائی تو نہیں دیتی تھی لیکن اس کے گلابی لیوں کی خفیف سی جنبش بڑی دلاویز اور نغماتی تھی۔ سجاد مبہوت سا کھڑا اسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اس نے ڈیرے پر اس کے بہت چرچے سنے تھے لیکن اسے دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس نے جو کچھ سنا تھا وہ حسن و جمال کی اس صورت کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا تھا۔ اس کے سن میں جو دلکشی اور اس کے سراپے میں جو جادو تھا اسے صرف آنکھوں کے راستے دل میں ہی اتارا جا سکتا تھا۔ اسے لفظوں میں بیان کرنے کا تو حوصلہ ہی نہیں رہتا تھا۔ اس نے چھانچ میں سے صاف اناج دوسری طرف پلٹتے ہوئے لوہی ایک اچھتی ہوئی سی نگاہ صحن میں ڈالی۔ اس کی دلکش آنکھوں کی نزلی چمک سجاد تک آئی۔

”اوتے کون ہے تو؟“ اس نے دچیں سے لگا کر کہا اور تیزی سے اٹھی۔

سجاد بری طرح چٹکا۔ غرور حسن سے اٹھے ہوئے قدموں کی دھمک، چھانچوں کے ترنم میں گھل مل کر اس کے قریب آگئی۔

”اوتے کیا الوڈن کی طرح منداغناں کھڑا ہے؟“ وہ اس کے قریب آکر اکھڑ پنے سے پوچھنے لگی۔ سجاد نے رعب و جلال سے چپکے ہوئے خوبصورت چہرے کو اپنے مقابل دیکھا۔ اسے یقین آگیا کہ ڈیرے کے لوگ ج کچہتے تھے کسی کی مجال نہیں تھی جو اس سے آنکھ ملا کر بات کر سکے۔ اس کا حلق خشک ہو گیا۔

وہ خاموشی کے اتنے سے وقفے پر جمبھلا گئی۔

”منہ میں زبان ہے کہ نہیں تیرے۔ بولنا کیوں نہیں۔ کیا لینے آیا ہے؟“ اس نے ٹھنکھریالے بالوں کی لٹ کو جھٹکتے ہوئے سختی سے جیسے سوال اس کی جانب اچھالے۔

سجاد شپٹا کر جھلت میں بولا۔

”استاد نے کتنی کا آنا منگوا ہے۔ پس کر آگیا ہو تو دے دے۔“ اتنا سا فخر کہتے ہوئے اس نے سوار سوچا کہ کہیں اس سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی۔

”چھا۔“ وہ دلا پر دہائی سے کہہ کر بھٹی۔ تو اس کی چھانچوں کی ریشمی صدا اس کے ساتھ ساتھ پھٹی۔ سجاد نے ہزاروں بار چھانچوں کی آواز سنی تھی مگر ان میں ایک بے ربط سی چمن چمن کے مواجہ سنائی نہیں دیتا تھا لیکن اس بات نے اسے حیران کر دیا تھا کہ گلابی رنگ کے بلوریں پاؤں چم کہہ کر دیکھو کہ کسے دس بھرے نئے گانے لگی تھیں۔ وہ بیدوں میں پڑے سرخ کنار کی والے ریشمی لاپے کو ذرا سا سنبھال کر اونچے پنگ پر چڑھی تو اس کی بلوری ایزلیوں پر گرئی ہوئی چھانچوں نے سجاد کی آنکھوں کو تجرہ کر دیا۔

وہ کپڑے میں بندھا ہوا آٹا لے کر بھٹی تو اس کے بوجھ سے پگ رہی تھی۔ اس کی نازک کمر کا حسین خم قیامت ڈھار رہا تھا۔ سجاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ گلابی نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ہانپتی ہوئی آواز میں بولی۔

”پہلے تو مجھے اے کے ڈیرے پر نہیں دیکھا۔ کیا نام ہے تیرا؟“

سجاد نے بھی غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے اوپر کی ہونٹ پر ہلکا سا پید تھا۔ اس کی دلکش آنکھوں میں شوقی اور چمک تھی اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے پا کر اس نے تیوری چڑھائی اور غرور دے بیازی سے تمغوزا سارخ خمیر لایا۔

سجاد نے نگاہ صاف کر کے کہا۔ ”سجاد۔“

”سجاد.....“ اس نے تسخّر سے اس کا نام پکا ڈالا اور ہنسنے ہوئے بولی۔

”سجاد یہ کیا ہوتا ہے؟ کیا نام ہے بھلا؟“

سجاد اس کے ذائق اڑانے پر جمبھپ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس سے بھی پوچھے کہ بھلا اس کا نام گلابی کیوں ہے۔ یہ بھی کوئی نام ہے۔ مگر بھر اسے خیال آیا کہ اس کا نام تو ٹھیک ہی تھا اس کا گلابی گلابی ہیکر پکار پکار کر کہتا تھا کہ اس کا نام گلابی ہی ہونا چاہئے۔

وہ یہ سب کچھ سوچ کر ہی رہ گیا اور بگو لے کی طرح دروازے سے باہر نکل گیا۔ گلابی

”نہیں نہیں چما مت۔“ وہ منت کرنے لگی۔ ”مجھے جج بتا دے۔ دیکھ مجھ سے مت چمپا۔ مجھے پتہ ہے تو ایسا نہیں ہے۔ یہ کیسے گاؤں والے ہی جھوٹ مارتے ہیں۔“

سجاد نے اس کی بات پر غور کیا اور کئی سے بولا۔

”کیسا کہتے ہے گاؤں والے؟“

”وہ کہتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔“ رانی لمے بھر کو جھکی اور اس کے چہرے کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کے نام اس ہو جانے سے ڈرتی ہو۔ پھر محتاط سے لہجے میں کہنے لگی۔

”سجاد دیکھ تا گاؤں میں شب کہتے ہیں کہ تو پہلاں کے ذیرے پر جاتا ہے۔ وہ تو..... وہ تو اچھا آدمی نہیں ہے۔“

”کہتے ہیں گاؤں والے۔ الو کہے۔“ وہ اکڑ پڑے سے بولا۔

”ان کا جو بی جاتا ہے بک دیتے ہیں۔ ان کی زبان کون پکڑے۔ ہم مکرور جو ہو گئے ہیں۔ ہماری عزت جو دو کوڑی کی ہو گئی ہے۔ اب ہر کوئی ہم پر ہی اٹھاتا ہے۔“ اس نے مدنی منہ میں گالی دی اور غصے سے ہونٹ چبانے لگا۔

رانی کے شکر چہرے پر رونق سی آگئی۔ وہ بے ساختہ اس کے بازو سے لگ گئی اور بڑے مان سے بولی۔

”دیکھا۔ مجھے یقین تھا کہ تو ایسا نہیں ہے۔“

.....

ہاجرہ بے چینی سے آگن میں ٹہل رہی تھی۔ وہ کبھی دروازے کی طرف دیکھتی اور کبھی مومن کی دیوار پر سے باہر لگی میں جھانکتے لگتی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ وہ کبھی پریشانی سے ہاتھ لٹی اور کبھی ہراساں آنکھوں سے یونہی چاروں طرف دیکھتی۔ اس کا چہرہ اتر گیا تھا۔ اس کی پیشانی بار بار پیسے سے بھیک جاتی تھی۔ وہ ہر آہٹ پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھتی۔ کسی کو نہ پا کر وہ لمے بھر کو مطمئن سی ہو جاتی لیکن پھر ٹھکرات اسے گھیر لیتے۔ بیگانہ کو آتا تھا مگر وہ ابھی تک نہیں آئی تھی۔ انتظار کے لمے طویل ہو گئے تھے۔ وہ عجیب شش و خج کے عالم میں اپنے ہی فیصلے کی شدتوں سے ڈر رہی تھی۔ شدت جذبات میں اس نے بیاں سے وعدہ تو کر لیا تھا کہ وہ چوہدری نواز سے ملنے ملے کی لین چپ وقت سر پر آیا تھا تو وہ ہزاروں امینٹوں اور ڈرا دینے والے دوسروں میں گھلے گئے جنس لگی تھی۔ اسے تہوں سے خوف آنے لگا تھا۔ اسے اپنے اچلے آچلے کی فکر ہونے لگی تھی۔

کی شریانی اٹھیلیاں کرتی ہوئی اس کے پیچھے چلی آتی تھی۔

گلابی ایک نشہ ساین کر اس کے حواسوں پر چھا گئی تھی۔ اس کی برہمی، اس کا غصہ اس کی شرارت، اس کی خوشنیاں، اس کی بے نیازی، اس کا غرور، اس کا ناز، کبھی کبھار دیکھ کر دل نہیں بھرتا تھا۔ یہ خواہش کسی شریاد خندی بچے کی طرح اس کے اندر اس طرح بجلی تھی کہ وہ اسے دیکھنے اس سے اٹھنے اس سے ہٹنے اس سے بچنے اس کے انوکھے پتہ کو۔ اس کے چیلے تیروں لگتا۔ وہ اس کی آواؤں کو، اس کے ناز و غرور کو۔ اس کے انوکھے پتہ کو۔ اس کے چیلے تیروں کو، اس کے نرالے رنگوں کو مومن میں بسا لینا چاہتا تھا۔ اس کی کیفیت اس ننھے بچے کی سی تھی جو کوئی انوکھی اور زرا بی شے دیکھ کر اسے دیکھنے، اسے چھونے اور اسے پالنے کیلئے کل اٹھتا ہے۔

ایک روز راہ چلتے رانی نے اسے ٹھہرا لیا تو اس نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ اس کی دلکش آنکھوں کے اداس ٹھکڑوں نے اسے نادم سا کر دیا۔ وہ اس کے قریب یوں چپ چاپ سی کھڑی تھی جیسے اس کے حکم کی منتظر ہو۔ سجاد کو چھٹی ہوئی متحرک گلابی آنکھوں والی گلابی کا خیال آیا جو اپنے اشاروں پر چلتے پر مجبور کر دیتی تھی۔

”سجاد!“ رانی نے ہولے سے پکارا تو اس نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آواز میں لگاؤ تھا۔ اس کی نگاہوں میں واضح محبت تھی۔

سجاد سن ہی من میں بچل سا ہو گیا۔ وہ گلابی نے قصور میں اتنا خوبصورت کیا تھا کہ رانی کی سادگی اور مصروفیت فراموش ہو گئی تھی۔ رانی جو بڑے یقین سے محبت کا احساس چنگا تھی اور گلابی جو یہ بھی نہیں جاننے دیتی تھی کہ وہ محبت کرتی ہے یا نفرت۔ وہ جانتی ہے یا دل لگی کرتی ہے۔ سجاد کو اپنے دل کی بے ایمانی اور نگاہوں کی آوارگی پر پیشانی ہوئی۔

اسی اندام کو کم کرنے کیلئے وہ رانی کے چاند چہرے پر چمکی ہوئی سیاہ لٹ کو محبت سے ستوار کر بولا۔

”ہاں رانی! جتا کیا بات ہے؟“

رانی کی آنکھوں میں ایک دم آنسو جھلکے۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور راز داری سے پوچھنے لگی۔

”سجاد! تو کہاں جاتا ہے۔ روز روز۔“

”سجاد! پوچھنا کیوں پھر نہیں کر بولا۔“

”کیوں نہیں۔ میں بھلا کہاں جاؤں گا۔“

بیگم نے اسے بہتر یقین دلایا تھا کہ وہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دے گی۔ اسے صرف ایک بار چوہدری نواز سے مل کر اسے تمام واقعہ سنا تھا۔ کیونکہ قتل اور اغوا کی چشم دید گواہ وہی تھی۔ اس کے بعد چوہدری نواز تمام معاملہ خود سمجھ لیا۔ وکیل سے مشورہ کر کے وہ عدالت میں کیس کرے گا۔

مگر ہاجرہ کو حوصلہ نہیں ہوتا تھا۔ اسے بار بار یہ خیال پریشان کر دیتا تھا کہ اگر کسی نے اسے چوہدری نواز کی حویلی کی طرف ہونے دیکھ لیا تو یہ بات نہ جانے کیا سے کیا ہو جائے گی۔ لیکن جب اسے اپنی سونی کالیاں اور اجڑی ٹانگ یا آتی۔ منظور کی خون میں ڈوبی ہوئی لاش کا خیال آتا تو اس کے دل سے سارے ڈر خوف نکل جاتے۔ اسے صرف ایک ہی بات یاد رہتی کہ اسے ہر حال میں منظور کے قاتلوں سے انتقام لینا ہے۔ انہیں ان کے انجام تک پہنچانا ہے۔ یہی سوچ کر اس نے بیگم سے وعدہ بھی کر لیا تھا کہ چاھول کی کام سے شہر جانے کا تو وہ اس کے ساتھ جا کر چوہدری نواز سے بات کرے گی۔

لیکن آج جب وہ دن آگیا تھا تو وہ خود کو آمادہ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک اٹھانا سا خوف اس کے اندر ڈھل چا رہا تھا۔ وہ یہ سوچ کر ہی کانپ جاتی تھی کہ اگر کسی کو پتہ چل گیا تو.....؟ ان دوسلوں اور اندیشوں نے اسے پکڑا دیا۔ متضاد خیالات نے اسے غڑھال کر دیا۔ ان دیکھے خوف نے اسے اتنا کمزور کر دیا کہ جب بیگم اسے لینے آئی تو اس نے جانے سے صاف انکار کر دیا۔

”ہا۔ ہائے۔“ وہ برا سنا بنا کر بولی۔

”تو کرتی کیا ہے ہاجراں! ہل میں تو لہ ہل میں ماش۔ میں تو چوہدری نواز سے بات کر کے آئی ہوں۔ وہ اڈا لیکر ہوگا۔“

”پر ماسی۔“ ہاجرہ ہچکچکی۔

”جانی ہاجراں! تیرا من بھی کھوتا ہی ہے۔“ وہ اس کی طرف حقارت سے پورا چہرہ لہرا کر بولی۔ ”تو صرف باتیں ہی کرنے جوی ہے۔ جب تو منظور کی گھر والی ہو کر آگے نہیں آتی تو دوسروں کو کیا پڑی ہے۔ پرانی مصیبت گلے لگانے کی۔ میری طرف سے نہیں جانی تو نہ جا۔ پر اتنا سوچ لے کہ آج چوہدری نواز ساتھ دیتے پر تیار ہے۔ کل وہ بھی پیچھے ہٹ گیا تو پھر۔“ ہاجرہ سر جھکا کر سوجھتی رہی۔ اپنے آپ سے لڑتی رہی۔ خود کو بھانپتی اور حوصلہ دیتی رہی۔ بہت دیر تک اس نے نہ کچھ کہا نہ جھکا ہوا سر اٹھایا۔ تو بیگم اس کے کاندھے پر ہنسی ہوئی۔

”اچھا ہاجراں! تیری مرضی۔ تو نے نہیں چلا۔ تو ٹھیک ہے۔ میں تو چلوں۔ جا کر چوہدری نواز کو بتا دوں کہ تو کچھ نہیں کرنا چاہتی۔“ ہاجرہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”دیکھ جا ماسی!“ اس کے اندر سے جیسے کوئی بے ساختہ بولا۔ اس نے اٹھ کر چادر کی گاڑھی سی بکلی باری اور بیگم کے ہمراہ ہوئی۔ راستہ بھر بیگم کی زبان تالو سے نہیں لگی۔ وہ اسے بتاتی رہی کہ چوہدری نواز کتنا شریف اور بھلا آدمی ہے۔ ہاجرہ بظاہر ہوں ہاں کہتی رہی تھی لیکن حقیقت میں وہ اس کی کوئی بات بھی نہیں سن رہی تھی۔ وہ اسی ادھیڑ بہن میں لگی ہوئی تھی کہ اسے چوہدری نواز سے کس طرح بات کرنی چاہئے۔ اسے کس طرح مدد پر آمادہ کیا جائے؟ اس نے چوہدری نواز کی حویلی میں آ کر اچھا کیا ہے۔ بار بار اسے اس کا تذکرہ سنا دیا ہے۔ اسے یاد دلاتے ہیں۔

چوہدری نواز بڑے تپاک سے ملا۔ اس کی جھنجک کی سجاوٹ، اس کی حویلی کی شامخہ ہاتھ دیکھ کر ہی اعزاز ہو رہا تھا کہ وہ کتنا خوشحال اور آسودہ ہے مگر وہ بالکل بھی مغرور یا تک چڑھا نہیں تھا۔ وہ بہت نرمی اور شائستگی سے باتیں کر رہا تھا۔

ہاجرہ بے طرح جھجک رہی تھی۔ اس کے پاؤں نرم و دھیر قالین میں دھسے جاتے تھے۔ گرد و پیش کی سجاوٹ اور ماحول نے اسے ششدر سا کر دیا تھا۔ پھر وہ اس جگہ آ کر کسی غیر مرد سے باتیں کرنے کے تصور سے ہی گھبرا رہی تھی۔ اس نے چوہدری نواز کے سوالوں کے جوابات بے مشکل ادھورے ادھورے سے دیے۔ وہ سر جھکا کر کئی سی ہنسی بار بار اپنی اذیتنی اپنے گرد لپیٹی رہی۔

چوہدری نواز خود ہی اسے بتاتا رہا کہ منظور اس کا کتنا عزیز دوست تھا۔ دونوں اکٹھے سکول میں پڑھتے رہے تھے جن دنوں منظور کا قتل ہوا وہ بدقسمتی سے گاؤں سے باہر تھا۔ اسی لئے اسے صحیح سوال کا علم نہیں ہو سکا۔ اب وہ چاہتا تھا کہ قانون کی مدد حاصل کرے۔

ہاجرہ خاموشی سے اس کی باتیں سنتی رہی اور اپنی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو اپنی میلی اذیتنی میں جذب کرتی رہی۔ چوہدری نواز نے اسے معاملے کی تمام اونچ نیچ سمجھا دی تھی کہ اس نے کیا پروگرام بنایا ہے۔ پولیس کو کیا بیان دیا جائے گا۔ گواہیاں کیونکر تیار ہوں گی۔ عدالت میں معاملہ کس طرح لے جایا جائے گا۔ اور کون سا وکیل کیا جائے گا۔

اس کی باتیں پوری طرح سے سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں لیکن وہ انہیں بڑے غور

کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا مگر وقت تھا کہ گزرنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ ہلکا رہا۔ ادھر ادھر وقت گزارتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر استاد کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔

استاد اس پر اعتبار کرنے لگا تھا۔ وہ کسی کام سے گھر بھیجتا تو صرف اسی کو۔ سجاد بھی اس انتظار میں رہتا کہ استاد کسی کام سے اسے گھر بھیجے اور وہ گلابی کے نرالے روپ کے طلسمات میں کھوکھورہ جائے۔ گلابی کے خیال سے اس کے من میں کیف و نشاط کی کبھی منی نکلیاں ہی چٹکتے نکلیں۔ اس کی بے چینی میں کمی ہی ہو گئی اور وہ پہلے کی نسبت خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔

وہ اطلاعاً کھلا کر اندر داخل ہوا تو گلابی نے پلٹ کر دیکھا۔ شفاف پیشانی پہ ناز سے بل ڈال کر وہ ابھی اور ایک عجیب شان و رباہی سے کچھ پاؤں دھرتی اس کے قریب آن کھڑی ہوئی۔ اس کی جمائیں ایک بار زور سے بج کر خاموش ہو گئیں۔ اس نے اٹھڑپے سے سوال کیا۔

”کیا بات ہے؟ جب دیکھو منہ اٹھاے چلا آتا ہے۔“

سجاد نے اپنے دو برواں کے سنہری چہرے کو دیکھا اور محو سے بے ہوش رہا۔ اس کا سانچے میں ڈھلا جسم، اس کی غرور سے ابھی ہوئی گردن، اس کی ٹھوڑی کا حسین خم اور ترشے ہوئے گلابی لب۔ وہ دیکھتا ہی رہا۔

گلابی نے اس کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرایا اور ترخان سے بولی۔

”اے۔ کیا دیکھ رہا ہے۔ الووں کی طرح۔“

سجاد کی محویت ٹوٹ گئی۔ وہ چونکا لیکن اس کے دلکش چہرے سے لگاؤ نہیں ہٹائی اور ایک ایک لفظ چپا کر بولا۔

”تجھے دیکھ رہا ہوں۔ تجھے۔“

اس نے ہلکی سی تیوری چڑھائی اور شان و رباہی کے پوچھنے لگی۔

”کیوں؟“

اس کے سوال میں ایک ایسا دلہانہ اشتیاق تھا جیسے جی بھر کر سکھار کرنے کے بعد کوئی دوشیزہ آئینہ دیکھنا چاہے۔

سجاد مسکرایا اور اسے چھپڑنے کو بولا۔

”اس لئے کہ تیری شکل میری بکری سے بہت ملتی ہے۔ کل بچاری پیسے سے مرگئی۔“

سے سن کر یاد رکھنے کی کوشش کر رہی تھی اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اسے نئی زندگی دے رہا تھا۔ اس کے سینے میں بڑبڑاتی ہوئی آگ کی تپش کو دیکھا کر رہا تھا۔ وہ نامیدی کے سمندر سے نکل کر امید کے ساحلوں کی طرف بڑھ رہی تھی اسے اپنا آپ بڑا انہم محسوس ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگتا تھا جیسے سارے جہان کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے ہر شے پر قابو ہے وہ ایک اشارے سے دنیا کو زیر و زبر کر سکتی ہے۔

.....

”کیوں بھی سجاد۔ تیار ہے نا تو؟“ استاد نے دو ٹوک لیے جسے سوال کیا۔

سجاد لمبے بھر کو تذبذب سا ہوا۔ اس کی رگوں میں دوڑتے ہوئے ماسٹر سکور کے شریف خون میں ہچکچاہٹ کی ایک لہری ابھی۔ استاد نے فوراً ہی اس کے تذبذب کو محسوس کر لیا اور کڑے لیے میں بولا۔

”کیوں یار! ابھی کچھ کسرتی ہے؟“

سجاد کچھ کہنا ہی چاہتا تھا تو وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بولا۔

”سن سجاد۔ میں نے پہلے ہی دن تجھے سمجھا دیا تھا کہ یہاں آگیا تو پلٹ کر نہیں دیکھ سکے گا۔ سمجھا؟ اگر تو نے دشمنوں کو ٹھکانا لگاتا ہے۔ تو پھر جی دار بن۔ جی دار۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر تو اپنی بہن کو نہیں ڈھوڑ سکتا۔“

بھلا۔ بھری کے تذکرے نے سجاد کے رگ و پے میں دکھ اور اذیت کی لہری دوڑا دی۔ اس کا جی چاہا کہ لمبے بھر میں ساری دنیا کو چٹکی میں مسل دے جس میں اس کی پھولوں ایسی معصوم بہن قدموں تلے روندی گئی تھی۔ اس نے سر جھک کر اٹھایا اور اذیت چھین کر بولا۔

”میں تیار ہوں استاد!“ اس کے لفظوں میں شیطے سے لپک رہے تھے۔

استاد نے نظام اور شاہو کو بلوایا اور انہیں تمام ضروری تفصیلات سمجھانے لگا۔ سجاد بڑے غور سے اس کی ایک ایک بات سنتا رہا۔ اس کا رواں رواں کچھ گزرنے کو بے تاب تھا۔ اسے ملی بھری تاخیر اور لحد بھر کا انتظار بھی دو بھر مظلوم ہو رہا تھا لیکن رات ہونے میں کمی کھٹنے باقی تھے۔

سجاد کے رگ و پے میں ایک عجیب بے چینی سی دوڑتی بھرتی تھی۔ آج اس کی آزمائش تھی اور اسے ہر حال میں اس پر پورا اٹھنا تھا۔ یہیں سے اس کا آغاز ہوتا تھا جو اس کو اپنی منزل کے بلے جانے والا تھا۔ وہ تصویر ہی تصور میں خود کو اس واردات کے تمام مراحل طے

بیگانہ حسب عادت دنیا جہان کی باتیں کر رہی تھی مگر ہاجرہ کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس کچے راستے کی طرف بے قراری سے دیکھ رہی تھی جس طرف سے چوہدری نواز نے آنا تھا۔

دور سے تانگے کی آواز سنائی دی تو اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بیگانہ نے خوش ہو کر کہا کہ یہ آواز چوہدری نواز کے تانگے کی ہے۔ آواز قریب آئی مگر اس کا سفید شاندار گھوڑا نظر آیا تو ہاجرہ کی جان میں جان آئی۔ اس نے اطمینان کا سانس لیا اور اچھی طرح سے چادر کی بکلیں مارتی ہوئی درختوں کے جھنڈ میں سے باہر نکل آئی۔ چوہدری نواز نے قریب آ کر تانگا روکا ان کا حال چال پوچھا اور انہیں تانگے میں سوار کرایا۔

بلند قامت سفید گھوڑا دگلی چال چلنے لگا۔ چوہدری نواز ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا لیکن ہاجرہ اپنی الجھن سے باہر نہیں نکل سکی اس کی باتوں کے جواب زیادہ تر بیگانہ نے ہی دیئے۔ ہاجرہ بے چینی سے پہلو بدلتی رہی۔ اسے انتظار کا ایک لمحہ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہ مرحلہ طے کر لینا چاہتی تھی لیکن وہ لمحہ ہاتھ آئے میں دیر تھی۔

خدا خدا کر کے تاکہ ایک جگہ رکا۔ چوہدری نواز جھلاک لگا کر اتر اور انہیں بھی نیچے اترنے کیلئے کہا۔ ہاجرہ نے دیکھا وہ ایک شاندار حویلی نما عمارت تھی۔ اس نے کبھی تھانے کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ تھانہ کیسا ہوتا ہے۔

”میں نے سوچا کہ تو تھانے جا کر کہیں پریشان نہ ہو اس لئے میں نے تھاندار کو اپنی حویلی ہی بلایا ہے۔“ چوہدری نواز نے بتایا۔

یہ سن کر ہاجرہ کی جان میں جان آئی۔ تھانے کے خیال سے ہی وہ لرز رہی تھی مگر اب اسے اطمینان ہو گیا تھا۔ کوئی ملازم دوڑا ہوا آیا اور اس نے چوہدری نواز کا استقبال کر کے گھوڑے کی باگ تھام لی۔

”کیوں اونے مانجھے۔ تھاندار پہنچا ہے یا نہیں؟“ چوہدری نواز نے پوچھا۔

”مائی باپ اندر بیٹھک میں بیٹھا ہے۔ انتظار کر رہا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”کوئی چام پانی پوچھا ہے اس کو؟“

”چام پانی۔“ مانجھے نے دانت نکالے۔

”وہ تو اندر بیٹھا مرے کھار رہا ہے۔“

ہاجرہ نے تمکھ نکل کر قطن ترکیا اور دل میں اپنے بیانات دوہراتی بیگانہ کے

ساتھ اندر داخل ہوئی۔ ڈیوڑھی سے اگلے دروازے پر چوہدری نواز رک گیا اور بیگانہ بولا۔

”بیگانہ تو یہاں ڈیوڑھی میں بیٹھ۔ ہاجرہ ابھی تھاندار کے سامنے بیان دے کر آ جاتی ہے۔ پھر مانتھیں چھوڑ آئے گا۔ مجھے شہر کا کم ہے۔“

ہاجرہ نے پریشان ہو کر بیگانہ کی طرف دیکھا اور لڑتی ہوئی آواز میں بولی۔

”دیکھیں نہیں۔ بیگانہ تم میرے ساتھ چلو۔ مجھے اکیلے آئے گا۔“

”ڈرکس بات کا ہے میں جو تیرے ساتھ ہوں۔ تھاندار میرا دوست ہے۔ تو بالکل مت گھبرا۔“ چوہدری نواز نے ٹپکی دی۔

”اور ہاں تجھے تیرا بیان تو اچھی طرح یاد ہے نا۔ بس دس پندرہ منٹ کی بات ہے ساری۔ تو گھبرانا مت۔ بس جو وہ پوچھے اس کا جواب دے دیتا۔“

ہاجرہ نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں ڈھری سی تھیں۔ بیگانہ نے اس کے شانے پر جھپکی دی۔

”تو گھبرانا مت دیکھئے میں یہیں باہر بیٹھی ہوں۔“

ہاجرہ نے پھر سبے ہوئے اعزاز میں سر ہلایا اور چوہدری نواز کے پیچھے حویلی کے اندر داخل ہو گئی۔

.....

سجاد اندر آ کر جھکنے سے پہلے گھر لوٹ آیا۔ اس نے صحن میں ہاجرہ کو چولہے کے پاس سر جھکا کر بیٹھے دیکھا۔ اس نے سلام کیا۔ لیکن اس نے جواب نہیں دیا۔ وہ اس سے بہت کم بات کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات پر ناراض رہتی تھی کہ وہ منظور کے خون کا بدلہ کیوں نہیں لیتا۔ وہ ایک چھری جھپٹ کر اس کے نزدیک ہی بیٹھ گیا اور ہولے سے بولا۔

”گھر جانی۔ روٹی دے دے۔ آج تو بہت بھوک لگی ہے۔“

ہاجرہ نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اسی طرح کم مسمی بیٹھی رہی۔ سجاد نے پھر اسے مخاطب کیا۔

”گھر جانی! روٹی دے۔“

ہاجرہ نے چونک کر خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ یوں جیسے اب بھی اس کی بات سمجھ نہ پائی ہو۔ ایسا لگتا تھا جیسے اس کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ سجاد کو اس کا دلکش

چہرہ اتر اتر ہوا سانس ہوا۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں اندر کو دھنی ہوئی تھیں۔ اس کے سیاہ بالوں کے درمیان چمکتی ہوئی لمبی ہارک یا مگ میں راکھ پڑی ہوئی تھی۔

سجاد دکی سا ہو گیا۔ اسے وہ ہاجرہ یاد آئی جو رنگوں، خوشبوؤں اور پھولوں میں لدی ان کی چمکت پر اترتی تھی۔ تو اس کا گھونگھٹ میں چمپا چہرہ بھی گلاب کا سرخ پھول معلوم ہوتا تھا۔ مگر اب اس پر برسوں کی زدیں کھڑی تھیں۔ سجاد نے اس کے چہرے سے نگاہ ہٹائی اس کی بھوک مرگئی تھی۔ اس کے اندر جیسے لاوا سا اگلنے لگا تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کے بغیر انتقام کے اس راستے پر نکل جانا چاہتا تھا جو اس مظلوم عورت کی چمن جانے والی خوشیوں کا ازالہ کر سکے جو اس کے ذہنی دل پر تسکین کا پھار رکھ سکے۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے روٹی اور دال رکھ دی اور خود پھر کسی گہری سوچ میں اتر گئی۔ سجاد کو بھوک نہیں رہی تھی۔ لیکن اس نے یونہی عادت کیا توالہ تو ذکر منہ میں رکھا۔ دال چمکی اور کھتی کھتی روٹی بھی جگہ جگہ سے چلی ہوئی تھی۔ اس نے ہاتھ جھک لیا اور بغیر کچھ کبے اٹھ گیا۔

”سجاد!“ ہاجرہ نے اسے اٹھتے دیکھ کر پکارا۔

”کیا بات ہے بھر جانی؟“ وہ اٹھتے اٹھتے پھر بیٹھ گیا۔

”سجاد! اگر میں مر جاؤں تو مجھے اپنے بھائی کے ساتھ نہ دفنانا۔“ اس نے اچانک

انجینی لہجے میں کہا۔

سجاد نے دکھ اور حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے پھر اپنی بات دوہرائی۔

”اچھا سجاد! میری بات یاد رکھنا۔ مجھے منظور کے ساتھ نہ دفنانا۔ میری قبر اس کے

ساتھ نہ بنانا۔“

”دیکھیں باتیں کرتی ہے تو بھر جانی!“ سجاد نے دکی لہجے میں کہا۔

”جتنے میرا ذرا خیال نہیں۔ تیرے سوا میرا اس دنیا میں ہے ہی کون۔ ایک تیرے دم

سے تو یہ گھر کھلا ہے۔“

ہاجرہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف اس کے کھلائے ہوئے رخسار

آنسوؤں میں چمکتے لگے۔

سجاد کا دل کٹ گیا۔ وہ دھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہ رو بھر جانی! دل تو ہڈا نہ کر ہم ان دنوں سے گھر اکو مر رہے ہیں۔ ہم زندہ

رہیں گے اور ایک ایک سے ایسا بدلہ لیں گے کہ ان کی لٹیکیں یاد رکھیں گی۔“

ہاجرہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر سسکیوں کے درمیان بولی۔

”پتہ نہیں ان کا لے منہ والوں کو بدلہ کب ملے گا۔ ہم ہی مر چک جائیں گے۔ انہیں تو کچھ نہیں ہوگا۔ یہ سب کے سب ایک جیسے ہیں۔ ایک جیسے۔“ اس کے لفظوں میں دکھ اور اذیت تھی۔

سجاد کا سارا وجود جیسے درد غم سے سلگنے لگا۔ اس نے برداشت کرنے کو ہونٹ کاٹے۔ لیکن اس کی تسلی کیلئے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ وہ اس مرحلے کو کب اور کیسے طے کر سکے گا۔ چوہدری کی اونچی چوٹی کی دیواروں کو کب ڈھسا سکے گا۔ وہ مضبوط کی کوشش میں مضیاں سمجھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاجرہ نے سر گھٹوں پر رکھ لیا اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی۔

اس کی سسکیاں بڑی دلدوز تھیں۔ اس کے آنسوؤں میں غم سلگ رہے تھے۔ سجاد دیکھ کے گھر سے پانوں میں ڈوب گیا۔ وہ سوچتا ہی رہا کہ اس کے دیکھوں کا مادا کس طرح کرے۔ اسے کس طرح اذیت کی قید رہا لٹائی۔ اس کی زندگی کے پر ہمار روز و شب کیوں کر لوٹائے۔

اس نے کچھ جھجک کر اپنا ہاتھ جت اور ہوردی کے ساتھ اس کے کھلے ہوئے سر پر رکھا اور چپکے سے آکر اپنی کوفڑی میں لیٹ رہا۔ لیکن دل بہت بے چین تھا۔ اس کی روح پر ایک بوجھ سا آنا مگر تھا۔ وہ خود کو ہاجرہ کی روٹی ہوئی آنکھوں کا مجرم سمجھ رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کی جل قفل آنکھیں کیا تھا منا کرتی ہیں۔ اس کے سلگتے آنسوؤں کی خاموش زبان کیا کہتی ہے۔ اس کی سسکیوں اور آہوں کا مادا کیا ہے۔ لیکن شاید ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ وہ اس کی جل قفل آنکھوں کے تھانے پورے کر سکتا۔ اس کے آنسوؤں کے مطالیوں کے لئے کچھ کر سکتا۔ اس کے بے بس آنسو اس کے دل پر گر رہے تھے۔ اس کی دلدوز ہچکیاں اس کی روح میں گونج رہی تھیں۔ وہ بہت دیر تک کڑھتا رہا۔ کوشش بدلتا رہا۔ پریشان ہوتا رہا۔ دل ہی دل میں اپنے منصوبوں کے تانے بانے بناتا۔ آنکھیں سمجھ کر سونے کی کوشش کرتا رہا۔

پھر نہ جانے نہ سو گیا یا جاگتا رہا اسے صبح اعجازہ نہیں ہو سکا۔ تاریکی میں اچانک لائٹیں لی زرد سیلی سیلی روشنی نظر آئی۔ پھر ہاجرہ کا سوگوار چہرہ نمودار ہوا اور اس کی لرزتی ہوئی آواز نائی دی۔

”سجاول! چہ پدی نواز کا نام یاد رکھنا۔ اسے نہ چھوڑنا۔ اس نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔ کہیں کا نہیں رکھا۔ چہ پدی نواز کا نام یاد رکھنا۔ اچھا چہ پدی نواز کو یاد رکھنا۔“ اس کا لہجہ زنجی زنجی اور سرد تھا۔ اس کی آواز یوں ڈوب رہی تھی۔ جیسے بہت دور سے آ رہی ہو۔

سجاول کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ عالم بیداری میں ہے یا کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ زرد میلی روشنی کے ساتھ ہاجرہ کا بیمار دھول میں اٹا ہوا پھرہ بھی غائب ہو گیا۔ کمرے میں پھر تار کی پھیل گئی اور سب کچھ ایک خواب کی طرح دکھائوں سے اوجھل ہو گیا۔

سوںے جائے کی وحدت کی کیفیت میں سجاول سوچتا رہا کہ اس نے خواب دیکھا ہے یا ہاجرہ واقعی اس کی گھڑی میں آئی تھی۔ پھر اس نے آنکھیں کھلیں اور دیکھتے سے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ کمرے میں کال سیاہ رات چھائی ہوئی تھی اور ہاجرہ کا کہیں کوئی نام و نشان ہی نہیں تھا۔

وہ غموگئی میں بڑبڑایا اور نیم خوابیدہ کی کیفیت میں اس نے لمبے بھر کو یہی سوچا کہ شاید اس نے خواب ہی دیکھا ہے۔

رات وہ ہاجرہ کے بارے میں ہی سوچتا ہوا سوچا تھا۔ اس کی باتیں اس کے ذہن پر اس قدر طاری تھیں کہ اسے خواب میں بھی وہی سب کچھ نظر آتا تھا۔ پھر اس کا دل چاہا کہ اٹھ کر ہاجرہ کو دیکھ آئے۔ مگر اس نے خود ہی بات ذہن سے جھٹک دی کہ اگر یہ سب خواب ہوا تو ہاجرہ مفت میں پریشان ہوگی۔ جو بات بھی ہوئی وہ اس سے صحیح ہی معلوم کر لے گا۔ اس نے کروٹ بدلی اور یہی کچھ سوچتے سوچتے بے خبر ہو گیا۔

○.....○.....○

”ہائے دے سجاول تیری بھر جانی کنوئیں میں ڈوب گئی۔“

سجاول دھک سے رہ گیا۔ اس نے خالی خالی نظروں سے ان کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔ مردوں میں سے کسی نے عورتوں کو ڈانٹا کہ انہوں نے اچانک اس کو یہ خبر کیوں سنا دی ہے۔ پھر اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر بہت آہستگی سے بولا۔

”سن یار سجاول! تیری بھر جانی ہاجرہ کی لاش کنوئیں میں پڑی تھیں۔ شاید بیماری کا پاؤں پھسل گیا۔ کوئی قریب نہیں تھا جو اس کی مدد کرتا۔ ہمیں تو عورتوں نے صحیح خبر کی ہے تو سب نے نل کر اسے کنوئیں سے نکالا ہے۔ حکیم صاحب کو بھی دکھا لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں اسے فوت ہوئے کافی دیر ہو چکی ہے۔“

سجاول کا ذہن مافوق سا ہو گیا۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آسمان اس پر ٹوٹ پڑا ہے۔ زمین اس کے پاؤں تلے نہیں ٹھہرتی۔ ارگرد کھڑے لوگ افسوس کرنے لگے۔ کچھ

عورتیں رونے اور بلند آواز میں جین کرنے لگیں لیکن وہ بالکل چپ کھڑا رہا۔ گرد و پیش سے بے خبر۔ صدمے سے اس کا ہجرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔

کسی ہمسائے نے اس کا ہاز و پکڑا اور محسن کے اس گوشے میں لے آیا۔ جہاں ہاجرہ کی لاش پڑی تھی۔ کسی نے اس کے چہرے سے کپڑا ہٹایا کوئی عورت بھڑائی ہوئی آواز میں بولی۔

”لے پڑ۔ بھڑائی کا منہ دیکھ لے۔“

اس نے ایک نگاہ ہاجرہ کے بے جان چہرے پر ڈالی اور یقیناً مٹھکوں کے بل یوں جھک گیا جیسے گر پڑا ہو۔ ایک عجیب سی حسرت سے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں نہ جانے کیا بڑبڑایا اور سر اس کی چارپائی کی پٹی پر رکھ دیا۔ کوئی کہتا تھا کہ ہاجرہ غلطی سے کنویں میں گر پڑی تھی۔ کوئی کہتا تھا کہ کسی نے اسے دھکا دے دیا ہے۔ مگر اندر ہی اندر سب کا خیال تھا کہ اس نے خودکشی کی ہے۔ جتنے مدتی آجائیں تھیں۔ وہ دونوں کے منہ بند کر سکتا تھا۔ نہ ہاجرہ کے نام پر کی گئی ہوئی تہمت مٹا سکتا تھا۔ اسے خود بھی وہ رات یا قحی جب ہاجرہ اس کے کمرے میں آئی تھی اور جسے وہ خواب بھٹتا رہا تھا۔

لیکن وہ حقیقت تھی۔ ایک تڑپا دیئے والی عالم حقیقت جس میں چوہدری نواز کا نام آتا تھا۔ پردے ایک ایک کر کے اس کی نگاہوں سے ہٹتے جاتے تھے۔ اسے ہاجرہ کی سب باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی جا رہی تھیں۔ اس کا جھکا ہوا سر۔ اس کی روٹی آنکھیں۔ اس کی بچھتاوے کی کیفیت۔ اس کا بار بار موت کا ذکر کرتا اور اپنی قبر منگور کے ساتھ نہ بنانے کی تاکید کرتا۔ ہر بات میں وہی ایک راز تھا جو گاؤں میں پہنچنے کی زبان پر تھا۔ مگر یہ صرف سجادول ہی جانتا تھا کہ اس راز میں چوہدری نواز کا نام بھی آتا تھا۔

گاؤں کے بزرگوں نے مل جل کر ہاجرہ کے فتنے دُفن کا انتظام کر دیا تھا اور بات پولیس تک نہیں پہنچی تھی۔ مگر لوگوں کی زبانیں بند نہیں ہوئیں تھیں۔ وہ اپنے اپنے انداز سے لگائے سے نہیں چوکتے تھے۔ کسی گھر سے اس کا ذکر کرتا تو کوئی ہوردی سے اٹھار اٹھوس کہتا۔ کوئی ترس کھا کر بار بار اس کا تذکرہ کرتا تو کوئی مشکوک لہجے میں سارا واقعہ وہڑنے لگتا۔ ہاجرہ کا ذکر۔ اس کی موت۔ سارے گاؤں میں کسی نہ کسی طرح گردش کی پھرتی تھی جس نے سجادول کو پاگل کر دیا تھا۔ لوگوں کی مشکوک نظریں اسے جیسے کٹی تھیں۔ دل جلانے والے تذکرے اسے غیرت سے مارے دیتے تھے۔ ابھی بھاگ بھری کا نام گاؤں والوں کی یادداشت سے نہیں ہوا تھا کہ ہاجرہ ایک نیا باب کھول گئی تھی۔

سجادول پر ہر وقت ایک دھشت سی سوار رہنے لگی تھی۔ ماضی کے جن رنجوں پر اس نے مصلحت کی مرہم رکھ دیا تھا وہ اسے پھر بیکل کرنے لگے تھے۔ یہ خیال بار بار اسے بچو کے لگتا تھا کہ اس نے ہاجرہ سے پرچا کیوں نہیں تھا کہ وہ چوہدری نواز کا نام کیوں لیتی تھی؟ وہ اس کے بارے میں کوئی گری ہوئی بات نہیں سوچتا چاہتا تھا۔ مگر اس حقیقت کا کیا کرتا جو بے رحمی سے منہ کھولے اپنے وجود کا احساس دلا رہی تھی۔ اس کے تصور سے ہی اس کا سینہ تلک تلک تھا۔ اس کے اندر غم و غصے کا جولا کھسکیں لاوا اگلنے لگتا تھا جو اسے تمام مصلحتوں کو پس پشت ڈال کر قانون ہاتھ میں لینے پر مجبور کر رہا تھا۔

.....

اس نے کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ نہ ہی کسی کو اپنے ساتھ شریک کیا ایک جنون بکولے کی طرح اس کے رویں روئیں میں اٹھا اور وہ اندھا دھند آگے بڑھتا چلا گیا۔ اسے اپنے کپڑے کوئی افسوس یا پشیمانی نہیں تھی۔ نہ ہی اس کے دل میں کوئی خوف یا اندیشہ تھا۔ اس کے سینے میں بھڑکی ہوئی آگ پر جیسے کسی نے ٹھنڈے پانی کا چھینٹا مارا کہ اس کی تپش میں کی کر دی تھی۔ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کے وجود پر لگے ہوئے رنجوں میں سے ایک دغمنہ مندل ہو گیا تھا۔ علاقے میں بہت بھگدڑ مچی۔ پولیس آتی جاتی رہی۔ پکڑ رکھڑ ہوئی مگر وہ اپنے آپ میں گمن رہا۔ اس نے استاد سے بہت سے گھر کھینچے تھے۔ پولیس والوں کو بھی معلوم تھا کہ وہ استاد کا بندہ ہے اس لئے اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔

ویسے بھی وہ دشمن دار آدمی تھا۔ جاگیرداروں کے ساتھ اس کے بہت سے مقدمے عدالت میں تھے۔ اس لئے پولیس کی تفتیش کا رنج ہی جا بجا تھا۔ مگر جاگیرداروں کا اثر و رسوخ ان پر کھلے بندوں ہاتھ نہیں ڈالے دیتا تھا۔

سجادول اب اپنے گھر میں آتا جاتا تھا۔ یہاں اس کے لئے رہا ہی کیا تھا جس کی طلب اسے یہاں آنے پر مجبور کرتی۔ رشتوں سے خالی ہو کر وہ کچھ خستہ حال مکان ہی تو رہ گیا تھا اسے گھر کہتے ہوئے بھی دل ہولن تھا۔

دیرانی اور ستار نے اپنے چاروں جانب اس میں ڈیرے لگا رکھے تھے۔ اس کے ذرے ذرے سے بھاگ بھری کی جھینٹ سناؤ دیتی تھیں۔ اس کے در و دیوار سے ہاجرہ کی روٹی ہوئی آنکھیں بھاگتی تھیں۔ اس کا کچھ منگور کے خون میں تھمزا ہوا نظر آتا تھا۔ سجادول اس جگہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا چاہتا تھا۔ یہاں آکر اس کا دل ہولن جاتا تھا۔ اسی لئے وہ زیادہ تر

استاد کے ڈیرے پر ہی رہتا تھا۔ کبھی کبھار حالات جاننے کے لئے یہاں کا چکر لگاتا تھا۔ ایک جھلٹی ہوئی دوپہر کو وہ اپنے گھر آیا تو اس کی اداسی اور بے سروسامانی اس کے اندر کھب گئی۔ مگر شہر خاک اڑ رہی تھی۔ نوٹے ہوئے برتن یہاں وہاں گھرے پڑے تھے۔ سوکھے ہوئے زرد پتے سنی میں دل رہے تھے۔ وہ ان پتوں پر چلتا نیم کے گتے بیڑے جا کھڑا ہوا۔ اس کے منظرے سائے نے جیسے اسے اپنی پناہ میں لیا۔ فضا کی حدت جو اس کے اندر کی پنش سے مل کر ان کے رگ و پے میں بے چینی بن کر دوڑ رہی تھی اس کی شدت میں کمی ہوئے گی اس نے منھ منھ سے انداز میں درخت کے تنے سے پشت لگا لی۔

یہ بیڑ تو بیاضی گھنا تھا۔ اس کا سایہ ویسا ہی خشک اور شاداب تھا مگر اس کے ارد گرد کی دنیا اجڑ گئی تھی۔ اس کی جھاڑوں کا سہاگ لٹا تھا۔ اس کی رشتیں چمن گئی تھیں۔ اس کے سائے میں منظور اور ہا جہرہ نے نس نس کر باتیں کی تھیں۔ ماں نے چڑھا کا تھا۔ بابا حقہ گڑ گڑاتا رہا تھا اور وہ خود بچپن کے معصوم معصوم کھیل کھلتا رہا تھا۔ یہاں بھگ بھری بھی اپنی سہیلیوں کے جہرمت میں چپکتی رہی تھی لیکن اب تو یہاں کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ یہ ساری قربتیں، تمام چاہتیں ایک ایک کر کے چمن گئی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھ کیلئے زندگی سے نکل گئی تھیں۔ اسے تنہا چھوڑ کر..... کیلئے پن کے صحرا کے حوالے کر کے۔

”سچا دل!“ ایک بچائی ہوئی سی آواز بہت قریب سے آئی۔

سچا دل کو یہ بھی ایک دھوکا ہی لگا۔ اس نے آواز کی سمت تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی اور اسی طرح چپ اور اداس کھڑا رہا۔

”سچا دل!“ پھر اسی آواز نے پکارا اور پکار کر رو پڑی۔

سچا دل نے نگاہ اٹھائی۔ رانی کا دلشیں چہرہ اس کے مقابل تھا جس کی ہوا بی آکھوں سے آنسو رخسار پر بہہ گئے تھے۔ وہ اب بھی لکھوں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے دیکھے ہوئے دل میں کوئی لطف چنہ بیدار نہیں ہوا۔

”تو یہاں کیوں آگئی ہے؟“ وہ لاشعری سے بولا۔

رانی بے ساختہ سکیوں سے رو پڑی۔

”سچا دل..... تو کہاں چلا گیا تھا؟“ اس کے اندر کی لاشعری محبت اس کے لہجے کی بے قراویں میں امنڈ امنڈ کر سچا دل کے چہرے میں گداز پیدا کرنے لگی۔

”سچا دل..... تو کہاں چلا گیا تھا؟“ اس کی آنسو بھری آنکھوں، اس کے جھپٹے ہوئے

رخساروں، اس کی رمدھی ہوئی آواز نے ایک زخمی سا گھوہ کیا۔

سچا دل نے اذیت سے ہونٹ کاٹے۔ وہ اس کے سر پر تائے کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ وہ کن راہوں پر بہت دور نکل گیا ہے۔ اس نے کون سا راستہ چن لیا ہے۔ وہ لفظ ہی ڈھونڈتا رہا کہ اس کے سوال کا کیا جواب دے۔ جو اس کے قریب کھڑی اپنا حق سمجھ کر بڑے مان سے پوچھ رہی ہے کہ وہ کہاں چلا گیا تھا۔ اسے کچھ اور نہیں سوچا تو رکے سے لہجے میں بولا۔

”رانی! بس اب میں چلا جاؤں گا۔ یہاں میرا بے ہی کون؟“

رانی بھونچکی سی رہ گئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو تیزی کے ساتھ بہنے لگے۔ وہ بار بار شاکہ نظروں سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس نے مضبوطی سے اس کی آستین تھام لی اور مت کرنے لگی۔

”ہائے سچا دل! تجھے حرم ہے تو کہیں مت جانا۔ کہیں مت جانا۔ یہیں رہنا۔ میری آنکھوں کے سامنے۔“

سچا دل کا دل اس کی طرف کھینچنے لگا۔ وہ خود کو اس کے سامنے بے بس سامعوں کرنے لگا۔ اس کی روٹی ہوئی آنکھیں۔ اس کے بہتے ہوئے آنسو اسے کمزور کرنے لگے۔ مگر اس کے پاس آس کی کوئی جوت نہیں تھی جو اس کے دامن میں ڈال دیتا۔ اس نے بڑے ضبط کے ساتھ آستین اس کے ہاتھ سے چھرائی اور مضبوط لہجے میں بولا۔

”رانی!..... میں اپنے ساتھ تیری زندگی خراب نہیں کرنا چاہتا۔“

”اس طرح نہ کہہ سچا دل!“ رانی نے بے قراری سے اس کی بات کاٹ دی۔

”تو پھر کس طرح سمجھاؤں تجھے؟“ وہ چڑچڑ سے پن سے کہنے لگا۔

”تجھے کیا پتہ میں کن حالات میں پھنسا ہوا ہوں۔ تو نہیں سمجھ سکتی کچھ نہیں سمجھ سکتی۔“

”سمجھ سکتی ہوں۔ سمجھ کیوں نہیں سکتی۔“ وہ آنسو پونچھی ہوئی بولی۔ ”تو بھانجے کا تو

سمجھو گی نا تو بتاتا تو سہی۔ بتایا کیوں نہیں؟“

”کیا معیت ہے۔ اب میں ہر بات تجھے نہیں بتا سکتا۔“ وہ بے حد روکے لہجے میں

بولا۔

اسے رانی کی آنسوؤں میں ڈوبی آنکھوں کا سامنا کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ اس کے اندر

ایک عجیب سی دھت سر اٹھا رہی تھی۔ وہ پریشانی سے سر جھٹک کر بولا۔

”بس اب تو گھر جا۔ چل یہاں نہ آیا کرتو۔ جا شاپاں اپنے گھر چلی جا۔“ وہ اس کا بازو تھپتھا کر بولا۔

رانی نے بھی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کے بازو سے لگ گئی۔

”سجاد! سجاد! تجھے کیا ہو گیا ہے؟ تو کتنا بدل گیا ہے۔ میں تو سمجھا تھا کہ تو آجائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ پر تجھے تو میری پروا ہی نہیں۔ یہ دن آنے سے پہلے تو میں مرجانی تو اچھا تھا۔ میں جاکوں کی سجاد۔ تم دیکھنا میں مرجاؤں گی۔ پر کسی اور کی ڈولی میں نہیں بیٹھوں گی۔ تم دیکھنا۔ میں جان دے دوں گی۔ میں مرجاؤں گی۔“ وہ اس کا بازو جھنجھوڑ کر بے ربط بیٹھے کبھی چلی گئی۔

سجاد کے رد میں روئیں میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ رانی کی شوریدہ سرعیت جسے اس نے بڑی مشکل سے اپنے دل اور روح کی گہرائیوں میں زخمہ زن کر دیا تھا۔ ایک دم کسی طوفان کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے بے تاب ہو کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا اور جلتے ہوئے لہجے میں بولا۔

”نہیں۔ تو کسی کی ڈولی میں نہیں بیٹھے گی۔“

رانی نے ایک خوشگوار سی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا اور اس کے سینے سے اپنی پیشانی رگڑتی ہوئی بولی۔

”سجاد! سجاد! اچھے پتہ تھا۔ مجھے پتہ تھا کہ تو آجائے گا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ سب کچھ۔“ اس کا دلکش چہرہ اس کے اچھے رنگوں سے جھللا رہا تھا۔

سجاد نے لمبے بھر کو اپنی ٹھوڑی اس کے مختصر بالے بالوں پر لگا دی۔ یہ لمحہ کتنا عزیز! کتنا خوبصورت اور دل نواز تھا۔ لیکن یہ اس کی تمام زندگی پر محیط نہیں ہو سکتا تھا۔ رانی اس کی ہاتھوں میں آدودہ نہیں رہ سکتی تھی۔ اس کا راستہ تو کانٹوں سے بھرا تھا۔ اس کے راستوں میں تو کوئی جنت ایسا گہرا اور محفوظ صحت نہیں تھی۔ جو وہ رانی کو اس کی بیش بہا محبت کے عوض دے سکتا۔ اس کے پاس اعتبار نہیں تھا۔ اس کے پاس یقین نہیں تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں تھا کہ کب اس کے ہاتھوں میں جھنجھڑیاں آن پڑیں گی۔ کب وہ تختہ دار پر کھڑا ہوگا۔ اس سوچ نے اس کے بازوؤں کی گرفت ڈھیلی کر دی۔ اس نے ہولے ہولے سے اسے آزاد کر دیا اور مجھے ہوئے لہجے میں رک رک کر کہنے لگا۔

”رانی! میرے پاس تجھے دینے کیلئے کچھ نہیں ہے۔ کچھ بھی نہیں۔“
رانی نے شامی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور غصے سے اسے جھنجھوڑ دیا۔
”سجاد! اس طرح کیوں کہتا ہے۔ تا تو کیوں کہتا ہے اس طرح۔ تجھے میرا خیال نہیں آتا۔“

اس کے اعداز میں اسنے ٹھکے ہوئے تھے کہ سجاد اس سے لگا ہیں چار کرنے کی ہمت بھی نہیں کر سکا۔ اس نے رانی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ابھی کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ دروازہ چوہنٹ کھول کر گاؤں کے کتے ہی لوگ اندر گھس آئے۔ ان میں سب سے آگے رانی کا باپ غصے سے سرخ چہرہ میں چلا آتا تھا۔

رانی کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ قہر قہر سے کہنے لگی۔ اس کا باپ غصے میں اس کی طرف بڑھا تو سجاد نے راستہ روک لیا اور بڑے تحمل سے بولا۔

”چاچا کیا بات ہے؟“

”واہ بھئی۔ تجھے ابھی پتہ ہی نہیں کہ کیا بات ہے؟“ کوئی طعنے لہجے میں بولا۔
”خبردار۔ بے گناہ لڑکی پر تہمت نہ لگانا۔“ سجاد نے ڈپٹ کر کہا۔ پھر رانی کے باپ سے مخاطب ہوا۔

”چاچا! مہرا! ان لوگوں کے کہے میں آکر اپنی لڑکی کو بدنام نہ کر۔“ تجھے پتہ ہے کہ میں تو یہاں ہوتا ہی نہیں ہوں۔ آج آیا ہوں تو یہ میری بھر جانی ہا جس کی ایک امانت مجھے دینے آئی ہے اور بس۔ اتنی سی بات ہے۔ جس کو تم لوگ پتہ نہیں کیا ہے کیا بنا رہے ہو۔“ سجاد نے یہ بات اسنے ڈوٹ اور اعتماد سے رانی کے باپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہی کہ وہ بھی متذبذب سا ہو کر اس کے چہرے کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے معاملے کی اصلیت جاننے کی کوشش کر رہا ہو۔

مجھے میں سے کچھ لوگ بائیں بنانے لگے مگر سجاد نے خود کو کمر نہیں پڑنے دیا۔ اس نے بڑی جرأت سے رانی کے باپ کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔

”چاچا! تو لوگوں کی طرف نہ دیکھ۔ مجھے بتا۔“ تجھے اب بھی شک ہے تو میں قسلی کر ادیتا ہوں۔“

رانی کا باپ گھموکی سی کیفیت میں کھڑا سر کو بے معنی سی جنبش دیتا رہا۔ سجاد نے زور سے کر کہا۔

کے گھر سے گرم گرم ناشتہ آگیا تھا۔ گاڑھی لپی، پراٹھے، ساگ اور مکھن دیکھ کر اسے بھی کچھ بھوک محسوس ہونے لگی۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ استاد نے مہربان نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔

”آپڑ۔ بسم اللہ کر۔“

وہ بغیر کچھ کبے اٹھا اور بے دلی سے تھوڑا سا کھا کر ایک طرف بیٹھا رہا۔ طبیعت پڑمردی ہو رہی تھی۔ کسی سے بات کرنے کی کوئی نہیں چاہتا تھا۔ دنیا اجڑی اجڑی سی محسوس ہوتی تھی۔ گرد و پیش جیسے سناٹا سا چھا گیا تھا کسی طرف بھی دیکھنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔

استاد کی تجربہ کار نگاہوں نے اس کی غیر معمولی خاموشی اور افردگی کو محسوس کر لیا لیکن اس نے خود کچھ نہیں پوچھا۔ وہ معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف وقفے وقفے سے یوں دیکھتا رہا جیسے اس کے دل کی نیکیات سے واقف ہو جیسے اس کے گھٹنیں چہرے پر کھنکھناتی ہوئی آوازوں کو صاف صاف پڑھ رہا ہو۔ جیسے اس کی اداسی کا سبب جانتا ہو۔

اس نے اس روز اس کے ساتھ معمول سے زیادہ محبت اور اچانکیت کا برتاؤ کیا۔ وہ بڑی بے تکلفی سے ساتھ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مختلف کاموں میں اس سے اس طرح مشورہ کرتا رہا جیسے ساری ذمہ داری اسی پر ہو جیسے اس پر بے پناہ اعتماد ہو۔

جب ذرا دن ڈھلا تو استاد نے اسے قریب بٹھا کر رازداری سے پوچھا کہ وہ آج رات کی واردات کیلئے تیار ہے یا نہیں۔ سجاد ابھی خاموش ہی تھا کہ وہ بڑی طاعنت سے بولا۔

”دیکھتے چہ۔ اگر آج تیرا دل نہیں تو نہ سہی۔“

سجاد نے لمبے بھوکو سوجا۔ کھنکھار کر گلا صاف کیا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

”دل کیوں نہیں استاد! آج ہی تو دل سے جاؤں گا۔“

اب بھلا اسے پرواہ ہی کس کی تھی۔ رانی اس کی زندگی سے جیسے چپے سے نکل گئی تھی۔ سارے رشتے ایک ایک کر کے چھن گئے تھے۔ تو اب اسے کسی کیلئے نہیں رہنا تھا۔ اُسے کسی کا خیال نہیں رہنا تھا۔ اسے مڑ نہیں دیکھنا تھا۔ اس کے اندر ایک پیکاری جادری تھی۔ اس کے اندر کوئی بیٹھا اسے بچو کے لگا رہتا تھا۔ اس کے رویں روئیں میں الاؤ سے جلتے رہتے تھے۔ وہ اپنے اندر بھڑکتی ہوئی آگ میں گرد و پیش کی ہر شے کو جلا کر بھسم کر دیتا چاہتا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور رات کیلئے تیاریاں کرنے لگا۔

”دیکھ جا چا! لڑکی بے قصور ہے۔ اسے کچھ مت کہنا۔ اب جا اسے اپنے ساتھ گھر لے جا۔“ وہ اتنا کہہ کر ہائش کی طرف مڑ گیا۔

رانی ہلدی ایسا زرد چہرہ لئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ اسے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے دیکھتی رہی۔ دوسرے لوگ اب بھی چنگوٹیاں کر رہے تھے۔ رانی کا باپ سر جبک کر آئے بڑھا اور سبھی ہوئی رانی کا بازو پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

○.....○.....○

سجاد نے سارے گھر پر ایک اودھامی نگاہ ڈالی۔ یادوں کا ایک جھوم سامے اپنی جانب ہٹتا ہوا نظر آیا۔ اس کے ذہن کے تاریں جھٹھنا اٹھے۔ وہ جھجھوڑ دینے والی یادوں میں زندہ چٹا جانے لگا۔ اس نے گھبرا کر بلند آہٹ دیواروں کو ڈھایا اور دروازے کو یونہی کھلا چھوڑ کر بغیر پلٹ کر دیکھے اکھڑے ہوئے قدم لیتا اور ادھر ایک جانب چل پڑا۔

وہ چٹا رہا۔ کبھی تیز۔ کبھی مدھم۔ کبھی لڑکھاتا ہوا اور کبھی خود کو گھٹینا۔ خاموش، رنجور اور دل گرفتہ۔ نہ جانے وہ کب تک چٹا رہا۔ کسی سست کاشتین کے بغیر۔ کسی منزل کو نگاہ میں رکھے بغیر۔ نہ جانے کن سوچوں میں الجھا ہوا۔ گھٹن سے چور چور۔ ٹوٹے ہوئے جوڑ بندے کے ساتھ۔

دروازے کے قریب بھگ کے نشے میں دھت پڑے ہوئے سائیں نے ادھر ادھر جھولنے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن نشے کی جھونک میں خود ہی ایک جانب لڑکھ گیا۔

سجاد نے دروازہ دھکیلا اور استاد کی چار پائی پر پڑ رہا۔ وہ کتنی ہی دیر چت لینا محبت کو گھورتا رہا۔ اسے رانی کا آنسوؤں میں بیٹا چہرہ اپنے قریب ہی کہیں محسوس ہوا۔ اس کی سسکیوں کی آواز اسے بار بار سنائی دیتی رہی۔ اس کی گرم سانس اس کو چھوتی رہی۔ اس نے دکھ اور عروسی کے کاٹ دینے والے احساس سے بیکل ہو کر آنکھیں میچ لیں اور تصورات میں جھٹکتی اس کی واضح تصویر پر سے نگاہ ہٹا لیتی چاہی لیکن اس کے رنگ اور شوخ اور واضح ہو گئے۔ وہ اس سے اور قریب آگئی۔ اور قریب۔ بے حد قریب۔ اس کے پاس۔ اس کا سارا وجود اسے پکارنے لگا۔ اس کی طلب اسے بچو کے دینے لگی۔ اس کا بے چین دل اس کی آرزو میں چلنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے گرم قطرے بہہ بہہ کر نکلتے جنہ جب ہونے لگے۔

استاد نے اسے جگایا تو دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ وہ آنکھیں ملا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔ استاد

زندگی ایک مخصوص ڈگر پر چل نکلی۔ حالات نے اسے ایک نیا روپ دے دیا تھا۔ وقت نے اسے ایک نیا انسان بنا دیا تھا جو اس سجادہ سے بالکل مختلف تھا جو ماضی شہور کا بیٹا تھا جس نے اس کی انگلی پکڑ کر چلنا سیکھا تھا۔ جو گاؤں کے گلی کوچوں میں سر جھکا کر گزرتا تھا۔ وہ اب ایک نیا سجادہ تھا۔ جس کے دل میں بھری ہوئی نفرت تھیں۔ جس کے اندر انتقام کی آگ جولاہی بن کر پھوٹی تھی۔ جو سارے جہاں سے برگشتہ تھا۔ جو ہر کسی سے بدلہ لیتا چاہتا تھا۔

استاد کہتا تھا کہ وہ قسمت کا دشمن ہے جس طرف جاتا ہے کامیابی اس کے قدم چوٹی ہے۔ جلد ہی وہ استاد کے تابع کی حیثیت اختیار کر گیا۔ وہ اس پر اتنا اعتماد کرنے لگا تھا کہ اس نے سارا کام اس کے سپرد کر دیا تھا۔ وہ اب ڈیرے کی بیٹھک میں بیٹھا مونچھوں کو تادوتا اور حکم چلاتا۔

سجادہ نے ڈیرے کی کایا پی پلٹ دی تھی۔ اس نے بیٹھک کو نئے انداز میں آراستہ کیا۔ چار پائیاں نکلوا کر میز کرسیاں ڈالوائیں۔ اس کی صفائی ستھرائی کا انتظام کیا۔ بھٹی چڑی اور دوسرے نشہ باز جو ہر وقت وہاں بیٹھکھا کئے اور ادھر رہتے رہتے تھے انہیں نکال باہر کیا۔ پولیس والوں سے بھی اس نے اچھے مراسم پیدا کر لئے تھے۔ علاقے کے باسوخ لوگوں سے بھی اس نے بنا کر رکھی تھی۔ اس نے استاد کے کام کو کہیں سے کہیں پہنچا دیا تھا۔ اس نے صرف قابل اعتماد لوگوں کو ہی اپنے ساتھ رکھا تھا اور بڑی ہوشیاری اور رازداری سے کام کرتا تھا۔

اسے کسی کی پروا نہیں تھی۔ نہ کسی کا خوف تھا۔ وہ ماضی کے رستے ہوئے زخموں کا مداوا کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اچھے ہونے مگر کے بدلے ساری دنیا کو اجاڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے چوہدری اور جاگیرداروں کے نام اپنے دل پر کھود لئے تھے۔ وہ ان سے ملتی جلتی صورتوں کو بھی منح کر دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے سنگتے من کو تسکین دینا چاہتا تھا۔ وہ اپنے اندر بھڑکتی آگ کو بجھانا چاہتا تھا۔ وہ انتقام کے راستے پر بہت دور تک نکل جانا چاہتا تھا۔

ایک عرصے بعد اس کا استاد کے گھر جانا ہوا تو گلابی کا دلکش چہرہ دیکھنا بہت اچھا لگا۔ وہ الہڑپنے سے پاؤں دھرتی، جھانپتیں بجاتی اس کے قریب آکھڑی ہوئی اور ایک ناز آفرینا غرور سے پوچھنے لگی۔

”تو کہاں تھا سجادہ؟ بڑے دنوں بعد محل دکھائی ہے؟“

اس کے انداز کا حکم نہ جانے کیوں سجادہ کو برا سا لگا۔ اسے رانی کی ملاحت یاد آگئی تھی۔ وہ کتنے پیار سے شہوہ کرتی تھی۔ وہ کیسے ڈر ڈر کر شکایت کرتی تھی۔ اسے خفا ہونا آتا ہی نہیں تھا۔ وہ تو اس کے خفا ہو جانے سے ڈرتی رہتی تھی۔

اور ایک یہ گلابی بھی جس کے ہر انداز میں حکم اور سرکشی تھی۔ وہ بات کرتی تھی تو معلوم ہوتا تھا جیسے سر پھاڑ دے گی۔ اس کا جی چاہا کہ زور سے اس کے بال کھسوت ڈالے۔ بھلا وہ کون ہوئی تھی اس سے پوچھ بچھ کرنے والی۔

اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور چڑچڑے پن سے بولا۔

”میں تیری طرح قارخ بیٹھا کھیاں نہیں مارتا۔ ہزار بکھیرے ہیں میرے دیکھنے لے۔“

گلابی کا دلکش گلابی چہرہ جھٹسا سا گیا۔

”اچھا۔ میں کھیاں مارتی ہوں۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”اور گھر کا سارا کام تیرا ہیہ کرتا ہے۔“

سجادہ کو اور غصہ آگیا۔

”باپ کا نام نہ لیتا۔ کبھی۔“

”کیوں؟“ گلابی نے بے ساختہ گالی بکی۔

”کیا کر لے گا تو میرا؟“

سجادہ نے گالی کے جواب میں گالی ہونٹوں پر ہی روک لی اور کڑنگی سے بولا۔

”میں تیری یہ گزبھری زبان کھینچ لوں گا۔“

”یہ رکب کسی اور کو دے جا کر کہینے۔“ وہ آگ جگولا ہو کر پے در پے کئی گالیاں بک لے

گی

سجادہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور اسے تل دے کر اس کی کمرے پیچھے لے گیا۔ گلابی دھڑکی ہوئی لیکن نہ جانے کیوں چپ ہو گئی اور حیران آنکھوں سے اس کی جانب دیکھتی رہ گئی۔

سجادہ نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر تھوڑا لہجے میں کہا۔

”اگر اب گالی بکی نا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔“ ایک جھٹکے سے اس نے اس کا

بازو چھوڑا اور اسے ساکت سی کھڑی چھوڑ کر باہر نکل آیا۔

.....

اسے گلابی کے حسن، اس کی شونہوں اور اس کے اغماض میں جیسے التفات سے کیا لیتا تھا۔ اسے زندگی کی کوئی کشش، کوئی رعتائی اپنی جانب نہیں پہنچتی تھی۔ جینا اس کے لئے ایک عذاب اور سانس لینا ایک تہمت تھی۔ جب تک وہ اپنے گھر کی عزت اپنی بہن کا پتہ نہیں چلا لیتا تھا۔ وہ دن رات اسی خیال میں سرگرداں رہتا تھا اسی جستجو میں ہانگوں کی طرح یہاں وہاں دیکھتا پھرتا تھا۔

پھر اڑتی اڑتی سی خبر اسے یہ ملی تھی کہ بھاگ بھری کوئیردار جیون کے آگے جوئے میں ہار دیا گیا تھا۔ اس بات نے سچاول کو پاگل سا کر دیا تھا کہ اس کی بہن کو تاش کا پتہ بتا دیا گیا تھا۔ اس نے جائیداد کو خون میں نہلا دینا چاہا۔ وہ نمبردار کو منہ نوح لینا چاہتا تھا۔ وہ اذیت دے دے کر اسے کتے کی موت مارنا چاہتا تھا۔ وہ اسے گھر سے بازار میں سنسکار کرنا چاہتا تھا۔ نمبردار نے اس کی آنکھ میں نفرت کی چنگاریاں پھونکنے دیکھ لی تھیں۔ اس کے انداز، اس کے لہجے میں اسے خبر کی سی کاٹ نظر آئی تھی۔ وہ کچھ تسخیل کیا اور کھور کر اس کی طرف سے دیکھتے ہوئے اکڑ پڑے بولا۔

”کیوں اونے۔ تو کتنے بھروسے میں ہے جوان؟“

سچاول نے مشکل خود پر قابو پایا اور غبر بھر کر بولا۔

”مجھے کسی لڑکی کے داروں سے بھیجا ہے۔ اس کی ماں اس کے غم میں مر گئی ہے۔ اس کا باپ اسے ڈھونڈنے نکلا تھا آج تک واپس نہیں آیا۔ پتہ نہیں مر کھ گیا یا عزت کے خوف سے کہیں منہ چپا کر بیٹھا ہے۔ تم کس اتنا بتا دو کہ وہ لڑکی ہے کہاں؟“

”اونے پارا“ وہ آنکھ تھپتھپاتے لہجے میں گویا ہوا۔

”تو کسی گڑھے مردے کے کھاڑنے آ گیا ہے۔ ہم کوئی حساب رکھتے ہیں کہ کون کہاں سے آئی ہے اور کدھر گئی ہے۔ یہاں تو کتنی آتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔“

سچاول نے اذیت سے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

”پھر کبھی کوئی اتہ پتہ؟“

”کیا اتہ پتہ؟“ وہ تیزی سے چھا کر بولا۔

”جوئے کا مال کتنے دنوں ہاتھ سے رہتا ہے؟ جس طرح آتا ہے اسی طرح چلا جاتا

ہے۔“

سچاول اپنی جگہ بیٹھا نہ سکا۔ مضیاں سمجھتا اور ہونٹ چپاتا وہ کمرے میں بے چینی سے ٹپکتے لگا۔ نمبردار بھی اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے قریب آ کر بے چینی سے لہجے میں بولا۔

”دیکھ یا اراد صاف بات ہے۔ اگر تو جگہ جگہ کھل خراب نہیں ہوتا چاہتا تو جا کر کسی کوٹھے شوٹے پر پتہ کر۔ اسی عورتوں کو کوئی گھر تو نہیں ڈال سکتا۔ ہر بھر کر وہیں پہنچ جاتی ہیں۔“

سچاول کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے بغیر کچھ سوچے پھرے ہوئے شیر کی طرح پلٹ کر اس کا گریبان پکڑ لیا۔

”کیا بکواس کر رہا ہے تو؟“ وہ دانت کچپکچپ کر کئی گالیاں بک گیا۔

”ارمان سے کا کا! ارمان سے۔“ نمبردار نے بغیر کسی گھبراہٹ کے اپنا گریبان کھسوٹتے ہوئے اس کے ہاتھوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”تجھے جان سلامت چاہئے کہ نہیں؟“ اس کے انداز میں گہرائی اور تجربہ تھا۔ اس کا لہجہ معنی خیز تھا۔ وہ شکرے کی طرح ہوشیار تھا۔

سچاول نے خود پر قابو پایا۔ اسے تو بہت دور تک جانا تھا۔ وہ نمبردار سے اٹھ کر اپنی راہ کھوئی نہیں کرتا چاہتا تھا۔ اس نے ایک بار نمبردار کی چپکلی ہوئی متحرک آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کڑے لہجے میں لفظ چپا چپا کر لگایا۔

”چھا۔ زندگی رہی تو کسی ہاتھوں میں ہاتھ ڈالیں گے۔“ اور ایک جھپٹکے سے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔

.....

بالا خانے کی چھوٹی چھوٹی چند سیز میاں چڑھنے ہی میں وہ ہانپ گیا۔ اس کے اعصاب جیسے اس کے قابو میں نہیں تھے۔ اس کے سر پر دشت سوار تھی۔ موسیقی کی تیز آواز ٹھنڈے دھڑکے کے طے جلتے شور کے ساتھ اس کے کانوں میں جھپٹے ہوئے سیسے کی طرح اتر رہی تھی۔ اس کے سارے جسم کا خون اس کے چہرے پر جمع ہونے لگا تھا۔

اسے پتہ چلا تھا کہ اس کوٹھے پر جولاری دھس کرتی ہے۔ پہلے اس کا نام بھاگ بھری تھا۔ لیکن اب اس نے اپنا نام بدل کر رکھ لیا ہے۔ یہ سن کر ہی اس پر قیامت گزرتی تھی۔ اس نے مجنونانہ کیفیت میں یہی فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنی عزت کے ماتھے سے یہ داغ مٹا کر رہے

گا۔ وہ اپنے خاندان کو یوں سربازدار رسوا نہیں ہونے دے گا۔ اگر وہ اس کی بہن بھاگ بھری ہے تو یہ اس کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔

اسے بھاگ بھری کے خود خال بچ طور پر یاد نہیں رہے تھے۔ وہ اس کا تصور کرتا تھا تو سوائے اس کی روٹی ہوتی آنکھوں کے کچھ بھی یاد نہیں آتا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ وہ جس حال میں بھی ہوئی وہ اس کو پہچان لے گا۔

خیر بچتی ہوئی درشنیں میں جیسے وہ اندھا سا ہو گیا تھا۔ اس کا سارا وجود جھنجھٹا اٹھا تھا۔ اس کی کپٹیاں سٹکے لگی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سارے جہوم کی آنکھیں اسی پر لگی ہوئی ہیں۔ طوبھری، تسخراڑانی حکارت لے ہوئے دل و جان میں نشتر بن کر اتر جانے والی لگا ہیں۔ اپنی ہی گالوں میں چلے کر دیئے والی نظریں۔ سب اسی کی جانب تک رہی تھیں۔ یوں جیسے جانتی ہوں کہ بھری محفل میں جانتی ہوئی، ادا میں بچتی عورت اس کی ماں جانی، اس کا خون اور اس کے خاندان کی عزت ہے۔

سجاد کی چٹائی پیسے سے بھینکتی لگی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ ہڈیوں کو پھٹلا دینے والی بھٹکی اس کے وجود کو ڈھانک لگی۔ محکمہ دکن کی چمک اور اٹھنے ہوئے قدموں کی دھمک اس کے دل پر پڑنے لگی۔ بڑے کیلے کپڑوں میں لپٹی دائرے میں گھومتی ہوئی عورت کے ساتھ ہر شے گھومتی لگی۔ سجاد کو چکر آنے لگے۔ اس نے دل پر جبر کر کے کھلی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ غزل کے کسی شوخ مصرعے کے ساتھ اپنی نازک گردن کو بار بار جنبش دے رہی تھی۔ اس کا رخ بھی بار سجاد کی جانب ہوا۔ لیکن بے تماشیا میک اپ سے چپکتے ہوئے چہرے پر کوئی تعش ایسا نہیں تھا جو سجاد سے پہچانا جاسکے۔ اس کا دماغ ماؤف سا ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے میک اپ اور چمک دھمک کے وجہ سے اسے نہیں پہچان پا رہا یا وہ واقعی بھاگ بھری نہیں ہے۔

اس نے قرب پیٹھے ہوئے ایک تماش میں کا زانو دہرایا۔ ”ناچنے والی کا کیا نام ہے؟“ وہ اس کی اداؤں میں اتنا غرق تھا کہ اس نے سنا ہی نہیں۔ سجاد نے زور سے اسے ہچکاک دیا اور اپنا سوال دہرایا۔ ”ناچنے والی کا کیا نام تاؤ۔“

اس نے جہوم کر سر دھوا پان چپا ہوا بولا۔ ”ہمیں نام سے کیا لینا۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ کم بخت ناچتی ہے کہ غضب ڈھاتی ہے۔“ وہ اتنا کہ کر بھر محفل میں گم ہو گیا۔

سجاد کے دل پر قیامت گزر گئی۔ ساری محفل کی آنکھیں اس کے قہر کتے ہوئے جسم پر جمیں۔ جو نہ جانے کس کے گھر کی عزت تھی۔ لوگ جہوم رہے تھے۔ ٹوٹوں کی بارش ہو رہی تھی۔ سجاد کو سارا جسم جیسے انگاروں سے داغا جانے لگا۔ وہ بے چین ہو کر اٹھ گیا۔ چاروں طرف دیکھا ہوا وہ بظاہر دروازے کی طرف چلا۔ وہ کسی ایسے فیصلے کی تلاش میں تھا۔ جو اس بازار کی جنس بن جانے والی تمام عورتوں سے واقف ہو۔ جو اسے ان کے اصلی نام بتا سکے۔

وہ ابھی اسی کوشش میں تھا کہ دادو پیش کے شور میں رقص ختم ہو گیا۔ راقمہ محکمہ و بھاتی، جبکہ جبکہ کر سلام کرتی۔ قریب ہی ایک ہی دروازے کی چلن اٹھا کر اندر داخل ہو گئی۔ تماشائیوں میں ہلچل سی گئی۔ ستارہ کا نام ایک گونج سی بن کر چاروں طرف پھیل گیا۔ سجاد ٹھک کر رک گیا۔ اور غور سے دیکھنے لگا تو گویا ناچنے والی کا نام ستارہ نہیں تھا۔

ستارہ! تو گویا ستارہ کوئی اور تھی۔ سجاد ایک بار پھر سونی پر چڑھ گیا۔ وہ ستارہ کو ایک نظر دیکھنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ جیسے جیسے تماشائی اس کا نام لے کر آہیں بھرتے اور اسے بلانے کا تقاضا کرتے تھے ویسے ویسے سجاد جیسے قل ہو رہا تھا۔

ساتھ ساتھ میں بنے ہوئے کروں میں سے ایک کی چلن بھی اور ایک سیاہ فام ہٹا کٹا آدی بار لٹکا اور نائیکہ کے کان میں کچھ پھونک کر پھر چلن کے پیچھے غائب ہو گیا۔

نائیکہ معذرت کرنے لگی کہ آج ستارہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ اس نے وہ محفل نہیں جاسکے گی۔ تماشائیوں کے چہروں پر ہاپوسی کی گرد چھائی۔ کچھ اٹھ اٹھ کر جانے لگے۔ کچھ آہیں پیٹھے جھٹ کرنے لگے کہ اگر ستارہ رقص نہیں کرنا چاہتی تو گانا ہی سنا دے۔ یہ بھی نہیں تو دیر باری کر ادا دے۔

نائیکہ پہلے تو ہنس کر انکار کرتی رہی پھر اس کے تہود بدلے اور وہ سختی سے بات کرنے لگی۔ چند ایک جو نٹے کی تزک میں اس کے سرے کی جانب بڑھنا چاہتے تھے۔ جہاں ستارہ تھی انہیں اپنے آرمیوں سے اٹھوا کر باہر پھکانے لگی۔

سجاد کے ذہن میں ایک خیال بجلی کی سی تیزی سے آیا اور اس کے رد ٹکٹے کھڑے ہو گئے۔

کہیں وہ بھاگ بھری تو نہیں تھی؟ جو اسے پہچان کر اس کے سامنے آنے سے کھڑا رہی تھی۔ اس لرزا دینے والے خیال کے آتے ہی اسے کسی کی پروا نہیں رہی۔ وہ دیوانہ سا ہو گیا۔ اس پر ایک دھن سوار ہو گئی۔ اس کے سر میں ایک ہی سودا سونگیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح

ستارہ تک پہنچتا ہے۔ یہ جانے کیلئے کہیں وہ بھاگ بھری تو نہیں۔

بھوم چھٹنے سے پہلے ہی وہ دوسروں کی نظر بچا کر ایک نیشا تاریک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔ اسباب کی بہتات اور بے ترتیبی سے معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کمرہ ستور یا گودام کا کام دیتا تھا۔ وہ سانس روکے وہیں ایک طرف چھپا ہوا بیٹھا رہا۔

ایک ایک لمحہ ایک نیسی بن کر اس پر ٹوٹا رہا۔ اسے اسنے پکڑے جانے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ لیکن اس احساس نے اس پر جاگتی کی کیفیت طاری کر رکھی تھی کہ ستارہ اس کی بہن بھاگ بھری ہے۔ وہ سزائے موت کے جرم کی طرح اس کا لکڑی میں بیٹھا نہ جانے کب تک جان لیوا لکھوں کا زہر قطرہ قطرہ اپنے اندر تارنا رہا۔ اور یہ انداز لگتا رہا کہ کب کی جاگتی فضا کی رفتیں اوجھکنے لگیں۔ کب انھوں کے چراغ گل ہوتے ہیں۔ کب مختصر روکن کی صدا ڈونگی ہے۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوا۔ روشنیاں گل ہونے لگیں۔ کمرہ کی طرف جاتے ہوئے قدموں کی چاپ، دروازوں کے بند ہونے کی آوازیں اور دبلی دبلی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ دروازے کے قریب آکر ہوا کو سمجھتا رہا۔ آوازوں کو سننا اور غاصلوں کا اندازہ لگاتا رہا۔ پھر اپنا ایمینان کر کے محتاط قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل آیا۔

اندھیری راہداری میں سے ہوتا ہوا کمرہ کی اس قطاری طرف بڑھا۔ جہاں چٹنوں کے پیچھے چراغ غمنا رہے تھے۔ روشنیاں جلتی جھکتی تھیں۔ ٹھنکی ہوئی ہنسی اور قہقہے پھینکتے تھے۔ برآمدے میں سے کسی کے حذر گزرا نے اور کھانسنے کی آواز آ رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب ناموس سی بو رچی ہوئی تھی۔ ماحول میں آکٹا دینے والا بو جھل پٹن اور جس تھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھتا بیٹھا جاتا اس کمرے کی طرف بڑھا۔ جسے لوگ ستارہ کا کمرہ کہہ رہے تھے۔ اسے ایک لمحے کو یہ خیال بھی آیا کہ ستارہ کمرے میں تھا نہیں ہوگی۔ مگر اسے کسی خطرے کی پروا نہیں تھی۔ وہ ہر قیمت پر یہ چلتا چلا چاہتا تھا کہ اس کے خاندان کی عزت اس نلام گھر کی زینت تو نہیں۔

وہ دبے بیروں کمرہ کی قریب پہنچا اور بڑی احتیاط سے سانس روک کر اندر جھانکا۔ پروے کی کھلی دروازوں میں سے وہ اندر بھیٹتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور تنہا معلوم ہوتی تھی۔ سجادوں نے اپنی جیب میں پڑے ہوئے خانو کوئٹلا اور پچکے سے کمرے میں اتر گیا۔ وہ درج پھیرے ہنگ پر بیٹھی تھی۔ شاید کی خیال میں کم تھی۔ جب ہی وہ اس کی آہٹ سے چونکی تک نہیں۔

سجادوں نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ سے اس کا منہ بند کر دیا اور پورے زور سے اسے اپنی جانب گھما کر بولا۔ ”بھاگ بھری..... تو نے کیا کیا۔“

سجاد کی نگاہ اس کی خوف سے پھیلی ہوئی آنکھوں سے ملی اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ بھاگ بھری کی آنکھیں نہیں تھیں۔ ماپوسی اسے اسے ہیڈ مساکر دیا۔ اس نے غصے سے اسے وہیں چھوڑ دیا اور خود پلٹ کر کمرہ کی طرف چلا۔

”غصہ وہ ذرا ایک منٹ رکھو۔“ اس نے عقب سے پکارا۔

سجاد نے مڑ کر دیکھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم لگتی قریب آئی اور بولی۔ ”کاش میں وہ بھاگ بھری ہوتی جس کی تلاش میں تم آئے ہو۔“

سجاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ پوچھنے لگی۔ ”بھاگ بھری تمہاری کیا گتھی ہے۔“

سجاد کلام اچھے لگا۔ عزتوں کے اس نلام گھر میں کھڑے ہو کر وہ کس طرح اقرار کرتا کہ یہاں وہ اپنی بہن کو تلاش کرنے آیا ہے۔ اس نے ضبط کی کوشش میں ہونٹ کانٹے اور چلنے کے ارادے سے پھر کمرہ کی طرف بڑھا۔ وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آئی اور پرتھمس لہجے میں بولی۔ ”یوں لگتا ہے جیسے بھاگ بھری تمہاری بہن ہے۔“

سجاد گڑ بڑایا۔ مگر بھر کو رکا مگر بولا کچھ نہیں۔ وہ اور قریب آگئی اور بڑی حسرت سے بولی۔

”اگر میرا بھائی بھی تیرے جیسا ہوتا۔ تو میں اس عذاب میں دن رات نہ جلتی لیکن وہ تو کسی چنڈ خانے میں نشے میں دھت پڑا ہوگا۔ اسے تو شاید یہ بھی خبر نہیں کہ اس کی بہن کس جہنم کا ایندھن بن گئی ہے۔“

سجاد نے تصدیق کرنے کو اس کی طرف دیکھا کہ وہ سچ کہہ رہی ہے یا مکر کر رہی ہے۔ اس کے خوبصورت چہرے پر سچ کی اذیت تھی۔ اس کی اداس آنکھوں میں حقیقت کے کرہنک آنسو تھے۔ اس کی شبیلی آنکھوں میں ساجوا کا جل جھل رہا تھا۔ وہ بولے ہوئے چلتی اس کے مقابل آگئی اور آچل سے اپنی آنکھیں پونچھنے ہوئے بولی۔

”تمہیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے کہ مجھ جیسی مجبور عورت کے دکھوں کے دن کٹنے والے ہیں۔ تم اسے اسی طرح تلاش کرتے رہے تو ایک روز ضرور اسے اس جہنم سے بھنکارا دلا دو گے۔“

سجاد کو اس سے کوئی ہمدردی تو نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ایک ناقابل فہم دکھ کا احساس ہوا۔ جو اس کے دل کی گہرائیوں میں سے ہولے ہولے پھوٹنے لگا۔ اس نے پھر ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ بظاہر ہنس رہی تھی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ کر رخساروں تک آ گئے تھے۔ سجاد کو اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے قدرے ملامت سے کہا۔ ”تو یہاں سے بھاگ کیوں نہیں جاتی؟“

”بھاگ کر کس کے پاس جاؤں۔ میرا تو کوئی نہیں۔“ اس نے پھیلے ہوئے کا جملہ والی آنکھیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

”کہیں بھی چلی جات۔ محنت مزدوری کر کے اپنا پیٹ پال۔ عزت کی روٹی سوچی اس روز روز کے گناہ سے بہتر ہے۔“

”اس کو کٹے سے باہر ہمارا ٹھکانہ کہیں نہیں ہے۔“ وہ آہی بھر کر بولی۔

سجاد بھٹا گیا۔ ”یوں کیوں نہیں کہتی انوکھی کھیتی کر مڑ کو حرام گم کیا ہے۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔ ”حرام کا لوالہ جلدی طلق سے اترتا ہے نا۔“

سجاد کو بہت برا لگا۔ اس نے گھور کر ستارہ کی طرف دیکھا۔ وہ چپتے چپتے یکدم خاموش ہو گئی اور ہونٹ کاٹنے ہوئے بولی۔ ”یہاں سے بھاگ کر بھی دیکھ لیا ہے۔ شریعوں کی بستی میں ہمارے لئے کیوں پناہ نہیں ہے۔ وہاں تو چپت بھر کر روٹی بھی نہیں ملتی اور کرنا بھی کچھ پڑتا ہے۔“ اس نے سر جھٹکا اور تکی سے بولی۔

”اس جہنم سے نکلتا آسان نہیں ہے۔ ان لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہیں۔“

سجاد کو ایک ناقابل برداشت محظن کا احساس ہوا۔ بھاگ بھگری کے خیال نے اسے تڑپا دیا۔ ستارہ کے لہجے کا دکھ، اس کے چہرے کا کرب، اس کی آنکھوں کی خردی، اس کے شب در شبی اذیت اسے یہ سب کچھ بھاگ بھگری پر بیٹنا ہوا مظلوم ہو رہا تھا۔ یہ تصور اسے بے کل کر دینے کیلئے کافی تھا۔ وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر اس کی تلاش میں نکل جانا چاہتا تھا تا کہ اسے جہنم کے اس دکھ سے نجات دلا سکے۔ وہ بغیر کچھ کہے جانے کے لئے پلٹا۔ لیکن ستارہ اس کے راستے میں آگئی اور ضمیر سے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میری آن، میرا اعتبار، میرا سب کچھ اس بازار میں غلام ہو گیا ہے۔ میرے پلے تو کچھ بھی نہیں رہا۔ اگر میں ایک بات کہوں تو کیا تم یقین کر لو گے۔“

”ہاں..... کہو۔“ سجاد نے متشعرانہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ہولے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

”یہ جگہ ایسی نہیں ہے کہ میں تمہیں کہہ سکوں کہ پھر بھی یہاں آنا۔ میں پاک دامن بھی نہیں ہوں جو تمہیں کہوں کہ مجھے یاد کر لیتا۔ میں نہیں جانتی کہ تم کون ہو؟ اور کہاں سے آئے ہو؟ تمہارے دل میں کیا ہے؟ اگر تم یقین کرو تو میں تمہیں اتنا بتانا چاہتی ہوں کہ میری روح اب بھی اس معصوم بڑی کی روح ہے جس کا نام اس کے باں باپ نے بڑے جاؤ سے بھاگ بھگری رکھا تھا۔ اس روح کا ستارہ کے گناہگار جسم سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی واسطہ نہیں۔ یہ معصوم روح ہمیشہ تمہیں یاد رکھے گی۔“

سجاد نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بات کو وہ صحیح طور پر سمجھ نہیں سکا۔ وہ اسے سمجھتا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن اس کی دراز پلکوں پر جو آنسو نکلتے تھے۔ وہ جیسے اسے بھاگ بھگری کی تصویر دکھا رہے تھے۔ ان آنسوؤں میں بھاگ بھگری کا روتا ہوا عکس ڈوب رہا تھا۔ وہ دکھ اور اذیت کی ناقابل بیان کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ اس کے پاس کہنے کیلئے ایک لفظ بھی نہیں رہا۔ وہ نہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ نہ سننا چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں صرف اور صرف بھاگ بھگری تھی۔ اس نے بغیر کچھ کہے اس کے ہاتھ سے اپنا بازو جھڑا لیا اور ہونٹ چپاتا ہوا جس راستے سے آیا تھا اسی سے باہر نکل گیا۔

اسے خود پر شک ہونے لگا تھا۔

سجاد کی وجہ سے ڈیرے کے دوسرے لڑکے بھی پر پڑے نکالنے لگے تھے۔ استاد اسے عرصے سے قائم کیا ہوا اقتدار اپنے ہاتھ سے کھوٹا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سجاد سے براہ راست بات کرنے کی ٹھانی۔ ایک روز جب سجاد خلاف توقع شام کو ہی ڈیرے پر آگیا تو استاد نے بظاہر بڑی نرمی اور مفاہمت کے لہجے میں اس سے پوچھ لی کہ وہ آج کل کہاں رہتا ہے؟ دوسرے لڑکے بھی چوکنے ہو گئے اور مفتی خیر نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

سجاد نے ایک بار سر اٹھا کر استاد کی طرف دیکھا اور خاموش ہی رہا۔ یوں جیسے بات کرنے کو جی نہ چاہتا ہو۔ اس کے سارے وجود پر جیسے تھکاوٹ اور استغلاال کی گرد سی پڑی ہوئی تھی۔

”اپنا تو خیال ہے سجاد کو کسی لمبی مار پر ہے۔“ شاہو نے دوسروں کو آنکھ مار کر کہا۔

”بھئی واہ۔ پھر تو ہمارا حصہ بھی ہوگا۔“ متانے نے تسخر سے کہا۔

”بادشاہو! تھوڑا راش پانی ہمیں بھی دیتا۔“ کسی نے لقمہ دیا۔

”یادوں کا بھی دھیان رکھنا پوچی۔“ کوئی اور بولا۔

سجاد نے گھور کر سب کی طرف دیکھا اور استاد کو تختی سے مخاطب کیا۔

”استاد جی! یہ ان شہدوں کی رسیاں کس نے ڈھیلی کر دی ہیں۔“

متانہ نے بھڑک کر اپنی جگہ سے اٹھا اور پھٹکارنا ہوا بولا۔

”استاد حیرا خیال نہ ہو تو قسم اللہ پاک کی ابھی اس کی گردن مل لوں۔“

سجاد نے تیزی چڑھائی۔ ”میں تم جیسوں کے من نہیں لگتا چاہتا۔ اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو استاد کرے۔ تم میں سے کسی نے کوئی بکواس کی تو میں زبان گدی سے کھینچ لوں گا۔“

سارے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ شکر دانست ہیں کہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ استاد نے گالی دے کر اسے خاموش کر دیا اور عقیدہ لہجے میں بولا۔

”تو چھڑو ان کو باریار۔ تو اپنی سنا کر آج کل کہاں غائب رہتا ہے۔ کم از کم ہمیں کچھ پتہ لھکا نہ تو معلوم ہونا چاہیے۔“

”بس استاد۔“ وہ نیچے ہوئے لہجے میں بولا۔

وہ دیوانوں کی طرح بھاگ بھری کوچہ جگہ ڈھونڈتا پھرا۔ یہاں، وہاں دور و نزدیک۔ ہر جگہ۔ چپے چپے میں، قریب قریب۔ اس کی تلاش میں اس نے دن رات ایک کر دیئے۔ لیکن ناکامی جیسے مقدر میں لکھی ہوئی تھی۔ مسلسل تلاش کا حل کچھ بھی نہیں تھا۔ کہیں کوئی کھون نہیں ملتا تھا۔ کوئی امید نہیں بندھتی تھی۔ ہر روز آس کا دیا جلتا اور بجھ کر اندھیرے کا احساس بڑھا دیتا۔ زندگی ایک مسلسل تلاش بن گئی تھی۔

وہ صبح کہیں ہوتا اور شام کہیں۔ رشتوں کی کک اسے دوڑائے لئے جاتی تھی۔ اس کے چہرے پر نامراد یوں کی گرم راکھ ہر لمحہ بھرتی رہتی تھی۔ اسے کائنات کا ذرہ ذرہ اپنے خلاف برسرِ پیکار نظر آتا تھا۔ کامیابی کی کوئی راہ نہیں سوچتی تھی۔

اس نے ہمت نہیں ہاری تھی۔ وہ مایوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بھاگ بھری کی تلاش میں دنیا کے آخری کونے تک جانا چاہتا تھا۔ وہ ہر قدم پر چاروں طرف دیکھتا ہوا چلتا تھا۔ وہ چلتے چلتے رک جاتا اور ٹھک کر دیکھتا شاید کہیں بھاگ بھری کا کوئی اتر پڑ چل جائے۔ کہیں اس کی جھلک نظر آجائے۔ اس کی کوئی نشانی مل جائے۔

ڈیرے سے وہ قریباً لاتعلیق ہو گیا تھا۔ وہ وہاں بہت کم نکلتا تھا۔ اکثر کئی کئی روز غائب رہتا تھا۔ استاد اس کی اس عدم دلچسپی کو توشیح کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ استاد اس کا اتنا عادی ہو گیا تھا کہ اب اسے نئے سرے سے کام سنبھالنا دشوار محسوس ہو رہا تھا۔

ڈیرے کے دوسرے لڑکے کہتے تھے کہ اسے بازار حسن کا چمکا پڑ گیا ہے۔ وہ صبح ایک کوٹھے پر ہوتا ہے تو شام دوسرے پر۔ رنڈیوں پر دولت اجاڑنے کے سوا اسے کوئی اور کام نہیں۔ اس بات نے استاد کو اور بھی زیادہ فکر مند کر دیا تھا۔ وہ تو اس پر بھروسہ کر کے غافل ہو چلا تھا۔ اپنی تمام تر ذمہ داریاں اس پر ڈال کر اسی پر انحصار کرنے لگا تھا۔ وہ پرانا گھاگ اور مردم شناس تھا۔ اسے بندہ پر یکے میں بھی غلطی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن سجاد کے معاملے میں

”سب تقدیر کے چکر ہیں۔ مقدر کی غلو کریں ہیں جس طرف لے جاتی ہیں چل پڑتے ہیں۔“

استاد کو اس کے شکستہ لہجے اور دھکی چہرے نے سب کچھ سمجھایا۔ لیکن اس کے دل سے شبہات نہیں نکلے۔ وہ ایک ایک لفظ تول کر بولا۔

”دیکھ کا کا تو ہمارے ڈیرے کا باندھ ہے۔ تیری ذمہ داری ہم پر ہے۔ ہم تیرے بھلے کو ہی کہتے ہیں۔ ابھی تیری عمر ہی کیا ہے اور تو رٹھریوں کے چکر میں پڑ گیا ہے۔ یہ بے وفا مخلوق بھلا کب کسی کی ہوئی ہے۔“

”رٹھریوں کی ایسی تھی۔“ سجاد نے گالی دے کر کہا۔

”میں لعنت بھیجتا ہوں ان انوکھی نظموں پر۔ میں وہاں جاتا ہوں تو کسی اور مقصد سے۔ کسی اور وجہ سے۔ میں وہاں عیاشی کرنے نہیں جاتا۔ وہاں پیر نہیں اجازت۔ لیکن تجھ سے جنہوں نے یہ خطیاں لگائی ہیں ابھی ان کا بھی حساب کتاب لیا ہے تو نے یا میں بتا دوں۔“

مستانے اور شکرے نے سانس روک کر ایک دوسرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے کئے۔ ان کے دوسرے ساتھی لگا ہیں چرانے لگے۔ استاد نے گھور کر ان کی طرف دیکھا اور ان کے بچھلے ہوئے سر دیکھ کر وہ غصے سے پھنکارا۔

سجاد نے اس کے کچھ کہنے کا انتظار نہیں کیا۔ اور ان سب کے کپے چٹے کھولے لگا۔ وہ تعجب اور حیرت سے ملگ ہو گئے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ سجاد ان کے تمام رازوں سے اس حد تک واقف ہے۔ استاد سے رہا نہیں گیا۔ وہ کڑے لہجے میں بولا۔

”کیوں اوئے۔ دُشے شریف زادو! اب بولو۔ کچھ کہو۔“

فجالت سے ان کی گردنیں جھک گئیں۔ وہ پچھلے چپکے ایک دوسرے کو کھپیاں مار کر اور زانو دبا کر استاد کی بات کا جواب دینے پر اکسائے گئے۔ آخر شکرے نے ہمت کی اور حقو کہنے سے متحرک ہو کر بولا۔

”استاد جی۔ ہم کوئی صوفی تو نہیں۔ دو گھڑی کہیں دل خوش کر لیتے ہیں تو کسی کے کلیجے میں کیوں پڑا ہوا ہے۔ جان بھلیا ہے لے پھرتے ہیں۔ کیا خبر کب پولیس کے جیسے چڑھ جائیں اور جیلوں میں پکیاں پیٹتے پھریں۔ ایک آدھ دن موجد کر لیتے ہیں تو کسی کو کیا تکلیف ہوئی ہے۔“

استاد نے دانت چیس کر حد درجہ رقتی گالی کی۔ جسے برداشت کرنے کو شکرے نے

بھی خاصے ضبط سے کام لیا۔

”بات کرنی آتی نہیں اور ماں کے بد معاش بنے پھرتے ہیں۔ اس ڈیرے پر آج تک کوئی چھاپ نہیں پڑا اوئے تو کس لئے..... کوئی ہماری طرف میلی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔ تو کیوں؟ پولیس والے میرے ماسے تو نہیں گتے۔ اس ڈیرے کی طرف کسی کی نظر نہیں جاتی۔ اس لئے کہ میں نے کبھی تمہاری طرح آوارگیاں نہیں کیں۔ چار پیسے دیکھ کر مجھے رٹھریوں کے خواب نہیں آتے۔ آج میرا ہاتھ تمہارے سر پر نہ ہو پولیس تمہاری کھال سمجھ لے۔“

سبھی نے سر جھکا لئے۔ استاد کی گالیوں کے جواب میں وہ بغاہر خاموش رہے۔ لیکن بار بار سرکشی کے ساتھ تڑپتی نگاہوں سے یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے جیسے آپس میں کچھ طے کر رہے ہیں۔ سجاد ان سب پر ایک اپنی ہوتی سی نگاہ ڈال کر بیزاری سے اٹھ کھڑا ہوا اور بغیر کچھ کہے بیٹھک سے باہر نکل گیا۔



مستند وڈس کی صد مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ گانے والی کی آواز ماناؤں تھی۔ لیکن اس میں بلا کا سوز اور درد تھا۔ اس کی لمبے لمبے ایسا گداز تھا جو دل میں سرت کا احساس جگانے کے بجائے ایک چمک سا لگا دیتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ سر نہیں لگا رہی آنسو بانٹ رہی ہے۔

بخنارو کافی دیر سے اس کی آواز سن رہی تھی۔ اس کے دل کی آوازیں منگھور ہو رہی تھیں۔ درد میں رہی ہوئی لے اس کے اک اک میں ٹیمپس سی جگا رہی تھی۔ مستند وڈس کا شور، سازوں کی آواز، طبلے کی شکست اور تماشا نیوں کی داد و تحسین جیسے اس آواز کے تقدس اور حسن کو دھجی کئے دھجی دھجی۔ اسے دشت سی ہونے لگی۔ اس نے کئی بار سوچی ہوئی بات کو پھر افرکی سے سوچا۔ من کو کچھل کر دینے والے سوال کو خود سے پھر پوچھا۔ یہ اس کے گرد و پیش کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟ وہ اس ساری فضا کا حصہ کیوں ہے؟ وہ اس متعفن ماحول میں سانس لینے پر کیوں مجبور ہے۔

ثریا کرے میں داخل ہوئی اور بخت آور سے بولی۔ ”بخنارو!..... اماں پوچھ رہی ہے کہ تم نے چٹکی تیار کر لی ہے؟“

بخت آور متوجہ نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح معصوم سی بیٹھی گانے والی کی آواز سنتی رہی۔ ثریا نے کپڑوں کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے ایک بار پھر اپنا سوال دہرایا تو وہ اس کی بات ان سن

چستانی سینے سے بھگ رہی تھی۔

بخت آدرو کو اس کی صورت کچھ جانی پہچانی سی معلوم ہو رہی تھی۔ مگر یاد نہیں آتا تھا کہ اسے کہاں دیکھا ہے۔ اس نے بھی دروازے پر گھسیٹا کر اس کی طرف دیکھا اور ٹھک گئی۔ چند لمبے ایک نکل اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر چند قدم اس کی طرف بڑھی اور سینے پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”ہائے مر جاؤں۔ تو کہیں بھاگ بھری تو نہیں؟“

بخت آدرو گہرا کر پیچھے ہٹی اور بوجھل سی ہو کر اس کی جانب نکلے گی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ زینت نے اسے سمجھو ڈالا۔

”تا کہیں تو بھاگ بھری تو نہیں۔ اللہ نہ کرے۔ کہیں تو بھاگ بھری تو نہیں؟“

دو شفاف آنسو بخت آدرو کی خوبصورت آنکھوں سے بہہ کر رخساروں تک آگئے۔ وہ انکار یا اقرار میں کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ نگاہ کے اس بازار میں شاسانی کی لہر بڑا جان لیا تھا۔ زینت کے ہونٹوں کو چھوتا ہوا یہ نام اس جگہ کی گندمی کے احساس کو اور بڑھا رہا تھا۔

زینت کا چہرہ کسی اور چہرے کی یاد دلاتا تھا۔ مگر یاد نہیں آتا تھا کہ اسے کہاں دیکھا تھا۔

بخت آدرو نے نیچے ہوئے سے لہجے میں پوچھا۔

”تو کون ہے؟ میں نے پہچانا نہیں؟“ زینت نے یکبارنگ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور سکیوں کے درمیان اپنے گانوں کی مخصوص زبان میں بولی۔

”ہائے بھاگ بھری تو نے بھی نہیں پہچانا۔ میں نے نہیں پہچانی۔“

بخت آدرو کے اندر جیسے ہونچال سا آگیا۔ اس کا دل جیسے کسی نے ٹھہکی میں لے لیا۔ اسے خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ ٹوٹ ٹوٹ کر نکمرے لگی۔ وہ آگے بڑھ کر بے اختیار اس سے لپٹ گئی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر بچھڑیوں سے رونے لگی۔

زیو جس کا گھر بھائی کے شانے کی خاطر اس کے بھائی چھوڑنے اپنا بھرا جاڑو دیا تھا۔ وہ اس بازار میں اجڑی ہوئی مانج لے لیا کے بچھے سے لگی تھی۔ حق کے ٹوٹے ہوئے بے ربط لفظوں میں آنسوئی آنسو تھے۔ وہ رنہ رنہ ہوئے لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”ہائے لی بھاگ بھریے امیں نے تو پاہن مٹور سے کہا تھا کہ بچھے لے آئے گا تو بھاگ بھری کو بھی لے کر آتا۔ مگر یہ تقدیر نے ہمیں کہاں لا ملا یا ہے۔ بھاگ بھری میں اور شریف

کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیا! یہ باہر کون کا رہا ہے؟“

”یہ زینت ہے۔“ وہ بولی۔ ”کل رات ہی زمان پور سے آئی ہے۔ گلے میں خدا نے نور دیا ہے۔ ناچ میں ڈراما کھاتی ہے۔ مگر کافی خوب ہے۔ اماں کہتی ہے گل جائے گی۔ یہ بھی ہمارے ساتھ ہی جائے گی۔“ وہ سرت سے چھپھاتے ہوئے بولی۔

”پتہ ہے بڑے ٹھانڈا کا بھرا ہوگا۔ مزہ آ جائے گا۔ سنا ہے دور دور سے بڑے بڑے زمیندار اور ڈیرے آئیں گے۔ پھر اماں دیکھنا کیا کمال دکھاتی ہے۔“

بخت آدرو نے بیزاری سے اس کے لبوں سے یہ تذکرہ سنا اور سوچے گی کہ ٹھیا نے اسی متحکمہ دؤں سے گونجتی چار دیواری میں آنکھ کھولی ہے۔ اسے اتنا شعور بھی نہیں کہ اس سے تقدس کے سارے رشتے عین کراسے ہوں کے کردہ بندھن میں پاندھ دیا گیا ہے۔ وہ ناٹیک کی بیٹی تھی۔ بیٹن پٹی بڑی تھی۔ شاید وہ یہ جانتی ہی نہیں تھی کہ اس چار دیواری کے باہر زندگی کسی اور طرح سے بہتی ہے۔

ٹھیا چند لمبے ایوں افسردہ اور کسی سوچ میں گم دیکھتی رہی۔ جب وہ کافی دیر متوجہ نہیں ہوئی تو وہ ناگواری سے بولی۔

”بختو! یہ تجھے کیا ہو جاتا ہے۔ کبھی تو بات دھیان سے سن لیا کرو۔ اماں کہہ رہی ہے کہ تیاری وقت پر کر لینا۔ درزی کو سننے کے پڑوں کا ماپ دے آتا۔ کوئی زیور کم ہے تو بٹھا لینا۔ عین وقت پر کوئی بات نہ یاد آئے۔“

بخت آدرو نے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور سر کو بے معنی سی جھنجھکی دی۔ ٹھیا جانے کے خیال سے اٹھی۔ لیکن ابھی وہ دروازے تک بھی نہیں پہنچی تھی کہ اچانک باہر شور مچا گیا۔ چیزیں ٹوٹنے اور مار پیٹ کی آوازیوں کے ساتھ مغلظات کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ ٹھیا لپک کر چمکن میں سے جھانکنے لگی۔ بخت آدرو وہیں بیٹھی رہی۔ یہ تو یہاں اکثر ہوتا ہی رہتا تھا۔

کبھی بیٹوں پر، کبھی لین دین پر، کبھی کسی اور بات پر یہاں جھڑے ہوتے ہی رچے تھے۔ گالیوں کا طوفان چا رہتا تھا۔ اسی وقت دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز آئی اور تیزی سے چلن ہٹا کر متحکمہ و چھانکی لڑکی اندر گھس آئی۔ اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور دروازے سے پشت لگا کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ وہ بے حد خوفزدہ معلوم ہوتی تھی۔ اس کی

دوڑتے ہی رہے۔ اس امید پر کہ ہم چوہدروں کی پہنچ سے دور نکل جائیں گے لیکن..... لیکن۔ انہوں نے شریف کو میرے سامنے گولی ماری اور مجھے..... مجھے.....

لچکیوں نے اس کے گلے میں پھنسا سا ڈال دیا۔ بخت آدرا کو اور کچھ سننے کی تاب نہیں تھی۔ یہ اس کی اپنی کہانی ہی تھی۔ انہوں نے بھی تو اس کے بھائی منظور کو اس کی آنکھوں کے سامنے گولی ماری تھی اور اسے..... اس کے ساتھ جو کچھ ہوا وہ جانتی تھی۔ وہ سب اس نے ننگے پٹڑے پر سہا تھا۔ وہ ہماگ بھری سے بخت آدرا بننے میں جن دکھوں کو جموں میں ڈالتی آئی تھی۔ زینت کے دکھ بھی اس کے دکھوں جیسے ہی تھے۔ جو وہ زہر سے زینت بننے میں سستی رہی تھی۔ زینت نے بیدروی سے ہونٹ چپائے اور آنسوؤں سے ہوجھل لہجے میں بولی۔

”ہماگ بھری جب شریف ہی نہیں رہا تو میں جی کر کیا کروں گی۔ میں جینا نہیں چاہتی، مگر مگر یہ لوگ۔ یہ لوگ.....!“

بخت آدرا آنسوؤں میں ڈوب گئی۔ اس کے من کا درد ناقابل برداشت ہو گیا۔ وہ بے دم سی ہو کر چٹک پر بیٹھ گئی اور آنکھوں سے منہ ڈھانک کر روئی رہی۔ اس کے پاس کہنے کیلئے کچھ نہیں تھا۔ خود کو سمجھانے کیلئے اس کے پاس کوئی عذر، کوئی بہانہ نہیں تھا۔

زینت اس کے قریب بیٹھ گئی اور ہونے سے اس کا شانہ ہلا کر بولی۔

”ہماگ بھری ابے! ہم ایک نہیں دو ہیں۔ اب ہم اور ظلم نہیں کھیں گے۔ اب ہم نہیں کھیں گے۔ وہ اس کے قریب ہوئی اور زار داری سے بولی۔

”ہماگ بھری تو سن لے اب ہم یہاں نہیں رہیں گے۔ ہرگز نہیں۔“

.....

استاد کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سجاد سوچ رہا تھا کہ گلابی نے اسے کیوں بلایا تھا۔ آتنا سامنا ہونے پر تو وہ سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتی تھی۔ لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ اس نے اپنے گھر کیلئے ملازم کے ہاتھ پیغام بھیجا تھا کہ وہ آکر اسے مل جائے۔ سجاد نے اس سے پوچھا بھی تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ لیکن وہ ٹھیک طرح سے بتا نہیں سکا تھا۔

ابھی ہوئی زندگی کی تھا کہ دینے والی مصروفیات میں گلابی سے شادی ملاقات ہوتی تھی۔ ظالم وقت بھی اتنی فرصت ہی نہیں دیتا تھا کہ خلافت کے اس حسین پیکر کا تصور بھی کیا جا سکے۔ گلابی کی دلیہز سے باہر سو دکھ، سو جھیلے تھے۔ جو اس طرح باعد سے رکھتے تھے کہ ادھر کا رخ کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا تھا۔ اب اس کا پیغام ملا تھا تو اس نے سوچا کہ کسی نہ کسی طرح وقت

نکال کر اس سے مل ہی آئے۔ شاید اسے کوئی ضروری کام ہو۔ ابھی اس نے دروازے کا پردہ ہی اٹھایا تھا کہ گلابی پر نظر پڑ گئی۔ اسے دیکھ کر گلابی کے چہرے پر کچھ عجیب سے تاثرات گزرتے ہوئے۔ سجاد اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ پریشان ہے یا کسی وجہ سے گھبرائی ہوئی ہے۔

اس کی اداسی اور چپ نی نی کی تھی جس نے اسے بکسر بدل دیا تھا۔ وہ ہنستی، مسکراتی، باز و داد، دکھاتی، ابھرتی، تیورانی چڑھاتی ہوئی گلابی معلوم ہی نہیں ہوتی تھی۔ اس کی گلابی رنگت بھی کچھ پھلک پھلکی سی تھی۔ اس کے بال سنورے ہوئے نہیں تھے۔ اس کے کپڑوں کا رنگ بھی شونہ نہیں تھا۔ اس کی اداسی ملگنی سی ہو رہی تھی۔ سجاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ یہ اسے ایک بیک کیا ہوا تھا کہ اس نے سنورا چھوڑ دیا تھا۔

اس نے زری سے سوال کیا۔

”کیوں گلابی! آخریت تو ہے تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

گلابی خلاف معمول چپ رہی۔ اس نے ایک بار نگاہیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی اداس آنکھوں نے کوئی بات کی۔ اس کے ہونٹ کچھ کہنے کو لڑے۔ لیکن اس نے انہیں دہنی ایسے دانتوں تلے دبا لیا۔ وہ دو قدم آگے چلی۔ اس کی ہانچیں کچھ بولیں لیکن پھر اسی کی طرح خاموش ہو گئیں۔

سجاد کے لئے اس کا یہ عجیب رویہ ناقابل فہم تھا۔ وہ دو قدم چل کر اس کے برابر آ گیا اور بڑی تشویش سے بولا۔

”گلابی! آخریت تو ہے۔ یوتی کیوں نہیں۔ مجھے کیوں بلایا ہے تو نے؟“

گلابی نے ترچھی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور اچانک بولی۔

”سجاد! ابامیرا بیابہ کر رہا ہے۔“ اس کے انداز میں ایک لگا تھی۔ اس کی جادو بھری آنکھوں میں ایک اٹوکھا سوال تھا۔

سجاد ان کو سمجھ کر دینے والی خوبصورت آنکھوں سے نگاہیں چرا کر بے ضرر سے لہجے میں بولا۔

”کس کے ساتھ؟“

گلابی نے فیسے سے سر جھکا اور ترخ سے بولی۔

”مجھے کیا پتہ۔ کسی کہنے منوں کے ساتھ۔“ اس کی شفاف پیشانی پر شکنیں تھیں اور اس کے رخسارے وجود میں جیسے کوئی زخمی نامن پھنکا رہی تھی۔

سجاد کچھ گھبراہٹ، کچھ بھجکا، کچھ حذب ہوا اور خود کو اس بے حد مشکل لمحے سے نکالنے کے لئے بڑی بردباری سے ہمت کر کے بولا۔
 ”گلابی پریشان کیوں ہوتی ہے۔ اگر تجھے یہ رشتہ پسند نہیں تو مجھے بتا۔ میں استاد سے آپ بات کر لوں گا۔“

”کیا بات کرے گا تو آپے سے؟“ اس نے چٹکیے تھوڑوں سے پوچھا۔

”یہی کہ تجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔“ وہ گلا صاف کر کے بولا۔

”اور؟“ وہ کڑے لہجے میں بولی۔

”اور یہ کہ جہاں تو چاہتی ہے وہاں تیرا ساکھ جڑے۔“ سجاد نے جیسے رہا ہوا سبق

سنایا۔

”اور؟“ اس نے جیسے غصے سے کھولتے ہوئے پھر پوچھا۔

”اور کیا؟“ سجاد بھی الجھا۔ ”اور تو بتا دے۔ جو کہتا ہے وہ کبہ دوں گا۔“

گلابی کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے گھور کر سجاد کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں سے مفتحات کا فوارہ سائل بڑا اور وہ دونوں ہاتھوں سے اس کا گریبان کھسکتی ہوئی چلائی۔

”اور یہ کہ تو دفع ہو جا۔ دور ہو جا میری نظروں سے موت جو گے۔ کیٹنے۔ تو چلا جا۔ جا

کہیں اور جا کر سر۔ میری جوتی کو بھی تیری پروا نہیں۔ تو.....“

سجاد اس کے اس طرح غصے میں آ جانے پر لمبے لمبر کو بھونچا رہ گیا۔ اس نے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑا کر چاہا۔ لیکن گلابی کی گرفت مضبوط تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے حواسوں میں نہیں۔ وہ ہاتھوں کی طرح کالیاں بکتی ہے کوئی جاری تھی۔

سجاد نے پریشان ہو کر اس کے دونوں بازو پکڑ کر اسے ایک زوردار جھٹکا دیا۔

”انسان کی پٹنی بن۔ بند کر یہ بکواس۔“

گلابی کا وجود سارے کا سارا ٹپک گیا۔ وہ جمبول کر اس کے اوپر آ رہی۔ سجاد اسے

سنہال کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک کڑکٹی ہوئی آواز نے اسے ساکت سا کر دیا۔ وہ گلابی کو چھوڑ کر چلنا اور لمبے لمبر کو اس کا ذہن ماؤف ہو گیا۔

استاد شکرے اور مستانے کے ساتھ کھڑا قہر آلود لگا ہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

”سجاد! مجھے تھہ ہے یہ امید نہیں تھی کہ تو میرے ہی گھر میں میری عزت کا گیری ہو

جائے گا۔“

گلابی اپنے حواسوں میں نہیں تھی۔ وہ ہاتھوں کی طرح ایک ایک کا چہرہ تک رہی تھی۔

سجاد بلاوجہ پھر سامن گیا اور کچھ اکڑے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

”استاد تو نجی ان شہدوں کی بات میں متہ گیا۔۔۔ تجھے میرا اعتبار نہیں۔ تو آپ اپنی

لڑکی سے پوچھ لے۔۔۔ وہ۔۔۔“

”بکواس نہ کرو۔“ شکرے نے کڑکٹی سے اس کی بات کاٹی۔

”تو نے لڑکی کو اس قاتل چھوڑا ہی کب ہے؟“

سجاد غصے سے کھول اٹھا۔ اسے ضبط کرنا محال ہو گیا۔ اس نے پھر شکرے کی

گردن دبوچ لی۔ استاد اور مستانہ دیکھتے ہی رہے اور شکرے کی آنکھیں اٹل آئیں۔ وہ

سجاد کے ہاتھوں میں جمبولے لگا۔ استاد نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کی

تو شکرہ اتورا کر زمین پر آ رہا اور بے سدھ ہو گیا۔

یہ سب کچھ لمبے لمبر میں اتنی تیزی سے ہوا کہ وہ سب کے سب حواس باختہ ہو گئے۔

خود سجاد کو بھی اس وقت ہوش آیا جب شکرہ کٹے ہوئے درخت کی طرح بھدی آواز کے ساتھ

زمین پر آ رہا۔ اس کی نیت اسے جان سے مار دینے کی نہیں تھی۔ جو کچھ ہوا وہ غیر ارادی طور پر

چشم زدن میں ہو گیا۔ حالت سراسر اس کے خلاف جاتے تھے۔ اس سے پہلے کہ کوئی شور مچاتا

سجاد نے جگت میں استاد سے کہا۔

”استاد تجھے اعتبار آئے نہ آئے۔ گلابی میرے لئے بھنوں جیسی ہے۔ میرا جو حساب

تیری طرف لکھا ہے۔ وہ گلابی کو شادی پر دے دینا۔ میرے ساتھ بس اتنا بھلا کر مجھے یہاں

سے نکل جانے دے۔“

استاد ابھی سمجھتی طور پر اس کی بات نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ بجلی کی سی سرعت سے تقریباً

دوڑتا ہوا محن سے باہر نکل گیا۔

.....

وہ دوڑتا ہی رہا۔ آگے ہی آگے۔ بہت آگے۔ اس نے دونوں کا فاصلہ گھنٹوں میں طے

کیا۔ لمحوں کو فاصلوں میں بدل دیا۔ وقت کی رفتار جیسے اس کے اپنے ہاتھوں میں آ گئی تھی۔

ایک ایک لمحہ اسے اس فضا سے اس ہوا سے، اس مقام سے کوسوں دور لے جا رہا تھا۔ جس

نے اسے قاتل بنا دیا تھا۔ جس کا ذرہ ذرہ اس کا دشمن تھا۔ وہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے مقید

ہونے سے پہلے، چھائی کے تختے پر قدم دھرنے سے پہلے وہ اپنے صے کا کام ختم کر لینا چاہتا

تھا۔

ریل میں چڑھتے، اترتے، بیٹھیں پر بھرم میں چلتے بھرتے، میبلز میں اُلجھتے اس نے کچھ بیبیوں پر ہاتھ صاف کئے اور اپنی گزراؤات کرنے لگے۔ اس کی زندگی مسلسل حرکت، مسلسل گردش میں بدل گئی تھی۔ وہ اپنی پہچان گواہ نکالتا تھا۔ اسے اپنی شناخت کرنے کی ضرورت نہیں رہتی تھی۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑا ہو کر دیکھتا کہ وہ پہچانا تو نہیں جاتا۔ اس نے اپنے بال اور مونچھیں خوب بڑھا لی تھیں۔ وہ ٹوپی اور منظر ہر وقت پہنتے رہتا جس میں اس کے چہرے کا بیشتر حصہ ضرور چھپ جاتا۔

وہ اونچا، لمبا، کھلے ہاتھ پیر کا وجہہ جوان تھا۔ لیکن اسے اپنی وجاہت کا احساس نہیں تھا۔ اس کی زندگی ماں اور بہن کے وجود اور محبت سے خالی تھی جو اس کی بلائیں تھیں۔ اس پر واری صدمے کا جانی، جنہیں ہر وقت بڑھتا چلا جاتا تھا کہیں اسے کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ وہ آٹھ جماعت تک پڑھا ہوا تھا۔ پلٹتے سے بات کر سکتا تھا۔ لیکن وقت کی ختم رانٹوں اور ناموافق ماحول نے اسے اکڑ اور تند خو بنا دیا تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ سمجھدار اور زمانے کے سرد گرم چکھے ہوئے تھا۔ وہ ہر طرح کے حالات سے بچا کر ناسکھ گیا تھا۔

اس نے اعلازہ کر لیا تھا کہ ریل گاڑیوں میں واردات کرنا آسان ہے۔ لوگوں کے بھرم، افرا تفری، سامان کی فراوانی، قلیوں کی دھکم پیل، گاڑی چھوٹ جانے کے خوف اور گھر پہنچنے کی جلدی میں جھٹلا لوگوں کے درمیان وہ کھو جاتا تھا۔ ایسے میں وہ ایک آدھ جیب پر ہاتھ صاف کر کے چند من کیلئے واردات کرنے سے غافل ہو جاتا تھا۔ ریل گاڑیاں اسے نت نئے شہروں میں لے جاتی تھیں جہاں وہ ایک ایک چہرہ پڑھتا، ایک ایک کو دیکھتا اور ہر ایک سے پہلو بچا کر گھل جاتا۔

وہ جبکہ بھاگ بھری کی یو سوگھٹا، رک رک کر بابا کو دیکھتا تھا جو پلٹ کر گھر نہیں آیا تھا۔ لوگ تو یہی کہتے تھے کہ وہ اسی روز غیرت سے مر گیا تھا جب بھاگ بھری اغوا ہوئی تھی۔ لیکن سجاد کو یقین نہیں آتا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ وہ بھاگ بھری کو ڈھونڈنے بغیر کس طرح مر سکتا تھا۔ سجاد کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بابا زندہ ہے۔ اور اسی کی طرح بھاگ بھری کو ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ زندگی کے کسی موڑ پر اچانک اس سے سامنا ہو جائے گا۔ اور وہ دونوں بھاگ بھری کو ڈھونڈتے ہوئے کہیں مل جائیں گے۔

زندگی کی آوارگی کا دوسرا نام ہو گئی تھی۔ اس کے شب و روز میں سے قرار کا لفظ مٹ گیا

تھا۔ بے چینی، خوف اور حلاش کے سوا اس کی زندگی میں کچھ نہیں رہا تھا۔ اسے یقین تھا کہ استاد اسے کبھی معاف نہیں کرے گا اور مستانہ اسے اور بھڑکا رہا ہوگا۔ وہ اس سے انتقام لینے بغیر نہیں رہے گا۔ یہی خوف اسے دوڑائے لے جاتا تھا کہ کہیں وہ بھاگ بھری کو حلاش کے بغیر جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہ چلا جائے۔ وہ اس بھری دنیا میں کسی پرندے کی طرح آزاد رہتا چاہتا تھا۔ تاکہ پیچھے پر لگا ہوا ڈال سکے۔ ہر جگہ دیکھ سکے اور ہر طرف آجاسکے۔

.....

نشین پر گاڑی رکھتے ہی مسافروں کا سیلاب سامانڈر کا گاڑی میں سوار ہونے کے لئے دھکم پیل کرنے لگا جن کو اترا تھا وہ اس افرا تفری میں پس کر رہ گئے۔ ثریا، بخت آور، زینت، ستارہ اور فردوس نے بڑی مشکل سے باہر نکلنے کا راستہ تلاش کیا اور کھلی فضا میں آکر اطمینان کا سانس لیا۔

بھاری بھر کم ٹائیکو کو ایک سامانڈے نے بڑی مشکل سے ہاتھ پکڑ کر ریل کے ڈبے میں سے باہر نکالا۔ وہ بھوم اور گرمی کی وجہ سے بری طرح ہانپ رہی تھی۔ لیکن اس کی عتابی نظروں ان سب پر جمی ہوئی تھیں جنہیں وہ دیکھا مال بنا کر اس بڑے جشن میں شرکت کیلئے لائی تھی۔

”سب آگئی ہیں نا۔ کوئی پیچھے گاڑی میں تو نہیں رہ گئی۔“ اس نے ہوا ہوا سانسوں کے درمیان بے سکتے غافلوں سے پوچھا۔

انہوں نے مونچھوں کو تاؤ دے کر سرخ آنکھوں سے ان سب کی طرف دیکھا۔ ستارہ نے تباہ سے اپنا چہرہ پوچھتے ہوئے ناکواری سے کہا۔

”گھر نہ آ رہا۔ سب تیرے ہاتھ ملتے ہیں۔“

اس نے برا سامانہ بنایا اور سامانڈوں میں سے کسی کو کہنے لگی۔

”جاؤ جاؤ کہ پچہ کرو۔ مرو کہ زمیندار صاحب نے کسی کو لینے بھیجا ہے یا نہیں۔“

”تم نشین سے تو باہر نکل۔ پھر آگے چل کر دیکھتے ہیں۔“ وہ آگے نکلتا ہوا بولا۔

زینت نے بخت آور کا ہاتھ پکڑ لیا اور ہولے سے بولی۔

”بھاگ بھری ہوشیار رہنا جیسے ہی کوئی موقع ملا نکلنے کی کوشش کریں گے۔“

”ان مشنڈوں کا کیا ہوگا؟“ زینا ان کی آنکھیں تو ہم سب پر لگی ہیں۔“ بخت آور نے

۱۰. سچھ کر دی زبان میں جواب دیا۔

”واہ۔ تم تو شاعری کرنے لگیں۔“ بخت آور نے ہنس کر کہا۔
 ”چلو اب بتا ہی دو کہ تم اسے کس طرح جانتی ہو۔“ فردوس نے لقمہ دیا۔

”ذرا ٹھہرو تو سہی۔ میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔“
وہ بری طرح شٹنیا اور جھلت میں اپنے بازو سے اس کا ہاتھ جھک دیا اور چلنے لگا۔

”وہ ایک رات آیا تھا۔“ ستارہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں بولی۔

”گاہک بن کر نہیں۔ قائل بن کر۔ اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔ میں چپ کی چپ رہ گئی تھی۔ میں ڈر گئی تھی۔ مجھے یاد ہے اس نے کہا تھا۔ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ اس نے کس طرح اذیت میں ڈوب کر کہا تھا۔ ”بھاگ بھری! یہ تو نے کیا کیا؟“

بخت آور نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ ستارہ کے ہونٹوں سے نکلے ہوئے لفظ انگاروں کی طرح اس کے سارے وجود کو داغ گئے تھے۔ وہ سانس روک کر بولی۔

”ستارہ تجھے ٹھیک طرح یاد ہے۔ اس نے بھاگ بھری ہی کہا تھا؟ بھاگ بھری؟“

جیسے اس نے بھاگ بھری ہی کہا تھا؟

”ہاں!“ ستارہ نے ایک سردا ہجر کر کہا۔

”وہ اسی نام کی تلاش میں آیا تھا بخت آور۔ یہاں اس نے کسی سے سنا تھا کہ پہلے میرا نام بھاگ بھری تھا۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ بہت پاپس ہوا۔ وہ جس بھاگ بھری کو ڈھونڈتا تھا۔ وہ میں نہیں تھی۔“

بخت آور دکھ اور اذیت میں ڈوبتے ابھرتے ہوئے بولی۔

”ستارہ! اس کا کیا نام تھا؟ تم نے اس سے اس کا نام نہیں پوچھا تھا؟“

”نہیں۔ نہیں۔ میں نے پوچھا نہ اس نے بتایا۔ شاید اگر میں اس سے پوچھ لیتی تو

بھی وہ نہ بتاتا۔“ ستارہ نے غور سے بخت آور کے حنجر چرے کی طرف دیکھا۔

وہ ہونٹ ہانپتی ہوئی جیسے اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”وہ سچا دل ہی تھا۔ ہاں وہ سچا دل ہی تھا۔“

”کون سچا دل؟“ ستارہ نے سوال کیا۔

بخت آور کا بیانیہ صبر جیسے لہریں ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا

اور آنکھوں سے رونے لگی۔

”ہائے میں سر جاؤں۔ وہ مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ اف خدا یا میں اس کے منہ سے

بتاؤں کہ میں یہاں ہوں۔“ وہ سسکیوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ اس کے سسکیوں میں

ڈوبے ہوئے لفظ کچھ ستارہ اور زینت کی سمجھ میں آ رہے تھے اور کچھ نہیں۔ البتہ سچا دل کے نام

پر زیو کو وہ تو خیر لڑکا یاد آ گیا تھا جس کی شرارتوں سے گھر بھری ناک میں دم رہتا تھا۔ جو چھپ

چھپ کر ٹھیل سے ان کے گھرے ہوئے مگروں کا نشانہ لیا کرتا تھا۔

ستارہ بھی جیسے سب کچھ گئی تھی۔ اس نے بخت آور کا شانہ چھپا کر آہستگی سے پوچھا۔

”بخت آور تجھے یقین ہے وہ میرا ہی بھائی تھا۔“

بخت آور نے تڑپ کر سراٹھایا اور بہتے ہوئے آنسو پونچھے ہوئے بولی۔

”ہاں۔ وہ سچا دل ہی تھا۔ میرا دل کہتا ہے وہ سچا دل ہی تھا۔ وہ بہت بڑا ہو گیا ہے۔

سارا پام منظور پر گیا ہے۔ ماشاء اللہ کتنا اونچا لہا ہو گیا ہے۔ ہائے میں سر جاؤں۔ وہ مجھے

ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اسے کس طرح بتاؤں۔“

ستارہ خاموش بیٹھی رہی۔ بخت آور کے دل کی کیفیت اس پر بھی گزر رہی تھی۔ بخت

آور جس سانچے سے دودھا تھا وہ اس کے لبوں بھی نہیں سی بن کر دوڑ رہا تھا۔ اس جگہ کی

گندہ کی کا احساس ایک بار پھر سارے وجود پر مسلط ہو گیا تھا۔ بیٹوں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

بے بس اور بے قرار آنسو جو روح کی غلش نہیں مٹا سکتے تھے۔ جو دامن کے دھبوں کو نہیں دھو

سکتے تھے جو ان کی روح کی پاکیزگی کے گواہ نہیں بن سکتے تھے۔

میں تینوں سے نجات دلا دے گا۔ اس کی ساری مشکوں کا خاتمہ کر دے گا۔ وہ جیسے سارے جہاں سے بیگانہ ہو کر صرف سجاد کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی۔ وہ اسے جی بھر کر دیکھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے اپنے سارے دُغم دکھانا چاہتی تھی۔ وہ اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ وہ اسے بہت کچھ سنانا چاہتی تھی۔ لیکن یہ سب کتنا نامکن سا معلوم ہوتا تھا۔ سجاد نہ جانے کہاں تھا؟ شاید کہیں بہت قریب تھا یا کہیں بہت دور۔ اس کی دھڑکن سے کوسوں دور۔ اس کی تلاش میں بھٹک رہا تھا۔ نامعلوم وہاں پھر کبھی اسے ملے گا بھی یا نہیں۔ یا شاید اچانک ہی اس سے آگاہی ملے کہ وہ کس طرح اس کا سامنا کرے گی۔ کس طرح اس کے سامنے نکلیں گے۔ اٹھائے گی۔ کس طرح اسے بھائی کہہ کر مخاطب کرے گی۔ کس طرح اس کے سامنے اپنے ناکردہ گناہوں کا اعتراف کر سکے گی۔

مختل میں ہوتے ہوئے بھی وہاں موجود نہیں تھی۔ اس کی آنکھیں کہیں اور دیکھ رہی تھیں۔ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ اس کی سوجھیں کہیں اور سفر کر رہی تھیں۔

زمیندار اور اس کے مہمان سرور و بے خودی میں ڈوب چکے تھے۔ رات ڈھل رہی تھی اور جذبے جوان ہو رہے تھے۔ ستاروں کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور فضا کہیں بیدار ہو رہی تھیں۔ وہ رقص کرتے کرتے تھک گئی تھیں۔ لغوئی کی لے چور چور ہو گئی تھی۔ مگر سننے اور دیکھنے والے نہیں تھکے تھے۔ چاروں طرف برستے بن نے تانید کو خوشی سے پاگل کر دیا تھا۔ وہ فضا میں اڑتے ہوئے سرخ، سبز، نلے، سیٹی پھر رہی تھی۔ مختل شباب پر تھی کہ زمیندار کے مہمانوں میں سے ایک بے خودی میں لٹکراتا ہوا اٹھا اور اس نے ستارہ کا بازو پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور لٹکرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اوسے میری بیٹھک کس طرف ہے۔ کوئی میرے ساتھ چلو۔“

ارد گرد بیٹھے ہوئے باقی مہمانوں نے محفوظ ہو کر قہقہہ لگایا۔ بخت آدر گاتے گاتے خاموش ہو گئی۔ باقی لڑکیاں جہاں تھیں وہیں رک گئیں۔ ستارہ نے اس کا ہاتھ جھٹک کر اپنا بازو چھڑا چا ہر گز اس نے نہیں چھوڑا اور اس کی جانب جھٹک کر جھوٹا ہوا بولا۔

”نہ سوچو! ہم بازو پکڑ لیں تو چھوڑتے نہیں۔ نہ ہانکل نہیں۔“

ستارہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی مگر اپنا بازو اس سے نہیں چھڑا پائی۔ دوسرے مہمانوں نے اس کی یہ قہقہہ دیکھنے لگے۔ زمیندار نے مونچھوں کو بل دے کر اپنے کپے کی ملازم کو آواز دی۔

”اوسے رخصتا..... جا چودھری صاحب کو ان کی بیٹھک میں چھوڑ آ۔“

رات جوان اور جادو بھری تھی۔ امنڈتے ہوئے شباب کی طرح پر بہار۔ رنگ اور خوشبو میں بسی ہوئی ایلز میا کی طرح شوخ، پینچل اور منہ زور فضا میں رن، رنگ اور نغنے تھے۔ ٹھنکروؤں کی جھکڑ سے در و دیوار گونج رہے تھے۔ ایک سے ایک بڑھ کر حسین چہرہ، ایک سے ایک بڑھ کر دلربا شباب۔ ہر طرف حسن اور ادائیں بھری ہوئی تھیں۔ خوشبوؤں سے معطر سراپے ہر ایک کی بن کر دلوں میں کلیاں کھلا رہے تھے۔ ناچتے ہوئے حسین پیکر دلوں میں اور مان چکا رہے تھے۔

زمیندار اور اس کے اونچے شہلوں والے مہمان چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھے جموم رہے تھے۔ فضا کی ترمک، لغوئی کی شوشی، قص کی دلاؤ یزی اور شباب کے زاویے نشے کو دو آہ کر رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے۔ کہنیوں سے ٹھوکے دیتے اور آنکھوں سے معنی خیز اشارے کرتے۔ وہ کرنی ٹوٹ اچھال رہے تھے۔

بخت آدر کا دل بیٹھا جاتا تھا جیسے جیسے مختل پر آتی تھی سمجھتی ہوئی مشتاق آنکھوں میں ہوس جاتی تھی۔ معنی خیز اشاروں میں بے باکی بڑھتی تھی۔ داؤد حسین کے شوخ اعلاز وجود کو چمیدنے لگتے تھے۔ گستاخیاں قریب آتی تھیں۔ وہ سٹ سٹ جاتی تھیں۔ اس کے لغوئی کی لے پھینکی پڑنے لگتی تھی۔ وہ چہروں کے جھوم میں گم رہی اپنا چہرہ چھپانے کی کوشش کرتی اور روشنیوں سے بھاتی تھی۔ اسے یہ تصور چین نہیں لینے دیتا تھا کہ ان بے شمار آنکھوں میں کہیں سجاد کی آنکھیں نہ ہوں۔ ان ان گشت چہروں میں کہیں سجاد کا چہرہ نہ ہو جو خاندان کی عزت کو یوں قہقہہ بنے دیکھ کر جانے کیا کرے۔

اس بات نے اس کے دل میں ایک دوا بنا دیا تھا کہ اس کا بھائی اسے تلاش کر رہا ہے۔ اس کا ایک ایک سانس اذیت سے بے حال ہو گیا تھا۔ وہ سجاد کی پناہ میں آنا چاہتی تھی۔ وہ اس کے مضبوط سہارے کی تلاش ہی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے سجاد اسے تمام

”منہیں نہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا۔“ نائیکہ کی پاٹ دار آواز گونجی اور وہ اپنا بے ہنگم جسم سنبھال کر درمیان میں آگئی۔

”چوہدری صاحب! یہ بات غلط ہے۔ وعدہ صرف مجھ سے کا ہوا تھا۔ کوئی لڑکی کسی کے ساتھ نہیں جائے گی۔“

”اوئے مائی۔ ہٹ پرے۔“ چوہدری نے سرخ آنکھیں نکال کر نائیکہ کو زور سے دھکا دیا۔ وہ گرتے گرتے بچی۔ مگر ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی اور کھنگلی سے بولی۔

”یہ رعب کسی اور کو دینا چوہدری۔ ہم خاندانی لوگ ہیں۔ جتنے کا وعدہ ہوا تھا اس اتنے تک ہی بات ہوگی۔“

”او۔ جانی۔ ٹر ٹر نہ کر۔ تیرے خاندان کی ایسی کی تیری۔“

وہ حقارت سے بولا اور بازو پھڑپھڑاتی ہوئی ستارہ کو اتنی زور سے اپنی طرف کھینچا کہ وہ اس کے اوپر ہی آ رہی۔ اس نے اپنا مضبوط بازو اس کے گرد لپیٹ دیا۔ مہمان اٹھ کھڑے ہوئے۔ سازندوں نے ساز چھوڑ دیئے۔ ساتھ آئے ہوئے ان کے محافظ بھر کر آگے بڑھے۔ زمیندار نے غصے سے اپنے ملازموں کو پکارا۔ نائیکہ بلند آواز میں انہیں کو سننے لگی۔ ایک محافظ نے دوڑ کر ستارہ کو اس کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ چوہدری کے ملازموں میں سے کسی نے اس کے کار میں ہاتھ ڈالا۔ کچھ مہمان بھی بیچ بچاؤ کرانے اٹھ کھڑے ہوئے۔

زینت نے بخت آور کے شانے کو ہولے سے چھوا۔ بخت آور نے چونک کر دیکھا۔ اس نے آنکھ سے ایک چھپا ہوا سا اشارہ کیا۔ تو بخت آور کی ساری حسیں جیسے بیدار ہو گئیں۔ اس نے ایک نگاہ سارے پچھے پر ڈالی۔

زیادہ تر مہمان نائیکہ اور اس کے محافظوں کی ٹوک جھونک و دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ کچھ معاملہ رفع دفع کرانے میں لگے ہوئے تھے۔ کچھ نٹے میں بے سدھ اول فول بک رہے تھے اور ان کے محافظ غٹنڈے ہاتھ پائی میں اٹھے ہوئے تھے۔

وہ بولے بولے۔ سب کی نظر بچا کر دروازے تک پہنچیں اور چپ چاپ موقع دیکھ کر باہر نکل گئیں۔

○.....○.....○

بخت آور کو ہوش آیا تو اس کا انگ انگ ٹوٹ رہا تھا۔ اس کے لئے اپنی جگہ سے

حرکت کرنا بھی دشوار تھا۔ روئیں روئیں سے ایک ناقابل برداشت ٹیس سی اٹھ رہی تھی۔ خوف کی برف نے اسے جم کر دیا تھا۔ وہ چاروں طرف دیکھتی تھی مگر جیسے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ کچھ کہتا جاہلی تھی لیکن بول نہیں پاتی تھی۔ اٹھنا جاہلی تھی مگر حرکت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے لئے سانس لینا بھی دشوار تھا۔ پلک تک جھپکنا مشکل تھا۔

گزرتے ہوئے لئے کسی خوفناک ڈراؤنے خواب کی طرح اب تک اس کے دماغ پر مسلط تھے۔ کچھ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کے ساتھ کیا ہوتا رہا ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ ہر طرف دشت برتن تھی۔ نیم تاریک بدبودار گونگڑی میں چاروں طرف سے خوفناک بیوے جیسے ہر اک ان پر یلغار کرتے رہتے تھے۔ اس کے حواسوں پر ابھی تک ان لمحوں کا قہر ڈٹا تھا۔

لبا! انجان! خوف سے بھرا ہوا راستہ۔ بیروں کے چھالے اور تعاقب کرنے والوں کا برآن دھڑکا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں کی دھلا دینے والی آوازیں۔ کوڑوں کی ضربیں۔ زینت کی لرزہ خیز جھنجھیں۔ گھوڑوں کے سسوں سے نکلا ہوا داغ داغ جسم۔ اس کے بعد کیا ہوا تھا؟ کچھ یاد نہیں آتا تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ جھنجھتی اور مرتی رہی تھی۔ کبھی بے ہوش ہو جاتی۔ تو کبھی ہوش میں آ جاتی۔ گرد و پیش ہلکی سی آہٹ بھی ہوتی تو اس کا رواں رواں کانپ اٹھتا۔ اس کا سارا وجود بیدار ہو جاتا۔ ننگے پنڈے پر اچھڑوں کے دھم دھمکتے۔ دروغ کی کاغذ اب سنبے والا بدن فریاد کرنے لگتا۔ وہ کوئی نیا قسم سننے کے خیال سے کانپ اٹھتی۔

وہ لمحہ لحد دلدل میں دھنکتی جاتی تھی۔ نجات کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ جیا جاتا تھا۔ نہ کوئی مرنے دیتا تھا۔ وہ تاریک کردہ کمرہ جیسے اس کی قبر بن گیا تھا جہاں چاروں طرف دشت و بریت رقص کرتی تھی۔ اس کا دم گھٹ کر رہ گیا تھا۔ اس میں آدھیتی برداشت کرنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ وہ سب کچھ سر جھکا کر مان لینے کے لئے مجبور ہو گئی تھی۔

○.....○.....○

گاڑی تاریکی میں بے ہنگم شور مچاتی ہی جیتی چلی جا رہی تھی۔ سجاد نے دروازے کے راز کو مضبوطی سے قما ہے ہوئے پائوں کی ٹھوک سے دروازے کو دھکا دیا۔ دوسرے ہاتھ میں لمبی دار چاقو تولے ہوئے وہ اندر داخل ہو گیا۔ وہ کافی دیر سے اسی موقع کی تلاش میں تھا۔ وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا کہ ڈبے میں بس صرف ایک لڑکی تھی۔

اوجھسی ہوئی لڑکی نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ وہ

اگر سوچا کہ وہ لڑکی اس طرح کیوں کہہ رہی تھی۔ مگر اس کی اس بات نے اس کے غصے کو کم اور
جھنجھلاہٹ کو ہلکا کر دیا تھا۔ اس کی یہ بات اتنی غیر متوقع تھی کہ وہ غیر ارادی طور پر ہلٹ کر
ایکٹے پر مجبور ہو گیا۔

اسے مڑ کر دیکھتے ہوئے پایا تو لڑکی پھر سہم گئی اور وہ چار قدم پیچھے ہٹ گئی اور بڑی
دادی سے جیسے اپنی صفائی چیش کرنے لگی۔

”میرا مطلب ہے۔ میرا مطلب ہے۔ تم تو شریف آدمی لگتے ہو۔ تم چور نہیں
لگتے۔ شاید شاید کوئی مجبور نہیں اس راستے پر آئے ہے۔“

سجاد نے حیرت سے اس کی بات سنی۔ اس کے لفظوں سے جیسے اس کے اندر
سرت کا ایک ہلکا سا احساس چھوٹا جس نے اس کے چہرے پر چھائی ہوئی کڑنگی کو قدرے کم
کر دیا۔

لڑکی نے بھی شاید اس تبدیلی کو محسوس کر لیا اور وہ ڈرتے ڈرتے محتاط سے لہجے میں
ہلی۔

”یہ کام تو اچھا نہیں ہے۔ مردوں کو اپنے ہاتھ سے کما کر کھانا چاہئے۔“
سجاد نے پھر غور سے اس کی طرف دیکھا کہ کہیں وہ ضرورت سے زیادہ چالاک
بننے کی کوشش تو نہیں کر رہی اور وہ جتنی سے بولا۔

”اپنے ہاتھوں ہی سے تو کما کر کھانا ہوں۔ جتنے معلوم ہے یہ کام کتنا مشکل ہے؟“
”مگر کوئی اچھا کام تو نہیں ہے نا۔“ وہ زرد چہرے کے ساتھ جھجکتی ہوئی بولی۔ اس
طرح تو تم پکڑے بھی جا سکتے ہو۔ تمہاری چھوٹی سی غلطی تمہاری زندگی کو خراب کر سکتی ہے۔
تمہارے خاندان کو بدنام کر سکتی ہے۔“

”مجھے کسی کی پروا نہیں ہے۔ میرا کوئی خاندان نہیں۔“ سجاد نے بے حد کڑے لہجے
میں کہا۔

”اوہو۔“ لڑکی نے افسردگی سے سر ہلایا۔

”تمہارا کوئی بھی نہیں؟“

سجاد نے اس کی بات کا جواب دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ چند لمحے شاید اس
لے جواب کے انتظار میں خاموش رہی۔ پھر مسافرانہ اعزاز میں بولی۔

”تمہارا کوئی نہیں ہے نا اس لئے شاید تمہیں کسی نے نہیں ٹوکا۔ شاید تمہیں کسی نے نہیں

جگت میں اٹھ کر زنجیر کی طرف بڑھی مگر راستے میں سجاد آ گیا۔ خوف سے پھیلی ہوئی
آنکھوں سے اس کی جانب کھینچی ہوئی وہ تیزی سے پیچھے ہٹتی اور بے کی دیوار سے جا لگی۔

سجاد نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے پاؤں کو ہلکا اور دو جگہ لہجے میں بولا۔

”تیرے پاس جو کچھ ہے وہ چپ چاپ نکال دے۔ میں تجھے کچھ نہیں کہوں گا۔“
وہ کانپ گئی اور خشک ہونٹوں کے ساتھ سہم کر بولی۔

”میرے پاس تو صرف تیس روپے ہیں۔“

سجاد کو سخت مایوسی ہوئی۔ اس نے خواہ مخواہ ہی بے خطرہ مول لیا تھا۔ وہ ابھی کچھ کہہ
نہیں پایا تھا کہ لڑکی نے اپنا پرس اس کی طرف بڑھایا اور گھبراہٹ ہوئی آواز میں بولی۔

”لو۔ تم خود دیکھ لو۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔ میرے پاس صرف تیس روپے ہیں۔“

سجاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ سوغات تم اپنے پاس ہی رکھو۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑی لیکن دوسرے ہی لمحے چپ ہو کر خوفزدہ لگا ہوں سے اس کی
طرف دیکھنے لگی۔ سجاد کو اس کے اس رویے پر حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ وہ ڈپٹ کر
بولا۔

”تیرے دانت کس خوشی میں نکل رہے ہیں۔ کم ذات۔“

لڑکی نے سہم کر نکلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا اور مجرموں کی طرح شانے سیڑ لائے۔
اس کا گلابی چہرہ بے حد گھبرا ہوا اور معصوم تھا۔ اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں سے جھلکتے خوف
نے اس کی دلکش آنکھوں کو ایک ڈرے ہوئے معصوم بچے کی آنکھیں بنا دیا تھا۔ سجاد نے ایک

بھر پور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ چپ رہی تو وہ اس سے بات کرنے کی خاطر بولا۔

”بولتی کیوں نہیں الو کی بچی۔ تو کیوں ہنسی تھی۔ مذاق اڑاتی ہے میرا؟“

”نہیں۔ نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”مجھ سے غلطی ہو گئی۔ مجھے ہنسنا نہیں چاہئے تھا۔“

سجاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے جانے کیلئے مڑا لیکن اسے روک
جانا پڑا۔ لڑکی کی ملائم آواز نے اسے روک لیا۔ وہ اس کے عقب میں کہہ رہی تھی۔

”بات سنو۔ تم مجھے چور نہیں لگتے۔“

سجاد ٹھٹھک گیا۔ اسے یہ بات بے حد عجیب اور اونٹنی معلوم ہوئی۔ اس نے حیران ہو

مردم رہتے ہیں۔ جن کو برا بھلا کوئی نہیں سمجھتا۔ جب وہ برے بن جاتے ہیں تو لوگ ان پر اٹھ اٹھاتے ہیں۔ انہیں سزا دیتے ہیں۔ بچے تو معصوم ہوتے ہیں نا۔“

اس نے ایک دزدیہ نگاہ سجاد پر ڈالی۔ یوں جیسے سوچ رہی ہو کہ اسے اپنی بات ہادی رکھنی چاہئے یا نہیں۔ پھر سجاد سے لہجے میں بولی۔

”مجھے لگتا ہے تم بھی ایسے ہی بچے ہو جسے کوئی استاد نہیں ملا۔ جسے کوئی سکھانے والا نہیں ملا۔ تمہیں دیکھ کر مجھے افسوس ہو رہا ہے۔ تمہاری اتنی عورت نہیں ہے۔“

سجاد نے انجیسے سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے لہجے کی شفقت اس کے لفظوں لی اوردی، اس کے دلکش چہرے پر بھی تھی۔ لہذا اس لڑکی کی معصومیت پر ہنسی آئی۔ وہ اسے گلاب والا وارث سمجھ بچھ رہی تھی۔ لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کا بھرا پراگر کس طرح لہ لہا لیا گیا تھا۔ اس کے بے دردی کے ساتھ جیٹوں، رشتوں اور چاہتوں سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ اسے جتنا کہ بولا۔

”میرا باپ بھی سکول میں ماسٹر تھا۔ سات آٹھ جماعتیں میں نے بھی پڑھی ہیں۔ پھر بڑے کافر بنی گیا تھا۔ لیکن میں اس فرق کو یاد نہیں رکھ سکتا۔ میں نے خود اپنی لہجے سے یہ راست چنا ہے۔“ بھی تو استانی؟“

”کیوں؟“ اس نے حیرت آمیز تجسس سے پوچھا۔ ”آخر تم نے کیوں یہ راست چن لیا۔ تمہارے گھر والوں کو کتنا افسوس ہوتا ہوگا۔ تم نے ان کی امیدوں پر پانی بھیر دیا ہے۔“ ”میرا گھر خالی ہے۔“ سجاد نے درشتی سے کہا۔ ”میرا کوئی نہیں ہے۔ کسی کو کچھ سے الگ امید نہیں ہے۔“

”لیکن تم انسان تو ہو۔ دوسرے انسانوں سے تمہارا انسانیت کا رشتہ ہے۔ انہیں تو تم اسی کی امید ہے نا۔“ وہ دم سے لہجے میں بولی۔

”اوپر۔ اچھے کی امید۔“ سجاد نے غصے سے دودھرایا۔

”دوسرے انسانوں نے میرے ساتھ کیا اچھا کیا ہے جو میں کسی کے ساتھ اچھا کرنا چاہتا ہوں۔ تو نے ابھی دینا نہیں دیکھی۔ تو نے صرف بچوں کے قاعدے پڑھے ہیں استانی! اچھے لہجے کے انسان کیا ہے؟ ابھی تجھے کسی کے ہاتھ نہیں لگے۔ جب تو یہ بڑی بڑی باتیں کرتی ہے۔ وہ ہونٹ پیچ کر بولا اور دفعتاً دو قدم آگے بڑھ کر اس کی چادر کا کونسا طرح زور سے پھاڑ لڑکی کے منہ سے چیخ نکلی گئی۔ اس کا رنگ فق ہو گیا۔ وہ ایک ہی جھٹکے میں چادر کے

بتایا کہ تم جو کچھ کر رہے ہو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ تم نے جو راست چنا ہے وہ اچھی زندگی کی طرف نہیں جاتا۔“ اس کے انداز میں بے ریا غلوس اور اوردی تھی۔ وہ یوں بات کرتی تھی جیسے پھواری پڑھی ہو۔

سجاد کا شک اب بھی دور نہیں ہوا۔ وہ حالت خوف میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسے ہر لمحہ پکڑے جانے، پھانسی لگنے اور شاخت کر لئے جانے کا دھڑکا سا لگا رہتا تھا۔ اسے ہر چہرہ دشمن کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ اسے اس بڑکی پر بھی شک ہو رہا تھا کہ وہ ایک غیر شخص میں اس قدر دلچسپی کیوں لے رہی تھی۔ جبکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ تو وہ اپنے اس رویے سے کیا ظاہر کرنا چاہتی تھی۔ اس نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا۔

”سچ بتا تو کیا چاہتی ہے؟“ وہ غرایا۔

لڑکی کا چہرہ دفعتاً پھید پر گیا۔ وہ ہنسنے لگی۔ ”میرا بازو چھڑاؤ۔“

”نہیں۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں چاہتی۔ چھڑاؤ۔ میرا بازو چھڑاؤ۔“

”تو پھر مجھے سبق کیوں پڑھا رہی ہے۔ بتا؟“ سجاد نے ڈپٹ کر کہا اور اس کا بازو چھڑا دیا۔

”وہ سٹ کر پیچھے ہٹی۔ اس نے شاکی نظروں سے سجاد کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر اپنا بازو دھسلانے لگی۔ سجاد کو وہ اچھی لگی۔ اس نے اپنا لہجہ نرم کر دیا۔

”بولتی کیوں نہیں۔“

”وہ کچھ خفا سی ہو گئی تھی اور خوفزدہ بھی۔ اس کی طرف دیکھے بغیر وہ ناراضی سے بولی۔

”اگر میں کچھ کہوں گی تو تمہیں برا لگے گا۔“

سجاد کے لبوں پر بے ساختہ مسکراہٹ آگئی۔ اس نے اپنے درشت لہجے کو بہت نرم کر دیا۔

”نہیں تو بتا تو سہی۔ میں برا نہیں مانوں گا۔“

لڑکی نے تنہیدی نگاہوں سے اس کی طرف اس طرح دیکھا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی ہو کہ اس کے ارادے کیا ہیں؟ پھر ہولے سے نکلتی گئی۔

”میں..... میں استانی ہوں۔ مجھے ان بچوں کو کچھ کہ بہت افسوس ہوتا ہے جو تعلیم سے

دیکھا ہی نہیں۔ میں تو تجھے صرف یہ بتانا چاہتا تھا کہ انسان کتاباے اعتبار ہے۔ ایک ہل میں وہ کیا سے کیا بن جاتا ہے۔“

لڑکی نے جیسے اطمینان کا سانس لیا اور یوں اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی جیسے بہت تھک گئی ہو۔ وہ ابھی تک بات کرنے کے قابل نہیں ہوئی تھی۔ اس کا سانس ناہوار تھا۔ اس کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ وہ بار بار اپنی ہادیاں چادر کو اپنے گرد لپیٹتی یوں بے اعتباری سے چاروں طرف دیکھتی تھی جیسے اپنے محفوظ ہونے کا یقین نہ ہو۔ سجاد ایک بار پھر فرش پر ا۔

”دیکھا کچھ لکے کی باتیں کرنا بہت آسان ہے۔ خود پر پڑے تو پتہ چلتا ہے۔ اب تار کیا کہتی ہے تو استانی۔“

وہ ایک جھرجھری سی لکیر ہوئی۔

”تم بھی ٹھیک کہتے ہو اور میں بھی۔“

”کیا مطلب؟“ وہ اس ابھی ہوئی بات پر الجھا۔

وہ انگلی۔ ”تم کہتے ہو کہ انسان بے اعتبار ہے۔“

”ہاں۔“ سجاد نے ہنکارا بھرا۔

”میں کہتی ہوں کہ اس بے اعتباری انسان کے اندر ایک اچھا انسان بھی ہوتا ہے۔

اگر تمہارے اندر ایک اچھا انسان نہ ہوتا تو تم کہ میرا لحاظ کرتے۔ میں اکیلی لڑکی۔“ وہ ہونٹ دانتوں میں داب کر خاموش ہو گئی۔

سجاد نے پیشانی پر ہل ڈالے۔

”میری جگہ کوئی اور ہوتا تو تم دیکھتیں۔“ اس نے بھی دانت سمجھ کر بات اس طرح ادھوری چھوڑ دی کہ مطلب کی کھینچی اور واضح ہو گئی۔

”اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا۔“ لڑکی کے گلہاں یوں پر خفیف سی مسکراہٹ آئی۔

”اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اسے بھی انسانیت کا کوئی رشتہ یاد آ جاتا۔ اس

کے اندر کے اچھے انسان کو مجھ اکیلی لڑکی پر تمہاری ہی طرح رحم آ جاتا۔ میں جنہیں سب تو سمجھتا چاہ رہی تھی کہ بس اتنی ہی بات چھوٹا سا یہ لحاظ تو انسان کا انسان سے تعلق اور رشتہ ہے۔“

سجاد نے تیزی سے چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی سی خوبصورت باتیں کرتی ہوئی بہت ابھی لگ رہی تھی۔ اگرچہ سجاد کو اس کی باتوں سے اتفاق نہیں تھا۔ لیکن اس کی آواز کی صفاس، اس کی باتوں کی جھک، اس کے لہجے کی شائستگی، اس کا سادہ سا انداز بہت

ساتھ کھینچی ہوئی اس کے قریب آ گئی۔

اس نے بدحواسی میں چادر خود سے غلیبہ کر کے دور ہٹ جانا چاہا۔ لیکن سجاد نے اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ اس کا بازو پکڑ کر اس نے بالکل اس کے کان میں کہا۔

”اگر تو کہے تو ابھی تاہوں کہ انسان۔“

اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ کر اس کے زرد چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ پوری جان سے کانپ گئی۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ وہ جیسے ہٹنے کی کوشش کرتے ہوئے خشک ہونٹوں کے ساتھ ہوئی۔

”چھوڑو۔ چھوڑو۔ خدا کیلئے مجھے چھوڑ دو۔“

اس کی دگرگوں حالت دیکھ کر سجاد کو ہلکی آگئی۔

”مری کیوں جاتی ہے استانی! اب کرنا پڑی پڑی باتیں کرنا انسان یہ ہے۔ انسان ہے۔“

اپنا بازو چھڑانے کی کوشش میں وہ ہانپ گئی۔ سجاد نے خود ہی اسے آزاد کر دیا اور دلچسپی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ چادر سنہا پتی ہوئی جیسے اپنی اور خوف سے پھیل گئی ہو۔

آنگھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ سجاد کو اس پر بہت ترس آیا۔ وہ بھولی بھالی سی باتیں کر لڑکی تھی۔ اس نے اسے

کچھ زیادہ ہی ڈرا دیا تھا۔ وہ کبھی ہوئی ہرنی کی طرح ہراساں نظروں سے یوں ادھر ادھر رہی تھی جیسے جانے پناہ کی تلاش میں ہو۔ وہ اسے ڈری ڈری، سبھی ہوئی سی، کبھی مٹی بہت اور

لگ رہی تھی۔ اس کے ارادے برے نہیں تھے۔ لیکن وہ اسے جھپٹنے سے باز نہ رہ سکا۔ اس میں پکڑا ہوا چاقو کسی آنگھوں کے سامنے لہرا کر بولا۔

”بس اتنی ہی بہت تھی۔“

وہ لڑکے جیسے ہلکی ہلکی اور برا مانستے ہوئے ہوئی۔

”اس میں بہت کی کیا بات ہے؟ اگر تم میری جگہ ہوتے تو تمہاری بھی نیکی ہوتی۔“

اس کی یہ سادہ سی بات سجاد کے دل کو لگی۔ اس نے مسکرا کر چاقو بند کر دیا اور

سے بولا۔

”ڈرومت۔ میں جنہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تو بہت نا تجربہ کار ہے۔ تو نے ابھی

اپنا اپنا سا تھا۔ سجاد نے زنگی میں وہ پہلی لڑکی دیکھی تھی جس کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ جو اسے خوبصورت لفظ استعمال کرتی تھی۔ جودل میں گھر کر لیتے تھے۔ جو اتنی ملائم باتیں کرتی تھی کہ اس کی آواز پر نلکے کا گمان ہوتا تھا۔

وہ اکڑ اور کمرودی زبان کا عادی تھا۔ اس نے ہمیشہ جیسے ہوئے درشت لفظ ہی سے اپنے گرد و پیش رہنے والی عورتوں کے ہونٹوں سے گالیاں ہی اچٹی دیکھی تھیں۔ شاید اسی لیے اس لڑکی کی نرم و ملائم باتوں سے اس کے اعصاب کو ایک ناقابل بیان سکون بخش دیا۔ اس کی سماعت میں رس گھلنے لگا۔ اس کا پیچھا کر وہ اسی طرح دھیمے دھیمے پوٹتی رہے۔ گھائی نازک ہونٹوں کو ہمیشہ دیتی رہے۔ اس کے رخسار پر ایک تھا سائین کڑھا ہوتا اور ہنسا رہے۔ وہ اس کے مقابل بیٹھ جانے اور چپ چاپ اس کی باتیں سننے کی خواہش کو نہ روک سکا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اسی کی تلاش میں تھا۔ اسے ہی ڈھونڈتا پھرتا تھا اسی کیلئے سرگرداں تھا۔ اسے ہی چاہتا تھا کہ وہ کہیں ملے۔ کہیں نظر آئے۔ کہیں اسی سے سامنا ہوتا تو اسے اپنا زنجی دل بھی دکھائے۔ اپنا فکار سیدھا اس کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ وہ ساری باتیں جو اس کے اندر کھولتی رہتی تھیں انہیں اس کے سامنے اگل دے۔

اسے معلوم بھی نہیں ہوا کہ کتنا وقت گزرا اور ریل کتنا سفر طے کر آئی۔ وہ کہاں سے کہاں گئی۔ وہ لڑکی بڑی بھردی سے اس کی درودار بنتی رہی۔ بڑی اپنائیت سے اس سے ایک ایک بات پوچھتی رہی۔ وہ یوں اس کی طرف متوجہ رہی جیسے اس کی باتوں سے زیادہ اہم کوئی اور بات نہ ہو۔

ریلوے لائن کے قریب ہی بنی ہوئی کسی مسجد سے اذان کی آواز سنائی دی تو وہ چونک گیا۔ رات تو ایک لمبی کی ہو گئی تھی۔ لڑکی نے چادر سے سر ڈھک لیا اور زیر لب کچھ پڑھنے لگی۔ سجاد یوں اذان کی آواز میں کھوکھو جیسے اس نے اذان پہلی مرتبہ سنی ہو۔ اس کے دل پر ایک ناقابل بیان کیفیت سی چھا گئی۔ اس نے سر جھکا لیا۔ اس کا ذہن خالی اور دل پر سکون تھا۔

.....

چھوٹے سے گھر کی فضا ایسی گرم اور مانوس تھی جیسے اپنا ہی گھر ہو۔ پرسکون اپنائیت سے بھرا ہوا۔ سجاد بچی سمجھ والے سادہ سے کمرے میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ یہاں کیوں چلا آیا ہے۔ چپ چاپ اپنی مرضی سے، بڑی رغبت کے ساتھ جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ کسی بڑے کی انگلی پکڑ کر اس کے ساتھ چل پڑے۔

یہاں تھنڈا کا ایسا نرم گرم احساس فضا میں گھرا ہوا تھا کہ دل سے سارے خوف تمام کنیاں مٹ گئی تھیں۔ وہ لڑکی کتنی مہربان اور اچھی تھی۔ اسے دیکھ کر دل پاکیزگی سے بھر جاتا تھا۔ نگاہوں میں عقیدت اتر آتی تھی۔ اس کی بھردی پا کر دل ہر شے سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ سجاد نے نہ جانے کیوں اسے کوئی ایسا بات نہیں بتائی تھی جو اسے بدگمان کر دے۔ جو اسے اس کی نظروں سے گرا دے۔ جو اس کا القاف جھین لے جو اس کی ہمریائوں کو کم کر دے۔ جو اس کے خلوص کا رخ پھیر دے۔ جو اس کی ہمدردیوں کی سمت بدل دے۔

سجاد نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ قاتل ہے اور پولیس سے چھپتا پھرتا ہے۔ اس نے کتنے ہی ڈاکے مارے تھے اور اپنے دشمنوں سے گن گن کر بدلے لے لے تھے۔ اس نے خود کو مظلوم اور ستم رسیدہ بنا کر پیش کیا تھا۔ زمانے بھر کی شکایتوں کے دفتر اس کے سامنے کھول دیے تھے۔ وہ اس کی بھردی، اس کی توجہ اور اس کے التفات سے جھولی بھر لیتا چاہتا تھا۔ وہ اس میں کی نہیں کرتا چاہتا تھا۔

لڑکی کا کشیشن آگیا تو سجاد نے اس کا سامان اٹھالیا اور اس کے ساتھ کشیشن کے باہر نکلیا۔ اس نے اسے اپنے ساتھ چلنے کیلئے کہا تو وہ بلا غدار اس کے ساتھ ہولیا اور اب اس کے گھر میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ وہ تو اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا تھا۔ پھر اس کے ہاتھ کیوں چلا آیا تھا۔ وہ تو اس کی کچھ بھی نہیں گنتی تھی تو وہ کس ناطے سے اس کے گھر چلا آیا تھا۔ اس نے تو یہ خیال نہیں کیا تھا کہ اس کے گھر میں اور لوگ بھی ہو سکتے ہیں اور وہ نہ ہانے کیسے ہوں اور اسے کس نظر سے دیکھیں۔

”لو چائے پیو۔“ اس کی آواز سن کر وہ پوچھلا کر کھڑا ہو گیا۔

اسی ایک لمحے میں اس نے فیصلہ کر لیا کہ اسے فوراً یہاں سے چلے جانا چاہیے۔ وہ ایک مجرم تھا۔ اسے ایک شریف گھر پر اپنا سایہ نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ اس نے غلطی میں لڑکی سے کہا۔

”نہیں نہیں۔ بس اب میں جا رہا ہوں۔ میں تو تمہیں گھر تک پہنچانے آیا تھا۔“

”تمہیں ایسی بھی کیا جلدی ہے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”چائے وغیرہ پی کر چلے جانا اور امیرمیتان سے کوئی اچھا کام تلاش کرنا۔“

وہ اس کی اپنائیت کے جواب میں کوئی عذر نہ پیش کر سکا اور چالہ اس کے ہاتھ سے

لے لیا۔

”کل اکل!“ کسی نے پکارا۔

وہ لڑکی جواب میں جی کہتی ہوئی اٹھ کر چل دی۔ تو سجاد کو علم ہوا کہ اس پھول جیسے شاداب چہرے والی لڑکی کا نام گل ہے۔ اسے یہ نام بہت اچھا لگا۔ اس نے ذریعہ اسے کئی بار درہریا تو اسے ایک پنجابی سی جھک اپنے چاروں جانب پھینکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ وہ سوچنے لگا کہ اس کا نام اسی کی طرح خوبصورت اور دلکش ہے۔

اسی وقت گل ایک ادیمبر عورت کے ساتھ کمرے میں آئی۔ سجاد مڑ پڑا سا گیا۔ اس نے جلدی سے چائے کا پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا اور اندھ کر اسے سلام کیا۔

”ماسی یہ سجاد ہے۔ گاؤں سے آیا ہے۔ کام کی تلاش ہے۔ میں اسے ساتھ لے آئی ہوں۔ سکول میں سفیدیاں کر دے گا۔ چھٹیاں بھی تو ختم ہونے والی ہیں۔“

سجاد ایک خوشگوار حیرت میں ڈوب گیا۔ اسے گل کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا۔ اسے اعزاء وہ گویا کر گل اس کے لئے اس گھر میں جگہ بنانا چاہتی ہے۔ لیکن ماسی اس سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کی نگاہوں کا انداز تنقیدی تھا۔ اور وہ مدغم لہجے میں گل سے کچھ کہہ رہی تھی جو یقیناً اسی کے بارے میں تھا۔

وہ خود کو بہت سبک سامحوس کرنے لگا۔ وہ خود کو ملامت کرنے لگا کہ وہ بغیر سوچ سمجھے اس کے گھر کیوں چلا آیا تھا۔ اس کا جی چاہا کہ ماسی کی جیتی ہوئی نگاہوں سے کہیں دم چلا جائے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور جھٹ پٹ گھر سے باہر نکل گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ گل اسے پکار رہی ہے۔ مگر اس نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

وہ سیدھا بازار گیا۔ اس کی جب میں کچھ پیسے تھے۔ اس نے سفیدی کرنے کا سامان خریدا اور پھر اسی گل میں چلا آیا جو اسے بہت چاہی پچھانی سی لگ رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ صدیوں سے اس کے ساتھ مانوس تھا۔ اس نے دروازے پر دستک دی تو گل کا پھول سا چہرہ نظر آیا۔ وہ اسے دیکھ کر حیران سی ہو گئی۔ شاید وہ بھی کبھی رہی تھی کہ وہ چلا گیا ہے۔ اس کے گلابی ہونٹوں پر ایک دلکش مسکراہٹ تھی۔

”ارے۔ میں تو سمجھ رہی تھی کہ تم چلے گئے ہو۔“

”نہیں۔“ سجاد نے سامان ترتیب سے رکھے ہوئے کہا۔

”میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا جب تک تمہاری بات کو جھنجھکاؤ نہ کروں۔“

”کون سی بات۔“ اس نے پوچھا۔

”میں سکول میں سفیدیاں کروں گا۔ تم نے ماسی سے جو کہا ہے۔“ وہ بولا۔

”اچھا۔“ وہ خوشگوار سی حیرت کے ساتھ کہنے لگی۔

”تم نے کبھی یہ کام بھی ہے؟“

”نہیں کیوں تو اب کروں گا تم فکر نہ کرو۔ میں تمہارے سکول کو خشکی کی طرح چمکا دوں گا۔“ اس نے بڑے فطری انداز میں کہا۔

”گل اکل!“ ماسی کی آواز دور سے سنائی دی۔

”اوہو۔ میں ادھر آ کر باتوں میں لگ گئی ہوں۔ ماسی بے چاری ناشتے کے لئے بلا رہی ہے۔“ گل نے تیزی سے کہا۔ پھر اس سے بولی۔

”تم پہلے ناشتہ کرو۔ پھر کوئی کام شروع کرنا۔“ وہ اتنا کہہ کر ”جی آئی ماسی!“ کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔

سجاد نے گل اٹھائی۔ کمرہ کی میں سے صحن کا کچھ حصہ نظر آ رہا تھا۔ ماسی چلنے کے قریب بیٹھی روٹی پکا رہی تھی۔ اسے ہان کا بھولا ہوا مہربان چہرہ یاد آیا۔ یہ چھوٹا سا آنگن، گرم چلہا، دھونیں کی سرخیں لکیر اور روٹی پکاتی ہوئی ماسی۔ اسے یہ سب کچھ اپنے گھر جیسا معلوم ہوا۔

اس کے دل کی دنیا میں کرب و الم کے جھکڑے چلے گئے۔ اس کی کیفیت اس ترے ہوئے بچے کی سی ہو گئی۔ جو ماں کی گود میں آنے کے لئے لپک رہا ہوا۔ اپنے بے تاب دل کو ایک بہلا دینے کے لئے وہ اٹھ کر دروازے میں آ کر کھڑا ہوا۔ گل دوسرے کمرے سے باہر آئی تو

اس نے ہمت کر کے جھپٹتے ہوئے اسے پکار لیا۔

”ہات سنو!“

وہ قریب آگئی اور نری سے بولی۔

”ہاں بتاؤ کیا بات ہے؟“

”اگر تم برائہ مانو تو میں وہاں بیٹھ کر ناشتہ کروں جہاں ماسی بیٹھی ہے۔ ادھر ماسی کے

پاس۔“

”ہاں آ جاؤ۔ کوئی حرج تو نہیں۔“ وہ خوش اخلاقی سے بولی اور اس کے آگے آگے چل

ہی۔ سجاد سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے چلا گیا۔

ماسی نے اسے گھر میں یوں بے تکلفی سے چلنے پھرتے دیکھ کر کڑے تنوروں سے گل

کی طرف دیکھا۔ اس کے اعزاء میں ٹانپندی کی تھی۔ سجاد دل بچھ سا گیا۔ وہ جواب دینے کے

کے بھولے ہوئے تصور اور پھجڑی ہوئی ماں کی یاد کو اپنے دل میں زندہ کرنا چاہتا تھا ملول سا ہو گیا۔ اس نے پھجڑی بالوں والی اس عورت کے چہرے پر شفقت تلاش کرنے کی کوشش کی جو ماں جیسی نظر آتی تھی۔ لیکن جس کی مٹا اس کے لئے نہیں تھی۔ وہ بے دلی سے اس کے قریب ہی ایک بیڑی پر بیٹھ گیا اور رساں سے بولا۔

”مائی! میں تمہیں ماں سمجھ کر تمہارے پاس آ بیٹھا ہوں۔ تم برا نہ مانا۔ تم میری ماں جیسی لگتی ہو۔“

مائی نے حیرت سے اس کی بات سنی اور غور سے اس کی طرف دیکھا کہ اس کی بات کی گہرائی کو جانچ سکے۔ وہ اپنے اندر امنڈتے ہوئے پیاسے جذبات کو دبانے کا اور خود کھائی کی سی کیفیت سے بولا۔

”مجھے ماں یاد آرہی ہے۔“

مائی نے ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا اور اس کا لہجہ نرم ہو گیا۔

”بڑا میں بھی تیری ماں جیسی ہوں۔ تجھے ماں یاد آرہی ہے تو مجھے اپنی ماں سمجھ لے۔“

تجھے پتہ ہے سب مائیں ایک جیسی ہوتی ہیں۔“ وہ محبت سے اس کے سامنے دودھ پورا کر کے رکھنے لگی۔

سجاد کو محسوس ہوا جیسے مائی کا سنگین چہرہ ماں کے مہربان چہرے میں بدل گیا ہے۔ وہ ناشتے کا خیال بھول کر اس کے مہربان چہرے کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔



گھر کا سکول کیا تھا دو کمروں پر مشتمل گھر ہی کا ایک حصہ تھا۔ جس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ دیواروں پر سے پلستر اکھڑا ہوا تھا۔ کبیں کبیں سے فرش بیٹھ گیا تھا۔ عرصہ ہوا یہاں سفیدی بھی نہیں ہوئی تھی۔ گھر نے بتایا تھا کہ وہ فیس برائے نام لیتی ہے۔ اکثر غریب بچے مفت ہی پڑتے ہیں۔ اس لئے اتنی آمدنی نہیں ہوتی کہ سکول کی قمرات پر قحبہ دہی جاسکے۔

سجاد لٹاؤ کرتے ہی سکول کی مرحمتوں میں جٹ گیا۔ اسے اس کام کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ استاد کے یہاں ہیرا پیمبری کرنے میں اسے مشقت کی عادت بھی نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کا دل، اس کی روح، اس کا سارا وجود جیسے اس کام کو کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ وہ خود بخود وہ سارے کام کر رہا تھا جو اس نے بھی نہیں کئے تھے۔ اس چھوٹے سے سکول میں وہ ایک پیشہ ور مزدور کی طرح دن رات یوں کام میں لگا رہا کہ اسے اپنا جیوش نہیں تھا۔ اسے کوئی مشکل نہیں ہوئی۔ اسے ذرا سی محنت کا احساس نہیں ہوا۔ جیسے جیسے وہ کام کرتا رہا۔ درود پوار نکھرتے چلے گئے۔ اس کے اندر تازگی اور ہنگامی کی ایک لہری جاگتی گئی۔

گھر کئی بار آ کر دیکھ جاتی تھی۔ مائی کے رویے میں بھی اب تبدیلی آگئی تھی۔ وہ اسے اتنی محبت سے مسلسل کام کرتا دیکھ کر بار بار کہتی تھی کہ وہ کچھ دیر آرام کرے۔ وہ کہیں تھک تو نہیں گیا۔ اسے چاہئے تو نہیں جینی۔ اسے بھوک تو نہیں لگی۔

لیکن سجاد کو ایسی کوئی طلب نہیں تھی۔ اس کے دل میں تو بس ایک ہی لگن تھی کہ اسے گھر کے سکول کو آئینہ بنا دیتا ہے۔ چٹکا دمکا۔ صاف شفاف۔ نیا گور۔ اس کے لئے یہ سب کچھ بہت نیا۔ نوکھا اور زندہ کر دینے والا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بہت دنوں کی تاریکی کے بعد آج سورج کا روپ نظر آیا ہے۔ وہ پھر سے جی اٹھا ہے اور اسے جینے کا اعزاز مل گیا ہے۔

اس کی دن رات کی محنت سے درود پیار کو سنوار دیا۔ اس کے جذبول کا نکھار چہار سو نکھر گیا۔ اس نے سکول کی صورت ہی بدل دی۔ جسے دیکھ کر گل کے دلکش چہرے پر خوشی کے نرالے رنگ چمک اٹھے۔ وہ دونوں کر دل میں نفسے کی طرح لہرائی ہوئی پھری۔ اس نے ایک ایک کوئے، ایک ایک گوشے کو دیکھا اور سرت سے چسپاتی ہوئی بولی۔

”واہ۔ واہ! چاہا دل تم نے تو میرے سکول کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ بچے آئیں گے تو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ وہ تو بچپائیں جسے بھی نہیں کہ یہ وہی سکول ہیں پہلے والا ٹوٹا پھوٹا۔“

سجاد کا دل انتہائی سرت سے بھر گیا۔ جو اس کے اندر سے پھوٹی اور اسے شراپور کر گئی۔ وہ اس شادمانی اور سرشاری کا زندگی میں پہلی بار مزہ چکھ رہا تھا۔ اس کا ایک ایک اس شیرینی کو محسوس کر رہا تھا۔ گل جیسی اچھی اور نیک لڑکی کے لبوں سے نکلنے والے یہ لفظ اسے اپنی ہی لگے ہوں میں بے حد اہم بن رہے تھے۔ وہ کھربھی تھی۔

”سجاد! تم نے تو کمال کر دیا ہے۔ میری ایک بڑی پریشانی دور ہو گئی ہے۔ سکول کی تو صورت ہی بدل گئی۔ مجھے بتاؤ اس سب پر تمہارا کتنا خرچ ہوا ہے۔ میں تمہیں تمہاری مزدوری بھی دوں گی۔“

سجاد کا چہرہ خستہ سا ہو گیا۔ اس نے افسردگی سے سر جھٹکا۔

”یہ کہہ کر تم نے میری ساری خوشیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ میری زندگی میں کوئی تو اچھا کام رہے دو۔ اس کا معاوضہ دینے کی بات کر کے میری ساری زندگی کی اکلوتی خوشی نہ چھینو۔“

”نہیں سجاد!“ وہ جلدی سے بولی۔

”تمہارے کام، تمہارے جذبے کا معاوضہ نہیں ہے۔ اس کی قیمت بھلا میں کس طرح دے سکتی ہوں۔ جس لگن سے تم نے کام کیا ہے میں ہزاروں روپے خرچ کر کے بھی اسے حاصل نہیں کر سکتی۔ میں نے تو اس خیال سے تمہا کہائی تھی زندگی، نیا کاروبار شروع کرنے کے لئے تمہیں رقم کی ضرورت تو ہوگی نا۔“

”جب ایسی کوئی ضرورت ہوگی تو میں تم سے مانگ لوں گا۔“ سجاد نے اس کی بات کاٹ کر یوں بے ساختہ کہہ دیا کہ اسے خود پر حیرت ہی ہو گئی۔ وہ اس لڑکی کو کتنا اپنا اپنا سا سمجھنے لگا تھا۔ پھر وہ خود ہی اپنی بات پر شہنشاہ اور یونہی بات بٹانے کو بولا۔

”نہیں۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔“

مائی بھی کرے میں چلی آئی اور اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

”واہ پترا! تو بہت اچھا کارکن ہے۔“

سجاد کا دل بھر آیا۔ وہ ایسی بزرگوار شفقت کی لذت، ممتا کا شرین ذائقہ عرصہ ہوا بھول چکا تھا۔ مائی کے اس محبت بھرے لسنے سے اسے یہ گشادہ فردوسی سوتا تھا لوٹا دی تھیں۔

.....

”بخت آور! جی چاہتا ہے تمہیں سامنے بٹھا کر بس دیکھتا رہوں۔ دیکھتا چلا جاؤں۔ تم کتنی حسین ہو۔ تمہارا حسن۔ تمہاری اداس میری جان لے لیں گی۔ زینت کا بھی جواب نہیں تھا لیکن تمہاری قربات ہی اور ہے۔ دل چاہتا ہے تمہیں چاہوں۔ تم سے محبت کروں۔ تمہیں چوں۔ کاش تم صرف میرے لئے وقت ہو جاؤ۔ صرف میرے لئے۔“

بخت آور اکتاہٹ بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا ایک ایک لفظ جیسے اس کے سارے وجود کو داغ رہا تھا۔ وہ زینت کی جگہ اس کو کھٹے پر لائی گئی تھی۔ یہ شخص جو زینت کا دیوانہ تھا اب اس کے قصیدے پڑھتا تھا۔ وہ کوئی خطی سا انسان تھا۔ جب بھی آتا مجب و غریب ہاتھیں کرتا رہتا۔ بخت آور کا جی چاہتا کہ اس کے منہ پر ٹھوک دے جو ہوں کو محبت کا نام دے کر محبت کی توہین کرتا رہتا تھا۔

وہ غیہ باز آنکھوں سے اس کی جانب والہانہ دیکتا ہوا اس کے بالوں میں بچے ہوئے مگرے کے کچرے کو چھو کر بولا۔

”بخت آور! تم نے خود میں اتنا حسن، اتنی دلکشی کس طرح سے جمع کر لی ہے۔ پھولوں کا یہ گہرا بھی اس لئے اچھا لگ رہا ہے کہ تم نے اسے پہنا ہوا ہے۔ اپنی ریختی زلفوں میں سجایا ہوا ہے۔“

”مجھے تمہاری یہ باتیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ بخت آور نے پھولوں کا وہ گہرا اپنے بالوں سے نوچ کر نکھر دیا۔

اس نے ٹوٹے ہوئے گہرے کے سارے پھول چن لئے اور انہیں اس پر اچھالتا ہوا

۱۱۵

”ہم اسے برے بھی نہیں جانتے۔“

”تم بہت برے ہو۔ تم بڑے سنگدل ہو۔ تم سارے ہی مرد بہت برے، بہت سنگدل

ہو۔ بے حس اور کٹھور، وہ نفرت سے ہونٹ چبا کر کہنے لگی۔

”تم عورت سے اس کے سارے رشتے چھین کر اسے صرف عورت بنا دیتے ہو۔ تم اس کے گرد ہوس کا جال ساپنے رچے ہو اور اسے محبت کا نام دیتے ہو۔ تم محبت کے نام پر تہمت کیوں لگاتے ہو۔ تم عورت کو کھلونا کیوں بناتے ہو؟ تمہیں غم بھی عورتوں کو دیکھ کر یہ خیال کیوں نہیں آتا کہ ہم بھی کسی کی بہنیں۔ کسی کی بیٹیاں ہیں۔“

”واہ۔ واہ۔ واہ۔ واہ۔ بخت آور واہ۔“ اس نے تالی بجا کر داد دی۔

”تمہیں کچھ معلوم ہے کہ میں غلوں میں طوائف کے لئے ایسے ہی زور دار مکالے لکھتا ہوں تو ہاں میں تالیاں بجاتی ہیں۔“

بخت آور نے غصے سے منہ پھیر لیا اور خود پر قابو پانے کی کوشش میں اٹھ کر کمرے میں غلنے لگی۔

وہ ریشمی گاؤں کے کاسہارا لے کر نیم دراز ہو گیا اور اس کی والہانہ نگاہیں اس کے ساتھ ساتھ کمرے میں گھومنے لگیں۔ بخت آور نے ہنسی سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر تم بھر دے نہیں کر سکتے تو غناقی بھی مت اڑاؤ۔“

”بھئی غناقی کون کا فرزا رہا ہے۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”چھاپا ہات سنو۔ یہاں آ کر بیٹھو۔“

بخت آور نے توجہ نہیں دی اور بیکل قدموں سے کمرے میں اسی طرح چلتی رہی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا لیکن جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”یہاں آؤ نا بخت آور تمہیں ہاں رہا ہوں ہاں بالکل سنجیدہ ہوں۔ تمہارے سر کی قسم۔ میں بہت سنجیدہ ہوں۔“

بخت آور نے پلٹ کر دیکھا۔ بوجھل قدموں سے قریب آئی اور ایک کرسی کے بازو پر ٹک گئی۔ وہ چہرے لے کر ہی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”بخت آور! مجھے دو ٹوک جواب دو۔ تمہیں یہاں رہنا ہے یا نہیں؟“

بخت آور کی آنکھوں میں ایک تیز چمک جاگئی۔ اس نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

”تم میں اتنی جرأت ہے کہ اس کو خٹے سے پاؤں نیچے اتار لو۔ بولو۔ تم میں ہے اتنی

ہمت۔ کہ اس جگہ سے باہر نکل سکو۔“

”تمہیں کیا معلوم کہ میں اس جرم میں کن کن اذیتوں سے نہیں گزری۔ لیکن یہ خیال اب بھی میرے دل سے نہیں نکلا۔ حالانکہ میں جانتی ہوں کہ اگر اب میں نے بھاگنے کی کوشش کی اور ان لوگوں کے ہاتھ آگئی تو یہ تیزاب سے میرا چہرہ بگاڑ دیں گے اور مجھے چرسوں اور انجنیوں کے حوالے کر دیں گے لیکن میں پھر بھی ذلت کی اس زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔“

”تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ کوئی جگہ ہے تمہاری نظر میں؟“ وہ راز داری سے پوچھنے لگا۔

”جگہ۔“ بخت آور نے غصہ کی سانس بھری اور نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

”تمہیں کچھ تو کوئی نہیں۔ مگر خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ مجھے کبھی نہ کہیں سر چھپانے کو جگہ مل ہی جائے گی۔“

”رہیں نا تم بھولی بھولی۔ گاؤں کی وہی نادان لڑکی۔ یہاں کوئی کسی کو سر چھپانے کی جگہ نہیں دیتا۔“ وہ زہریلی ہنسی بھنسا۔ ”تم جیسی خوبصورت عورتوں کیلئے یہاں اور وہاں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ بس ذرا یہ جگہ بدنام بہت ہے۔“

”نہیں۔ دنیا میں سب تم جیسے نہیں ہیں۔ کوئی ایسے لوگ بھی تو ہوں گے۔“ بخت آور نے ہنسی سے اس کی بات کاٹی۔

”ہاں بھئی۔ دنیا میں ایسے لوگ تو بہت ہیں۔“ وہ ہنسنے ہوئے سر ہلا کر بولا۔ ”لیکن ان ایسے لوگوں کو اپنی عزت کی بہت فکر ہوتی ہے۔“

”خاموش ہو جاؤ۔ میری بہنوں کو پست نہ کرو۔“ بخت آور نے غصے سے کہا۔

”اچھا سنو۔“ وہ دیکر ہنسی سے بولتا ہوا بولتا۔

”اچھا اب سچ سچ بتاؤ کہ کیا تم واقعی چھٹکارا چاہتی ہو۔ یہاں سے؟“

”ہاں۔ ہاں۔ ہاں۔ اور کتنی دفعہ کہوں کہ تمہیں یقین آئے۔“ بخت آور چمکی

”خفا کیوں ہوئی ہوں جان سن! وہ بڑے لگاؤ سے بولا اور کچھ سوچنے لگا۔ پھر اس نے نیا سرگٹ سلگا یا اور گھر سے گھر سے شل لینا ہوا اپنی کسی سوچ میں ڈوبا رہا۔ بخت آور خاموش

سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس نے کافی دیر بعد سرگٹ کا گل جھانڈتے ہوئے کسی گہری سوچ میں سے ابھر کر کہا۔

”میں تمہاری مدد تو کر سکتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں۔ ایک بات سے ڈرتا ہوں۔“
 ”وہ کیا؟“ بخت آور نے بے تابانی سے پوچھا۔

”اب تمہیں کیا بتاؤں۔“ وہ سر جھک کر بولا۔ ”میری بیوی کم بخت بڑی ظالم ہے سالی۔ اگر اسے اس بات کی ذرا سی ہجک بھی پڑ گئی تو میری خیر نہیں۔“

”اس طرف سے تم بے فکر رہو۔“ بخت آور نے اطمینان کا سانس لے کر کہا۔

”میں تمہارا گھر جاؤں گا نہیں جانتی۔ میں تو صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم مجھے کہیں کوئی معمولی سی نوکری دلو اور ادھر بس۔ اس کے بعد میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی۔“

”ارے ارے رہے۔ اب ایسا غضب بھی نہ کرنا ظالم نہیں تو ہم سر جابئیں گے۔“
 اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ کر اسے اپنی جانب کھینچ لیا۔



سہاول کے پاس کوئی ایسا ہنر نہیں تھا جسے وہ دنیا کے ہرے بازار میں رکھ کر اپنے لئے باعزت زندگی کی ضمانت حاصل کر لیتا اور گل سے کیا ہوا وعدہ نبھالیتا۔ ان گنت لوگوں سے آباد اس شہر میں کوئی اسے جاننے پہچاننے والا نہیں تھا۔ اس نے اپنی شناخت اپنے ہاتھوں سے منائی تھی۔ وہ اس چہرے کے ساتھ جینا نہیں چاہتا تھا جس کے ہاتھ پر قاتل لکھا تھا۔

وہ ایک نئے انداز ہی پہچان کے ساتھ کارزار حیات میں اترتا چاہتا تھا۔ اس کی اپنی کوئی شناخت نہیں تھی۔ کوئی اسے جاننے والا نہیں تھا۔ وہ جہاں بھی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کرتا اس سے ضمانت طلب کی جاتی۔ اس ہجرے پر اب انجی شہر میں اس کا کوئی ضامن نہیں تھا۔

اس نے دو ایک جگہ دھاڑی بھی لگائی لیکن شفقت کا یہ کام اسے تھا کہ آچر چور چور کر دیتا۔ شام ڈھلے اس کی جیب میں صرف چند سکہ ہوتے۔ جن سے وہ مشکل اپنے پیٹ کی آگ بجھاتا۔ کچھ اور کرنے کے لئے وقت ہی نہیں پتا تھا۔

وہ اس طرح کی زندگی نہیں گزار سکتا تھا۔ اسے فراغت کی ضرورت تھی۔ اسے ہماری جیب چاہئے تھی جو سودا اس کے سر میں سایا ہوا تھا اس کے لئے کڑکڑاتے نوٹوں کی ضرورت تھی۔ اسے اپنی بہن کو ڈھونڈنا تھا۔ اسے ہماگ بھری کے ہماگ جگانے تھے۔ اسے خاندان کی عزت کو بازار کی ذلت سے نکالنا تھا۔ اس کے لئے اسے سونے کی کٹی کی ضرورت تھی جو کونھوں کے دروازے کھول دے۔ جو بند کدوں کے راز آشکار کر دے جو اسے چور دواؤں

کے راستے بتا دے۔

وہ شہر کی خاک جھان جھان کر ہار گیا تھا لیکن قسمت نے یادری نہیں کی تھی۔ کوئی راستہ بھی تو روزگار کی طرف نہیں جاتا تھا۔ کہیں عزت کی روٹی نہیں تھی۔ تھک کر وہ ایک تانگے میں بیٹھ گیا اور اسے اسی راستے کی طرف مٹلے کوکھا جو گل کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

وہ اس دن سے نکلا تھا تو پھر وہاں نہیں گیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی باعزت روزگار حاصل کرے تو گل کا سامنا کرے لیکن ہر طرف ناکامی ہی ناکامی تھی۔ اسی ناکامی سے گھبرا کر اس نے اچانک گل کے پاس جانے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ شاید اس کی خوبصورت باتیں اسے سہارا دے سکیں۔ اس کی ڈھارس بندھا سکیں۔ شاید وہ اسے کوئی اچھا مشورہ دے سکے۔ یا شہر میں اپنے کسی شہاسا کے بارے میں بتا سکے جو اس کی ضمانت دے دے یا اس کی سفارش کر سکے۔

وہ اسی اوویز بن میں لگا ہوا تھا کہ اسے اپنے پہلو میں ہلکی سی جھپن کا احساس ہوا۔ اس نے چونک کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔

”جان عزیز! جو کچھ جیب میں ہے چپ چاپ نکال دے ورنہ۔“

تو جوان تا نگہ بان نے دانت کھینچ کر کہا اور منہ سے کٹاک کی سی آواز نکالی۔ سہاول کو اس لڑکے کی دیدہ دلیری پر غصہ آیا۔ اس کی عمر زیادہ نہیں تھی اور واردات کا طریقہ بھی ٹمھا ہوا نہیں تھا۔ اس نے گھوڑے کی رفتار پر تکی کر دی تھی اور نکلا ہوا چاقو اس کے پہلو میں رکھے ہوئے تھا۔

سہاول نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ بہت گھبرا گیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے دفعتاً بھپٹ کر کوچوان کا چاقو والا ہاتھ گرفت میں لے لیا اور اس کی کلائی اس طرح مروڑی کہ چاقو اس کے ہاتھ سے پھوٹ گیا۔ تا نگہ بان کا رنگ اڑ گیا۔ سہاول نے گھوڑے کی نگاہیں کھینچ کر اسے رکھا اور چاقو اس کی آنکھوں کے سامنے لہرایا۔

”فٹھہ گردی کرتا ہے کہینے۔“

وہ کھٹکے مانے لگا۔

”معاف کر دے یار۔ چل جانے دے۔ تجھے اللہ رسول کا واسطہ۔“

”اچھا؟ اب تجھے جانے دوں؟“ سہاول نے شدید طیش میں اس کا گریبان پکڑ کر

اسے جھکایا۔

”لو کہ پٹھے۔ میں تو تجھے ایسا مزہ بکھاؤں گا کہ۔۔۔۔۔“

بڑے پر جمیلا تھا۔ گل کی خوبصورت باتوں کی ہلک اسی تک اس کے ذہن میں تازہ تھی۔ وہ اپنی زندگی کے اس ڈھب کو بدلنے پر اپنے پورے جذبوں کے ساتھ آمادہ تھا۔ وہ تمام باتیں جو گل نے اس سے کئی تیس دن اس لڑکی سے کہے تھے۔ وہ اسے سمجھانے لگا۔ اسے اس دلدل سے نکلنے پر آمادہ کرنے لگا۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ پھر اس نے بے خیالی میں جب سے سگریٹ نکالا اور اسے سلاکار کا ایک لباس پہن لیتے ہوئے بولی۔

”یار یہ سگریٹ تو ایک ہی ہے۔ لے تو بھی سش لگا لے۔“ اس نے سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔

سجاد نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”تو سگریٹ بھی جیتی ہے؟“

”ہاں۔ بس منہ کو لگ گیا ہے۔“ وہ عادی سگریٹ نوشوں کی طرح سش پہ سش لیتے ہوئے بولی۔

”نفس بھی کرتی ہے؟“ سجاد نے پوچھا۔

”نہیں۔ نہ نہیں لگتا۔ یہ ٹیٹ چٹا ہوتا تو آپ بھلا دیتا ہے۔“ اس نے چنگی بجا کر

سگریٹ کی راہ بھاری

”اس نشتے نے تو میرا بھائی مجھ سے جھین لیا ہے۔ وہ اپنے ہوش میں ہوتا تو میں گھر سے کیوں نکلتی۔“

سجاد کو انہوں سا ہوا۔

”تو تو کوئی اور کام کر لیتی تات۔“

”اور کام کیا کرتی۔“ اس نے گھوڑا چلانے کی مخصوص آواز نکالی۔

”یہ تاکہ چلانا کوئی برا کام ہے کیا؟“

”اور ساتھ جو یہ وارداتیں کرتی ہے وہ۔“ سجاد نے غصے سے کہا۔

وہ ہلکھلا کر فیس پڑی۔

”یہ تو آج پہلی بار کی ہے اور تو کمر گریا۔ یہ چاقو تل گیا تھا کہیں سے۔ میں نے کہا۔ چلو

ہاتھ لکھائیں۔“

”بڑی کینسی ہے تو۔ میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ابھی تجھے سیدھا کر دیتا۔“ سجاد نے

لڑکے نے بدخواہی میں دونوں ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اپنا گریبان چھڑاتا ہوا بولا۔

”نہیں۔ نہیں۔ نہیں۔ مجھے معاف کر دے۔ مجھے کچھ مت کہنا۔“

سجاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی غیر معمولی کشادہ آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اس کے بال چیشانی پر بکھر گئے تھے۔ وہ خوف سے پسینے پور ہا تھا۔ اس کی کلاں پٹلی تھیں اور ہاتھوں کی گرفت مضبوط نہیں تھی۔ سجاد کو کچھ شک سا ہوا۔ لڑکے کی آواز نرم تھی اور اپنا آپ چھڑانے کا انداز کسی مرد کا نہیں تھا۔

سجاد نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور کھلا ہوا چاقو اس کی خوف سے پھیلی ہوئی ہراساں آنکھوں کے درمیان رکھ کر بولا۔

”سچ بتا۔ کہیں تو لڑکی تو نہیں۔“

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ وہ بدک کر چیخے ہٹا۔ سجاد نے اس کے سر پر لپٹا ہوا صاف کھینچ لیا۔ اس کے سیاہ ریشمی بال شانوں پر بکھر گئے۔ وہ سراستکی سے اس کی طرف نکتے لگی اور اس نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

سجاد کو اس پر ترس بھی آیا اور غصہ بھی۔ اسے پہلے ہی شک ہو گیا تھا کہ اس کا مخاطب لڑکا نہیں۔ لیکن اب یقین آ جانے پر اسے انہوں بھی ہوتا تھا۔ نہ جانے کون سی مجبوری تھی جو اس کو خیر تو لڑکی کو شباب کے ان ایلبلہوں میں گھر کی دہلیز سے باہر لے آئی تھی۔ اس نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور نکلتی سے بولا۔

”تجھے کوئی اور کام نہیں ملا تھا کہ نہ کوالو کی بٹھی۔“

لڑکی نے سبھی سبھی ہی نگاہ اس پر ڈالی اور اپنے بکھرے ہوئی ریشمی بال اپنے صافے میں لپیٹتی ہوئی بولی۔

”مجبوری ہی سب کچھ کراتی ہے۔ ورنہ درد خوشی سے جان جو کھوں میں ڈالتا ہے۔“

”تجھے کیا مجبوری ہے؟“ سجاد نے دھڑکی سے پوچھا۔

لڑکی کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے ارادے خطرناک نہیں۔ اس نے اس کا خوف کم ہو گیا تھا۔ وہ اب پہلے کی نسبت کچھ اطمینان اور بے تکلفی سے بات کرنے لگی تھی۔

”باپ مر گیا۔ ماں مر گئی۔ بھائی آوارہ نشینی ہو گیا تو اب کس کے آسرے چوں۔“

سجاد ان راہوں کے بیچ غم سے آشنا تھا۔ اس نے زندگی کی دھوپ چھاؤں کو نکتے

حال ہوگا۔ شاید اس کے ذریعے ہی اسے کوئی معقول ملازمت مل جائے۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا اور بولا۔

”جمل اب پہلے اسی طرف چل۔ تیرے ملاں پہوڑی کو بھی دیکھ لینے جہں سکتے پانی میں ہے۔“

”وہ پانی میں نہیں۔ وہ تو آپ سمندر ہے سمندر۔“ اس نے گھوڑے کی ہانگ موڑ کر اسے دوسرے راستے پر ڈال دیا۔

آبادی سے کچھ دور نکل کر وہ کچے راستے پر چل پڑی۔ گھوڑے کے سگون سے اڑتی ہوئی دھول میں اسے دور ایک پرانا حویلی نما مکان نظر آیا۔ لڑکی نے گھوڑے کی ہانگیں سمجھ لیں اور چلا گیا لگا کر بچے اتاری۔ گھوڑے کی لگائی تانگے کے ساتھ ہاتھ باندھتے ہوئے وہ شرارت سے بولی۔

”آ جاؤ بادشاہو! آ یاں نوں۔“

سجاد چاروں طرف تجسس لگا ہوں سے دیکھتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دور سے حویلی کافی بڑی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا اونچا دروازہ بھدا اور پرانا لیکن مضبوط تھا۔ لڑکی نے دروازے پر دستک دی تو گیٹ میں سے ایک چھوٹی سی کھڑکی کھلی اور ایک بڑی بڑی مونچوں والے کھرت چہرے نے باہر جھانکا۔

”میں ہوں پانچا بھل۔ میں ہوں شہزادی۔“ وہ بلند آواز میں بولی۔ تو سجاد کو معلوم ہوا کہ اس کا نام شہزادی ہے۔

گھوڑی دیر میں دروازہ کھل گیا۔ وہ دوڑ کر تانگے پر سوار ہوئی اور اسے اندر لے جا کر وسیع صحن میں کھڑا کر دیا جب تک سجاد بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔

”آ جا یا۔ آ جا۔“ وہ بڑی بے تکلفی سے بولی اور اس نے آگے بڑھ کر ایک دروازے پر پڑی ہوئی چٹن اٹھائی۔

”ملاں جی! اجازت ہے۔“ وہ جھکی۔

پھر چٹن اٹھا کر اندر کھس گئی۔ سجاد بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ اسے فضا میں رہتی ہوئی ایک مالوس سی بو کا احساس ہوا۔ اس نے سامنے دیکھا۔ تخت پر گاؤٹیکے کے سہارے

مضبوط جسم اور اونچے قد کا ایک اوسط عمر آدمی بیٹھا تھا۔ اس کی سیاہ کبھی داڑھی اس کے چوڑے ٹانگوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی بل کھاتی ہوئی مٹھریائی ٹیٹس اس کی کھٹی داڑھی میں الجھ کر رہ

ملازمت بھرے انداز میں کہا۔

”اوہ۔“ اس نے تانک سکڑی۔ ”یہاں ہم نے بھی ہاتھوں میں چوڑیاں نہیں پہنی ہوئیں۔ کوئی ہاتھ لگا کر تو دیکھے۔“ اس نے منہ ہی منہ میں گالی کی۔

”بڑی پیسے خان بن رہی ہے اور ابھی کیسے تیری جان نکل رہی تھی۔ کیسے معافیاں مانگ رہی تھی۔ مری جاتی تھی۔“ سجاد نے بتایا۔

وہ کھسکی سی ہوئی لیکن پھر ڈھٹائی سے بولی۔

”وہ تو میں نے کہا کیا خون خرابا کرنا۔ اسی طرح کام نکلتا ہے تو کھل جائے۔ نہیں تو تو دیکھتا۔“

سجاد کو اس کی جھٹی بھکار نے پرہی آگئی۔

”کیسا فضول بک رہی ہے۔ میں تجھے پھر ایک بار کہتا ہوں کہ کوئی شریفوں والا کام کر۔ خواہ مخواہ کیوں اپنے خاندان کی عزت کو تباہ نہ کرنا۔“

”اچھا۔ تو تو دلا دے مجھے کوئی شریفوں والا کام۔ تو دلا دے۔“ وہ منہ چماڑ کر کہنے لگی۔

سجاد ہنس پڑا۔

”ابھی تو میں اپنے لئے کام ڈھونڈتا پھرتا ہوں۔ تجھے کہاں سے کام دلاؤں۔“

”تو فکر کیوں کرتا ہے۔“ وہ بے تکلفی سے اس کے زانو پر ہاتھ مار کر بولی۔

”جمل میرے ساتھ۔ ملاں پہوڑی کے پاس بڑے کام ہیں۔ جیسا کہے گا کام مل جائے گا۔“

سجاد نے جھکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”یہ ملاں پہوڑی کون ہے۔ الوگا چر خا۔“

وہ یوں سے ساختہ بنی جیسے اس کی بات کا بہت لطف لیا ہو۔

”بہت کھرا آدمی ہے۔ سارا شہر اس کی مٹھی میں ہے۔“ اس نے مٹھی بند کر کے اس کے سامنے لہرائی۔

”تم ایک بار اس سے مل کر تو دیکھو یا راہ تمہارے لئے کوئی نہ کوئی کام نکال ہی لے گا۔“

سجاد نے لمبے بھر کو سوچا کہ اس سے مل لینے میں کیا حرج ہے۔ وہ اس شہر کا واقف

مگنی تھیں۔ بے حد سیاہ بالوں نے اس کی سرخ و پید رنگت کو نمایاں کر دیا تھا۔ اسے اعزاز ہو گیا کہ یہی ملاں پہنڑی ہے۔ شہزادی نے آگے بڑھ کر جیسے اس کا تعارف کرایا۔

”ملاں جی۔ یہ سچا رابندہ بے روزگار ہے۔“

”اچھا!“ اس نے ہماری آواز میں کہا اور سجاد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”ہاں جی یار! کیا مسئلہ ہے تیرا؟“

سجاد نے راستے میں سوچ لیا تھا کہ وہ اسے کیا کہانی سنانے گا۔ وہ اس کے سوالوں کے سنے سنے جواب دیتا رہا۔ اس نے محسوس کیا کہ ملاں کے شکوک دور ہو گئے اور اس کے اعزاز میں قدرے نرمی آگئی۔

”سجاد!“ ایک چابک سبب سے کسی نے پکارا۔

سجاد اپنا نام نکر چوٹ گیا۔ اس نے ملاں کو اپنا اصل نام بھی نہیں بتایا تھا لیکن اچانک اپنا نام نکر اس نے بے خیالی میں پلٹ کر دیکھا اور سنانے میں رہ گیا۔ ہونٹوں پر ایک غیث مسکراہٹ لئے متنازع اس کے مقابل تھا۔ یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ سجاد ایک لمحے کو پیٹے پیٹے ہو گیا۔ شکرے کا بے جان چہرہ اور پھرائی ہوئی آنکھیں اس کی نگاہوں میں گھوم گئیں۔ وہ ماضی کی دلدل میں دھنسا چلا گیا۔

متنازع قریب آکر معصومی رازداری سے بولا۔

”واہ۔ اونے سجاد۔ تجھے وضو وضو تے تو پولیس کی آنکھیں آگئیں اور تو

یہاں چھاپا بیٹھا ہے۔ بلے جی بلے۔“

سجاد جیسے پتھر کا ہو گیا۔ اسے اندازہ کرتے بن پڑتی تھی نہ اقرار۔ قسمت اسے گھیر گھاڑ کر یہ کہاں لے آئی تھی۔ جس جرم کو چھپانے کیلئے وہ بد رہ بھٹکا بھرتا تھا۔ متنازع اس کا اشتهار بن کر سامنے آ گیا تھا۔ وہ ملاں پہنڑی کے کان میں گھسا ہوا نہ جانے کیا چھوٹ رہا تھا۔ اس کی بات سننے ہی ملاں کی آنکھوں میں عجیب سی چمک آگئی تھی۔ وہ یوں سر بلارہا تھا جیسے ہجوم رہا ہو۔

متنازع نے آنکھ کھچ کر کہا۔

”ملاں جی! یہ تو بڑے کام کا آدمی ہے۔ اسے ہاتھ سے نہ جانے دینا۔“

ملاں نے ایک شاطر مسکراہٹ اس کی جانب پھینکی۔

”کیوں جی جوان! تو تو ابھی کوئی اور ہی کہانی سنا رہا تھا۔“

سجاد الجھ کر رہ گیا۔ وہ باوجود کوشش کے ماضی کے اس گھمگھور سامنے سے نہیں نکل سکتا تھا جس نے اس کے ماتھے پر اس کی سابقہ زندگی کے جرائم کھود دیے تھے۔ وہ ان سے کس طرح انکار کر سکتا تھا۔ بات اس کے ہاتھوں سے نکل چکی تھی۔ اس کے قدموں تلے زمین نہیں رہی تھی۔ وہ کسی دلیل، کسی جواز سے انہیں قائل نہیں کر سکتا تھا۔ متنازع اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا تھا۔ وہ اس سے نگاہیں ملا کر بات نہیں کر سکتا تھا۔ ساری آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور وہ سب کے درمیان محرم بنا بیٹھا تھا۔

شہزادی نے ملاں کے شانے پر سے ہٹا لیا اور مزاحمتیہ لگا کر بولی۔

”ماننے ہوں ملاں جی! یہ کیسا تھکا لاکر دیا ہے۔ اول نمبر۔“

سجاد بھٹا گیا۔ اسی آفت کی پڑا نے اسے یہاں لا پھنسا یا تھا ورنہ وہ دل میں ٹھان کر چلا تھا کہ گلی کی دلیز پر جا کر اس سے اپنے لئے رٹل اور حصار مانگے گا۔

شہزادی نے سگریٹ کا کس لیکر دھواں اس کی طرف چھوڑتے ہوئے اٹھلا کر کہا۔

”سوہو۔ کیوں جوانی رو لے۔ اپنے پر نہیں تو کچھ ہمارے حال پر دم کرو۔“

سجاد کا جی چاہا۔ اس کا گلا گھونٹ دے۔ اس نے سارا غصہ اس پر نکالا۔

”کیوں نہ کر کم ذات۔“ وہ گلی دے کر بولا۔

ذیرے کے دوسرے لوگ اور ملاں پہنڑی سب بے ساختہ ہنس پڑے۔

”اونے بار! اس کی بات کا کیا برا ماننا ہے۔ یہ تو ہمارے ذیرے کی چڑیا ہے چڑیا اور بڑیوں کی بولی کا بھی کبھی کسی نے برا ماننا ہے۔“

شہزادی ہنسی کے مارے دوہری ہو گئی۔ سجاد نے دانت کھینچ کر خوہ کا پو پایا۔ ملاں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور ایک عجیب سی سرزد دینے والی مفاہمت کے اعزاز میں بولا۔

”دیکھ یار! ہم یادوں کے یار ہیں۔ تیرے لئے جھادوں بن جائیں گے۔ ایسا ہے۔ ہمارے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چل۔ نہیں تو تیرا ہاتھ میرا ہے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اتنا سوچ لیتا۔“

سجاد کو ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ جہاں سے چلا تھا وہیں واپس آ گیا ہے۔ اس نے سر اٹھا کر ملاں پہنڑی کی طرف دیکھا۔ اسے جھرجھری سی آگئی۔ ملاں کی حیر آنکھوں کی ظالم ہاب! اسے حصار میں لے رہی تھی۔

”تم نے جہاں اتنے احسان کئے ہیں ایک احسان اور کرو۔ مجھے کوئی ملازمت دلو

وہ۔ مجھے کوئی کام کرنے میں عار نہیں۔ عزت کی زندگی کے لئے میں گھروں میں برتن بھی مانجھ سکتی ہوں۔ میں ہر کام کرلوں گی۔“ بخت آور نے اس کی منت کرتے ہوئے کہا۔

وہ جان پر کھیل کر اس کے ساتھ نکل آئی تھی۔ وہ چھپتا چھپاتا اسے ایک ہوٹل میں لے آیا تھا۔ جہاں اس نے کمرہ پہلے سے رکھا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ اس کے لئے یہ کمرہ اس کے فطرساز نے لیا ہوا تھا تا کہ وہ یہاں سکون سے اس کی فلم کے لئے کہانی اور مکالمے لکھ سکے۔ اسے یہاں آنے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ وہ دن بھر اس کمرے میں اکیلی بند رہتی۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ دروازہ بالکل مٹھ کر لے۔

شام کو وہ آ جاتا۔ اس کے لئے کھانا بھی لاتا اور رات گئے تک وہیں رہتا۔ پھر وہ ہوتی اور اس کی تنہائی اور پکڑے جانے کا رادینے والا خوف۔ جب بھی وہ آتا بخت آور اس سے پہلا سوال یہی کرتی کہ اس کی ملازمت کا کوئی بندوبست ہوا ہے یا نہیں۔ اور وہ جواب میں ہر روز ایک ہی بات کہتا۔

”بھئی۔ میں تو ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں لیکن کوئی بات ہی نہیں بنتی۔ تم اطمینان رکھو میری جان۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہو جائے گا۔“ وہ اپنے مخصوص لالہالی انداز میں کہتا اور گہری نگاہوں سے اس کے دلکش چہرے کی طرف دیکھتا رہتا۔ بخت آور اکتی گئی۔

”میں تو ہوٹل کے اس کمرے میں قید رہ رہ کر ٹھک آ گئی ہوں۔ بس ہر وقت ایک دھڑکا سا لگ رہتا ہے۔ ڈرتی رہتی ہوں میں۔ وہ لوگ تو مجھے پاگلوں کی طرح دھوڑ رہے ہوں گے۔“

”اسی لئے تو میں کہتا ہوں کہ کچھ وقت گزر جائے تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے وہ کچھ لگتے۔ ذرا ٹھک ہا کر بیٹھ تو جائیں کہ اب تم ان کے ہاتھ نہیں آؤ گی۔“ وہ مزہ لیتے ہوئے بولا۔

”یہ انتظار، یہ بے یقینی۔ بڑی اذیت ناک ہے۔“ وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور پشت پر ہاتھ باندھ کر کمرے میں ٹپکتے لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھتا اس کے قریب آیا اور اس کی غصہ کی نلکی اٹھ کر اس کا دلکش چہرہ اوپر اٹھا کر بولا۔

”بخت آور تمہیں کس معلوم کرتا کیا ہو؟ تمہیں تو چاندنی، خوشبو اور نور سے تراشا گیا ہے۔ میں تمہیں دلوں کی نگہ بنانا چاہتا ہوں۔ لاکھوں دلوں کی دھڑکن۔ تم برتن مانجھنا یا معمولی

کام کرنے کے لئے نہیں بنی ہو۔“

بخت آور نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

”یہ تم کیسے باتیں کر رہے ہو؟ مجھے تو اب تم پر شک سا ہونے لگا ہے۔“

”مجھ پر شک؟“ وہ معنوی حیرت سے کہنے لگا۔

”خدا کا نام لو بخت آور۔ اسنے تو کوسں میں سے تم نے صرف مجھ پر ہی اعتبار کیا ہے اور اب شکر کر رہی ہو۔ تمہیں کس معلوم کہ میرے دل میں تمہارے لئے کتنی جگہ ہے۔ لیکن تم ہو۔ میرے خلوص کو تسلیم ہی نہیں کرتی ہو۔ خدا کی قسم بڑی ظالم ہو تم۔ بڑی ستم شعار ہو۔ اپنے ہاتھ کے سچے جذلوں پر شک کرتی ہو۔ سچ سچ جیج۔“

”مجھے باتوں سے نہ بھلاؤ۔“ بخت آور نے کھردرے لہجے میں کہا۔ ”اگر واقعی تمہارے دل میں میری کوئی قدر ہے تو مجھے عزت کی زندگی کی طرف جانے دو۔“

”تمہاری یہ جلد بازی تمہاری یہ جلد بازی۔“ وہ دائیں بائیں سر ملاتے ہوئے بولا۔ ”بخت آور خاتم میں تو تمہیں وہ مقام دلانا چاہتا ہوں جو تمہارے شایان شان ہو۔ جو تمہارے قابل ہو۔“

”میں تو سنگسار کئے جانے کے قابل ہوں۔“ وہ ملاحت بھرے لہجے میں بولی۔ ”نہ نہ۔ نہ۔ اس طرح نہ کہو بخت آور۔ ہائے میرا دل دھکتا ہے۔“ وہ اداکاری کرتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”تم تو دل گلی کر رہے ہو۔“ بخت آور نے بے دلی سے اسے ٹوکا۔

”تمہیں پتہ ہے بخت آور۔ میں ایسے مقبوض پر فلوں میں کیسے مکالمے لکھتا ہوں۔“

غیر میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور ڈرامائی انداز میں بولا۔

”جیج صاحب! مجھے نہیں۔ اس معاشرے کو سنگسار کیجئے۔ جس نے گناہوں کا یہ طوطا بنے۔ گلے میں ڈال دیا ہے۔ مجھ سے پہلے ان گناہوں کو سزا دیجئے جنہوں نے مجھے تماشے کی بنی اور نظارے کا بہانہ بنا دیا ہے جیج صاحب!“

”چپ ہو جاؤ۔ خدا کیلئے خاموش ہو جاؤ۔“ بخت آور نے جھنجھلا کر کہا۔ ”تمہیں کسی نے جذبات کا خیال ہی نہیں ہے۔ تمہیں ہر بات میں بگاڑے سوچتے ہیں۔“

”جیج۔ جیج۔ جیج!“ وہ مزاحیہ انداز میں بولا۔

”ہائے میرے مکالموں کی ایسی نادرہی۔ بخت آور! تم کیا جانو کہ میرے مکالموں پر

انکار کرے۔ تمہاری ایک فلم ہٹ ہو گئی تو پھر تم دیکھنا سارے ملک میں تمہارے ہی نام کی دھوم ہو گئی۔“

”تم سمجھتے کیوں نہیں ہو۔ مجھے یہ سب نہیں چاہئے۔“ بخت آور نے ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں ہیروئن نہیں بننا چاہتی۔ میں گنام رہنا چاہتی ہو۔ میرا بھائی مجھے ڈھونڈتا پھرتا ہے۔ وہ مجھے پرے سے پرانا چٹا دیکھ کر مر نہیں جائے گا۔ نہیں میں ایسا نہیں کر سکتی۔ میں ایسا نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں۔“

”تم بھی بہت بھولی ہو بخت آور!“ وہ چٹا۔ ”تم کیا سمجھتی ہو کہ تم اب تک گاؤں کی دی سی دی سی سادھی لڑکی بھاگ بھری ہو۔ میری جان تم بہت بدل گئی ہو۔ کبھی آئینہ تو دیکھو۔ تم خود کو نہیں پہچان سکو گی۔ تمہیں آئینے میں بخت آور ہی نظر آئے گی۔ بھاگ بھری نہیں اور اب تو ہم تمہیں خوش بخت بنا دیں گے۔ فلمساز خوش بخت تمہارے تو وہ ٹھانڈے ہوں گے کہ تمہارا بھائی تو کیا تمہیں خوش تمہارے ہی لے کر کھٹے والے بھی نہیں پہچانے گے۔“

”کوئی مجھے پہچانے یا نہ پہچانے۔ میں تو خود کو پہچانتی ہوں نا۔“ بخت آور نے قطعی لہجے میں کہا۔

”میں اپنے ہاتھوں اپنے خاندان کی عزت کو مات نہیں بناؤں گی۔ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے ہیروں میں ٹھنکروں نہیں بناؤں گی۔ میں اس دوزخ سے اس لئے تو نہیں نکلی تھی کہ ایک نئے جہنم کے عذاب میں گرفتار ہو جاؤں۔“

وہ نرمی سے اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا لیکن وہ کسی طرح رضامند نہیں ہوئی۔ وہ اس کی ہر بات کے جواب میں انکار ہی کرتی رہی۔ وہ کچھ جبر سار ہو کر کمرے میں پھنسلے گا۔ ہاتھوں کی گھٹیاں۔ پچھتیاں۔ پچھتیاں سے بال جھٹکتا۔ ہونٹ چپاتا ہوا۔ وہ نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ پھر اس کی طرف پلٹا اور خیرانوں سے لہجے میں بولا۔

”بخت آور! تمہیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہئے کہ تمہیں بڑے آرام سے پھر وہیں پہنچایا جا سکتا ہے۔ جہاں سے تمہیں جان بچو کہ میں ڈال کر نکالا گیا ہے اور وہاں تمہارا جو حشر ہو گا وہ تم مجھ سے بہتر جانی ہو۔ اس کے چہرے پر بڑی بے رحم تھی قہقہے اور وہ انجینی سی نکالوں سے اس کی طرف گھور رہا تھا۔“

بخت آور سنانے میں رہ گئی۔ اس کی گھورتی ہوئی بے رحم نظریں اسے اپنے وجود میں تیر کی طرح پیوست ہوئی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔

سینما ہال میں تالی بجتی ہے۔ عورتوں کے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ہر سال بہترین مکالمہ نگار کا ایوارڈ تمہارے اس نیاز مند کو ہی ملتا ہے۔“

بخت آور بے چینی سے اٹھ گئی۔

”مجھے کسی سے کوئی مطلب نہیں۔ تم مجھے نالے کی کوشش نہ کرو۔ آج مجھے صاف صاف بتا دو کہ آخر تم کیا سوچ رہے ہو۔ مجھے لگتا ہے تمہارے ذہن میں کوئی خاص بات ہے۔“ وہ بھی اٹھ کر قریب آ گیا۔ اس نے شانوں سے تمام کراے اپنی جانب گھمایا۔ چند لمبے اس کے تھمتائے ہوئے دلکش چہرے کی طرف دیکھا رہا۔ پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بخت آور۔ تم بہت حسین ہو۔ ناچ گانے کے فن سے واقف ہو۔ دل پر چوٹ کھائے ہوئے ہو۔ تم.....“ اس نے چند لمبے توقف کیا اور اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔

”تم بہت اچھی فنکارہ بن سکتی ہو۔“

”کیا؟“ بخت آور نے الجھ کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”میں چاہتا ہوں کہ تم فلموں میں کام کرو۔ میں تمہیں فلموں کی ہیروئن بنانا چاہتا ہوں۔ خدا کی قسم تم سب کا نمبر کاٹ دو گی۔ ہر طرف تمہارے چہرے ہوں گے۔“

”تم میرے پاؤں میں پھر ٹھنکروں بنا دینا چاہتے ہو؟“ بخت آور نے اس کی بات سمجھی سے کاٹ دی۔

”اوہو۔ نہیں۔ بھئی۔ تم میری بات نہیں سمجھیں۔“ وہ جلتے میں بولا

”میں سب سمجھتی ہوں۔ اپنی نادان نہیں۔“ بخت آور نے اسے مزید کچھ کہنے کا موقع

نہیں دیا۔

”لیکن تم بھی یہ سمجھ لو کہ جو کچھ تم چاہتے ہو وہ کبھی نہیں ہو گا۔“

”ایک تو تم جذباتی بہت ہو یا! بغیر سوچے سمجھے بولنا شروع کر دیتی ہو۔“ وہ مفاہمت کے انداز میں نرمی سے بولا۔

”دیکھو نا میں! آج کل تو اچھے اچھے گھرانوں کی لڑکیاں معمولی چانس کے لئے ترسیں بھرتی ہیں۔ ہاتھ پیر جوڑتی ہیں۔ سٹوڈیو کے چکر لگاتی ہیں اور کیا کچھ نہیں کرتیں۔ مگر کوئی گھاس نہیں ڈالتا۔ تم تو خوش قسمت ہو کہ تمہیں ہیروئن بننے کا چانس مل رہا ہے۔ میری کہانی چکیوں میں کھنٹی ہے۔ فلمساز میرے دروازے پر کھڑے رہتے ہیں۔ ہیروئیں میری منت خواہد کرتی ہیں۔ میں جس کے لئے کہ دوں فلمسازوں کی مجال نہیں کہ اسے ہیروئن لینے سے

اسے یوں لگا جیسے وہ ایک جال سے نکل کر دوسرے جال میں پھنس گئی ہے۔ اس نے بے چارگی سے سر جھکایا اور نوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم مجھ پر رحم نہیں کر سکتے۔ مجھے مجبور سمجھ کر۔“

”دیکھو۔ میں نے اپنی جان اور عزت واؤ پر لگا کر تمہیں وہاں سے نکالا ہے۔ اب بھی ان کی طرف سے خطرہ ہے۔ اتنے دنوں سے تمہیں اس فائدہ سار ہوئی میں رکھا ہوا ہے۔ کیوں؟ کس لئے۔ میں کوئی امتیاز پسند نہیں ہوں۔ میں نے کچھ سوچ کر ہی یہ رسک لیا ہے۔ سمجھیں تم؟“

اس کا قطعی انداز بے حد درست تھا۔

بخت آدرس سی ہو گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ وہ مغموں سے لہجے میں بولی۔

”غلطی میری ہی ہے میں نے تم پر اعتبار کر لیا۔ میں نے تم سے غلط توقعات وابستہ کر لی تھیں لیکن اس غلطی کی مجھے اتنی بڑی سزا تو نہ دو۔“

”خوابو! معلوم بننے کی کوشش نہ کرو بھی۔“ وہ بے نیازی سے کہنے لگا۔

”ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔ میری بات پر شیجیگی سے سوچو۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔“

”میں اپنا برا بھلا خوب سمجھتی ہوں۔“ بخت آدر نے سر اٹھا کر تیزی سے کہا۔

”اور سنو۔ تم جیسے میری مرضی کے خلاف کوئی کام کرنے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ سمجھو تم۔“

اس کے انداز میں سرکشی اور بغاوت کا تاؤ تھا۔

”بخت آدر!“ اس نے اپنا لہجہ یکسر بدل دیا اور اسی مانوس طامعت سے کہنے لگا۔

”یوں ایک دم فیصلے نہیں کر لیا کرتے۔ ہر بات پر خوب سوچ سمجھ لینا چاہئے۔“

”میں نے سوچ لیا ہے۔“ بخت آدر نے قطعی لہجے میں کہا۔

”مجھے اب کچھ اور نہیں سوچنا۔ یہ فیصلہ ایک بل کا نہیں۔ میں نے ساری زندگی اس فیصلے کیلئے اذیت سہتے ہوئے کاٹی ہے۔ میں اسے نہیں بدل سکتی۔“

”عجب ہو بھی تم بھی۔“ اس کا انداز دوستانہ اور ملائم ہو گیا۔

”میری بات غور سے سنو بخت آدر! اس قدر جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم

تجربے کار یا کم عمر نہیں ہو۔ زندگی کی حقیقتوں کو اپنے سامنے رکھو۔ اپنے حالات، اپنی حیثیت، اپنے ماضی کو فراموش نہ کرو۔ میں تمہارا دل نہیں دکھانا چاہتا لیکن حقیقت تو بہر حال حقیقت ہے۔“ وہ ڈرامائی انداز میں لمبے بھر کو خاموش ہوا پھر میری نگاہوں سے اس کی جانب نکتے ہوئے ایک ایک لفظ پر زور دیتا ہوا بولا۔

”تم ایک عام عورت نہیں ہو۔ تم نے ایک عرصہ اس بازار میں گزارا ہے۔“

بخت آدر اذیت سے بے حال ہو گئی۔ ماضی کے پھینکنے کچھڑ کی طرح اس پر آن کرے۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے سارے وجود سے اس بازار کا نقش اٹھ رہا ہے۔ وہاں گزرے ہوئے سارے لمحے اس کے ماتھے پر لکھے ہیں۔ وہ بے قراری ہو کر ابھی اور تیزی سے کھڑکی کی طرف بڑھی۔

”مجھے ایسی زندگی کی ضرورت نہیں۔ میں ایک لوح بھی زندہ نہیں رہنا چاہتی۔“

وہ لپک کر اٹھا اور اسے راستے میں ہی جا لیا۔

”بخت آدر! عقل سے کام لو۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ پاگل نہ بنو۔“

”چھوڑ دو مجھے چھوڑ دو۔“ بخت آدر نے اس کی گرفت میں تڑپے ہوئے دلیلاگی سے کہا۔

”میرا راستہ نہ روکو۔ مجھے مرنے دو۔ مجھے مر جانے دو۔“ اس نے اس کی قمیص محسوس ڈالی۔ اس کی گردن اور بازوؤں کو ناخوں سے زخمی کر دیا۔

اس نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر اسے زوردار ہلکا دیا۔

”یہ کیا حماقت ہے بخت آدر! تم اپنے ساتھ مجھے بھی پھنساؤ گئی۔ تمہاری خودکشی کے بعد میں کس کس کو مصائبائیاں پیش کرتا پھر دوں گا۔ عجیب بیوقوف عورت ہو تم۔ میں تو تمہیں لا کر چھڑاتا۔“

بخت آدر اس کی بے رحم گرفت میں بے بس ہو گئی۔ اس نے دھشت سے سردائیں لائیں جھکا۔

”خدا۔ میں کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟“

وہ اسے ہاتھوں میں لئے ہوئے کھڑکی سے دور ہٹ آیا اور اس کے بالوں پر شیشہ انداز میں ہلکی دے کر بولا۔

”بخت آور اپنے ذہن کو صاف رکھو۔ دیکھو اپنے دماغ پر بوجھ نہ ڈالو۔ ابھی کچھ اور مت سوچو۔ اپنے اعصاب کو پرسکون رکھو۔ شاباش۔ ابھی تو سوچنے کیلئے بہت وقت بڑا ہے۔“

○.....○.....○

”شہزادی! سناؤ کیا حال چال ہے؟“ شہزادی نے شرارت سے ناچتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

”یہ لو سگریٹ پیو۔ تم ہی کیا یاد کرو گے؟“ اس نے ٹوپی میں سے سگریٹ نکال کر اسے اپنے ہونٹوں میں دبے ہوئے سگریٹ کے ساتھ سلگاتے ہوئے کہا۔

سجاد نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ اس کی کھٹکی ہوئی چٹیل ہنسی نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ وہ محموں کر پھر اس کے سامنے آگئی اور سگریٹ اس کی طرف بڑھایا۔ سجاد زچ ہو گیا۔ اس نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے چھین کر فرش پر پھینکا اور اس پر اپنا بھاری جوتا دکھ دیا۔

”دفع ہو کہنی۔“ وہ گالی دے کر بڑ بڑایا۔

وہ اس کے چڑ جانے پر محفوظ ہوئی۔

”اوئے ہوئے۔ یار! یہ کیا ظلم کر دیا۔ یہ تو بڑی اونچی نسل کا سگریٹ تھا۔ بس یہ دو ہی تو ملاں کے پٹکے کے نیچے سے بڑی مشکل سے پار کئے تھے۔“

”جا جہنم میں۔“ سجاد ہنسنے سے غرایا۔

”جہنم کا راستہ تو بتاؤ۔“ وہ فرارے کی طرح ابلتی ہوئی مترنم ہنسی کے ساتھ بولی۔

سجاد کو اس کی بے گئی باتیں زہر لگی تھیں۔ وہ بے حد شریر، چو چٹال، نٹ کھٹ اور بے باک تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے کا ایک ایک نقش بائیں کرتا تھا۔ اسے نہ کسی کی پروا تھی نہ لحاظ۔ جیسے ہوئے بدعاشوں کے ساتھ وہ اس بے تکلفی سے بات کرتی تھی جیسے اس کی ہم عمر سہیلیاں ہوں۔ اس نے لڑکوں کا طیلہ اور عادات اپنائی تھیں۔ پہلی نگاہ میں وہ لڑکا سی معلوم ہوتی تھی۔ خود اس نے بھی جیسے فراموش کر دیا تھا کہ وہ لڑکی ہے۔ جب وہ ڈیرے پر ہوتی تو یہاں سے وہاں شرارتیں کرتی۔ چٹپٹی پھرتی تھی۔ ملاں نے سمجھ لیا تھا کہ وہ اس کے ڈیرے کی چڑا تھی۔

سجاد کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس نے ہی اسے اس جال میں لا پھنسا تھا۔ وہ

اس وقت کو کچھ سنا تھا جب وہ اس کے ساتھ ملاں کے ڈیرے پر چلا آیا تھا۔ اور یہاں سے

نکلے کے سارے راستے اس کے لئے مسدود ہو گئے تھے۔ ملاں اور اس کے کارندے ہر وقت اس پر نگاہ رکھتے تھے۔ وہ ان کے ہاتھوں کھلوتا بننے پر مجبور تھا۔ وہ ابھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ ابھی چائنی کا پھندہ لگنے میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اسے تو ابھی جاک بھری کا کھوج لگا تھا۔ اپنے خاندان کی عزت کو بازار سے لگانا تھا۔ وہ اسے ڈھونڈے بغیر مرنا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ اپنے کمرے میں تھا ہوتا تو باوجود کھن کے اس کی آنکھیں بند سے خالی رہتیں اور حالات کی کھٹیاں زہر بن کر اس کے رگ و پے میں آگ لگانے لگتیں۔ اسے اپنا بھرپور انگریز آتا جو مل بھریں ویران ہو گیا تھا۔ اسے ماں کا مہربان چہرہ اور گرم گود یاد آتی۔ اسے بابا کا خیال آتا جو نامعلوم زندہ بھی تھا یا اپنے غموں کو سینے سے لگائے گئیں جاسویا تھا۔ بھراے رانی کا خیال آتا۔ اس کا دلکش چہرہ۔ اس کی محبت بھری نگاہوں کی یاد اس کے دل میں الجھل مچا دیتی۔ وہ پریشانی سے اٹھ کر اپنے بستر پر بیٹھ جاتا اور سوچتا کہ تقدیر کی گردش اسے کہاں لے آئی تھی۔

وہ اپنے محور سے دور ہوت کر گیا تھا۔ نگل نے اسے جو آس دلائی تھی وہ کب کی ٹوٹ گئی تھی۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے اپنی صورت دکھائے۔ وہ اس سے کیا وعدہ نہیں بھاسا تھا۔ وہ ایک بار پھر تپا پندہ اور قابلِ عزت زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

وہ شہزادی کی موجودگی فراموش کر کے نہ جانے کیا سوچتا رہا۔ افسردہ، مغموم، آکٹا ہوا سا۔ بدل اور پشیمان۔ وہ شوق لگا ہوں سے اس کی خوبصورتی کو دیکھتی رہی۔ جب وہ اپنے آپ میں ہی الجھتا رہا اور اس کی جانب توجہ نہیں ہوا تو اس نے گلے میں بندھا ہوا ریشمی رومال لہرا کے اس کے سر پر ڈال دیا اور مکمل ہنسنے ہوئی بولی۔

”واپس آ جاؤ سرکار! بڑی دور نکل گئے ہو۔“

سجاد چونک گیا۔ اس نے جھپٹ کر رومال پھینکا اور چڑچڑے پن سے بولا۔

”دفع ہو۔ چل پرے ہو۔“

شہزادی نے شرارت سے ایک آنکھ پچی اور اس کے برابر بیٹھتی ہوئی بولی۔

”سوہج۔ کبھی تو ہنس لیا کرو۔“

سجاد بیزار ہو کر اٹھ گیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے غصے

سے غرایا۔

”دفع ہو جا۔ جا کہیں اور جا کر مر۔“

سائیں سائیں کرتی سیاہ رات میں وہ گھٹی جھاڑیوں میں سے رائیلیں تانے ہوئے نکلے اور انہوں نے مسافروں کو سنانا راستے میں روک لیا۔ مسافروں کی دہشت سے آنکھیں پھٹ گئیں۔ غورگوں کی چیخیں نکل گئیں۔ بچے خوف سے رونے لگے۔ رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ان کے سیاہ لباس اور رائیوں کی چمکتی ہوئی تالیاں نغماں میں دہشت گھول رہی تھیں۔ لوگ ششدر سے اپنی جگہ پر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

سجاد نے دنگ لہجے میں کہا کہ سب لوگ خاموشی سے نقدی اور دوسری قیمتی اشیاء ان کے حوالے کر دیں تو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ مسافروں نے خوفزدہ نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بندوق کی تہی ہوئی تالیوں کا مقابلہ کرتا۔

سجاد نے سب ساتھی چوکے تھے۔ بس کے اندر اور باہر چاروں طرف پھیلے ہوئے ایک ایک لمحے کا حساب رکھ رہے تھے۔ ان کی نگاہیں ہر طرف تیزی سے دوڑتی پھرتی تھیں۔ وہ مسافروں کی ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ مسافروں کے پاس خاموشی سے اپنا مال و متاع ان کے حوالے کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ چہروں پر دہشت اور پریشانی لے وہ اپنی اپنی جیبوں کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے۔

اجانک بھیجی ہوئی کمر والا ایک ضعیف شخص اپنی سیٹ پر سے اٹھا۔ سجاد اور اس کے تابعیوں نے رائیلیں تان لیں۔

”خبردار بابا!“ اس کے ساتھیوں میں سے ایک نے چمکا کر کہا۔

لیکن بوڑھا کارکن نہیں نہ ہی خوفزدہ ہوا۔ وہ چندی آنکھوں سے چمکتی ہوئی تالیوں سے اٹھیں ملاتا۔ اکٹڑے اکٹڑے قدم رکھتا سجاد کے قریب آکھڑا ہوا۔ بس کے مسافر سانس دھکے لگاتے تھے۔ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں اسے بڑی شفقت سے

دو لڑکھائی۔ بے تحاشہ ہنسی دروازے تک پہنچ گئی اور چنگیل پنے سے نہ معلوم کیا کہنے لگی۔

بابو دروازے کے قریب سے گزر رہا تھا۔ شہزادی کی آواز سن کر وہ اندر آ گیا۔ وہ ڈبرے کا سب سے فیشن ایبل لڑکا تھا۔ کچھ بڑھا کٹھا بھی تھا۔ اپنے لباس اور ٹکا ہری ٹپ ٹاپ کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اسی لئے سب اسے بابو کہتے تھے۔

اس نے بھی نظروں سے دونوں کی طرف دیکھا اور سجاد سے بولا۔

”کیوں اوئے۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

سجاد نے اسے نظر انداز کر دیا اور اپنا تولیہ اٹھا کر نہانے چل دیا۔ بابو تھلا کر آگے بڑھا اور اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال ہوا بولا۔

”اوئے۔ مجھ سے بات کر کے جا۔ تو یہاں کیا کر رہا تھا اس کے ساتھ۔“

سجاد نے ایک ہی جھٹکے میں اس سے اپنا کر گریبان پھرا کر اسے پرے دھکا دیا۔

”جا۔ اپنی اس کچھ لگتی سے پوچھ۔“

شہزادی کے سامنے اپنی اس بکلی پر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ بے تحاشہ گالیاں بکتا وہ اس کی طرف چمپٹا۔ سجاد بھی ہمتا کر پلٹ آیا اور اس نے تادیب توڑی گھونٹے اس کے جیزے پر بڑھ دیئے۔

”اب گالی بکی تو زبان گدی سے سمجھ لوں گا۔“

شہزادی بے ساختہ ہنس پڑی۔ بابو پکڑا گیا تھا۔ سجاد نے بابو کا گریبان پکڑ کر اسے شہزادی کی طرف دھکا دیا اور غصے سے فرمایا۔

”لے۔ بتا اپنے ماں سے کہ تو یہاں کیا کر رہی تھی۔“

شہزادی کی ہنسی رکے میں نہیں آئی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے بولی۔

”کیوں ماما جی! پوچھو کیا پوچھتا ہے۔“

بابو نے دانت کچپا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔ شہزادی کو ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا تھا۔ غوارے کی طرح اس کی سترہ ہنسی ابلتی چلی جا رہی تھی

سجاد نے ایک قہر آلود نگاہ اس پر ڈالی اور تولیہ شانے پر ڈالتی ہوئی باہر نکل گیا۔

مقابلہ کیا۔

”پتر۔ اگر تو کسی مسلمان کا بچہ ہے تو تیرے باپ نے تجھے اتنا نہیں بتایا کہ کسی کو لوٹ کر پیٹ بھرتا دروازے کے انگاروں سے اپنا پیٹ بھرتا ہے۔“

سجاد کو کتنی ہی کیفیت میں اس کی جانب تکتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ، اس کی آواز، اس کا لہجہ اس کا انداز چار جانب سے اس پر یلغار کرنے لگے۔ یہ شافعی یہ پچان طوق کی طرح اس کے گلے آ پڑی۔ وہ کانپ اٹھا۔ اس کے سارے وجود کو جہنم کے شعلے چاٹنے لگے۔ ذرا ذرا اس پر حقوے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ اپنے چہرے سے سیاہ نقاب نوج کر پھینک دے اور بابا کے قدموں میں جھک کر کہے۔

”بابا! تو مجھے کچھ منہ ہار کے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ اب بتا میں تیرا سکھایا ہوا سبق کس طرح یاد رکھوں۔“

وہ سر سے پاؤں تک بیٹے میں ڈوب گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا جیسے وہ ابھی دھڑلے مار مار کر رونے لگے گا۔ اس کے لئے ان بڑی نگاہوں کا سامنا کرنا قیامت ہو گیا تھا۔ جن میں کوئی پہچان نہیں تھی لیکن وہ اس کا نام لے لے کر پکار رہی تھیں۔ اس کے لئے وہاں ایک لمحہ رکتا بھی بار ہو گیا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو اشارہ کیا کہ وہ کسی کو لوٹے بغیر چپ چاپ بس سے اتر جائیں۔ وہ اس کے حکم کے پابند تھے۔ لیکن ہاتھ آیا ہوا بال چھوڑتے ہوئے وہ نگاہوں سے نگاہوں میں گم رہے۔ بس وچس کر رہے تھے۔ وہ بار بار گھومتی ہوئی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ شاید وہ اپنا فیصلہ بدل دے گا۔

لیکن سجاد کی تو جیسے جان پہنچی تھی۔ یہ لہجہ اس کے لئے زندگی اور موت کا لمحہ تھا۔ اس نے بددوق کی نالی اپنے ہی ساتھیوں کی طرف سیدھی کر دی تو وہ غصے سے سر جھٹکتے، ماتھے پر تیریاں ڈالنے بغاوت سے سنے ہوئے ایک ایک کر کے بس سے نیچے اتر گئے۔

مسافر دم بخود ہو گئے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ ان کا سب کچھ لٹنے لٹنے لگا ہے۔ وہ پتھر سے ہو کر اپنی جگہ پر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔ ان کی آنکھوں میں حیرت، خوشی، سوال تھے لیکن موقع کی نزاکت نے زبانوں پر مہر ثبت کر دی تھی۔ وہ احساس تشکر سے متھکتا ہوئے چروں کے ساتھ بابا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بابا نے سجاد کے بازو پر محبت سے ہتھی دی۔

”شبابش۔ شبابش۔ جوانا۔ تو کسی شریف کی اولاد ہے۔ تو نے مجھ بڑھے کی بات مانی ہے۔ اللہ پاک تجھے اس کا اجر دے۔ دیکھا بھی کچھ نہیں بکرا۔ تیرے ہاتھ سے کچھ نہیں کیا۔ جہنم کی آگ سے پیٹ نہ بھر۔ اپنے رب سے معافی مانگ لے۔ تو بے توجہ چروں کو بھی قلعہ بنا دیا ہے۔“

سجاد کے دل کی دنیا زیر و زبر ہونے لگی۔ احساس جرم نے اس پر جان کنی کی سی کیفیت طاری کر دی۔ وہ ایک نئے کی طرح تیز ہوا کی زد میں تھا۔

وہ تو بابا کی زندگی سے مایوس ہو چکا تھا۔ وہ ملا بھی تھا تو کہاں؟ زندگی کے کس موڑ پر۔ یہاں وہ اسے کسی رشتے سے پکار بھی نہیں سکتا تھا۔ نہ اس سے کچھ پوچھ سکتا تھا۔ نہ اسے اپنا مال سنا سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔ اس کے گلے میں پھنسا سا لگ رہا تھا۔ وہ بند لٹے وہیں متذبذب سا کھڑا بابا کی طرف بڑی حسرت سے دیکھتا رہا پھر جھک کر اس کے پاؤں چھوئے اور اٹلے قدموں بس سے باہر نکل گیا۔

ذیرے کی طرف لوٹنے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے بابا کی آواز بھی لپکتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے چاروں جانب پھیل رہی تھی۔ اس کے دگ دیے میں اتر رہی تھی۔ بابا کو دیکھ کر اس نے لہو کا رنگ چمک اٹھا تھا۔ بھی وہ عداوت کے بیٹے میں تھا جاتا بھی حالات کی تکلفی اسے چل کر دیتی۔ انتقام کی خار دار دایوں میں سے گزرتے ہوئے وہ جن بدنامیوں کو اپنی جھولی میں ڈال آیا تھا وہ اسے بچو کے دیے لگتیں۔

بابا اسی بس میں بیٹھا اس کی دنیا سے اس کی بچنے سے اس کی دسترس سے بہت دور نہ ہانے کسی طرف نکل گیا تھا اور وہ فراق و جدائی کے چیلن صحرا میں پھٹنے کو تیار رہ گیا تھا۔ بابا نے ہانکوں کو اسے اپنا دیکھا بھی چھو دکھایا تھا لیکن اس کی آواز اس کے ساتھ ساتھ تھی۔ ہڈیوں کو پھٹکا دینے والی، روح کو پھینچو دینے والی، اعصاب شکن آواز۔

وہ کہاں جائے؟ کیا کرے؟ اپنے دکھ کس سے کہے؟ کس کو دل کا حال سنائے؟ کوئی نہ تھا۔ وہ جو اس کے زخموں کو دیکھے۔ ان کی دھن کو محسوس کرے۔ ان پر مہم رکھ دے۔ مگر گرد و اٹل میں کوئی نہیں تھا۔ وہ تنہا اکیلا۔ انجی چروں میں گھر گیا تھا۔ نفرت کی چنگاریوں نے اٹھا دیا تھا۔ ذیرے کے لوگ مرنے مارنے پر تیار تھے۔ وہ اس کی جان کے دشمن ہو رہے تھے۔ ان نے ہاتھ آیا ہوا بال چھوڑ دیا تھا۔ مساندہ بازو دوسرے لوگوں کو اور مڑکارے تھے۔ ان مالاں پھوڑی نے سب کچھ نہ کر بھی کسی روئے کا اکہار نہیں کیا تھا۔ وہ بس پر اسرار خاموشی

کی چادر اوڑھے بیٹھا رہا۔

سجاد اپنے کمرے سے نہیں نکلا تھا۔ وہ کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی تھی کہ اگر ملاں پھوڑی نے اس کے ساتھ کوئی تعرض کیا تو وہ کسی کی پروا نہیں کرے گا۔ نفع و نقصان کچھ نہیں سوچے تھے۔ اس نے خود کو ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار کر لیا تھا۔

وہ ایک جان لیوا مکمل میں مبتلا تھا۔ ماضی کے رشتوں نے حال کی تکلیفوں کو ناقابل برداشت بنا دیا تھا۔ مستقبل تاحد نگاہ زہریلے عموں کی طرح چھلکا ہوا تھا۔ اس کے اندر ایک شدید طوفان چاٹتا تھا۔ اس کے وجود کی دیواریں لرز رہی تھیں۔ وہ بری طرح سے ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔

وہ بڑا جی دار تھا۔ وہ حوصلہ ہارنے والوں میں سے نہیں تھا۔ لیکن آج اس کا دل بھرا ہوا تھا۔ آج وہ جی بھر کے آنسو بہانا چاہتا تھا۔ وہ اپنے حوصلوں کے ہار جانے کا اعتراف کرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی ایسے کو تلاش کرنا چاہتا تھا جس کے سامنے وہ اپنا دکھ بھرا دل کھول سکے۔ جسے اپنے زخم دکھا سکے۔ جس کے سامنے رو سکے۔



بکلی کی سی سرعت سے معا ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور وہ اپنے کمرے سے نکلا۔ تیرہ قدموں سے وہ نیم تاریک راہداری سے گزرا تو اسے ایک مانوس سی آواز سنائی دی۔ وہ ٹھک گیا۔ اس نے غور سے سنا اب اس آواز کے ساتھ لپٹی ہوئی سسکیاں بھی اس تک پہنچیں۔ وہ کانپ گیا۔ اس نے کھلی ہوئی کمری میں سے ایک نظر کمرے پر ڈالی۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ اس کا خون کھول اٹھا اور وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا۔ شدید اشتعال میں اس نے بغیر سوچے سمجھے دیوانوں کی طرح اپنے شانے کے زور سے بند دروازے کھولا اور چونک پر آن کھڑا ہوا۔

”گل! تو کیا کر رہی ہے یہاں؟“ وہ غصے سے سرخ چہرہ لئے دھاڑا۔

کمرے میں موجود بابو نے چونک کر دیکھا۔ گل دوڑتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی اور ہانپتی ہوئی اس کے شانے سے لگ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔

سجاد نے حیرت اور طیش سے اس کے زرد رخساروں پر بہتے ہوئے آنسوؤں کی اڑی ہوئی رگت کو دیکھا۔ پھر ایک نگاہ بابو پر ڈالی جس کے ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ تھی۔

کچھ اندازہ نہیں کر سکا کہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے غصے کے ساتھ گل کو پیچھے ہٹایا اور دانت چیں کر بولا۔

”گل! تو کیا کر رہی ہے یہاں؟“

وہ اسی طرح اڑی ہوئی رگت کے ساتھ کم کم کمری میں۔ بابو نے بڑے رعب سے کہا۔

”اوسے جا جا۔ اپنا راستہ لے۔ یہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے۔ تو خواہ مخواہ ماما نہ بن اس کا۔“

سجاد کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ اس نے گھور کر بابو کی طرف دیکھا اور گل کو جھجھوڑ دیا۔

”کتنی کیوں نہیں کہتی! کہ تیرا اس کے ساتھ کیا معاملہ ہے؟ بتا کیوں آئی ہے تو یہاں؟ کیوں آئی ہے؟“

گل کا پھول سا چہرہ کھلا گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بات نہیں نکلتی تھی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور چاقو پکڑے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

سجاد کے لئے گونگو کی یہ کیفیت ناقابل برداشت تھی۔ وہ بابو کی طرف جھپٹا جو ہونٹوں پر مسکراہٹ لئے مڑے گا۔ وہ اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”کون لایا ہے اس لڑکی کو یہاں؟ کون لایا ہے؟ بتا۔“ سجاد نے اس کے گریبان میں ہاتھ ڈالا۔

”اپنے بیدوں سے چل کر آئی ہے یہ نیک پروین۔ اپنی مرضی سے۔“ بابو نے گریبان ہچکاتے ہوئے متحضر سے لفظ چبانے۔

”اس کے ساتھ تو تیری بھی پرانی یاری لگتی ہے۔ مگر یہ تلی کسی کے ہاتھ آنے والی نہیں۔“ اس نے باجی پین سے آنکھ دہائی۔

سجاد سن سا ہو گیا۔ وہ جیسی بھی تھی۔ جو بھی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کوئی ایسی بات سننا نہیں چاہتا تھا۔ ہر اچھائی پر اسے اس کا ایمان گھٹا گیا تھا۔ وہ نیکی کے چہرے کو مسخ

ہوا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے بابو کا گریبان چھوڑ دیا اور ہونٹ چباتا جگر پیتا پانی پی

۔ پلٹ گیا۔ لیکن گل اس کے راستے میں آگئی اور اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا چاقو اسے دکھا کر

راستے بھر سجاد نے کوئی بات نہیں کی۔ ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا اور گلی سے کچھ فاصلے پر اس طرح چلتا رہا جیسے اس کی موجودگی سے بے خبر ہو۔ اس کے گھر سے کچھ دور وہ رک گیا اور خشک سے لہجے میں بولا۔

”اب اس کی طرف سے غم نہ کرنا میں اس کا خیال رکھوں گا۔ اور ہاں سن۔ آئندہ کبھی اس جگہ نہ آئیں گی۔“ اپنی بات ختم کر کے اس نے پلٹ جانا چاہا۔

”تم گھر نہیں چلو گے سجاد!۔“ گل نے ہولے سے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ روکھائی سے کہنے لگا۔

”مافی سے قول لو۔ وہ تمہیں یاد کرتی رہتی ہے۔“ گل نے اصرار کیا۔

”پھر کبھی سہی۔“ وہ سر جھٹک کر بے اعتنائی سے بولا۔

”اب ایسی بھی کیا بات ہے؟ تم تھوڑی دیر کیلئے گھر نہیں آ سکتے۔ خواہ مخواہ ضد کر رہے ہو۔“ وہ ناراضگی سے کہنے لگی۔

سجاد نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ روشی روشی سی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں سوتی ہوئی تھیں اور چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ بے حد پریشان نظر آتی تھی۔ کچھ سوچ کر وہ ابھر کچھ کہے اس کے گھر کی سمت چل پڑا۔

مافی بڑی محبت سے ملی اور گھر کرنے لگی کہ وہ اتنا عرصہ کیوں نہیں آیا تھا۔ وہ یونہی غمزدگیاں لگاتے لگاتے بھانسنے لگا۔ بھانسنے کا نام تھا۔ اسے حیرت ہو رہی تھی کہ مافی اسے بھولی نہیں تھی۔ وہ انہوں کی طرح گھر کر رہی تھی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی خون کا رشتہ نہیں تھا۔ وہ چار پانی پر اس کے بار بار بیٹھی ہوئی اس کی پشت پر محبت سے ہاتھ پھیر کر اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ اتنے دن کیا کرتا رہا۔ اسے کوئی ڈھنگ کا کام ملا ہے یا نہیں۔

اپنی پشت پر رکھے ہوئے مافی کے شفقت بھرے ہاتھ کے لمس کو محسوس کرتے ہوئے وہ ناقابل فہم احساس جرم کا فکار ہو رہا تھا۔ اس کا بی جاتا تھا کہ مافی کا ہاتھ اپنی پشت پر سے ہٹا۔ اسے اور اسے صاف کہہ دے کہ وہ ان محبتوں اور شفقتوں کا حقدار نہیں۔ وہ تو اس قابل بھی نہیں کہ محبت کا کوئی رشتہ خود سے منسوب کر سکے۔ کسی شریف گھر کی چھت تلے کچھ لمحے گزار لے۔

مافی اس کے لئے چائے بنانے اٹھ گئی۔ وہ وہیں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اٹھا کر گرد و پیش دیکھا۔ سامنے کھڑکی کے قریب گل گل باگل خاموش بیٹھی تھی۔ کھڑکی سے

”سجاد! اگر تم مجھے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دے تو میں یہ چاہتا ہوں کہ میں نے اس کی بات سن لی۔“ اس کے پیٹ میں گھونپ دوں گی۔ میں خود سر جاؤں گی یا اس کو مار دوں گی۔ یہ جھوٹ بکس ہے۔ خدا کیلئے اس پر اعتبار نہ کرو۔ مجھے اس سے نجات دلاؤ۔ اس نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔“ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بابو نے تہہ بہ لگایا۔

”واہ بھی۔ تو تو بڑی ابھی ایکٹنگ کر رہی ہے۔ کیسا معلوم بن رہی ہے۔ اپنے اس

یار کے سامنے۔“

سجاد کے لئے یہ صورتحال ناقابل برداشت ہو گئی تھی۔ کبھی وہ روتی ہوئی گل کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی تسخیر سے ہنسنے ہوئے بابو کی طرف۔ گل نے زور سے اس کی آستین کھینچی۔

”سجاد! جنہیں اعتبار کیوں نہیں آتا۔ میری بات سنو۔ مجھ پر یقین کرو۔ اس بد معاش نے میرا بیٹا حرام کر دیا ہے۔ یہ ہمارے محلے کا ہے۔ یہ نہیں کیوں میرے پیچھے پڑا ہے۔ میرا چچا کرتا ہے۔ رتنے بھینکتا ہے۔ مجھے دھمکیاں دیتا ہے۔ اس نے مجھے خود بلایا ہے۔ کہتا ہے اگر میں آپ نہ آئی تو یہ مجھے خنڈوں سے اٹھوا لے گا۔ خدا کی قسم سجاد میں آج اس سے فیصلہ کرنے آئی ہوں۔ آج یہ رہے گا یا نہیں۔“

سجاد بابو کے کرتوتوں سے بے خبر نہیں تھا۔ گل کی روتی ہوئی آنکھوں کی فریاد اس کے دل پر جا چکی۔ وہ دانت کچکچا کر بابو پر جھپٹا اور اس کی گردن دونوں ہاتھوں سے دبوچ لی۔ بابو سنبھل نہیں سکا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس کی آنکھیں اٹھنے لگیں۔ وہ خود کو آزاد کرانے کے لئے ہاتھ مارنے مارنے لگا۔

گل کی دہشت سے چیخ نکلی تھی۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور شدید گھبراہٹ میں اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھکی کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”گل! تو ہٹ جا۔“ سجاد نے چلا کر کہا۔

”نہیں۔ نہیں۔ اسے چھوڑ دو۔ یہ مر کر تمہارے متھے لگے گا۔ اسے چھوڑ دو۔ بات

پولیس تک پہنچی تو کیا ہوگا۔“

سجاد نے کچھ سوچ کر بابو کی گردن چھوڑ دی اور اسے دکھانے کے گرغریا۔

”اگر اب اس کی طرف آنکھ اٹھا کر کبھی دیکھا تو تیری ہڈیوں کا بھی یہ نہیں چلے گا۔“

چمن چمن کرا آتی ہوئی سورج کی کرنوں کے جھرمٹ میں اس کا معصوم حسین چہرہ بہت دلکش معلوم ہو رہا تھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

کمرے میں ناگواری خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔ اسے کل پروردہ کر غصہ آ رہا تھا۔ اسے بار بار اس خیال سے دشت میں سو رہی تھی کہ کل اس جگہ کیسے کیوں تھی۔ اگر وہ اتفاقاً وہاں نہ پہنچ جاتا تو نہ جانے کیا ہو جاتا۔

دونوں میں سے کسی نے بھی بات نہیں کی۔ اپنی اپنی سوچ میں الجھے ہوئے دونوں چپ بیٹھے رہے۔ ماسی چائے لے کر آئی تو انہیں اس طرح لائق بیٹھے دیکھ کر کچھ حیران ہوئی اور چائے کی پیالیاں تپائی پر رکھ کر گھر سے مخاطب ہوئی۔

”کل! کیا بات ہے؟ اس طرح چپ چپ کیوں بیٹھی ہو؟“
کل نے چونک کر دیکھا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ماسی کے قریب آ کر بولی۔
”ماسی! تو نے مجھے سے کچھ کہا؟“

”ہاں۔ تجھ سے ہی بات کر رہی ہوں۔ تو سنے بھی۔ کیا ہوا ہے تجھے؟ طبیعت تو تیرے ٹھیک ہے؟ کتنے دنوں سے تو پریشان ہی ہے؟“ ماسی نے فکر مندی سے کہا۔
”نہیں تو ماسی! میں تو بھلی چٹکی ہوں۔“ وہ کانوں کے پیچھے ہاتھوں کی ایک شریک لٹہ

سینے سے ہوتے ہوئی۔
”سجاد! نہ نگہ اٹھا کر اس کے پھول ایسے گفتگو چہرے کی طرف دیکھا جو کھلایا ہوا م لگتا تھا۔ وہ ہزنت کا ایک گوشہ دانتوں میں دبائے ہوئے تھی۔ جس سے اس کے گلابی رخسار پر گڑھا پڑ گیا تھا۔ سجاد کے سارے جذبوں نے جھنجھلا کر سوچا۔

”اس دلربا پائیزہ حسن پر باؤ کی آوارہ نگاہ کیوں پڑی تھی۔“
ماسی نے چائے کا پیالہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ خاموشی سے چائے پینے لگا۔ ماسی اس کے قریب ہی چار پائی پر بیٹھے ہوئے ہوئی۔

”ہمارا نہ کوئی عزیز ہے نہ رشتہ دار۔ بس مسافروں کی طرح پڑے ہیں۔ چرتو ہی سہی پھیرا لگا جایا کر۔“

وہ سعادت مندی سے سر ہلاتا رہا لیکن منہ سے ایک لفظ بولنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ کل بھی بالکل چپ بیٹھی چائے پی رہی تھی۔ ماسی کچھ دیر اپنے طور پر ہی باتیں کرتی رہی پھر باپ کی ہمسائی نے آواز دی تو وہ اسے دیکھنے کیلئے اٹھی۔

سجاد بھی اس کے ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ ماسی نے اسے کھانے کیلئے روکنا چاہا۔ لیکن وہ جانے کو تیار ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ بے طرح الجھ پڑا تھا۔ اس کی کچھ باتیں نہیں آ رہی تھیں کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ کیوں اس قدر الجھا ہوا ہے۔ وہ نہ کسی سے بات کرنا چاہتا تھا۔ نہ کہیں ٹھہرنا چاہتا تھا۔ وہ کسی کی طرف نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ بس بے مقصد چلتا ہوا نہ جانے کس طرف نکل جانا چاہتا تھا۔

ماسی اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر باہر نکل گئی تو گل نے قریب آ کر کہا۔
”سجاد! میری بات سن کر جانا۔“

وہ اسی طرح کھڑا رہا اور قدرے لائق سے بولا۔
”دیکھو۔ آئندہ وہ کچھ بھی بکواس کرے تم ہاں قدم نہ رکھنا۔ اچھا۔ میری بات کو یاد رکھنا۔ میں تمہیں بتا رہا ہوں کہ وہاں کبھی مت جانا۔“

گل بالکل اس کے مقابل آن کھڑی ہوئی۔ ”سجاد! مجھے معلوم ہے تم ناراض ہو۔“
”مجھے کیا ضرورت ہے ناراض ہونے کی۔“ وہ خفا خفا سار بولا۔
وہ ہولے سے بڑی پیادری ہنسی ہنسی۔

”خفا بھی ہو اور کہتے ہو کہ خفا نہیں ہو۔“
سجاد کو اس کے ہنسنے پر نہ جانے کیوں غصہ آ گیا۔
”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ تم اس لفظ کے پاس کیسے ہی کیوں نہیں۔“ وہ چڑچڑے پن سے

بولتا۔
”تم اچھی سمجھتی ہو جی سجاد! پڑھی لکھی ہو جنہیں پتہ نہیں کہ ایسی جگہوں پر لڑکیوں کو نہیں جانا چاہئے اور وہ بھی اکیلے۔ کتنی بے ذوقی کی تم نے۔ مجھے تو یہ کہہ کر غصہ آ رہا ہے کہ آخر تمہیں ضرورت کیا تھی وہاں جانے کی؟ وہ روتے لکھتا تھا تو لکھتا رہتا۔“ اس نے جھلا کر سر جھٹکا۔
”آئندہ ایسی حرکت کی نہ تم نے تو۔“ وہ کچھ اٹکا اور چپے اپنی صحت کرنا ہوا بولا۔

”میرا مطلب ہے کہ آئندہ ایسی بے ذوقی نہ کرنا۔ تمہیں؟“
گل برا ماننے یا خفا ہونے کے بجائے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اشتیاق بھر سے لہجہ میں بولی۔

”بے باتیں تمہارے منہ سے بہت اچھی لگ رہی ہیں سجاد! میں نے نہ باپ کو دیکھا ہے نہ میرا کوئی بھائی ہے۔ لیکن تمہارے ہونے سے میں یہ محسوس کر سکتی ہوں کہ جن گھروں

مجھے ہر معصیت سے نکال سکتے ہو۔“ وہ بڑی سادگی اور سچائی سے چھوٹے چھوٹے سیدھے سادے لفظوں میں خود کو بیان کر رہی تھی۔

سجادول کچھ سمجھا۔ کچھ نہیں سمجھا۔ نہ اس نے سمجھنے کی ضرورت محسوس کی۔ وہ دل ہی دل میں نام سادہ سا رہا تھا۔ وہ کچھ شینا گیا تھا۔ پہچان ہو گیا تھا۔ یہ دیکھ کر کہ وہ معصوم بیوی بھالی لڑکی اس پر کتنا اعتبار کرتی تھی۔ مگر اس جیسا شخص اس بچوں سے چہرے والی لڑکی کے معصوم اعتماد کا حق درمیان نہیں تھا۔ وہ اپنے وجود کا سایہ بھی اس پر نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی حفاظت میں سینہ سپر ہو جانا چاہتا تھا۔ لیکن ہمیشہ کے لئے اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو کر۔

وہ سر جھٹک کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ جھٹلاہٹ۔ کچھ پشیمانی سے بولا۔

”تم یہ سب کچھ مجھے کیوں سنارہی ہو۔ تم مجھ پر اتنا اعتبار نہ کرو۔ تم ایک بہت اچھی شریف لڑکی ہو۔ تمہیں ایک شخص پر اس طرح اعتبار نہیں کرنا چاہئے۔ تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ میں کیسا آدمی ہوں؟ میں کیا کچھ کرتا رہتا ہوں۔ میرا تعلق کن لوگوں سے ہے۔ میں کن میں اٹھتا بیٹھتا ہوں۔ میں۔ میں۔ میں۔“ وہ اٹکا۔ کچھ موزوں لفظ پھٹنے کیلئے۔ ایسے مختاط لفظ جو اس لڑکی کے لئے نامانوس نہ ہوں۔

کل درمیان میں ہی بول پڑی۔ ”میں تم پر اعتبار کرتی ہوں۔ تو کیا تم مجھے دھوکہ دو گے۔“

سجادول نے اس کی سوالیہ نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ ان میں ابھرنے والے سوالات نے اس کے اندر ایک الجھلی سی چٹائی۔ وہ اس سے یہ سوال نہ بھی کرتی اس پر اتنا اعتماد نہ بھی کرتی تو بھی وہ اس کو دھوکہ دینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ دوسری قدموں میں اس کے نزدیک آ گیا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کرچے لہجے میں بولا۔

”میں تمہیں دھوکہ نہیں دے سکا کل! میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ اس لئے میں تمہیں بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں کوئی چھٹا آدمی نہیں ہوں۔ میں مجرم ہوں اور پولیس سے چھپتا پھرتا ہوں۔ تم مجھے نہ جانے کیا سمجھ رہی ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے وہی سمجھو جو میں ہوں۔“

وہ اس کی بات توجہ سے سنتی رہی۔ پھر سرسرا کر بولی۔

”دیکھو تم مجرم ہو یا میرے آدمی۔ مجھے اس سے کیا؟ میرے ساتھ تو تم نے بھلائی ہی کی ہے۔ میرے ساتھ تو تم نے اچھا انسان بننے کا وعدہ کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اس وعدے کو ضرور بھگاؤ گے۔“

میں مرد ہوتے ہیں وہ سکتے محفوظ ہوتے ہیں۔“

سجادول اس کے اہمایت مجھے لہجے پر بے حد پشیمان ہوا۔ وہ بڑے اعتماد سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یہ جانے بغیر کہ وہ قائل اور مجرم ہے۔ پولیس اسے تلاش کرتی پھرتی ہے۔ وہ اس کی نگاہوں کے اعتماد کے مقابل کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے پھر چلنے کا ارادہ کیا اور اس کی بات ٹالنے کو بولا۔

”اچھا۔ تو میں چلتا ہوں۔“

”کیا ہو گیا ہے سجادول!؟“ گل نے ہنسی سے اس کی جانب دیکھا۔

”میں کتنی بار تم سے کہوں گی کہ تھوڑی دیر کے لئے رک جاؤ۔ لیکن تم۔۔۔۔۔ تم سننے ہی نہیں ہو۔ آخر ایسی کیا معصیت ہے جنہیں؟ تھوڑی دیر بیٹھ نہیں سکتے؟ میں چاہتی ہوں کہ بابو کے بارے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں۔“

”تم بھول جاؤ اس بد معاش کو۔ نام مت لو اس کا۔“ وہ منہ ہی منہ میں گالی دے کر جھنجھلاہٹے ہوئے لہجے میں کہنے لگا۔

”تم جیسی لڑکی کو اس کا نام بھی نہیں لینا چاہئے۔ بس اب اس کا ذکر نہ کرنا۔“

گل اس کے شخص سے محفوظ ہوئی۔ ہولے سے ہنس کر مطمئن لہجے میں بولی۔

”میری بات تو تمہیں سننی پڑے گی۔ سجادول تمہیں کیا پتہ کہ تم نے اس وقت مجھے کتنا سہارا دیا ہے۔ تم نے مجھے ہر فکر سے آزاد کر دیا ہے۔ میں اس کہنے بابو کی وجہ سے اتنی پریشان تھی کہ میری راتوں کی نیند اور دن کا چین حرام ہو گیا تھا۔ میں چاروں طرف دیکھتی تھی۔ لیکن مجھے کوئی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو مجھے نہاں میں لے لے۔ جو مجھے ہر فکر سے آزاد کر دے۔ جو مجھ سے اتنا کہہ دے کہ وہ سب کچھ سنبھال لے گا۔ مجھے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں تو اس عذاب سے گھبرا کر خوشی کرنے کو تیار تھی۔ اسی لئے تو میں بے خوف ہو کر بابو کے ڈیرے پر چلی گئی تھی۔ میں یہ سوچ کر گئی تھی کہ یا خود میرا جاؤں گی یا اسے مار دوں گی۔“

”پاگل ہو تم تو۔“ سجادول نے سر ہلایا۔

”بھلا تم چاقو سے اسے سٹنڈے کو مار سکتی تھیں۔ وہاں کچھ اور ہو جاتا تو۔“

”نہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اللہ سے مجرم دوسے پر وہاں گئی تھی۔ میں نے ساری رات دعائیں مانگی تھیں۔ اللہ نے میری سن لی۔ اس نے کہیں سے تمہیں وہاں بھیج دیا۔ تمہیں دیکھ کر میرا خوف ختم ہو گیا تھا۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ تم۔۔۔۔۔ تم۔“

”عجیب باتیں کرتی ہو تم بھی۔“ وہ زنج ہو گیا۔

”اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤ کہ میں کس حال میں پھنسا ہوا ہوں۔ حالات نے مجھے کس طرح بے بس کر رکھا ہے۔ میں نے تم سے اچھا انسان بننے کا وعدہ تو کر لیا تھا۔ لیکن اسے نبھانا آسان نہیں۔ اسے نبھانا ہوں تو پچاسی کا پچھوہ گئے پڑتا ہے۔ مگر مجھے ابھی مہلت چاہئے۔ ابھی میرے ذمے کچھ کام باقی ہیں۔ میں انہیں پورا کرے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔“

وہ یکتف خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر سر جھکا ہوا کمرے میں ٹپکنے لگا۔ گل خاموشی سے اس کی طرف متوجہ رہی۔ وہ اس کی طرف پلٹا اور بولا۔

”گل! میں تمہیں بتاؤں کہ مجھ سے دن رات کس اذیت میں گزارتا ہوں۔ کس طرح روز جیتا اور روز مرتا ہوں۔ میں اپنے آپ سے کس قدر شرمندہ ہوں۔ میں تو خود سے آنکھ بھی نہیں ملا سکتا۔“ اس نے ایک سرد آہ بھری۔

”میرے ماں باپ مجھے کیا بنانا چاہتے تھے اور حالات نے مجھے کیا بنا دیا ہے۔“ اس نے تاسف سے اپنی پیشانی پر ہاتھ مارا۔

”میں تو اس قاتل بھی نہیں کہ اپنے باپ کو باپ کہہ سکوں۔ وہ کہتا ہے تو بے چہرہوں کو قتل بنا دیا ہے۔ مگر میں کس طرح تو بے کروں؟ میں کس طرح تو بے کر سکتا ہوں؟ میں نے تو یہ کر لی تو ہمارے بھری کا کیا ہوگا۔ اسے جہنم سے کون لکالے گا۔ مجھے بتاؤ ناگل کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ رات میں نے اپنے باپ کو دیکھا تھا۔“

وہ اپنی رو میں کہتا گیا۔ گل نے اسے نہیں ٹوکا۔ نہ ہی کوئی سوال پوچھا۔ وہ ایک ہمدرد اور غمگسار کی طرح بڑے اٹھماک سے اس کی باتیں سنتی رہی اسے اپنے آپ سے باتیں کرتے ہوئے دیکھتی رہی۔

وہ جیسے کسی اور ہی دنیا میں تھا۔ وہ جیسے اپنے ہی مقابل اپنے ہی رویہ تھا۔ خود فراموشی کے عالم میں وہ اپنے بارے میں اپنے آپ سے ہی باتیں کر رہا تھا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں بار بار نیچی چمک آتی تھی۔ وہ ہونٹ کاٹا ہوا بالکل اس معصوم بچے کی طرح باتیں کر رہا تھا جو باہر سے جھٹکا کر کے آیا ہو اور اپنی صفائی چیش کر رہا ہو۔

.....

”سجاد! اٹھ پڑ! دیکھ دن کتنا چڑھ آیا ہے۔“ ماسی کی آواز پر سجاد نے کسلندی سے آنکھیں کھولیں۔ ماسی اس کے سر ہانے کھڑی ہوئی ہوئے اس کا شانہ جھنجھٹا رہی تھی۔

اسے ماں کے نرم گرم لمس کا احساس ہوا۔ اس نے طمانیت بھرے دل کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں اور بولے بولے ماسی کے سہانے لمبے میں اتر گیا جہاں ماں کی شفقت تھی۔ اس کی ممتا کی پھوار تھی۔ اس کی محبتوں کی شادابی تھی۔ اس کے وجود کی خشک اور سایہ تھا۔

ماسی نے اسے پھر آنکھیں بند کرتے ہوئے دیکھا تو محبت بھری تشویش سے پوچھنے لگی۔

”سجاد! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

سجاد نے آنکھیں کھولیں۔ ماسی کے چہرے کی ممتا اور اس کے لہجے کے دلار نے اسے جیسے تسلی دے دی۔ وہ چار پائی سے اٹھا اور مچن میں گئے ہوئے پنڈ پپ سے پانی کے دو چار پپا کے چہرے پر لگائے۔ کھلی کی اور کرتے کے دامن سے چہرہ صاف کرتے ہوئے بولا۔

”اچھا ماسی! اب میں چلتا ہوں۔“

ماسی جو چو لہے کے پاس جا بیٹھی تھی وہیں سے بولی۔

”کیوں پڑ! بھوکا ہی چلا جائے گا۔ ناشتہ تو کر لے۔“

”تمہیں ماسی! اس وقت دل نہیں چاہتا۔“ وہ ناخن چباتا ہوا بے دلی سے بولا۔

”اس کا مطلب ہے تیری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ وہ بڑے لگاؤ سے کہنے لگی۔ ”جل ادھر آ۔ دودھ کے ساتھ بخاری گولی کھا لے۔ میں ابھی گل سے کہتی ہوں کہ تمہیں آکر دو لٹی دے۔“

”نہ..... نہ ماسی اسے تکلیف نہ دینا۔“ وہ جلدی سے بولا۔

”میں ٹھیک ہوں بالکل۔ لا تو دودھ گرم کر دے۔“ وہ قریب ہی ایک بڑھی پڑی بیٹھی کیا۔

ماسی نے دودھ کا چالہ اس کے قریب رکھتے ہوئے کہا۔

”گل کہہ رہی تھی کہ تم اس سے مل کر جانا۔“

وہ بے حد پریشان ہوا۔ اس نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگا کہ وہ گل کا سامنا کس طرح کرے گا۔ رات اس نے اپنی رو میں اس سے نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ اسے تو یہ بھی صحیح طور پر یاد نہیں تھا کہ اس نے کیا کچھ کہہ دیا تھا۔ نہ جانے وہ اس کی باتوں کو کس رنگ میں لے گی۔ نہ جانے وہ اس کے بارے میں کیا سوچتی ہوگی۔ وہ اونچے خیالات رکھنے والی بہت نیک لڑکی

تھی۔ نہ معلوم وہ اس سے بات کرنا بھی پسند کرے گی یا نہیں۔ شاید وہ پہلے بھی مہربان نہیں رہے گی۔ وہ اس کی بدلی ہوئی نگاہوں کا سامنا کس طرح کرے گا۔ وہ اس کی بے انتہائی یکسر برداشت کرے گا۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ وہ اس کے آنے سے پہلے ہی چلا جائے تاکہ اس کا سامنا ہی نہ ہو۔ وہ ان مہربان آنکھوں میں اتاری ہوئی نفرت و حقارت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اس نے جلدی جلدی بڑے بڑے گھونٹ بھرے، خیال ایک طرف رکھا اور منہ صاف کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اچھا ماسی میں چلتا ہوں۔ گل کو میرا سلام دے دیتا۔“

”تم خود ہی اس سے سلام دعا کرو۔ وہ صبح بھی تمہارا انتظار کرتی رہی مگر تم جا گئے ہی نہیں۔ اس لئے وہ مجھ سے کہہ گئی تھی کہ تمہیں بتا دوں کہ اس سے مل کر جانا۔“ ماسی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تاکہ گل کو بلا لائے۔

”نہیں ماسی رہنے دو۔ میں پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔“ سجاد نے ہلکی سی گھبراہٹ سے کہا۔ اور لمبے لمبے ڈنگ بھرتا مہن میں سے ہوتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ گل کے آنے سے پہلے یہاں سے چلا جانا چاہتا تھا۔ مگر دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھک گیا۔ گل اپنے ترو تازہ وجود کے ساتھ اس کے مقابل تھی۔

وہ بے طرح پشیمان ہوا۔ احساسِ عداوت نے اسے سینے میں ڈوب دیا۔ وہ دانتوں سے ناخن کترنے لگا۔ اس نے مجرموں کی طرح سر جھکا لیا۔ اس میں گل کی طرف دیکھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

”سجاد! جا رہے ہو تم؟“ اسے بھی اتنی جلدی کس بات کی ہے؟ وہ ٹھٹھکی سے کہنے لگی۔

سجاد کے دل سے جیسے ایک بھاری بوجھ مٹ گیا۔ گل کی شیریں آواز نے اسے پھول کی طرح کھلا دیا۔ یہ سوچ کر کہ وہ اس سے ناراض نہیں ہے وہ ہلکا ہلکا ہو گیا۔ اس نے احساسِ ممنونیت سے اس کی جانب دیکھا۔ اس کی مہربان مسکراہٹ اس پر چھا گئی۔ وہ باوجود کوشش کے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ صرف چند بے معنی سے لفظ اٹکتے ہوئے اس کی زبان سے نکلے۔

”گل!..... گل! کہیں تم مجھ سے غفا تو نہیں۔“

”کو بھلا میں تم سے کیوں غفا ہونے لگی۔“ وہ خوش دلی سے ہنسی۔

”کہیں..... کہیں تم مجھ سے نفرت تو نہیں کرنے لگیں۔“ اس نے جیسے سانس روک کر پوچھا۔

”کیوں بھی؟ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہو؟ آخر تم نے میرا کیا بگاڑا ہے۔ جو میں تم سے نفرت کروں گی۔ تم سے غفا ہو جاؤں گی۔“ اس نے بڑی نرمی سے سوال کیا اور ملائم سی نگاہ اس پر ڈالی۔

”میں برا آدمی ہوں۔ بہت برا۔“ وہ پریشانی سے کہنے لگا۔

”تم خود برے نہیں ہو سجاد! تم برے حالات میں گھر گئے ہو۔ تمہیں برا بننا پڑ گیا ہے لیکن یہ بات تو ابھی سے تاکہ تم اچھا انسان بننا چاہتے ہو۔ تمہیں برائیوں کا پتہ ہے۔ تمہارا نمبر زندہ ہے اور تمہیں برے سے بھٹک کر تیز کرنا پڑتا ہے۔“

سجاد اس کی ان باتوں کا مطلب کھوجے ہوئے کھوسا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے اندر ایک انتہائی سی خوشی پھوٹی ہے جس نے اسے شراہور کر دیا ہے۔ وہ جیسے خود سے بولا۔

”اب مجھے جانا چاہئے۔“ پھر بے خیالی میں گل سے پوچھنے لگا۔

”میں چلا جاؤں؟“

”تمہیں جانے کی بہت جلدی ہے تو چلے جانا۔ ناشتہ تو کر لیا ہے تاکہ تم نے؟“

”ہاں بس کر لی ہے۔“ وہ غلٹ سے بولا۔

”کہاں کیا ہے اس نے ناشتہ۔ بہت کہا ہے اس کو تو بس ایک پیالہ دودھ پیا ہے۔“

ماسی دور ہی سے بولی۔

”کیوں سجاد! یہ کیا بات ہے؟ تم نے روٹی کیوں نہیں کھائی؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”بس بھوک نہیں ہے۔ دل نہیں چاہ رہا تھا۔“

”کیا ہو گیا ہے جو تمہیں بھوک نہیں ہے۔ خواہ وہ پریشان کیوں ہوتے ہو۔ چلو چل کر آرام سے ناشتہ کرو۔ بھوکے پیٹ گھر سے نہیں نکلنے۔“ اس نے زور دے کر کہا اور چوہے کی طرف ہل گئی۔

سجاد انکار نہ کر سکا اور گرد و پیش کو ایک نئے اور خوبصورت انداز میں دیکھتے ہوئے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وہ ڈیرے پر پہنچا تو وہاں سفر کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ ملاں پھوڑی اپنے مرشد کے آستانے پر حاضری دینے جا رہا ہے۔ ڈیرے کے کبھی لوگ اس کے ساتھ جائیں گے۔ وہ ہر سال عرس میں شریک ہوتا تھا۔ یہ سب تیاریاں اور اجتماع اسی سلسلے میں تھا۔

ہاؤستانہ اور دوسرے لوگ اس سے خار کھانے گئے تھے۔ وہ پہلے ہی اس سے حسد کرتے تھے کہ ملاں اس پر اتنا اعتبار کیوں کرنے لگا ہے۔ اس پر یہ نیا شاخسانہ تھا کہ اس نے ہاتھ آیا مال چھوڑ دیا تھا۔ ڈیرے کے لوگ ابھی تک بکڑے ہوئے تھے۔ وہ اسے گھور گھور کر دیکھتے اور بڑبڑاتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ملاں اس سے باز پرس کرے۔ اپنا رواجی جلال دکھائے اور اسے آڑے ہاتھوں لے لیکن وہ نہ جانے کیا سوچ کر اس تمام واقعہ کو نظر انداز کر گیا تھا۔ اس کے رویے سے یوں ظاہر ہوتا تھا جیسے اسے اس تمام معاملے کی خبر ہی نہیں۔

سجاد کا دل ہر شے سے اچٹ تھا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اسے یہ ڈیرہ اس میں رہنے بسنے والے چہرے بڑے مکروہ معلوم ہو رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ غلطی سے کسی ایسی متضمن جگہ پر چلا آیا ہے جہاں سانس لینا بھی محال ہے۔

گل کا پھول سا گلشن چہرے اس کے تصور میں جھانکتا تھا۔ اس کی شیریں آواز سماعت میں رس گھول رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ کے شگونے اس کے من میں پھوٹ رہے تھے۔ وہ کسی پھولوں سے لدی خوشبو سے ہمراہ، چاندنی سے چمکتی ہوئی فضا میں تہاہینہ کر بوی عقیدت سے اس کے بارے میں سوچتا چاہتا تھا۔ وہ خود کو یقین دلانا چاہتا تھا کہ گل نے اسے لگا ہوں سے نہیں گرایا۔ اس کی خوشبو اس کا وجود اس کی مہک ابھی اس کی زندگی میں باقی ہے۔

سب لوگ چلے کیلئے تیار تھے۔ اسے بھی مجبوراً تیاری کرنی پڑی تھی۔ وہ کپڑے بدل کر کرتے میں بنن لگا رہا تھا کہ شہزادی ہنستی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ سجاد نے اس کی طرف توجہ نہیں دی اور توری چڑھا لے اپنے کام میں لگا رہا۔ وہ اپنی شیریں آنکھیں شوشی سے سمھاتی ہوئی قریب آئی اور کرتے میں بنن لگانے میں اس کی مدد کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”دفع ہو۔“ سجاد نے اس کے ہاتھ ہٹائے۔

وہ اس کے چڑ جانے پر بے حد معظوظ ہوئی۔ اس کی کٹ کٹ فنی سارے کمرے میں گلیں کرنے لگی۔ سجاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ڈھیلے ڈھالے مردانہ کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ اس کے گلے میں رنگین ریشمی رومال تھا۔ الجھے ہوئے مجھے بالوں پر اس نے نرمی

لپٹی لگا رکھی تھی۔ اس کے کان پر سرگرمٹ اٹکا ہوا تھا۔ وہ آنکھوں میں شوشی بھر کر اس کی طرف الجھ رہی تھی۔

”جا۔ اپنا کام کر۔“ سجاد نے خشکی سے ڈانٹا۔

وہ ٹپٹی نہیں اور اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر بولی۔

”واہ۔ آج تو بڑی فیشن نکالی ہے۔“

سجاد بے طرح جھنجھٹایا۔ ایک بازو سے اس کا بازو پکڑ کر اس نے غصے سے اسے ہٹا دیا تو وہ پھولوں سے ہمراہی ڈال کر طرح کچلتی ہوئی اس کے اوپر ہی آ رہی۔ سجاد نے چڑا کر اسے پرے دھکیلا تو اس کے گلابی ہونٹوں سے سرخ لپٹی کا ایک فوارہ سا اہل پڑا۔ سجاد بھلا یا۔

”شہزادی! کسی وقت تو انسان بنا کر۔“

اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں ہنستی ہوئی مٹکتائی۔

”سنا ہے کل تو نے بابو کی اچھی بھڑا پونچھ کی ہے۔“ اس نے شوشی سے آنکھ دہائی۔

”کیوں استاد۔ کیا معاملہ تھا؟“

”تو اپنے کام سے کام رکھا کر۔ اچھا۔ کبھی؟“ سجاد نے آنکھیں نکالیں۔

وہ یوں شرارت سے دو قدم پیچھے ہٹ گئی جیسے اس کے غصے سے خوفزدہ ہو گئی ہو۔ پھر

ایم ایم آگے بڑھی اور رازدارانہ سے کہنے لگی۔

”سنا ہے استاد کی لڑکی کا معاملہ تھا۔ کیا کہتے انہوں نے تو تم بھی پورے ہو۔“

سجاد کو ضبط کرتا محال ہو گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا اور اس کی

مانت کے باوجود اسے دروازے سے باہر دھکیل کر دروازہ بند کر لیا۔

ملاں پہوڑی نے خانقاہ سے کچھ دور بیروں سے جو تیاں اتار دیں۔ سر پہ لپیٹا ہوا
عادر گلے میں ڈال لیا اور عقیدت و محبت میں ڈوبا ہوا خانقاہ کی سمت روانہ ہو گیا۔ وہ سب بھی
اس کے پیچھے اس کے قدموں پر قدم دھرنے لگے کہ کہیں کوئی غلط قدم نہ پڑ جائے۔ کہیں کوئی
نہ ادا نہ ہو جائے۔ سجاد نے ملاں کو بھی اس عالم میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ بے رحم اور سخت
عزیز تھا۔ یہاں آکر اس کا چہرہ ایسا سخت اور سنگین چہرہ بھی ملائم ہو گیا تھا۔ نہ جانے اس کے
دل کا حال کیا تھا۔ اس کی روح کا کیا عالم تھا۔ بظاہر تو وہ عقیدتوں میں شرا بہر نظر آتا تھا۔

سجاد کے اپنے دل کی حالت بھی دگرگوں تھی۔ اس کی آنکھیں عقیدت کے آنسوؤں
سے نم ہو گئیں۔ اس کا جی چاہا کہ خانقاہ میں یہاں وہاں بیٹھے ہوئے مست حال فقیروں میں
اٹل ہو کر اس پاپ بھری دنیا سے ہمیشہ کیلئے ناسے توڑ لے۔ خدا کے اس پیارے بندے کی
فطرت پر سر جھکا کر اپنے سے آسودگی اور سکون کی بھیک مانگ لے۔ ملاں پہوڑی بید و مرشد
لی نہ تھی۔ اس میں حاضری دینے کو بے قرار تھا کہیں مریدوں نے بتایا کہ بزرگ صاحب اس وقت
اللہ میں مشغول ہیں۔ حجاز سے میں موکل آ جا رہے ہیں اس لئے کسی کو حجاز سے نزدیکی
والی اجازت نہیں۔ بید و مرشد دھپنے سے فارغ ہو کر جس کو طلب فرمائیں گے وہی ان کی
فطرت میں شرف بازیابی حاصل کرے گا۔

سجاد کے دل پر ایک ناقابل بیان ہیبت سی چھا گئی۔ مولکوں کے تصور سے ہی وہ
گھبرا گیا۔ اسے اپنی زندگی کے تاریک گوشے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔ اس نے
روپ ہو کر سوچا کہ گناہوں سے بھری یہ دنیا ان ہی خدا کے پیارے بندوں کے دم سے قائم

ملاں ایک جانب عقیدت سے آنکھیں بند کر بیٹھا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے
دل میں کچھ مٹی منہ میں کچھ پھڑ پھڑا رہا۔ اس نے کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی
اور وہ مرشد کے تصور میں اس طرح گھویا ہوا تھا کہ گرد و پیش کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ اس نے نہ
دیکھا تھا نہ بیا تھا۔ نہ ہی سگریٹ نوشی کی تھی۔ بس سر جھکائے یوں بیٹھا تھا جیسے مراقبے میں

اس کے قریب ہی شہزادی اپنی شورش اور خوبصورت کشادہ آنکھیں حیرت سے کھولے
تھی۔ سجاد نے شاید آج پہلی بار اسے لڑکوں ایسے کپڑے پہنے ہوئے دیکھا تھا۔
ملاں اور سجاد اس کے سر سے بار بار دھٹک جاتی تھی جس سے اس کے مردانہ انداز میں کٹے

وہ بزرگ صاحب کے مخصوص علاقے میں پہنچے تو ان وصل رہا تھا۔ انسانوں
ایک سیلاب سا ایسی سمت رواں تھا۔ ہر طرف چہل پہل اور گہما گہما تھی۔ فضا میں خوش
جوش اور گرمی تھی۔ وقفے وقفے سے بیس آئیں اور عقیدت مندوں کو ان کی منزل پر پہنچا
کر واپس روانہ ہو جاتیں۔ بھل گاڑیوں، تانگوں، ریڑھیوں، ٹریکٹر ٹرائیوں اور مختلف
سوار یوں میں لوگ گاتے، دھمال ڈالتے، خوشیاں مناتے چلے آتے تھے۔ راہ میں پہنچے
چلنے والوں کی ٹولیاں سبز اور سنہری چادریں اٹھائے، عقیدت کے نئے گاتیں کش
کشاں بڑھتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ سب بھی جس بس سے یہاں پہنچے تھے وہ بھی
صاحب کے عقیدت مندوں سے بھری ہوئی تھی۔

یہاں کی گہما گہما اور رونق پر سید کا سامان ہوتا تھا۔ ہر طرف شور و ہنگامہ اور
پہل تھی۔ بازار سے ہوتے تھے۔ جموں لگے ہوئے تھے۔ کہیں نہ کہیں بازیگر اپنا
نما رہے تھے۔ کہیں سرکش والے اپنا پنڈال لگا رہے تھے۔ قوالوں کی ٹولیاں دور دور سے
تھیں۔ اس سب کی اور بے آباد جگہ پر ایک چھوٹا سا شہر بن گیا تھا۔

سجاد کو پتہ چلا کہ ان دنوں ملاں کے بید و مرشد کے بزرگوں کا عرس ہوتا ہے۔
جاری کیا جاتا ہے۔ سماع کی محفلیں ہوتی ہیں۔ دھمال ڈالی جاتی ہے۔ لوگ دور دور سے
اور اپنے من کی مرادیں پاسے ہیں۔ کئی روز تک میلہ بھی لگتا ہے۔ لوگ برکت کے لئے
فروخت بھی اسی منڈی سے کرتے ہیں۔

سجاد یہاں کی رونقوں میں گم سا ہو گیا۔ اسے اپنے گاؤں کا وہ میلہ یاد آ گیا
میں وہ اپنے باپ کی اٹھی پکڑے گھومتا پھرتا تھا۔ جہاں کی رونق اور چہل پہل میں گم ہو کر
لگتا تھا جیسے وہ میلہ اس کے دل میں اتر آیا ہو۔ وہ کئی روز تک اس کی گہما گہما کو اپنے
محسوس کرتا رہا تھا اور اپنے ہم جو بیوں سے اس کا تذکرہ کرے لے کر کرتا رہا تھا۔

نگاہ بھی نہیں ڈال سکا۔ بس چپ چاپ عقیدت سے سر جھکا کر ان کی مقدس آواز سنتا رہا۔ ان کے ہونٹوں سے چھوٹے والے لفظوں کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔ اس کے دل کی گھبراہٹوں میں سکون و اطمینان کی لہریں ہی اٹھ رہی تھیں۔

پیر و مرشد کی گفتگو سے ایک عجیب جلال چلتا تھا۔ ان کی بھاری گوشیلی آواز ہیبت طاری کرتی تھی۔ ان کی گفتگو سمجھنا آسان نہیں تھا لیکن ان کی آواز کا زبردست عربی لب و لہجہ اور ناقابل فہم الفاظ سنا دل پر وحید سا طاری کر رہے تھے۔ پیر صاحب کی باتیں تو شاید ملاں کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہی تھیں لیکن ان کی عقیدتوں کی تسکین اس طرح ہو رہی تھی کہ پیر و مرشد ان سے مخاطب تھے۔ اور وہ ان کے رویہ و ان کے اس مقدس جگرے میں بیٹھے ہوئے تھے جہاں مؤکل آتے جاتے تھے۔

.....

وہ رات اسی سرشاری میں بسر ہوئی۔ سنا دل ایسی آسودہ اور پرسکون نیند عرصہ سے نہیں سوتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے دل پر کوئی بو جھ نہیں۔ وہ تمام دھکوں سے آزاد ہو کر زندگی کے نئے اور سنہری دور میں داخل ہو گیا ہے۔ وہ رات بڑے اطمینان سے سوتا رہا۔ اس کی آنکھ کھلی تو ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ اس کے کانوں میں سار کی صدا گونج رہی تھی۔ ملک اور مائیں اللہ ہو اور حق باطن کی آوازیں بلند کر رہے تھے۔

وہ کچھ دیر اسی طرح اپنی جگہ پر ڈاکر کھینچا رہا۔ پھر اذان کی سرمدی صدا گونجی تو اس کے ہونٹوں پر آپ سے آپ کلمہ طیبہ جاری ہو گیا۔ وہ قریب ہی سوئے ہوئے ملاں پہنچا اور دوسرے لوگوں کو سوتا چھوڑ کر نماز پڑھنے کے خیال سے اٹھ کھڑا ہوا۔

اس کی تکلیفوں سے بھری ہوئی زندگی میں یہ چونکا دینے والی تبدیلی تھی۔ وہ آسودہ تھا اور نماز کی طرف اس کا دل خود بخود جھک رہا تھا۔ باہر اعلانے میں سار کی محفل ختم ہو گئی تھی۔ ملو لوگ وضو کر رہے تھے۔ کچھ ٹولیوں میں بیٹے۔ یہاں وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ مائیں اور ملک دیواروں کے ساتھ بے خبر اور دست پڑے تھے۔ کچھ نیندا اور نئے میں بڑبڑا رہے تھے۔ کچھ بلند آواز میں خراٹے لے رہے تھے۔ سنا دل ان سب سے بچتا بچتا مسجد میں داخل ہو گیا۔ اس کے وضو کرنے تک جماعت کھڑی ہو چکی تھی وہ اسی میں شامل ہو گیا۔

نماز کے بعد وہ ایک جانب بیٹھا مولوی صاحب کا وعظ سنتا رہا لیکن اسے کوئی خاص لگنا نہیں آیا نہ اس کا دل مطمئن ہوا۔ مولوی صاحب کی زبان میں وہ شیرینی اور تاثیر نہیں تھی

ہوئے سیاہ منتظر یا لے ہاں اس کی پیشانی پر جھکے جاتے تھے جنہیں وہ سینٹ سینٹ کر پھولدا اور چادر میں چھپا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک ماحظوم سا ہراس تھا۔ وہ بار بار ہونٹوں میں ہونٹوں میں بیٹھ پڑے گنتی تھی۔

شاہوستانہ یا باواؤ ڈیرے کے دوسرے لوگ بھی متوذب بیٹھے تھے۔ لوہان اور اگرچہ کی بو ماحول کو حد بے پراسر اور پرمجمل بنا رہی تھی۔ سنا دل کے اندر ایک ہلچل سی مچی تھی۔ خدا کے تقدس نے اسے اسیر کر لیا تھا۔ اس کی ہر سانس میں جبین اثر آتی تھی۔ وہ خود کو ایک ڈیرے کی طرح حقیر معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ان اللہ والے لوگوں سے روشنی کی بجائے مانگنا چاہتا تھا۔ اسے روشنی جو اس کی تاریک راہوں کو منور کر دے۔ جو اس کے دل سے ہو کر گزرے۔ جو اس کے روح کو تار کیوں سے نکال لے۔

وہ جلد سے جلد اس پہنچی ہوئی ہستی کی زیارت کر لینا چاہتا تھا جو اس کی دنیا بدل سکتی تھی جو اس کے دکھوں کا عداوہ کر سکتی تھی۔ اسے یقین سا ہو گیا تھا کہ پیر و مرشد کی بارگاہ میں کر وہ کچھ اور ہو جائے گا۔ اس کی تقدیر بدل جائے گی۔ وہ یہاں کی خاک میں مل کر آسودہ جائے گا۔

کسیں رات گئے پیر و مرشد وظیفے سے فارغ ہوئے تو ملاں پہنچنے کو بار بار بلا اجازت ملی۔ سنا دل اسی تاک میں تھا۔ وہ پچھلے سے اس کے ساتھ ہو گیا۔ ملاں کی عقیدت و اتقاد نہیں تھی۔ اس نے مجازی اتنا کر گئے میں ڈال لی تھی۔ نیکے پاؤں ہاتھ باندھے اپنی قدم پر ناز کرتا تم آنکھوں کے ساتھ وہ حجرے کی طرف روانہ ہوا تو سنا دل بھی اس کے ساتھ چلا تھا۔

وہ عود و عطر سے ملبستہ ہوئے حجرے میں پہنچے تو ملاں نے جھک کر اس کی چوکی بوسہ دیا۔ سنا دل نے بھی اس کی تھلیدی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ جھکا نہیں۔ بلند ہوا جانب اٹھ رہا ہے۔ اوپر بہت اوپر۔ بے حد ہلکا پھلکا۔ ہر غم اور فکر سے آزاد۔

”آ جاؤ بچہ۔ آ جاؤ۔“ پیر و مرشد نے بھاری آواز میں انہیں اندر آنے کی اجازت تو چھوٹے سے حجرے کے سبز دروازوں کی کھمبہ آواز سے گونجنے لگے۔ ملاں نے بڑھ کر قدم بوسی کی لیکن سنا دل خود کو اس جرات پر آمادہ نہیں کر سکا۔ وہ ملاں کی اوٹ میں داخل ہو گیا۔ اس کا دل پا کیزگی سے بھر گیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔ اس کی کانیں جھک گئیں۔ وہ پیر و مرشد کے رعب و جلال سے دیکھتے ہوئے نورانی چہرے

جو بھر و مرشد کے لفظوں میں جھلکتی تھی۔ رات کی کیفیت کا لطف، بھر صاحب کے لفظوں کی چاشنی، ان کی گفتگو کی لذت اور حالات ابھی تک اس کے رویں رویں میں مگلی ہوئی تھی۔ وہ اسی کیفیت میں سرشار مسجد سے باہر آیا اور خانقاہ کی سمت چل پڑا۔

وہ ابھی احاطے میں داخل ہی ہوا تھا کہ شہزادی سے ٹھہر بیٹھ ہو گئی۔ وہ وہاں آئی ہوئی دوسری لڑکیوں میں گھری چپک رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر تازگی تھی۔ وہ اپنی ہم عمر لڑکیوں کے ساتھ ہنسی کھاتی، اٹھکیاں کرتی بہت خوش معلوم ہوئی تھی۔ اس پر نگاہ پڑی تو وہ دوسری لڑکیوں سے بٹھکھ ہو کر اس کے قریب آگئی اور سرکار کر بولی۔

”بڑی نمازیں نمازیں پڑھ رہے ہو یہاں آکر۔ خبر تو ہے؟“

”تو اپنے کام سے کام نہ لگے تھی۔“ سجاد نے انکڑے سے کہا اور آگے بڑھ آیا۔

اس نے دیکھا کہ شہزادی اپنی ساتھیوں کے جھرمٹ میں کھڑی ہنس کر ان سے نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ وہ اسے نظر انداز کر کے خانقاہ کی رانچیں دیکھنے لگا۔ آج عرس کی تقریبات شروع ہونے والی تھیں۔ حزار پر حزار چٹائی جاتی تھی۔ حزار کوٹھل دیا جانے والا تھا۔ عقیدت مند حزار پر ٹوٹے پڑتے تھے۔ اس کے ستونوں سے لپٹنے ہوئے، رابرداری میں بیٹھے ہوئے، دیواروں سے لگے ہوئے، جن میں، دالان میں۔ ایک دوسرے پر گرتے پڑتے وہ اپنے اپنے انداز میں عقیدت کا اظہار کر رہے تھے۔

سجاد نے لنگر سے کھانا لیکر ناشہ کیا اور ابھی ہاتھ صاف کر ہی رہا تھا کہ دھوم مچ گئی کہ بھر و مرشد تشریف لے آئے ہیں۔ بھج میں لچل شہزادہ سر لہروں کی طرح بڑھتی اور پھلتی چلی گئی۔ عوام کی بے قرار یوں میں شدت پیدا ہو گئی۔ لوگ دھمکیل سے ایک دوسرے کو گراتے اور پچھاڑتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ وہ بھر و مرشد کی ایک جھلک کے پیاسے تھے۔ وہ انکا دیدار حاصل کرنے کو تڑپ رہے تھے۔ وہ ان کی ایک نگاہ کرم کے منتظر تھے۔

بھر و مرشد کو ان کے مرید گھبرے میں لئے ہوئے تھے۔ وہ جذب و عقیدت میں ڈوبے ہوئے لوگوں کے جذبات کی شدت سے بھر صاحب کو کھنکھارے ہوئے تھے۔ سجاد کے دل کی کیفیت میں بھی جیسے ایک انقلاب سا پیدا ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے بھر و مرشد ہی اس کی جائے پناہ اور حارس ہیں۔ اس کا سب کچھ ان کے پاس ہے۔ وہ اس کی، چھاؤں۔ اس کا قرار ہیں۔ اسے نہ جانے کیا ہوا کہ وہ غیر ارادی طور پر لوگوں کی گھٹی بھیڑ کو چرتا بے اختیار آگے بڑھا اور بھر و مرشد کی سبز چادر کا کونہ آنکھوں سے لگا رو دیا۔

مجھے ہر ایک سکوت سا چھایا گیا۔ بھر و مرشد کے مرید تیزی سے آگے بڑھے اور اسے بے دردی سے کھینچ کر علیحدہ کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ لیکن بھر و مرشد نے منع کر دیا اور اپنا ہماری ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا۔ ان کی کوششیں آواز کے بلند ہوتے ہی چاروں جانب جیسے سنا چھایا گیا۔ لوگ دم بخود ہو کر سننے لگے۔ بھر و مرشد فرما رہے تھے۔

”نا چاہی ادا دل کو صاف رکھ۔ اللہ مشکیں آسان کرے گا۔“

لوگ دھک دھک و حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ وہ کتنا خوش قسمت تھا کہ اس پر بھر و مرشد کی نگاہ کرم ہو گئی تھی۔ بھر و مرشد تو آگے بڑھ گئے۔ ان کی سبز چادر کا کونہ اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اور لوگ سجاد پر ٹوٹ پڑے۔ کوئی اس کے ہاتھ چوم رہا تھا۔ کوئی اس کے پاؤں چھو رہا تھا۔ کوئی اس سے دعا کرنے کیلئے کہہ رہا تھا اور کوئی اس سے اپنے بچے کے سر پر ہاتھ بھرانا چاہتا تھا۔

سجاد جیسے دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو گیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ کہاں ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ کوئی اس سے کیا کہہ رہا ہے؟ کوئی اس سے کیا چاہتا ہے؟ اس کی جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی۔ وہ سب کچھ فراموش کر چکا تھا۔

ملاں پہنچوئی نے دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر اسے اندر مسافر خانے میں لے جانا چاہا لیکن وہ رضامند نہیں ہوا اور قبر کے چتوڑے سے ٹپک لگائے وہیں بے خود سا بیٹھا رہا۔ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں رہا تھا۔ وہ اس زمانے سے بہت دور جیسے کسی اور دنیا میں سانس لے رہا تھا۔

نہ جانے وہ کب تک اسی عالم ہی خودی میں ڈوبا رہا کہ ایک جاگ کسی کے بیقراراری سے رونے اور بار بار اسے مخاطب کرنے کی آواز سے وہ چونک گیا۔ بے خودی کی سی کیفیت آہستہ آہستہ زائل ہونے لگی اور اسے دنیا کی آوازیں اپنے چاروں طرف سنائی دینے لگیں۔

اس نے بے خیالی میں آنکھیں کھولیں اور روٹی ہوئی آواز کی سمت دیکھا۔ گھٹی چادر اوڑھے کوئی عورت زار و قطار روٹی ہوئی مضطرب التجا میں کمری رہی تھی۔

”سائیں جی! اللہ کے واسطے میرے کا کے کو بھالو۔ سائیں جی۔ تم اللہ والے ہو۔ میرے بچے کیلئے دعا کرو۔ تمہیں اللہ، رسول کا واسطہ، جنجن پاک کا واسطہ۔“ اس کی آواز میں اتنا درد اور اس کے لہجے میں اتنی ہمت تھی کہ سجاد کا اپنا دل بچ گیا۔ اس نے ایک نگاہ رونے والی کی سمت دیکھا اور اس کی نگاہ وہیں رو گئی۔ اس کا سارا وجود جیسے طوفان کی زد میں آ گیا۔

اس کی چادر سر سے ڈھلک سی گئی تھی۔ اس کے مجبورے بال نکھرے ہوئے تھے اور اس کی بادامی آنکھیں جل تھل تھیں۔ وہ یقیناً حقیقت کی اس دنیا میں لوٹ آیا جسے جبر و شدت کی نگاہ کرم نے بھلا دیا تھا۔

وہ ان شرعی آنکھوں کو ہزاروں آنکھوں میں پہچان سکتا تھا۔ وہ ان بادامی آنکھوں کو صدیوں بعد بھی شناخت کر سکتا تھا۔ ان آنسو بھری آنکھوں میں تو وہ کبھی خود کو دیکھا کرتا تھا۔ اس کے دل کی دنیا زیر و زبر ہو گئی۔ اس کی بے قرار یوں نے اسے بے ساختہ پکار لیا۔

”رانی! رانی!“

وہ بے طرح چوکی اور آنسوؤں سے بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ وہ ان آنسوؤں کی طرح ٹپک ٹپک ہو گئی جو اس کے دلچ زخموں پہ لگے اس کے دل کے لئے کی داستان بیان کر رہے تھے۔ اس کے ہونٹ لرزے لیکن وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔

سجاد نے مضطرب ہو کر کہا۔

”تو نے مجھے پہچانا۔ ہیں رانی؟“

رانی نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔ اس کے ہونٹوں سے ایک سسکی نکلی اور آنسو اس کے رخساروں پر تیزی سے بہنے لگے۔ اس نے اپنی اذنی لہوں میں دہائی۔ اس کی روتی ہوئی آنکھیں وہ کچھ کہنے لگیں جسے بیان کرنے کو اس کے کانچے لب ترس رہے تھے۔

سجاد کو وہ لمبے زخم زخم کر گئے۔ آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی رانی اسے خرابانے لگی۔ اس کے لب ہولے ہولے مل رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا کہہ رہی تھی؟ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی؟ سب کچھ اس کی رندگی ہوئی کچھ ہی کہہ رہی تھی۔

سجاد نے خود ہی اس خاموشی کو توڑ دیا۔ جو جیسے زندگی اور موت کا سوال بن گئی تھی۔

”رانی! بولنی کیوں نہیں۔ کچھ کہہ تو سکی۔ کچھ کیوں بیٹھی ہے؟ کچھ تو کہہ۔“ رانی کے خوبصورت چہرے پر بے بسی کی ایسی دھند سی چھا گئی جیسے بولنے پر قادر نہ ہو۔ اس کے لب ہا چہرے پر برسنے والی اذیت جیسے گویا کی کوترے لگی۔ سجاد کا جی چاہا ایک بار اس کا ہاتھ قلم لے۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی حرف، کوئی لفظ نہ لے۔ جو فراق کے ان محروم لبوں کی اذیت کی تلافی کر سکیں۔ وہ لہر لہا اس کی زندگی کو خردیوں اور کامیوں سے بھرتے رہے تھے۔ لیکن رانی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی۔ بس بیٹھی یوں ہاتھ ملتی رہی جیسے کوئی بے حد عزیز شے ٹھکرائی ہو۔

”رانی۔ فی رائے۔ جلدی آ۔ دیکھ کا کے کو کیا ہو گیا ہے۔“

اچانک کسی عورت نے عجب سے پکارا اور اس کی آواز چاروں طرف پھیل گئی۔ سارا عالم ٹھہر گیا۔ ساری کیفیتیں ٹوٹ گئیں۔ کتنے میں بیٹھی ہوئی رانی لرز گئی۔ وہ چونک کر یکدم اٹھی اور بے تابی سے پکارا۔

”ہائے میں مر گئی۔ کیا ہوا میرے کا کے کو؟“

اس نے ددڑ کر بچے کو گود میں لے لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگی۔ وہ عورت نہ جانے اسے کیا بتانے لگی اور رانی پریشانی، بے قرار سی، بے کل سی ہو کر اس کے ساتھ ساتھ ہنسی ہوئی کچھ بھریں خواب کی طرح نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔

.....

رانی اپنے ساتھ سکون کی وہ دولت بھی لے گئی جو اسے جبر و مرشد کی ایک نگاہ کرم نے بخشی تھی۔ اس کے کھوجانے سے یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ کھو گیا ہے۔ یوں لگتا تھا جیسے زندگی میں محبت کا کوئی رشتہ باقی نہیں بچا۔ چاہتوں کے سب وار بند ہو گئے ہیں۔ جتنی ہوئی زندگی میں نہ کہیں سایہ قاتل نہ خنک ہوا۔ نہ کسی ایسے مقام کی آس جہاں ہل دہل مٹھرا چا سکے۔ کہیں سکون نہیں تھا۔ کہیں قرار نہیں تھا۔ درد دل کی دوا کسی کے پاس نہیں تھی۔ زخم دل کا مداوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ خانقاہ میں بھکتا پھرتا تھا جیسے کوئی کم کردہ راہ مسافر جسے منزل تک پہنچنے کی زندگی آس تھی نہ آزاد ہو۔ لوگ اس کی طرف اشارے کرتے اسے روک کر اپنا حال کہنے کی کوشش کرتے ایک دوسرے کو بتاتے کہ یہی وہ خوش قسمت ہے جسے جبر صاحب اپنا نگاہ کرم نے کچھ کا کچھ کر دیا تھا۔ وہ کہیں نہیں رکتا تھا۔ کسی کی بات نہیں سنتا تھا۔ بس یہاں وہاں بونی بھکتا پھرتا تھا۔ لوگ اسے دیکھ دیکھ کر کہتے تھے کہ وہ جبر صاحب کے کرم سے اللہ لوگ ہو گیا ہے۔

حکیر یہ اس کا دل جانتا تھا کہ اس پر کیا بیت رہی ہے۔ اسے دنیا کتنی بے رنگ اور اجڑی اجڑی سی معلوم ہو رہی ہے۔ نہ اس کا جی تو قیوں میں لگا۔ نہ وہ حال میں نہ کسی محفل میں نہ ہزار پر۔ اس کی روح میں ایک نکار تھی۔ اس کی نگاہوں میں ایک جستجو اور اس کے دل میں غم۔ وہ کبھی یہاں کھڑا ہو جاتا تو کبھی وہاں۔ کبھی تیزی سے چل پڑتا تو کبھی رک کر نہ جانے کیا سوچنے لگتا۔ اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کسی طرف دیکھتے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ کوئی امانت دل کو نہیں بھاتی تھی۔

والے ہیں۔

”بکواس نہ کر۔“ سجاد نے غصے سے سر جھٹک کر کہا۔

اس نے اپنے مخصوص انداز میں آنکھ دبائی۔

”یار یہاں تو لوگ دل جھٹلی پر لے پھرتے ہیں آپس کی بات ہے میں نے تو سب کو

بہی کہا ہے کہ اپنا منگیتر ساتھ ہے ذرا کسی نے سبلی آنکھ سے دیکھا تو استریاں ڈھیر کر دے گا۔“

وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں ہنس پڑی۔ اس کے سنہری عارضوں میں گلابی رنگ پھوٹا۔

”سجاد! اگر کوئی تھ سے پوچھے تو انکار نہ کرنا۔ تجھے میری قسم۔“

”الوکی پٹھی۔“ سجاد نے دانت چکچکائے۔ ”تجھے منگیتر بنانے کو کوئی اور مسئلہ نہیں

ملاقات۔“

”اور کوئی اپنے جوڑ کا ہے ہی نہیں۔“ اس نے شان دلربائی سے شانے اچکائے۔

”چل جا اب۔ میرا دماغ نہ چاٹ خواہو۔“ سجاد نے بیزار سے کہا اور چلنے کا

ارادہ کیا۔

شہزادی کی خوبصورت شوخ آنکھوں میں گلے کی سی کیفیت اتر آئی۔

”سجاد! تو تو ہمیشہ خفا ہی رہتا ہے۔“ اس کا لہجہ اتنا مختلف تھا کہ سجاد نے غور سے

اس کی طرف دیکھا اور منہ ہی منہ میں کوئی گالی دے کر آگے بڑھا گیا۔

○.....○.....○

وہ یونہی گم سم سا کھڑا تھا کہ شگفتگی ہوئی چٹپٹی ہنسی اس کے چاروں جانب کھڑکی۔ اس نے نگاہ اٹھائی۔ اپنی ہم عمر لڑکیوں میں گھری ہوئی شہزادی ہنس ہنس کر اس کی طرف اشارے کر رہی تھی۔ وہ سخت بیزار ہوا۔ اس کا پی چاہا کہ یہاں سے ہٹ جائے۔ وہ خود بھی کسی کو شریک نہیں کرنا چاہتا تھا۔

لڑکیاں ایک دوسرے کو ٹھوکے دیتی۔ سرگوشیاں کرتیں، شوخ مسکراہٹیں دے رہیں ہونٹوں میں دبا ہنسی اس کے قریب آگئیں۔ سجاد نے الجھ کر حسیں کے اس جبرمٹ کی طرف دیکھا۔ شہزادی کی شوخ آنکھوں میں شرارت چمک رہی تھی۔ اس کے خوبصورت چہرے پر خوشی اور مسکراہٹ کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ لڑکیاں ایک دوسری کے پیچھے چھتیں ایک دوسری کو اس سے بات کرنے کے لئے آگے دھکیلتیں ہنسی رہیں۔ پھر ایک گلابی گالوں والی نٹ کھٹ سی لڑکی ذرا آگے بڑھی اور ہنسنے ہنسنے اس طرح بولی کہ اس کے شوخ لفظوں سے اس کی چٹپٹی ہنسی کہیں الگ نہیں تھی۔

”وہ پا۔ یہ شہزادی تیری کیا لگتی ہے؟“

دوسری لڑکیاں بھی ایک جھٹکا کے سے ہنس پڑیں۔ سجاد نے گھور کر شہزادی کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا بکواس کر رہی ہے؟“

شہزادی نے ہنسنے کی بجائے اپنی ہنسی روک کر کہا۔

”چپ کرو۔ نی چپ۔ ہمارا سجاد تو بڑا ڈاڑا ہے۔ بڑا ہی ڈاڑا۔“

وہ سب ہنسنے ہنسنے دوہری ہو گئیں اور آپس میں سرگوشیاں کرنے لگیں۔ سجاد نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے ہونٹوں پر ناچنے والی چٹپٹی ہنسی اسے کوئی انوکھی اور عجیب شے معلوم ہو رہی تھی جس سے وہ واقف نہیں تھا۔ زندگی جو ہمیشہ اس کے لب کی آہ رہی تھی ان لڑکیوں کے ہونٹوں پر ہنسی بن بن کر کھل رہی تھی۔

شہزادی نے اندازہ نہ کیا کہ وہ خفا ہے۔ اس نے دوسری لڑکیوں کو کچھ کہہ کر بیگ دیا اور خود اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ سجاد نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”جا۔ تو بھی دغ ہو۔ یہاں کیوں کھڑی ہے میرے سر پر؟“

وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

”سجاد! میں تیرے سر پر کھڑی ہو جاؤں تو لوگ یہیں میلہ لگا لیں۔ کہیں کوئی سر رس

کے مرید سوچتے ہوں گے۔ وہ خود یقیناً جاگ رہے ہوں گے۔ عبادت میں معروف ہوں گے۔ وہ چپ چاپ ان کے در پر جا بیٹھے گا اور اس نے اپنے لئے سکون کی دولت مانگ لے گا۔

اس کے دل میں امید کی جوت جلی اور اس کے قدموں میں تیزی آگئی اسے منزل کی خوشبو بہت قریب محسوس ہونے لگی۔ اسے یقین سا ہونے لگا کہ پیر و مرشد اسے سکھائیے بھیک دے دیں گے۔ وہ اس کی جھولی میں سکون کی دولت ڈال دیں گے۔ وہ اسے دنیا سے بے نیاز کر دیں گے۔ یہی سب اس کے کشائ کشائ پیر صاحب کے حجرے کی طرف کھینچے جاتی تھی۔ وہ ڈیوڑھی کے دروازے پر لمبے بھر کر کا پی تھا کہ دروازہ دھڑ سے کھل گیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔

کوئی لڑکی بدحواسی میں جمی تھی۔ گرتی پڑتی ڈیوڑھی سے باہر آئی۔ بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوئی وہ دایر پر گھومنے ہوئے سچا دل کے ساتھ بڑے زور سے ٹکرائی۔ وہ بھی لڑکھڑایا لیکن سنبھل گیا اور اسے شانوں سے بکڑ کر روک لیا۔ وہ گھبرا کر خود کو چھڑانے لگی۔

سچا دل نے بولکھلا کر اس کا چہرہ دیکھا۔ اس کے ہال بھرے ہوئے تھے۔ اس کی اور حسی زمین پر لٹک رہی تھی۔ وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں تھی۔ سچا دل نے پریشانی میں اسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”شہزادی! شہزادی! ہوش کر۔ ہوش کر۔ کیا ہوا ہے تجھے؟ یہ کیا حال بنایا ہے تو نے اپنا؟“

وہ ٹھٹک گئی۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور بے ساختہ اس کے بازو سے لگ گئی۔

”سچا دل! مجھے یہاں سے کہیں اور لے چل۔ مجھے یہاں سے نکال۔ خدا کے لئے سچا دل مجھے کہیں اور لے جا۔“

سچا دل نے شہزادے کو اسے خود سے علیحدہ کر دیا اور تسلی کے لئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا لیکن اسے اس پر شہ پر غصہ آ رہا تھا۔ اس کی خوشی اور بے باکی نے ہی بے نوبت پہنچائی تھی۔ اب اس کی خوشی، شرارت، بے باکی اور طراری سب کا فور ہو گئی تھی۔ وہ آنکھوں سے پتے ہوئے آنسوؤں کو دونوں ہاتھوں سے پونچھتی ہوئی بچکیاں میں رہی تھی۔ وہ اپنا مضبوط نہر سکا اور اس کا بازو بکڑ کر اسے اوٹ میں لے جاتے ہوئے بولا۔

وہ سکون کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا تھا مگر سکون کہیں نہیں تھا۔ اس کا پی چاہتا تھا کہ پیر و مرشد کے حجرے میں جا کر اپنا سر ان کے قدموں میں رکھ دے۔ اپنا چاک چاک دل ان کے سامنے کھول دے۔ اپنا دنگار سیدہ آئینہ دکھائے۔ ان سے کہے کہ انہوں نے تو اسے مشکلیں آسان ہو جانے کی دعا دی تھی لیکن اس کی تو مشکلیں اور بڑھ گئی تھیں۔ اس کی بے سکونیوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کا قرار لٹ گیا تھا۔ اس کی روح میں اندھیرا چھا گیا تھا۔

وہ ملاں پھوڑی کو حیرت سے دیکھتا جو اس آستانے پر آکر بالکل بدل گیا تھا۔ وہ اگلیوں میں تسبیح پھراتا یوں مطمئن اور آسودہ نظر آتا تھا جیسے دل میں کوئی غلش نہ ہو۔ جیسے ضمیر پر کوئی بوجھ نہ ہو۔ کاش وہ بھی اس آسودگی کا ذائقہ چکھ سکتا۔ کاش یہ آستانہ اس کی تقدیر بدل سکتا۔ اس کا لخت لخت دل ٹھکانے نہیں آتا تھا۔ دکھ، غم، ٹھکرات اس کے پیچھے پیچھے اس کے آس پاس اس کے گرد و پیش ہر طرف فضا میں تیرتے پھرتے تھے۔

خافہ میں بے مقصد گھومتے گھومتے وہ ٹھک کر چور ہو گیا تھا۔ آخر وہ ایک گوشے میں پردہ کسوئے کی کوشش کرنے لگا لیکن نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کرشمیں بدل بدل کر اس کا جسم دیکھنے لگا۔ فضا میں جس بدھتا جاتا تھا یا اس کے اپنے اندر کی گھٹن تھی جو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

رات کی سیاہ چادر پر گئے ہوئے ستارے دم دم دم دم اور بے نور تھے۔ فضا میں ایک عجیب ناگوار سی بورچی ہوئی تھی۔ قریب سوئے ہوئے لوگوں کے خراٹوں کی آوازیں مکر وہ اور کراہت آمیز تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر پرت لیٹا آسمان کی طرف خالی خالی نظروں سے گھورتا رہا۔ پھر کچھ سوچ کر اٹھا اور ارد گرد کسوئے ہوئے لوگوں سے پچتا پچتا پیر و مرشد کے حجرے کی طرف چل پڑا۔ ہوئے ہوئے پاؤں دھرتا وہ سوچ رہا تھا کہ اس گہری رات میں پیر و مرشد

نے شش و پنج کے عالم میں کہا۔

اس نے ایک بل میں دنیا بیتی دیکھی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اتنی تیزی سے سامنے آیا تھا کہ اس پر یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ اس نورانی صورت والے پیر کے بارے میں ایسا سوچنا بھی گناہ معلوم ہوتا تھا جس کی ایک نگاہ نے خود اس کی دنیا میں الجھل سی چا دی تھی۔ وہ اس کے بارے میں کس طرح یہ سب کچھ سوچ سکتا تھا۔

”سجاد! میں اور کس طرح بات کروں۔ تجھے کس طرح سمجھاؤں؟“ اس کی آواز بھرا مٹی۔

”میں بھی مٹی ہی ہوں سجاد! مگر ایسی تو نہیں کہ ایسی تہمت اپنے نام لوں گی۔“ شاید پہلی بار سجاد نے اس کی آنکھوں میں مٹی دیکھی تھی۔ اس کی بھرائی ہوئی آواز میں آنسوؤں کی آمیزش تھی۔ اس کا بات کرنے کا انداز جی کی گواہی دے رہا تھا۔ وہ پشیمان سا ہو کر بولا۔

”شہزادی! اس بات نے تو مجھے حیران کر دیا ہے۔ اس پیر کو دیکھتا ہوں تو یقین ہی نہیں آتا لیکن تو تسلی رکھ۔“ اس نے شہزادی کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”گھر نہ کر۔ اگر وہ پیر واقعی ایسا بندہ ہے تو مجھ اب اس کی خیر نہیں۔ لیکن دیکھ یہ بات اپنے تک ہی رکھنا۔ خبردار جو کسی کے سامنے زبان کھولی۔ اور اگر اب تجھے غلام وہاں بھیجے تو فوراً مجھے خبر کرنا۔ سمجھی؟ اس کے یہاں ہزاروں مرید ہیں۔ اس بات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو۔“

شہزادی نے اپنے سر پر رکھا ہوا اس کا ہاتھ قلم لیا۔

”سجاد! مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں اب یہاں نہیں رہتا چاہتی۔ وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ میں نے اسے دشمنی کر دیا ہے۔ وہ مجھ سے بدلے لے گا۔ سجاد! میں اپنی مری ماں کی تم کھاتی ہوں۔ میں ایسی دیکھی لڑکی نہیں ہوں۔ میرا دامن پاک ہے۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ تو مجھے اپنے کپڑوں کا جوڑا لا دے میں ابھی یہاں سے نکل جاؤں گی۔“

سجاد بے طرح پریشان ہوا۔ اندھیری سناں رات اور وہ تنہا لڑکی۔ بھلا اس وقت کہاں جا سکتی تھی۔ اس غیر متوقع صورتحال نے ذہن بالکل ہی ماؤف کر دیا تھا۔ اس پر شہزادی بڑبڑاتے ہوئے نہیں دیتی تھی۔ اس نے مسلسل یہ رٹ لگا رکھی تھی کہ وہ ابھی اور اسی وقت یہاں پہنچ جائے گی۔ سجاد دلچ زبج ہو کر اس پر برس پڑا۔

”کتنی تیزی سے شہزادی نے ہی یہ چاند چڑھایا۔ برا بھلا کچھ نہیں کہتی۔ ہر ایک سے بک بک کرتے کھڑی ہو جاتی ہے۔“ شہزادی نے زور سے اس کا بازو ہلکا اور سر کٹی سے بولی۔

”تو کیا کہ میں کوئی ایسی دیکھی لڑکی ہوں۔ میں آپ تو اس مسئلے کے پاس نہیں مٹی تھی۔ مجھے ملاں نہ بھیجا تھا۔“

”کس کے پاس؟“ سجاد نے جگت میں پوچھا۔

”اسی کہنے پیر کے پاس۔ کہتا تھا اس کے گھر سے بنیادیں تو خودی خدمت کر دیتا۔ مجھے کیا پتا اس بد معاش کی کیا مرضی ہے۔ بڑا ہی بنا بھرتا ہے۔ پھر میں نے بھی ایسے ہوش ٹھکانے لگائے ہیں کہ ایک بار تو یاد ہی کرے گا۔ الو کا پتلا پیر۔“

سجاد بھونچکا سا رہ گیا۔ وہ ٹھیک طرح سے سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ شہزادی کیا کہہ رہی ہے۔ وہ کس کا ذکر کر رہی ہے۔ وہ کس کو صلوٰۃ تیس ساری ہے۔ پیر و مرشد کے بارے میں تو وہ ایسی بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن شہزادی تو اسی کا نام لے رہی تھی۔ شاید اسے کوئی غلط فہمی ہوئی تھی یا اچانک حادثے کی وجہ سے اس کا دماغ چل گیا تھا۔ اس نے زمین پر گھٹنیں ہوئی اس کی اوڑھنی اٹھا کر اس کے سر پر ڈالی اور دلی زبان سے بولا۔

”کچھ سوچ مجھ کے بات کر شہزادی! تجھے دھوکہ تو نہیں ہوا۔“

”میں ابھی اتنی اندھی نہیں ہوئی۔ سمجھا تو۔“ وہ ترخ کر بولی۔

”تجھے میری بات پر یقین نہیں آتا تو چاند جا کر ابھی اس بد معاش سے پوچھ لے۔ جا جا کے ہلدی چڑھا لگا اس ماسے کو۔ جو کہینہ بدکار پیر بنا پھرتا ہے۔“ اس کی آواز بلند ہونے لگی۔

”آہستہ بول۔“ سجاد نے گھبرا کر اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے غصے سے ایک جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔

”کسی نے تیری یہ بکواس سن لی تو ہم دونوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“

”جو ہوتا ہے سن لے۔ میں جھوٹی نہیں ہوں جو کسی سے ڈروں۔ تو ابھی آ میرے ساتھ۔ چل اسی بد معاش کے حجرے میں۔ میں تو تھی ہوں اس کے منہ پر۔“ وہ دانت چپیں کر گالیاں بکتے ہوئے بولی۔

”مختل سے کام لے شہزادی۔ ذرا جھل سے مجھے بتا کہ بات کیا ہوئی ہے۔“ سجاد

”دماغ تو صحیح ہے تیرا الو کی جیٹی! اس وقت اکیلی تو کہاں جانے گی؟ کہاں مرے گی؟ اب کسی اور کے ہتھے چڑھنا چاہتی ہے۔“

اس نے حسب عادت اسے ترکی پر ترکی جواب نہیں دیا۔ اس کے دلکش چہرے پر ایک زراعی سی کیفیت چھا گئی۔ وہ دو قدم آگے بڑھتی اور اپنا چھوٹا سا سلام باہم اس کے شانے پر رکھ کر دھیرے سے مسکتی گئی۔

”سہاول میں اکیلی ہوں نا۔ تو میرے ساتھ چل۔ چل ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں چلے گا۔“ اس کے والہانہ لہجے میں جیسے اربانوں کی کلیاں چنگ رہی تھیں۔

سہاول نے چونک کر اس کا ہاتھ پرے جھٹک دیا اور گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کے غصے کی پروا کے بغیر اس کے بازو سے لگ گئی۔

”سہاول! تو مجھے کہیں بھی لے چل۔ میں آنکھیں بند کر کے تیرے پیچھے چل پڑوں گی۔ میں ساری عمر تیری غلامی کروں گی۔ ساری عمر۔“

”بیچہ ہٹ۔ کسی نے دیکھ لیا تو۔“ سہاول نے بھراے پیچھے دھکیل دیا اور ناراضی سے بولا۔

”بیوقوفی کی باتیں مت کر۔ جا۔ جا کر آرام کر۔ کوئی ایسی ویسی بات ہو تو مجھے فوٹا تانا۔“

”سہاول میری بات مان لے۔“ شہزادی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

سہاول نے سر جھٹکا۔

”پاکل ہوئی ہے۔ چل جا کر سو جا۔ تجھے ملاں کا پتہ نہیں۔ جینا حرام کر دے گا۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور دوپٹوں کی کھڑی ہونٹ کا پتہ نہ لے کر اس کا ہاتھ

تھما۔

”چل میں تجھے اپنے ڈیرے تک پہنچا آؤں۔“

”نہیں تو رہنے دے۔ میں آپ چلی جاؤں گی۔“ شہزادی نے اس کا ہاتھ پرے دیا اور آگے بڑھ گئی۔

○ ○ ○ ○ ○

اگلی صبح شہزادی غائب تھی۔ ملاں اور ڈیرے کے دوسرے لوگ سب حیران تھے کہ

کدھر گئی۔ پہلے تو ملاں بھی سمجھتا رہا کہ وہ بچہ و مرشد کی حویلی کے زنان خانے میں ہے۔ مگر جب شام تک اس کی کوئی خبر نہیں ملی تو اس نے بچہ و مرشد کے مریدوں سے پوچھا۔ یہ سن کر اس کے مریدوں سے زمین نکل گئی کہ بچہ و مرشد کا ایک مرید بھی غائب ہے۔ غالباً وہ اسی کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔

بچہ و مرشد کے مریدوں نے کہا تھا کہ آئندہ وہ ایسی بدچلن لڑکیوں کو اپنے ہمراہ لے کر نہ آیا کرے۔ اگلی تو انہوں نے بچہ و مرشد کو اس واقعے کی خبر نہیں ہونے دی تھی ورنہ ان کے جلال کی حد نہ ہوتی۔ ملاں نے ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی منت سناہت کی کہ وہ اس بات کی کسی کو کالوں کا خبر نہ ہونے دیں۔ خاص طور پر بچہ و مرشد سے اس کا باطل ذکر نہ کریں ورنہ وہ ان کے سامنے نگاہ اٹھانے کے قابل بھی نہیں رہے گا۔

شہزادی کے غائب ہونے کی خبر نے سہاول کو بے حد غم مند کر دیا تھا۔ وہ جو پہلے ہی نیلے اور پریشان خواب کچھ اور بے چین ہو گیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اسے بچہ و مرشد نے ہی غائب کر دیا ہے۔ اور اگر وہ اپنی حماقت میں خود کہیں نکل گئی تھی تو بھی اس کی خبر نہیں تھی۔ ملاں اس کی جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ اس کے کارندے اسے بوکیر کنوں کی طرح ہر طرف سونگھتے بھرتے تھے۔ وہ کہاں تک چھپ سکتی تھی۔ کتنی دور تک بھاگ سکتی تھی۔

بار بار اس کی شری آنکھیں، اس کی جھنجھلی ہنسی، اس کی ٹٹ کھٹ شرارتیں سہاول کی یادوں میں ابھرتی تھیں۔ وہ کسی زندگی سے بھرپور، بستی پیکلی لڑکی تھی لیکن اب نہ جانے کس حال میں تھی۔ کہاں تھی؟ کدھر چلی گئی تھی؟ اسے ابی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں ملاں کے کارندے اسے ڈھونڈ ہی نہ لگائیں۔ اسے بھی ملاں نے یہ فرض سوچنا تھا کہ وہ قرعہ شیش اور بسوں کے اڈے پر اسے تلاش کرے۔

سہاول بظاہر تو خانقاہ سے نکل کر بسوں کے اڈے کی طرف چل پڑا تھا لیکن اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ ساری دنیا سے اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔ عقیدتوں کے برج ستارے سمار ہو گئے تھے۔ اس کا مٹی چاہتا تھا کہ اس مخوں بھر کے منہ پر کا کھل کر اسے گیوں بازاروں میں گھسیٹتا بھرے۔ ایک ایک کو اس کے گالے لگواتا بتائے۔ اس کے کردہ چہرے سے نیک نامی کی نقاب لوٹ کر اس کا اصلی چہرہ دنیا کو دکھا دے۔

وہ دل ہی دل میں اس پر سوچ رہا تھا۔ وہ کوئی ایسا منصوبہ بنانا چاہتا تھا کہ بڑے کو بے نقاب کر سکے جس نے اپنے کچھ دھمکائی کلمات کا ایک جال سا بن کر رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ بہت

”ابھی پتہ کر کے آتا ہوں۔“ سجاد نے چلتے چلتے کہا تو ملاں کروٹ بدل کر پھر سو گیا۔

پیر و مرشد کے حجرہ خاص کے سامنے ایک جھوم تھا لیکن کسی کو کچھ خبر نہیں تھی کہ اندر کیا ہو رہا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو دھکے دے دے کر آگے جانے کی کوشش کر رہے تھے۔ کچھ اڑیاں اٹھا اٹھا کر دوسروں کے کندھوں پر سے جھاک رہے تھے۔ کچھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ یہ کیسا شور ہے؟ کسی کی پیچیں اور کیسے تھپتھپ سناؤ دے رہے ہیں؟ حجرے میں کون لڑکی ہے؟

لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ صرف قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اندازے لگاتے جا رہے تھے لیکن آگے کیا ہو رہا ہے کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ لوگوں کے آپس میں باتیں کرنے سے ایک شور مچ گیا تھا لیکن لڑکی کے تھپتھ اور پیچیں اب بھی سناؤ دے رہے تھے۔ جس وقت یہ دھشتاں ہنسی چاروں طرف گونجتی تو جیسے پر سکوت سا چھا جاتا۔

اچانک آگے کھڑے ہوئے لوگوں میں ایک معمولی سی بچی گئی۔ کسی نے پیچھے مڑ کر بلند آواز میں روتے ہوئے فریاد کی۔

”ہم مارے گئے۔ ہم لٹ گئے۔ پیر صاحب قتل ہو گئے۔“

”ہیں.....! پیر کی ماریے گئے؟“ کسی نے وحشت سے کانپ کر کہا۔

”ہائے.....! ہائے.....! پیر سائیں کا خون ہو گیا۔“ کوئی کرب سے چلایا۔

”ہم لٹ گئے۔ ہم جیم ہو گئے۔ اللہ والی سرکار کا دصال ہو گیا۔“ کسی نے سینے پر

”اترنا۔“

سارے مجھے میں ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ ”پیر و مرشد شہید ہو گئے۔“

فضا میں خون کو جھجھ کر دینے والی وحشت چھا گئی۔ کسی کو اعتبار نہیں آتا تھا۔ کوئی یقین نہ کرتا کہ یہ نہیں تھا۔ لوگوں کے سروں پر جیسے آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ بیروں تلے زمین ڈول رہی تھی۔ سب حیرت و سراسیمگی کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ پیر صاحب کو اس نے قتل کیا ہے؟

کسی نے بتایا کہ پاس اگلی لڑکی نے جو تھپتھ لگا رہی ہے۔ لوگ دم بخود ہو گئے۔ حیرت نہ انہیں تنگ کر دی۔ ایک معمولی لڑکی اتنے پیچھے ہوئے پیر کو کس طرح قتل کر سکتی ہے؟ اس والے نے سارے ذہن کو چکرا دیا تھا۔ لیکن اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

لیے تھے۔ علاقے کے تمام معزز زلوگ وہاں حاضری دیتے تھے۔ اس پر کوئی الزام لگانا اور اسے ثابت کرنا آسان نہیں تھا لیکن وہ پھر بھی اس کی مصنوعی کرامات کا پردہ چاک کرنا چاہتا تھا۔ خواہ اس میں اس کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔

وہ اسی اوچھڑ بن میں لگا ہوا بسوں کے اڈے تک گیا اور پوچھی ادھر ادھر آوارہ گردی کر کے کہیں شام کو واپس آیا۔ یہ جان کر اسے ایمٹان ہوا کہ ملاں کے کسی کارندے کو شہزادی کی خبر نہیں ملتی تھی۔ مگر یہ فکر ابھی بھی اس کے دل سے دور نہیں ہوا تھا کہ اگر شہزادی کو پیر کے بندوں نے غائب کیا ہے تو نہ جانے وہ کہاں ہوگی؟

رات نکلنے سے کھانا آیا تو اس نے بے نام ہی کھایا۔ نہ وہ صبح میں شریک ہوا نہ کسی اور محفل میں۔ بس چپ چاپ ایک کونے میں پڑ کر لیٹ رہا۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور فانی پریشانی نے اس کی پلگوں کو بو بھل کر دیا۔ وہ کچھ دیر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہا پھر نہ جانے کب سو گیا۔

اچانک عجیب سے شور وغل سے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے ارد گرد سونے ہوئے دوسرے لوگ بھی اٹھ اٹھ کر بیٹھ رہے تھے۔ کسی لڑکی کے خوشگام قہقہوں سے خاموش رات گونج رہی تھی۔ کچھ لوگ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کچھ نے لیٹے لیٹے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے؟ اور کچھ اسی طرح بے خبر پڑے سوئے رہے۔

رفتہ رفتہ تھپتھ چوچوں کا روپ دھارنے لگے۔ ان میں تیزی اور دہواگی پیدا ہونے لگی۔ لوگ صُفک گئے۔ کچھ اور اٹھے۔ کچھ نے قیاس آرائی کی کہ پیر و مرشد کسی کا جن نکال رہے ہیں۔ کسی نے کہا کہ کسی موکل کو زبرد کر رہے ہیں۔ جن اور موکل کا تذکرہ من کر کچھ لوگ منہ لپیٹ کر پھر پڑ رہے لیکن کچھ من چلے اٹھ کھڑے ہوئے کہ اپنی آنکھوں سے پیر صاحب کی کرامات دیکھیں۔

سجاد کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ اصل معاملہ کیا ہے؟ یہ سوچ کر اس کے اعدا ایک ہیجان سا بنا ہو گیا کہ آج کسی اور شہزادی کا آجلی پیر کے کندے آتھوں میں ہے۔ اس کی رگوں میں گردش کرتا ہوا لہو اوابن گیا۔ وہ لپک کر اٹھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ آج وہ پیر فیصلہ کر کے ہی رہے گا۔ اس کے قریب ہی لیٹے ہوئے ملاں نے نیند بھری آنکھیں بھٹک کھولیں اور نیم غنودگی کے عالم میں بولا۔

”سجاد! یہ کیسا شور ہے؟“

تھوڑی دیر بعد پیر صاحب کا ایک مرید خاص باہر آیا۔ اس کا چہرہ جھکا ہوا تھا اور روئے روئے اس کی چنگی بندھ گئی تھی۔ اس نے مجھے کو کتابا کر لڑکی پر کسی بھاری جن کا قبضہ تھا جس پر قابو پانے کی کوشش میں پیر صاحب شہید ہو گئے تھے۔

لوگ جواب تک شش و پنج کے عالم میں تھے اور بے یقینی سے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ ابھی اس خبر کی تردید ہو جائے گی۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ غور میں بلند آواز میں بین کرنے اور سر کے بال نوچنے لگیں۔ کچھ لوگ کھٹے میں آگئے۔ کچھ مدد سے سے ٹنگ ہو گئے۔

لڑکی کے قریب کوئی بھی جانے کی ہمت نہیں کر رہا تھا۔ وہ کبھی قہقہے لگاتی، کبھی چپیں مارنے لگتی اور کبھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ اس کے ہونٹوں سے مغلقات کی بارش ہورہی تھی۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا۔ اس کی آواز پھٹ گئی تھی۔ وہ نوٹے پھوٹے لفظوں اور اجڑے جملوں میں نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔

بھوکہ کو دیکھ کر اس کی وحشت بڑھ رہی تھی۔ کبھی وہ حجرے کے اندر چلی جاتی۔ پھر زور سے دروازے کے پتہ بجاتی، نہ جانے کیا کچھ کہتی ہوئی باہر آتی۔ کبھی ہنستی، کبھی روتی۔ کبھی گالیاں بکتی اور کبھی نہ جانے کس کو کوئی۔ اس کے مطلق سے غیر انسانی آوازیں نکل رہی تھیں۔

جس سے لوگ دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ اس پر جن کے قبضہ کا خوف کسی کو آئے نہیں بڑھنے دیتا تھا۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ جا کر اسے قابو کرے۔ سب اس خوف سے کانپ رہے تھے کہ لڑکی پر جن سوار تھا۔ جو اتنا طاقتور تھا کہ اس نے اتنے بچپنے ہوئے پیر کو قابو کر دیا تھا۔

سجاد مجھے میں سے راستہ بناتا ہوا پیر مرشد کے حجرے کے قریب پہنچ گیا۔ وہ خود جانتا تھا کہ پیر مرشد اور لڑکی میں کیا معاملہ ہوا تھا۔ لڑکی خود کو بچاتے ہوئے پیر کو قتل کر گئی تھی۔ شاید اسی قتل کی دہشت نے اسے پاگل کر دیا تھا۔ وہ اس لڑکی کو دیکھنا چاہتا تھا جس نے اپنے سرخون لیکر نہ جانے کتنی ڈھیراؤں کے آچھل تار تار ہونے سے بچائے تھے۔

حجرے کے قریب پہنچ کر اس نے احاطے میں شیرنی کی طرح بھری ہوئی لڑکی دیکھا۔ جس کے لمبے سیاہ بال کھل کر بکھر گئے تھے۔ جس کے کپڑے کہیں کہیں سے مکے ہو گئے۔ جس کے سر پر چادر نہیں تھی۔ جس کے چہرے پر چھائی ہوئی دہشت نے اسے

خوبصورت نقوش بگاڑ دیے تھے۔ جس کی وحشی آنکھوں سے غم و غصے کی چنگاریاں بی پھوٹ رہی تھیں۔ وہ کسی ایک سمت نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی ایک جگہ نہیں ٹھہرتی تھی۔ اسے کسی کل قرار نہیں تھا۔ وہ بار بار سر جھٹکتی ہوئی اپنے ہی بال ہلاتی تھی۔

سجاد ٹھک گیا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں تھا۔ اس کا دل جیسے کسی نے منہ میں لے لیا۔ وہ غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ مگر بے مددے میں ڈوبے ہوئے اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھی۔ "کاش یہ لڑکی یہاں نہ ہوتی۔"

اسے بلور سے ترشے ہوئے خوبصورت پردوں میں کھٹکتی ہوئی جھانگریں یاد آئیں۔ اسے غرور حسن سے تھماتیا ہوا دلکش چہرہ یاد آیا۔ اسے سستی میں ڈوبی ہوئی گلابی آنکھیں یاد آئیں۔ اسے اکھڑے جیسے میں بولنا ہوا پیار یاد آیا۔ اسے تھیلے تھوڑا اور باز سے کبھی ہوئی گردن یاد آئی۔

اس کے اندر بے طرح ٹوٹ پھوٹ ہوئے تھے۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا دشوار ہو گیا۔ رنج و الم کی تڑپا دینے والی کیفیت نے اسے چور چور کر دیا۔ اس کا جی چاکر رو پڑے۔ یہی طرح باگی اور دلبرہ گلابی کے ہاتھ تو ہندی کے بجائے خون سے رنگے گئے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں پولیس کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دینے لگے۔ پیر مرشد کی دورو ایک بڑی سا کھٹی۔ اسی لئے فواری ساری مشینری حرکت میں آگئی تھی۔ سجاد کی آنکھوں نے سامنے دلاؤ بڑی کے پیکر سحر کی صورت کو پولیس والے اپنی گاڑی میں ڈال کر لے گئے اور دو ترکوں دل کو جھٹلا دیا۔ پیر مرشد گریا۔

زندگی کا یہ قسم اس پر بہت بھاری پڑا تھا۔ اسے ہر شے ٹوٹی ہوئی سی محسوس ہوتی تھی۔ ہر طرف بے قراری اور بے لگبی تھی۔ بے یقینی اس کی رگ رگ میں ساکتی تھی۔ اسے بار بار پھولوں کی گلابی کا خیال آتا تھا جو جیل کی سنگلاخ دیواروں کی طرف چلی گئی تھی۔

یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کچھ بھی اپنے اختیار میں نہ ہو۔ نہ لمحے، نہ دل، نہ وقت، نہ آواز۔ نہ تقدیر، نہ اپنا آپ، بے اختیار اور بے کسی جیسے چاروں طرف برس رہی تھی۔ وہ اکٹایا ہوا، بیان حال، رنج میں ڈوبا، اجمرا اس جگہ سے دور ہٹا گیا۔ وہ اس جگہ سے، اس مقام سے، اس لمحے سے بہت دور نکل جانا چاہتا تھا۔ جہاں گلابی قاتل کے روپ میں کھڑی تھی۔ وہ انہیں اپنے ہوئے پردوں کے ساتھ بے سمت چٹا چلا گیا اور نہ جانے کب تک چٹا رہا۔ خود بہتر کر دو پیش سے لاپرواہی سے بلا سمجھے۔

اچانک اس کا پاؤں مٹی کی ڈھیری سے ٹکرایا۔ وہ گرتے گرتے بچا اور جیسے گرد و پیش میں لوٹ آیا۔ اس نے حیرت سے چاروں طرف دیکھا۔ وقت اور مقام اور سب کچھ بدلا بدلا سا نظر آتا تھا۔ وہ بغیر کچھ کھائے پیئے نہ جانے کہاں نکل آیا تھا۔ اس کے چاروں طرف نغصا خاموشی تھی۔ اور ہر طرف مٹی کی چھوٹی بڑی ڈھیریاں بکھری پڑی تھیں۔ وہ شاید کوئی قبرستان تھا۔ جس کی نغصا میں ہیبت اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔

سجاول کے دل کی اداسی اور گہری ہو گئی۔ زندگی کے انجام نے اس کی ہاپوسی اور حسرت بڑھا دی۔ اسے وقت، زندگی اور ساری دنیا مٹی کا ڈھیر نظر آنے لگی۔ اس نے نیچے ہوئے دل کے ساتھ سوچا کہ زندگی کی حرارت، روفی اور گہما گہمی کو یوں مٹی کا ڈھیر ہی ہونا ہے تو پھر یہ ساری تک و دو، یہ سارا تکمیل اور یہ ساری جیت ہار کس لئے۔

ہر طرف ویرانی ہی ویرانی۔ نا آسودگی اور اکیلا پن تھا۔ اس نے گھبرا کر اس جگہ سے دور نکل جانا چاہا۔ جو اسے اس کی، زندگی کی اور ہر شے کے فنا ہو جانے کی خبر دے رہی تھی۔ وہ تیز قدم اٹھا رہا تھا کہ اچانک ٹھک گیا۔

اس نے حیرت سے دیکھا کھلے ہوئے بالوں والی ایک عورت ایک قبر پر اوندھے منہ پڑی تھی۔ اس کے قدم وہی رک گئے۔ اس کے دل پر نامعلوم ہی ہیبت چھا گئی۔ اس کے رونکنے کڑے ہو گئے۔ اس ویران سے قبرستان میں یہ کون عورت تھی جو قبر سے لپٹی ہوئی تھی اس کے ہجرت پر بال مٹی سے اٹے ہوئے تھے۔ وقفے وقفے سے اس کی سسکیوں کی درد منگوا صدا سنائی دیتی تھی۔ جو روح پر ایک لرزہ سا طاری کر دیتی تھی۔ وہ شاید کچھ کہہ بھی رہی تھی لیکن اس کے شکستہ لفظ کچھ میں نہیں آتے تھے۔

سجاول کو افسوس سا ہوا۔ اس کا دل چاہا کہ اسے تسلی دے۔ اسے سمجھائے کہ دنیا کا کچھ دستور ہے۔ خدا کی مرضی کے سامنے کون دم راس کا ہے۔ اس کے اس طرح رونے اور ہوا کھونے سے مٹی کے ڈھیر میں مٹی ہو جانے والا رشتہ اس کی محبت، اس کی چاہت اسے واپس نہیں مل سکتی۔ وہ دو چار قدم آگے بڑھا اور اس نے غصے سے لہجے میں پکارا۔

”بی بی!..... بی بی! انھہ گھر جا اس طرح رونے سے کبھی کوئی واپس نہیں آیا۔ اللہ بھی مرضی ہے۔ مرنے والے کے ساتھ ہر انھیں جاتا۔“

اس نے بہت کچھ کہا اور کئی دفعہ کہا۔ لیکن اس نے جنہیں تک نہیں کی۔ نہ پہلو ہلا

سجاول نے ارد گرد دیکھا۔ قبرستان میں ہر طرف ویرانی کا بسیرا تھا۔ کوئی ذی روح یہاں ان کے سوا نہیں تھا۔ ہر طرف موت کے سائے منڈلاتے نظر آتے تھے۔ سجاول نے چاہا کہ آگے بڑھ کر اس کا شانہ ہلائے یا اسے قبر سے علیحدہ کرنے کی کوشش کرے۔ اس کی خستہ حالت دیکھ کر اس کا دل کڑھ رہا تھا۔

اس نے اسے دونوں شانوں سے پکڑ کر آہستہ سے اٹھانے کی کوشش کی اور ملائمت سے بولا۔ ”انھہ بی بی! اپنے گھر جا۔ اللہ تعالیٰ مجھے مہر دے۔ تیری پریشانی دور کرے۔“

”نہیں..... نہیں۔ میں اپنے کاکے کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گی..... وہ میرے بغیر نہیں رہتا۔“ اس نے خود کو اس کی گرفت سے چھڑا لیتا چاہا۔ لیکن سجاول نے اسے اس کا موقع نہیں دیا اور اسے قبر پر سے اٹھا کر اس کے پیروں پر کھڑا کر دینا چاہا۔

وہ تڑپ کر اس کی گرفت سے نکل گئی اور دور بہت کر دشت زدہ نظروں سے اس کی جانب لنگھنے لگی۔ اس کا سارا چہرہ مٹی مٹی ہو رہا تھا۔ ارد گرد آلود ہال بکھرے ہوئے تھے۔ سجاول نے دکھ اور ہمدردی سے اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ وہ خود کو روک نہیں سکا بے ساختہ آگے بڑھ کر اس نے اس کے دونوں ہاتھ تھام لئے۔

”رائی! تو نے یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟ تجھے کیا ہوا ہے؟“ وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کی دلکش بادامی آنکھوں میں دشت اور ویرانی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ کچھ خوف زدہ کی کڑی بھی اس کی طرف اور کبھی قبر کی طرف اس طرح دیکھ دیتی تھی۔ جیسے اس انتظار میں ہو کہ وہ جائے اور وہ پھر میرے لپٹ کر منوں مٹی سے ملے۔

سجاول کے دل کی دنیا تاراج ہو گئی۔ دکھ اور رنج کے پھل دینے والے احساس نے اسے چور چور کر دیا۔ اس کے من کی اکلونی آرزو یہ کس روپ میں اس کے درد کو کڑی تھی۔

”میری آنکھیں ملے۔ ہوش و خرد سے بیگانہ اجڑی اجڑی ہو گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ٹوٹی ہوئی التجا تھی۔

”میرا کاکا!..... میرے بغیر نہیں رہتا، وہ ڈر جاتا ہے۔ وہ روتا ہے۔ وہ روتا ہے۔“ وہ

ہٹ گئی۔ اور ناخن چپاتی ہوئی ہوئی۔

”نہیں..... نہیں۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ میں اپنے کا کے پاس رہوں گی۔

اپنے کا کے پاس۔ اس کے ساتھ۔“

سجاد نے اس کے ہونٹوں سے کھرتے ہوئے شکستہ جھڑپوں کو سنا۔ لیکن وہ اس کے سوا کچھ نہیں سمجھ پایا کہ وہ اپنے بچے کے غم میں ہوش و حواس کھو بیٹھی ہے۔ اسے وہ لمبے یاد آئے جب خانقاہ میں وہ اس کے قدموں میں بیٹھی اپنے بچے کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں سے جھلکتا ہوا اس کا عکس آنسوؤں میں بھیک گیا تھا۔ لیکن آج اس کے آنسوؤں میں کوئی عکس، کوئی تصویر، کوئی چہرہ نہیں تھا۔ سجاد کو لگا جیسے اس کے پاس کچھ بھی نہیں رہا۔ رانی کی یہ بے جا حالت دیکھنے کیلئے کاش وہ یہاں بھی نہ آیا ہوتا۔

سجاد کا جی تھا کہ اپنے ہاتھوں سے اس کے ہال سینے۔ اس کے چاندیے چہرے سے گرد ہٹائے اور اسے اسی اچلے روپ میں دیکھے جو آج بھی اس کے دل کے آسان پر پورے چاند کی طرح روشن تھا۔ وہ پھر ایک بار اس کے قریب آیا۔ اور ملاحت سے بولا۔

”رانی!..... ہوش کر۔ دیکھ مجھے بچپان..... میں سجاد ہوں سجاد۔ میں سجاد ہوں۔“ اس نے بار بار دوہرایا کہ شاید کوئی لفظ، کوئی حرف اس کے دل پر جا گئے۔ شاید اس کا نام اسے چونکا دے۔ شاید اس کی بچپان اس کے ہوش کو نوا دے۔

لیکن اس کی دشت بھری آنکھوں میں کوئی پہچان نہیں ابھری۔ وہ کچھ خوفزدہ سی اپنے بچے کے بارے میں نہ جانے کیا سمجھتی تھی۔ اگلے قدموں اس سے دور ہوتی گئی۔ سجاد ابھی کچھ کھانا چاہتا تھا کہ دروازے سے کسی کی آواز سنائی دی۔

”رانی!..... اورانی۔ تو پھر یہاں پر ہی ہے۔ چل آگھر چل۔ آ جا شایاں۔“ سجاد نے پلٹ کر دیکھا گاڑھے کی ہکل میں کوئی دیہاتی عورت تھی جسے سجاد نہیں پہچانتا تھا۔ لیکن اس نے فوراً ہی اسے سلام کر دیا۔

اس نے سلام کا جواب دینے کے بجائے اسے سر سے پاؤں تک تنقیدی نگاہوں سے دیکھا اور کچھ اکڑ لہجے میں بولی۔ ”بھائی تو کون ہے؟ یہاں کا تو نہیں لگتا۔ تو کیا کر رہا ہے اس قبرستان میں؟“

”پوچھیں ہوں بی بی!“ اس نے گہرا سانس لے کر کہا۔

”یہاں سے گزرا تو سوچا فاتحہ ہی پڑھ لوں۔ دیکھا تو یہ یہاں اس قبر پر پڑی تھی

شاید اس کے بچے کی قبر ہے۔“

اس عورت کا شک قدرے رخص ہوا اور اس کا لہجہ بدلا۔ ”بس بھائی کیا کریں۔ کس سے گھر کریں۔ مقدور خراب ہوں تو اس کا کیا علاج۔ کہتے کو گاؤں سے چوہدری سے بیاہی گئی ہے۔ پر سکھ کا ایک دن نہیں دیکھا۔“

سجاد کے دل پر فحاشی مگر گئی۔ اس نے ایک دمکتی ہوئی نگاہ رانی پر ڈالی جو پھر قبر پر جھک کر دنیا دماغیہا سے بے خبر ہو گئی تھی۔ سجاد نے پریشانی سے پوچھا۔

”کیوں بہن اس کا گھر والا اچھا نہیں ہے۔ اس کا خیال نہیں رکھتا؟“

”اس نے خیال کیا رکھا ہے۔“ اس عورت نے چاروں طرف یوں دیکھا کہ اس کی بات کوئی اور تو نہیں سن رہا اور رازداری سے بولی۔ ”یہ اس کی تیسری بیوی ہے۔ اب وہ چوتھی کے پھر میں ہے۔ سکول کی استانی کے گھر کے پچھلے لگتا ہے۔ بس مرد و زات ہے جس پر دل آ گیا۔ اسے تو پوچھنا تک نہیں۔ یہ بچپاری ہے زبان نہ لکونی آگے نہ پیچھے۔ پچھو گیا تھا تو اسے بھی آسرا تھا، اسی میں لگی رہتی تھی پر قسمت..... اللہ کا مال تھا۔ اللہ نے لے لیا۔ پر اس کو چین نہیں۔ اپنے ہوش میں نہیں آسکی۔ نہ کھاتی نہ پیتی ہے۔ سارا سارا دن کا کے کی قبر پر بیٹھی رہتی ہے۔ میں ہی آ کر اسے منت ساجت کر کے لے جاتی ہوں۔“

سجاد کا احساس جھلکی جھلکی ہو گیا۔ کھلی کی طرح ایک خیال اس کے ذہن میں آیا اور اس نے عورت سے پوچھا۔ ”وہ استانی کون ہے جس کے پیچھے اس کے گھر والا پڑا ہے۔“

”بہنیں گاؤں کے سکول میں پڑھاتی ہے۔ ایک ماہی کے ساتھ اکیلی رہتی ہے۔ ہے تو شریف گھر کی پر چوہدری نے اسے ایسے بزر باغ دکھائے ہیں کہ“ اس نے منہ ہی منہ میں گالی بی اور بولی۔ ”کل وہ رانی کے حسن پر جان دیتا تھا۔ آج استانی کے پیچھے پڑا ہے۔ کل اسے ہموڑ کرسی اور طرف منڈاٹھا کے چل پڑے گا۔“

وہ جھٹک کر پھر رانی کو منت ساجت کے ساتھ قبر سے ہٹانے لگی۔ پادول کیلئے اس نے کھوکھو کا دیکھا محال ہو گیا تھا۔ اس کا بس چلنا تو رانی کے دکھوں کا مداوا کرتا۔ اپنی جان کے عوض اس کی خوشیاں خرید لیتا۔ اپنی محبت کہیں نہیں بکتی۔ خوشیاں اور سکھوں میں نہیں ملتے۔ لیکن اس نے وہ لچ لچا تھا کہ وہ رانی کیلئے سکھ تلاش کرے گا۔ اس کی خوشیاں ڈھونڈ کر لائے گا۔ اس نے ہلہ دم دل میں ٹھکانا اور ان کی طرف پلٹ کر دیکھے بغیر قبرستان سے باہر نکل گیا۔

وہ بھی کچھ سوچتا ہوا قبرستان کی طرف چل پڑا۔ اس طرف کسی کے آنے کا خدشہ کم سے کم تھا۔ وہ کسی نہ کسی طرح یہاں رات تو گزار ہی سکتا تھا۔ قبرستان تک پہنچنے پہنچنے اندھیرا چاروں طرف پھیل گیا۔ پہلی تاریکیوں کے دم چاند کی روشنی بہت ہی پراسرار اور مہلک سی تھی۔ اس نے ایک نگاہ مچی دیوار کے اندر ڈالی۔ دور دور تک مٹی کی ڈھیریاں پھیلی دیکھ کر اسے جبرجری سی آگئی۔ ہر طرف پھیلی ہوئی دریائی دل پر ہیبت طاری کرنے لگی۔ وہ وہیں دیوار کے پاس کھڑا خود کو اندر جانے پر آمادہ کر رہا تھا کہ اچانک اس کے پیروں میں ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی۔

اس نے چونک کر اپنا پاؤں زور سے جھکا۔ درد کی ایک شدید لہر اس کے پاؤں سے چلی تو ساری ٹانگ میں دوڑتی چلی گئی۔ اس نے گھبرا کر دیکھا۔ گھاس پھوس اور سوکھے ہوئے پتوں میں ایک سیاہ پتلی لکڑی حرکت کرتے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ سجاد نے اس موڑی کا سر پکڑنے کیلئے ادھر ادھر کی چیز کی تلاش میں دیکھا۔ دور اسے ایک بڑا پتھر نظر آیا۔ اس نے دوڑ کر وہ پتھر اٹھایا۔ لیکن تب تک وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا۔

اس کوشش میں وہ پسینے پسینے ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اسے پکڑے آ رہے ہیں۔ اس کا حلق خشک ہونے لگا۔ اس نے سر کو کئی بار جھکا۔ اپنی آنکھوں کو پوری طرح کھول کر ہوش و حواس بحال رکھنے کی کوشش کی۔ وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور اپنا پاؤں دیکھنا چاہا۔ لیکن اندھیرے میں کچھ بھی دیکھنا محال تھا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آئے لگے۔ ذہن پر جیسے ایک دھند سی چھا گئی۔ پاؤں میں سوزش بڑھنے لگی۔ وہ بے طرح پریشان ہوا۔ وہ ایسی بے بسی کی موت نہیں مرنا چاہتا تھا۔ اس کے ذمے تو ابھی بہت سے کام تھے۔ اس نے اپنے اندر کی ساری قوت خود کو زندہ رکھنے میں صرف کر دی۔ جب سے رد مال نکالا اور اسے اٹھاؤ سے خون کے بہاؤ پر کس کر باغداد۔

محاسن کے ذہن میں خیال آیا کہ قبرستان میں کہیں گورکن تو ہوگا۔ شاید وہ اس کی کنیا کہیں تلاش کر سکے۔ وہ موت سے ہار نہیں مانتا چاہتا تھا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور نڈھال سالو کھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ قبرستان میں داخل ہو گیا۔ اس کا سر پکڑا رہا تھا اور حلق خشک تھا۔ اس نے اپنی پوری قوت سے آواز دی۔ ”کوئی ہے..... کوئی ہے.....“

دن بیتا جا رہا تھا۔ اس نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ ان بے درپے صدموں نے جیسے اسے مار دیا تھا۔ اس کی صراہی بے آب و گیاہ زمر کی جی جو دو ٹھنکتا تھے۔ وہ دونوں اس کی آنکھوں کے سامنے سوکھ کر مٹی میں مل گئے تھے۔ اسے بھوک تو نہیں تھی لیکن جسم میں تھابت سی ٹھوس ہوتی تھی۔

گاؤں کا تنہو دیکھ کر وہ رک گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ یہاں کچھ درک کر کھانا کھانے کے بہانے استانی کے گھر کا پتہ پوچھ لے گا۔ تنہو والی نے جتنی مددہ وال اور روٹی اس کے سامنے رکھی۔ تو اس کا بھی ایک نوالہ توڑنے کو بھی نہیں چاہتا تھا۔ لیکن مجبوراً اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ کھانا کھا رہا ہے اور تنہو والی سے بولا۔ ”اماں..... استانی کہاں رہتی ہے؟“ اس عورت نے تنہائی کی لگاؤ سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیوں..... تم کیوں پوچھ رہے ہو۔ مجھے تو تم اس گاؤں کے نہیں لگتے۔“

”ہاں اماں.....! میں دور سے آیا ہوں۔ استانی سے مجھے کام ہے۔ اس کے رشتہ داروں کا ایک پیغام اسے دینا ہے۔“ سجاد نے بات بنائی۔ ”وہ تو دونوں سے کہیں گئی ہوئی ہے۔“ اس نے اطلاع دی۔

سجاد پریشان ہو گیا۔ اس نے جو سوچا تھا اس پر عمل کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ اوپر سے شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے کھانا کھا دیا اور اس سے استانی کے گھر کا پتہ پوچھ کر اٹھ آیا۔

گاؤں کی جتنی گیمیں میں سے ہوتا ہوا وہ استانی کے گھر کے باہر جا پہنچا۔ جھولتے ہوئے پرانے سے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ اسے سخت ہاپسی ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ شاید تنہو والی کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی یا استانی واپس آگئی ہو اور اسے پتہ نہ چلا ہو۔ لیکن وہ تو واقعی موجود نہیں تھی۔ اس نے دروازہ کھینچتے ہوئے پتوں سے اس کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بھی کچھ سمجھ نہ سکتا۔ اس نے یہی کہا کہ وہ آنے والی ہے۔ کل یا برسوں آجائے گی۔

سجاد نے جھکتے ہوئے اندھیرے اور پہلی تاریکیوں کے باریک دم چاند کی طرف دیکھا اور سوچنے لگا کہ وہ اس اجنبی گاؤں میں رات کہاں گزارے۔ وہ استانی سے ہر حال میں ملنا چاہتا تھا۔ چاہے وہ دس دن بعد آئے یا مہینے بعد۔ مگر وہ اتنے دن کہاں پناہ لے۔ وہ ایک مشکوک آدمی تھا۔ ملاں سے کچھ کہے بغیر وہ بلا ارادہ یہاں تک آ گیا تھا۔ یقیناً وہ بھی اس کی تلاش میں ہوگا۔ وہ خود کو کہاں محفوظ کرے۔

گھرا سنا اس کی آواز سے پکنا چر ہو گیا اور اس کی گونج دور تک دوڑتی چلی گئی۔ اس نے تھوڑا وقفہ کیا کہ شاید اس کی آواز کا کوئی جواب آجائے۔ لیکن تاریکی اور خاموشی جوں کی توں تھی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے سے ناچنے لگے۔ اسے اپنے پاؤں پر کھڑے رہنا دشوار ہو گیا۔ درد کی لہریں اسے ہر آن ہلکتے دینے لگیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے زہر سے نیلی پڑی ہوئی اس کی اپنی لاش پھرنے لگی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آرزوؤں، امیدوں اور ولولوں کا خاتمہ اس کسہری کے عالم میں ہو گا۔ اس نے گھبرا کر بیچہ پوروں کی پوری قوت سے آواز دی۔ ”کوئی میری آواز سن رہا ہے تو میری مدد کرو۔ کوئی ہے..... کوئی ہے۔ یہاں کوئی ہے.....“

وہ جھوٹا انداز میں مسلسل آوازوں پر آوازیں دینے لگا۔ ”مدد..... مدد..... میری مدد کرو۔ خدا کے لئے میری مدد کرو۔ میری آواز سنو۔“

وہ چلا تا رہا۔ چیختا رہا۔ اس کا شور کر قرعہ جھاڑیوں سے ایک ملی تیزی سے نکل کر بھاگی۔ کچھ پرعدوں نے پر پھڑ پھڑائے۔ رات کا سناٹا جتنے لگا اور اس کی آواز کی بازگشت اسی کی طرف لوٹ لوٹ کر آنے لگی۔

لیکن کوئی ذی روح اس کی مدد کو نہیں آیا۔ کسی نے اس کی آواز کا جواب نہیں دیا۔ مایوسی نے اسے چاروں جانب سے گھیر لیا۔ اس پر غنودگی سی چھانے لگی۔ اس کی آنکھوں کے پپوٹے اتنے بھاری ہو گئے کہ اسے آنکھیں کھولے رکھنے میں دقت ہونے لگی۔ وہ موت کے خوف اور آرزوؤں کے حسرت میں بدل جانے کی مایوس پتھر دینے والی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ اور وہ کسی گھر سے تاریک غار میں بچے ہی نیچے گرے چلا جاتا تھا۔

.....

بخت آور نے کھڑکی کھولی۔ تیزی سے آتی جانی گاڑیوں کا بے ہنگم شور اس کی سماعت سے گھرا یا۔ اسے زندگی کا احساس ہوا۔ تازہ ہوا دھوئیں اور پٹرول کی ملی جلی بو کے ساتھ اندر آئی۔ اتنی بلندی سے چمکتی ہوئی سلیٹی سڑک پر اڑتی ہوئی رنگ برنگی گاڑیاں بچوں کے کھلونوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں۔ فٹ پاتھ پر راگبیر آ جا رہے تھے۔ خرید و فروخت کر رہے تھے۔ وہ زندگی کے ہنگاموں میں رچے بسے محسوس ہوتے تھے۔ بخت آور نے ایک سرواہ بھری۔ زندگی کی اس رنگارنگی اور ہنگاموں میں شاید اس کا کوئی حصہ نہیں تھا۔ وہ ایک قیدی کی طرح اس کھڑکی سے باہر بہتی ہوئی زندگی کو صرف دیکھ ہی سکتی تھی۔ آگے بڑھ کر اس میں اتر نہیں سکتی تھی۔ اسے گھر نہیں سکتی تھی۔ اس میں گم نہیں ہو سکتی تھی۔

وہ دن میں کئی بار اس کھڑکی کو کھولتی تھی۔ بہروں اس میں سے جھانک رہتی تھی۔ لیکن اس میں اتنی بات نہیں تھی کہ باہر بہتی ہوئی زندگی میں شامل ہونے کے لئے اس کھڑکی سے جھلاک لگا دے۔ اس ان چاہی زندگی سے نجات پانے کیلئے موت کو گنگے لگے۔ جب بھی اس کے ذہن میں یہ خیال آتا تھا تو اس کے حوصلے پار جاتے تھے۔ اس کے اندر کہیں زندگی کی چاہت اتنی بڑھ جاتی تھی کہ اسے موت سے خوف آنے لگتا تھا۔

ہوٹل کے اس کمرے سے باہر پاؤں دھرتے ہوئے بھی وہ ڈرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کو تلاش کرنے والے اس سے غافل نہیں ہوں گے۔ وہ پھر ان کے ہتھے چڑھ کر اذیت کی ہنگامی پر نہیں بندھنا چاہتی تھی۔ وہ اس پریشان خیالی سے غائب۔ جا بے جاگل سی ہونے لگی تھی۔ پھر اس کے اندر کوئی کہتا کہ شاید کسی روز سجادوں اسے ڈھونڈے وہاں تک آ پہنچے گا۔ اسے عذاب سے نجات دلا دے گا۔ اسے اس جہنم سے نکال لے جائے گا۔ وہ سوچوں کے تانے بانے بنتی۔ آس کے دیئے جلاتی رہتی۔ وہ آتا اور ایک ہی پھوک سے انہیں بجھا کر

چلا جاتا اور وہ اندر مڑی میں پھنکی رہ جاتی۔

وہ روز کی نہ کسی احمق سیٹھ کی بیوقوف سرباہ دار یا نو دو لیجے کو ساتھ لے آتا۔ اسے ملو اتار اور اٹھیں کھانے کرنے کی کوشش کرتا کہ وہ اسے اپنی نئی فلم میں بہروں لے لیں۔ ان کی بھوک نظر میں لپٹ لپٹ کر اس کا جائزہ لیتیں جیسے وہ کوئی بکاؤ مال ہو۔ وہ اس کے حسن کے تعصیبے پر ہمتا اور انہیں مجبور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ وہ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملاتے اور ہنسی دل کی کر کے رخصت ہو جاتے اور پھر پلٹ کر نہ دیکھتے۔

دروازہ سے مل جانی گھونسنے کی آواز پر اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ آج بے وقت آ گیا تھا۔ بخت آور نے بیڑی سے سوچا۔ اب اس کا وجود اسے ٹھکنے لگا تھا۔ اس کی موجودگی اس سے برداشت نہیں ہوتی تھی۔ وہ لحو لحو مرنے اور لحو لحو جلتی رہتی تھی۔

دروازہ آہستہ سے کھلا۔ بخت آور نے منہ پھیر لیا۔ وہ اس کا کردہ چہرہ نہیں دیکھتا چاہتی تھی۔ اسے اس کی بے رحم نگاہوں کی کسی ظالم مسکراہٹ سے نفرت تھی۔ پردے کے پٹنے دروازہ بند ہونے اور لاک کھنکے کی آواز سنائی دی۔ وہ اسی طرح کھڑکی کے قریب کھڑی رہی جیسے باہر دیکھ رہی ہو مگر درحقیقت وہ کچھ بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔

”بخت آور.....!“ انہی آواز پر بخت آور نے پلٹ کر دیکھا۔
”کون ہو تم؟“ غیر ارادی طور پر ہی اس کے منہ سے نکل گیا۔ اس کے سامنے ایک کم عمر سا نوجوان تھا جس کی صورت دیکھنی ہوئی سی لگتی تھی۔ لیکن وہ اسے صحیح طور پر پہچانی نہیں تھی۔

وہ اس کے سوال پر گھبرا سا گیا اور جلت میں بولا۔ ”میں شیری ہوں۔ شہریار۔“
”تم ہو کون؟ اور یہ کمرے کی چابی تمہیں کس نے دی ہے؟“ بخت آور نے درشتی سے پوچھا۔

”شہریار! ذرا آرام سے۔ مجھ پر اتنا رعب نہ ڈالیں کہ میں ڈر رہی جاؤں۔“ وہ اطمینان سے ایک کمری پر بیٹھنے ہوئے بولا۔

بخت آور تنہائی نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کا ذہن بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اسے لگ سا ہونے لگا تھا کہ اس نوجوان کو یہاں کسی منصوبے کے تحت بھیجا گیا ہے۔ شاید اسے بھاری وعدے کی جانب لے جایا جا رہا تھا جس سے بھانگ کہ وہ یہاں آئی تھی۔ اس خیال سے اس کا سارا وجود گنگا اٹھا۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ وہ خاموشی سے

سب کچھ برداشت نہیں کرے گی۔

اس نوجوان نے سر اٹھایا۔ اسے اپنی جانب گھورتے دیکھ کر وہ ہنس پڑا اور خوش طبعی سے بولا۔ ”ہیلو.....“ آپ اس طرح تو میری طرف نہ گھوریں۔ اپنا موز ٹھیک کریں تو میں بات کروں۔“

”ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ تمہیں کس نے بھیجا ہے؟“ بخت آور نے درشتی سے پوچھا۔
”بھیجا تو کسی نے نہیں۔ میں خود آیا ہوں۔“ اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔
”کیوں؟“ بخت آور نے کڑے تیردوں سے پوچھا۔

”اس لئے۔ اس لئے کہ میں آپ سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ بہت ساری باتیں۔ تمہائی میں۔ اکیلے اکیلے، آپ کے پاس بیٹھ کر۔“ اس نے بچوں کی طرح آنکھیں میچیں۔
”محرّم ہو کون؟“ بخت آور الجھ گئی۔

”تمہارا یہ آپ کو کہ میں شیری ہوں۔ شہریار!“ اس نے برجستہ کہا اور ہلے بچوں کے انداز میں بولا۔ ”آپ بیٹھیں تو سہی نا..... پھر میں آپ کو ساری بات سچ سچ بتا دوں گا۔ بالکل سچ سچ!“

”ہاں بولو۔ تم کیا چاہتے ہو۔“ بخت آور نے خشک لہجے میں کہا۔
وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کے سینے میں مقابل آن رکا اور منت مہرے لے لہجے میں بولا۔
”کیا میں اتنا ہی برا ہوں کہ آپ چند منٹ میری بات بھی نہیں سن سکیں۔ آپ کو کیا پس منگتی مشکل سے آپ تک پہنچا ہوں۔“

بخت آور دو قدم پیچھے ہٹ کر اور منکھوک سے لہجے میں بولی۔ ”بیکار وقت ضائع نہ کرو۔ سیدھی طرح سے بتاؤ کہ تم یہاں کیوں آئے ہو۔ یہ چابی تمہیں کس نے دی ہے۔“
”تازہ؟“

”یہ چابی؟“ اس نے شرارت سے آنکھ دھائی۔ ”یہ چابی تو میں نے خود بخوائی ہے۔“
”کیہ لیں۔ کتنے کا گنہگار ہیں ہم۔“

”کیوں۔ تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“
”ضرورت تھی نا۔ بڑی سخت ضرورت تھی۔“ اس نے سر ہلایا۔ تمہوڑا توقف کیا پھر تیزی سے آگے بڑھ کر اس نے پلک میچتے میں بخت آور کا ہاتھ اپنے دلوں ہاتھوں میں قیام کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا اور پر زور لہجے میں بولا۔ ”مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ سچی محبت۔ خدا

”مجھے کچھ نہیں پتا۔“ وہ بچوں کے سے ٹپلے پن سے بولا۔

”بس مجھے نہیں پتا آپ کچھ بھی کہیں۔ آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔ آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں۔ جب میں یہاں ڈیڑی کے ساتھ آیا تھا اور میں نے آپ کو دیکھا تھا تو مجھے اسی وقت آپ سے محبت ہو گئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ آپ سے پھر ملنا چاہتا ہوں۔ وہ آپ کو اپنی فلم میں ہیروئن کے لیے لیں مگر انہوں نے میری ایک نہیں سنی۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اپنی ہیروئن ہیں اور عوام سننے چہرے کو مشکل سے ہی قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنا سرمایہ ضائع نہیں کرنا چاہتے۔“

”بس پھر میں نے سوچ لیا کہ میں خود آپ سے ملنے کا کوئی نیا رستہ نکالوں گا۔ میں نے چابی بنوائی پھر میں اگلے کے آنے جانے کا وقت نوٹ کر رہا۔ اسنے دنوں کی تنگ و دو کے بعد اس میں کامیاب ہوا ہوں کہ آپ کے پاس آسکوں۔ آپ کو کچھ سکوں۔ آپ سے بات کر سکوں لیکن آپ تو.....!“

اپنے دل کی ساری باتیں وہ بڑی سادگی سے بچوں کے سے موصوفانہ انداز میں کہتا جا رہا تھا۔ بخت آدر کچھ حیرت، کچھ شوش سے اس کی باتیں سنتی رہی۔

.....

دوسرے روز پھر اسی وقت دروازے میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی تو بخت آدر بے تکلفی اس کا خیال فوراً شیریں کی طرف گیا۔ یقیناً وہی اس وقت آسکتا تھا۔ وہ پریشان تو ہوئی لیکن اس کی آمد سے اتنی بری نہیں لگی۔ وہ بظاہر ایک بے ضرر سارا کا معلوم ہوتا تھا۔ وہ جو ہوش کے اس سر کے میں قید تھا جی کاٹ کاٹ کر آگئی تھی۔ اسے اس لڑکے کی وجہ سے خفگوار سی تبدیلی کا احساس ہوا تھا۔ وہ اس کی پردہ زنگی میں ہوا کے نرم جبر سے جھونکی کی طرح داخل ہوا تھا۔ جس سے لکھوں کے لئے ہی کسی جس قدرے کو ہم گیا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے ہندوئوں کیلئے قفس داہو گیا ہو جس سے باہر کا زندگی آمیز منظر صاف نظر آنے لگا ہو۔

اس نے آہستہ آہستہ دروازہ کھولا اور ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ اندر بھاگا۔ پھر پلٹ کر دروازے کو دیکھا۔ پردہ برابر کھڑا اور ایک ایک قدم اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔

”ہیلو!.....! ہیلو!.....! ہیلو!“

بخت آدر بے تاثر چہرے کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا۔ اس نے بہترین کپڑے پہن رکھے تھے۔ بال بھی بڑے پلٹے سے بنائے تھے۔

کی قسم پاک محبت۔“

بخت آدر نے بیزاری کے ساتھ اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔ اس کے اس عجب رویے نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ اسے کہاں ملی تھی؟ اسے کہاں دیکھا تھا؟ اور وہ تھا کہ محبت کے دعوے کر رہا تھا۔ بخت آدر نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ڈپٹ کر بولی۔

”تم کیا اول فول بیک رہے ہو۔ تم ابھی اور اسی وقت یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں تم جیسے لوگوں کو خوب سمجھتی ہوں۔“

وہ اس کے سخت رویے سے روہنا ہو گیا۔ چند لمبے یوں منہ بسور کر کھڑا رہا جیسے کسی لاڈلے بچے کو کسی نے ہاتھوں جھڑک دیا ہو۔ پھر اس نے بڑھ کر بخت آدر کا اچھل قہام لیا۔

”خدا کے لئے مجھ سے نفرت نہ کریں۔ میری بات کا یقین کریں۔ مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔ بچی اور پاک محبت۔ مجھے تھوڑی دیر تو اپنے پاس بیٹھنے دیں۔ میں بڑی مشکلوں سے یہاں تک پہنچا ہوں۔“

بخت آدر نے جب تک کر اپنا اچھل اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیا۔ یہ دیکھ کر اسے قدرے حیرت ہوئی کہ اس کی آنکھیں غم تھیں۔ وہ عجیب محبت میں پڑ گئی کہ اس سے کیا برتاؤ کرے۔ اسے یہاں سے کس طرح باہر نکالے۔ اس کی اس بے گئی بات سے کیا مطلب نکالے۔ وہ اب بھی کسی روئے ہوئے بچے کی طرح منہ بسور سے جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔

”مجھ سے کوئی محبت نہیں کرتا۔ مجھے کوئی پیار نہیں کرتا۔ کسی کو میری پروا نہیں۔ کسی کو میری ضرورت نہیں۔ میں سر بھی جاؤں تو کسی کو کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

بخت آدر نے بے شمار چہرے دیکھے تھے۔ وہ مردوں کے انداز اور ان کی نگاہوں کے مطالبوں کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ لیکن اس نوجوان کے چہرے پر، اس کی آنکھوں میں، اس کے انداز میں ہوش کا کوئی مطلب نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹے بچے کی طرح جیسے کسی کی حکایت کر رہا تھا۔ بخت آدر غور سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ وہ اسی طرح خود سے باتیں کرتا رہا۔ پھر بخدا آدر نے اسے پکارا۔

”ہات سنو! اتم غلط جگہ پر آ گئے ہو۔ یہاں تمہیں کچھ نہیں مل سکتا۔ میرا دامن قہم خالی ہے۔ میں تمہیں کچھ نہیں دے سکتی۔“

اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی بڑھیا سی خوشبو کمرے میں تیرنے لگی تھی۔

”اقریب آ کر قالین پر آتی پائی مار کر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی منگی اس کی گود میں رکھ دی۔“ بتائے میری منگی میں کیا ہے؟“ اس نے بچوں کے سے چونچال پنا سے پوچھا۔

”بناؤ یہ کیا بچتا ہے۔“ بخت آدہ نے اس کا ہاتھ پرے دھکیل دیا۔

”پلیز..... آپ کھول کر دو کیسیں۔“ اس نے پھر اپنی بند منگی اس کی گود میں رکھ دی۔

”نہیں بھئی۔ تم خود ہی تادو۔“ بخت آدہ نے کوئی دیکھی لے بغیر کہا۔

”اٹ۔ آپ کتنی یار ہیں۔ تموزی ہی کو شش تو کریں نا۔“ اس نے منت کی۔

”کھولو بھئی۔ یہ تم خواہ خواہ کیا پراسرار رہنے کی کوشش کر رہے ہو۔ کھولو۔“ بخت آدہ

نے یونی ہنس اپنی منگی کھلوانے کو اس کی انگلیوں کو چھوا۔

اس نے صحت پٹ منگی کھول دی۔ بخت آدہ نے دیکھا اس کی ہتھیلی پر ایک خوبصورت

انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ ذرا سا بلند کیا اور بڑے احترام سے بولا۔ ”اے میری طرف سے قول کر لیجئے۔“

بخت آدہ نے اس کی ہتھیلی پر رکھی ہوئی انگوٹھی کی طرف دیکھا۔ پھر اس کا چہرہ دیکھا جو امید و ہم کی کیفیت میں ڈوب ابھر رہا تھا۔ وہ کم عمر سا لڑکا تھا۔ وہ اتنی جیتی انگوٹھی کہاں سے لے سکتا تھا۔ ابھی وہ کچھ تذبذب میں ہی تھی کہ کیا کہے کہ وہ بول اٹھا۔

”پلیز۔ آپ اس کو پہن کر دو کیسیں نا۔ نہیں تو میرا دل ٹوٹ جائے گا۔“

بخت آدہ نے انگوٹھی ہاتھ میں لے کر دیکھی۔ اس میں جیتی ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اس نے کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو بہت جیتی انگوٹھی ہے۔ تم نے کہاں سے لی ہے؟“

”اس بات کو چھوڑیں۔ بس آپ اس کو پہن کر دکھائیں۔ پلیز! آپ اپنے اس پیارے سے ہاتھ میں پہن لیں نا اس کو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولا۔

”تم جہاں سے منگی یہ انگوٹھی اٹھا کر لائے ہو۔ وہاں جا کر رکھو۔ میں اسے نہیں پہن سکتی۔ سمجھتے تم۔“ بخت آدہ نے انگوٹھی اس کے ہاتھ پر رکھ دی۔

”آپ کیا سمجھ رہی ہیں کہ میں نے یہ چوری کی ہے؟“ وہ چمک کر بولا۔ ”جناب سے

ہمارے ماں باپ کا مال ہے اور ہمیں اس پر پورا پورا حق حاصل ہے۔ میں تو آپ کیلئے ہر شے سے فریاد کرتا تھا تا کہ میں پھر میں سے سوچا کہ انھیں کچھ پسند نہ چل جائے۔ یہ انگوٹھی تو چھوڑ

کی چیز ہے۔ چھپ بھی سکتی ہے۔“

”نہیں بھئی۔ میں اسے نہیں لے سکتی۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔“ بخت آدہ نے روکھے سے لہجے میں کہا۔

”پلیز! آپ ایک بار پہن کر دکھا دیں نا۔“ اس نے التجائی کی۔

”پلیز! میری خاطر۔“ صرف ایک بار پہن کر دکھا دیں۔ صرف ایک بار۔ پھر میں

اسے لے جاؤں گا۔“ وہ اصرار کرنے لگا۔

بخت آدہ کو اس کے اس بچکانہ اصرار کو جاننا مشکل ہو گیا۔ اس نے بے دلی سے وہ انگوٹھی اس کے ہاتھ سے لی اور اسے اپنی انگلی میں پہن کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ ”لو۔ دیکھو۔ بس.....“

اس نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا۔ ”خوبصورت..... بہت خوبصورت۔ بس اب میں جیتی دیر یہاں ہوں نا آپ اس کو پہنے رہیں۔ خدا کے لئے اتنی بات تو مان لیں۔ آپ کا کیا چلا جائے گا اور میرا دل ٹوٹنے سے بچ جائے گا۔ پلیز!“

”اور اگر وہ تمہارا اکل آ گیا نا تو تمہارا سر ٹوٹنے سے نہیں بچ سکے گا۔ بس اب اٹھو اور غائب ہو جاؤ۔ اپنی یہ انگوٹھی بھی لے جاؤ۔“

”اٹکل.....“ وہ چنسا۔

”اٹکل کا علاج تو مجھے ابھی طرح معلوم ہے۔ بس ایک روز آتی کر لے کر یہاں آ جاؤ گا۔ پھر دیکھیں گے آپ اٹکل کا حشر۔ اس لئے اٹکل سے گھبرانے کی ضرورت نہیں۔“

”کیا تمہاری آتی بہت خطرناک خاتون ہیں؟“ بخت آدہ نے پوچھا۔

”پوری بلا کو خان ہے۔ اٹکل تو ان کے سامنے قمر قرقر کا بچنے ہیں۔ دیکھنے والی حالت ہوتی ہے ان کی۔“

”ہوں..... اگر وہ یہاں آ گئی پھر تو مجھے بھی نہیں چھوڑے گی۔“ بخت آدہ نے مذاق

کہا۔

”ارے..... سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ اس نے دفعتاً اپنے لمبے بازو اس کے گرد لپیٹ دیے۔ ”میرے ہوتے ہوئے آپ کو کوئی ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔“

طرف لگاؤ۔ یہ وقت بھر نہیں آئے گا۔“

”اور یہ وقت بھی تو بھر نہیں آئے گا۔“ وہ قائلین پر بیٹھ گیا اور اس کی گود میں اپنا سر رکھتے ہوئے بولا۔ ”یہ بڑا جتنی وقت ہے۔ بہت جتنی۔ آپ مجھ سے پوچھیں کہ میرے لئے یہ لمحے کتنے جتنی، کتنے افسوس ہیں۔“

بخت آدر نے اس کا سر ہٹایا۔ ”اچھا۔ تم یہ باتیں بتانا بند کرو اور ٹھیک طرح سے بیٹھ کر میری ایک بات سنو۔“

”جی فرمائیے..... ارشاد۔“ وہ سیدھا ہوا بیٹھا۔

بخت آدر نے چند لمحوں کے بعد سوچا کہ اسے یہ بات شہر بارے کرنی چاہئے یا نہیں۔ پھر اس نے سوچا کہ وہی تو اس کی امید تھا۔ اسے کوشش تو کرنی چاہئے تھی۔ وہ استسما میرے نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بخت آدر نے گلا صاف کیا۔

”ہاں شہر بارا کیا تم میری تمویزی سی مدد کرو گے؟“

”مدد..... صرف مدد۔ یعنی آپ تو جان بھی ناگئیں تو حاضر ہے۔“ وہ گرجوٹی سے بولا۔

”نہیں، یعنی۔ جان سے کام نہیں چلے گا۔ مجھے تو تمہاری مدد چاہئے۔ بس تموزا سا تمہارا تعاون۔ باقی سب میں سنہال لوں گی۔“

”فرمائیے۔“ وہ ہمدرد گوش ہو گیا۔

”شہر بارا! میں اس قید سے لگتا جاہتی ہوں۔ میں تمہارے اس اٹکل سے پیچھا چھڑانا جاہتی ہوں۔ کیا تم اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہو؟“

”بالکل کر سکتا ہوں۔“ وہ زوردار لہجے میں بولا۔ ”کیوں نہیں کر سکتا۔ یہ تو بات ہی کوئی نہیں۔ میری طرف سے آپ ابھی پچھلے۔ انھیں، جلدی کریں۔ نیک کام میں دیر نہیں ہونی چاہئے۔“ شہر بارا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ دونوں چونک گئے۔ دونوں نے گھبرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔

”یہ کون ہے؟“ شہر بارا نے قدرے پریشان ہو کر آہستگی سے کہا۔ ”روم سروں والے نہیں؟“

”نہیں..... ان لوگوں کو منع کیا ہوا ہے۔“ بخت آدر نے جواب دیا۔

”تو پھر کون ہو سکتا ہے؟ کہیں اٹکل.....“ وہ ہلکا کر اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ تقریباً ہر روز عی آ جاتا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں چھپا بیٹھا ہوئی کے اس کمرے کی گھرائی کرتا رہتا ہے۔ اٹکل جیسے عی جاتا وہ کمرے میں چلا آتا اور اپنی بے گئی باتوں سے اسے الجھائے رکھتا۔ وہ بھی رفتہ رفتہ اس کی یکسو عادی ہو گئی تھی۔ ہوئی کے بند کمرے میں جہاں زندگی سے ملنے والی ساری راہیں مسدود تھیں اسے زندگی کی حرارت اور حسن نظر آنے لگا تھا۔ وہ دن بھر کسی قیدی کی طرح اس کمرے کی اوچی دیواروں کے سچ گھٹ گھٹ کر مرنے رہتی تھی۔ اسے تازہ ہوا کے جھونکے کا سا احساس ہوتا تھا۔

شہر بارا اس کے لئے ایک خوشگوار تبدیلی اور ایک نئی امید بن کر آیا تھا۔ وہ عروسیوں کا مارا اور محبتوں کا ترسا ہوا انسان تھا۔ اس کے سر ہایہ دار ماں باپ کے پاس اس کے لئے کوئی وقت نہیں تھا۔ اس کا کوئی بہن بھائی نہیں تھا۔ کسی کا ذائقہ اس نے چکسا ہی نہیں تھا۔ اس کے اندر تنہائی اور اکیلے پن کا ایک صحرا سا پھیلا چلا گیا تھا جس میں وہ جیسا سا بھٹکتا رہتا تھا۔

کسی روز وہ نہ آ پاتا تو بخت آدر کو کچھ کھو یا سا لگتا۔ وہ جوا کہی اس بے رحم شخص کے رحم و کرم پر ہوئی کے کمرے میں قیدی تھی۔ شہر بارا کی وجہ سے جیسے اسے ایک سہارا سا مل گیا تھا۔ وہ اس کے لئے جنگل میں راستہ اور صحرا میں نشان کی طرح سے تھا۔ پہلے وہ زندگی سے فرار حاصل کرنے اور موت کے دامن میں پناہ لینے کے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔ اب اس کی سوچ نے ایک نئی کروٹ بدل لی تھی۔ اب اسے اس قید سے رہائی کی صورت نظر آنے لگی تھی۔ شہر بارا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اس کا انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کی آداب اس کے لئے پہلے کی طرح ناگوار نہیں رہی۔ اسی لئے وہ خوش ہو کر کہنے لگا۔

”مجھے یہ ہے۔ آپ میرا انتظار کرتی رہتی ہیں۔“

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ بخت آدر نے اسے چھیڑا۔ ”ھٹل دیکھی ہے تم نے اپنی۔“

”ھٹل..... ہاں ھٹل تو میں نے دیکھی ہوئی ہے۔“ وہ اتر آیا اور بالکل اس کے مقابل

آن کھڑا ہوا۔

”آپ بھی تمویزی دیر دیکھئے نا۔ آپ کی قسم محبت ہو جائے گی مجھ سے۔“ اس کے

منہ کے خیر انداز پر بخت آدر کو کوئی آہستگی۔

”تم بھی عجیب باتیں کرتے ہو۔“ وہ قریبی صوفے پر بیٹھ گئی۔

”بیوقوف محبت کرنے کے لئے تو زندگی بڑی ہے۔ اچھی تم اپنا دھیان پڑھنے لکھنے

”جلدی کرو۔ ہاتھ روم کے پچھلے دروازے سے باہر نکلو۔ جلدی کرو۔ وہ ابھی اندر آ جائے گا۔ اس کے پاس چابی ہے۔“

دستک ایک بار پھر ہوئی اور پہلے کی نسبت بلند آواز میں۔ شہر یا جزی سے اٹھ کر غسٹانے میں گھس گیا۔ بخت آدر نے کچھ دیر انتظار کیا کہ شہر یا رکھل جائے اور پھر دروازے کے پاس آکر اس نے پینڈل گھمایا۔

اس نے پورا دروازہ کھول دیا اور دشتی سے بولا۔ ”کب سے دروازہ کھٹکتا رہا تھا۔ تم نے سنا نہیں۔“

”تمہارے پاس چابی جو ہوتی ہے۔ تو پھر دروازہ کیوں کھٹکتا رہے تھے۔“ بخت آدر نے ناگواری سے کہا۔

”وہ میرے دوسرے کوٹ کی جیب میں رہ گئی ہے۔“ اس نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے دتین لمبے لمبے سانس لئے۔ ”یہ آج کل تم پر غم بہت استعمال کرنے لگی ہو۔ خیریت تو ہے۔“

بخت آدر اندری اندر کلک گئی۔ شہر یا واقعی خوشبو کا بے دریغ استعمال کرتا تھا جو اس کے جانے کے بعد بھی کمرے میں تیرتی پھرتی تھی لیکن اسے کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اس بات کو بھی نوٹ کرے گا۔ وہ قدرے پریشان تو ہوئی لیکن اس نے اپنے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہونے دیا اور یوں بے نیازی سے خاموش بیٹھی رہی جیسے اس کی بات کو کوئی اہمیت نہ دی ہو۔

وہ اس کے مقابل آن کھڑا ہوا اور تھکانہ لہجے میں بولا۔ ”بخت آدر.....! ابھی تمہارے پاس کون تھا؟“

بخت آدر دھک سے رو گئی۔ لیکن اس نے خود پر قابو پا لیا اور تلخ لہجے میں بولی۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”میں کوئی فاری نہیں بول رہا ہوں۔ جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔ ابھی اس وقت تمہارے ساتھ کون تھا؟“ اس کا انداز بے حد درشت تھا۔

”اس قید تمہائی میں میرے سوا یہاں اور کوئی نہیں ہوتا۔“

”بخت آدر۔ جھوٹ بولو۔“ اس نے سختی سے اسے ٹوک دیا۔

”سچ بتاؤ یہاں کون آتا ہے؟“

”یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تمہارا شک ہے۔“ بخت آدر نے ناگواری سے جواب دیا۔

”بخت آدر!“ اس نے سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔

”جو میں پوچھ رہا ہوں۔ مجھے اس کا جواب دو۔ یہاں کون آتا ہے؟“

بخت آدر نے جرات سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔ ”بہرے ہو۔ تم نے میرا جواب نہیں سنا۔“

اس نے اچانک آگے بڑھ کر اس کے بال پکڑ لئے اور اسے زور سے کھینچ کر اس کا ہر ہچکے کو جھک گیا۔ وہ غصے سے سرخ آنکھوں کے ساتھ اس کی طرف ٹھونکتا ہوا بولا۔

”بتاؤ..... یہاں کون آتا ہے؟ کون آتا ہے یہاں تمہارے پاس۔ تمہیں شریفانہ زندگی داس نہیں آئی جو تم نے یہاں بھی وہی کروت کرتے شروع کر دیئے ہیں؟ میں تمہارا ذوق لپی جاؤں گا۔“

کرب و اذیت سے بخت آدر کے آنسو نکل آئے۔ خود کو چھڑانے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے غصے سے کہا۔ ”چھوڑو مجھے ذلیل انسان..... چھوڑو۔ یہاں اس قید میں ہمارے سوا اور کون آتا ہے۔ تم.....؟“ اس کی آواز بلند ہو گئی تھی۔

اس نے یکدم اپنا کھردرا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ ”خاموش رہو۔ تم شہر چاکر یہاں لوگوں کو اکٹھا کرنا چاہتی ہو۔ اگر اب تم نے کچھ اور کہا تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ تمہیں تم.....؟ اس نے بے دردی سے جھٹکا دے کر اسے صوفے پر پیٹک دیا۔

بخت آدر اذیت سے بے حال ہو گئی۔ اس کے اندر نفرت کے ابال سے اٹھنے لگے۔ وہ سر طرح اس شخص کے ہاتھوں میں بے بس ہو گئی تھی۔ اس کے دم و کرم پر پڑی ان چابی اندکی گزارنے پر مجبور تھی۔ باہر قدم کھانسی تھی تو اسے جیسے کتے ہی دروازے اس کی تاک میں تھے اور یہاں اس کی قید میں جینے کی اذیت ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ زندگی ختم ہوتی تھی نہ ملے بنتے تھے۔

بخت آدر نے ٹپس میں دانت چیں کر کہا۔ ”تم گمے ہوئے انسان ہو۔ تم بے دم غلام ہو۔ کیونکہ! تم ایک ہی بار مجھے مار دو۔ میں روز روز کے مرنے سے تو چھوٹ جاؤں گی۔“

”بکواس بند کرو۔“ وہ میز پر ایک پاؤں رکھ کر اس کی طرف جھکتے ہوئے خونخوار لہجے میں بولی۔ ”اگر مجھے کچھ چل گیا تو تمہاری خیر نہیں۔ اتنا سمجھ لینا۔“ اس نے زور سے

پاؤں زمین پر مارا اور کرے سے باہر نکل گیا۔ بخت آور آنسو بھری آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

○.....○.....○

اگلے روز شہر پار پھیلے روزانے سے آیا اور آتے ہی بخت آور کو دونوں شانوں سے پکڑ کر کھما دیا۔ پھر اس کے بازو سے لگ کر بولا۔ ”شکر ہے میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ میرے سامنے ہیں۔ اپنے تمام زخموں جہاں سوز کے ساتھ۔“

بخت آور نے اسے ہرے دکھایا۔ ”دور ہو۔ کیا فضول حرکت ہے۔“

”اف۔ اف۔ میں آپ کو کیا بتاؤں کہ میں نے کل سے آج تک کا وقت کس طرح گزارا ہے۔ مجھے بس یہی ڈر تھا کہ اگر اگلے کو کوئی شک ہو گیا تو وہ آپ کو کہیں اور نہ لے جائیں۔ تو پھر میں کیا کروں گا۔ مجھ غریب کا کیا ہوگا۔“

”اپنی بکواس بند کرو بزدل کہیں کے۔ کل تم کیسا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے تھے اور تمہارا مکینہ اگلے میرے پیچھے بڑ گیا تھا۔“

”اوہ خدایا۔“ وہ پریشان ہو گیا۔ ”ان کو پتہ چل گیا ہے؟“

”اور نہیں تو کیا۔ تم جو شیشی بھر کر پر نفوس اندر آئے ہو وہی اس کو سب کچھ بتانے کے لئے کافی ہے۔ بس اب تم آئندہ یہاں مت آنا۔ وہ کل بہت غصے میں تھا۔“ بخت آور نے ملامت آمیز لہجے میں کہا۔

”اوہ ہو..... انہوں نے آپ کو کچھ کہا تو نہیں؟“ وہ گھبراہٹ۔

”بس اب تم یہاں نہ آ کر۔“ میں تمہیں بتا رہی ہوں۔“ بخت آور نے سختی سے کہا۔

”فہمک ہے۔ میں نہیں آؤں گا اور آپ ابھی اور اسی وقت میرے ساتھ چلیں گی۔“

انگل کو کیا حق ہے کہ آپ کو یہاں قیدیوں کی طرح رکھے۔ اب خواہ کچھ بھی ہو میں آپ کو یہاں سے لے کر یہی جاؤں گا۔“ وہ ایک عزم کے ساتھ قلعی لہجے میں بولا۔

”تم اپنے ہوش میں تو ہو۔ کہاں لے کر جاؤ گے تم مجھے؟“

”جناب میرے پاس سب انتظام ہے۔ آپ ایک بار چلنے کی حاضری تو بھریں۔“

بڑے اعتماد سے بولا۔

”کیا انتظام ہے تمہارے پاس۔ پہلے مجھے بتاؤ تو سہی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ میرے لئے باہر کتنا خطرہ ہے۔ چاروں طرف میرے دشمن مجھے کس طرح سے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

اور تمہارا یہ انگل کتنا خطرناک ہے۔“

”ہم بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہیں۔ آخر جیسے کس کے ہیں۔ پلیز آپ مجھ پر بھروسہ تو کریں اور پھر دیکھیں آپ کا یہ خادم کیا کمال دکھاتا ہے۔ بس اب اٹھ جائیں اتنا نہ سوچیں۔“

پہلیں انھیں۔ پلیز۔“ اس نے بخت آور کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

بخت آور سوچ میں پڑ گئی۔ کل کے واقعے نے اسے بہت دل برداشتہ کر دیا تھا اس کے اندر بغاوت سر اٹھانے لگی تھی۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ شخص اس سے کوئی بڑا فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اس کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہونا چاہتی تھی۔ وہ اپنی رہائی کیلئے کچھ نہ کچھ کوشش ضرور کرنا چاہتی تھی وہ پھر ایک بار اپنا آپ داؤ پر لگانے کو تیار ہو گئی۔ اس نے غور سے شہر یاری طرف دیکھا۔

”کیوں شیری! بعد میں تم بچتے دو گے تو نہیں؟“

”کیسی باتیں کرتی ہیں آپ۔ میرے لئے تو اس سے بڑی خوشی کوئی نہیں کہ میں آپ کے کسی کام آؤں۔ بس اب آپ اور وقت ضائع نہ کریں اور جلدی سے تیار ہو جائیں۔ میں ذرا ارد گرد کا جائزہ لیتا ہوں۔“ اس نے چٹکی بجا کر کہا اور بالکونی کی طرف چلا گیا۔

○.....○.....○

میں اٹکنے لگا۔ اس کی پیشانی پسینے میں جھپکنے لگی کسی ان دیکھے حادثے کے ڈر سے وہ نہ تو ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سننا چاہتی تھی نہ ہی ان کی طرف دیکھنا چاہتی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

پولیس والوں نے فحش کے شے میں سے اندر جھانکا اور اکڑ پنے سے شہریار کا نام پوچھا۔

”میرا نام قیوم ہے۔“ اس نے بڑی روانی سے بتایا۔ ”اور یہ میری باجی زریبہ ہے۔“ کہاں جا رہے ہو؟ کہاں رہے ہو؟ گیس کی کہاں سے کرائے پر لی وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے بہت سے سوالات پوچھ ڈالے۔

بخت آور سانس روکے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو سن رہی تھی۔ اسے شہریار پر حیرت ہو رہی تھی کہ ایس نے کسی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا اور بڑے اعتماد سے ان کے سوالات کے جواب دے رہا تھا۔ بخت آور نے چادر سے اپنا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ انہوں نے وہ ایک بار اس کی طرف دیکھا لیکن کوئی اعتراض نہیں کیا۔

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی اور وہ لوگ آگے بڑھ گئے۔ ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی۔ بخت آور کا رکاب ہوا سانس جیسے چرے بحال ہو گیا۔ شہریار نے جیسے ہی گاڑی ڈرائیور کے سامنے کیلئے کہا۔

”باجی! شاید یہاں کوئی واردات ہو گئی ہے جب ہی پولیس سب کو روک رہی ہے۔“ بخت آور کو فحش آگئی۔ شہریار کی چالاکي پر اسے حیرت ہو رہی تھی۔ وہ جسے بھولا بھالا اور سادہ سا سمجھتی تھی وہ کتنا ہوشیار تھا۔ شہریار کی اس ہوشیاری نے اسے حوصلہ دیا تھا۔ اسے قدرے اطمینان ہو گیا تھا کہ شہریار حالات کا مقابلہ کرنے میں اس کا ساتھ دے سکتا تھا۔ وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے کیلئے اس پر اعتماد کر سکتی تھی۔

سن رہا تھا یا منزل کے بارے میں اطمینان اور تذبذب کے باعث وہ کچھ طویل معلوم ہو رہا تھا۔ بخت آور آنے والے لمحوں کے بارے میں اچھی اچھی امیدوں اور تمناؤں کے ساتھ سوچ رہی تھی۔ اسے آزادی اور رہائی کی سستی ختمی سمرت کا نرالا احساس گم گمادار تھا۔

”اس گیت کے اندر لے جاؤ۔“ شہریار نے ایک سرخی گیت کی طرف اشارہ کیا۔ بخت آور کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ شہریار نہ جانے اسے کہاں لے آیا تھا۔ اس نے خوف اور گھبراہٹ کے طے بلے جذبات کے ساتھ سوچا اور خود کو آنے والی صورتحال کا سامنا کرنے

نئی طرز کی کشادہ کالونی شاید حال ہی میں تعمیر ہوئی تھی۔ سارے گھر ایک ہی طرز کے بنے ہوئے تھے۔ بخت آور نے فحش کے شے میں سے باہر جھانکتے ہوئے اپنے ساتھ بیٹھے ہوئے شہریار سے پوچھا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“

شہریار نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کا ہاتھ دبا کر اسے خاموش رہنے کے لئے کہا۔ بخت آور کو بھی احساس ہو گیا کہ اسے مقابلہ رہنا چاہیے۔ فحش والا ان کی گفتگو سن سکتا تھا۔

اس کے دل میں ایک عجیب الجھن سی جچی تھی۔ تید سے رہائی کی خوشی اور مکمل فضا کی خوشگوار۔ کچھ خوف، کچھ امیدیں اس کے ساتھ ساتھ ستر کر رہے تھے۔ وہ تو جان فحش پر لے کر نکلی تھی۔ انجام سے بے پروا ہو کر ایک بہتر اور باعزت زندگی کی آس لے کر۔ اس کے دل کو اطمینان تھا۔ اس کے دل کو تر تھا کہ اس نے ایک اچھی زندگی کی طرف قدم کی ہے۔ آگے کیا ہونے والا ہے اس کے بارے میں اس نے سوچا تھا نہ سوچنا چاہتی تھی۔ وہ خود کو خوف اور اندیشوں سے مارنا نہیں چاہتی تھی۔ شہریار نے ابھی تک اسے کچھ نہیں بتایا تھا کہ وہ اسے کہاں لے جا رہا ہے۔ وہ ایک باعزت زندگی کی تلاش میں اس کے ساتھ ہر خطرے سے بے نیاز ہو کر چل پڑی تھی۔

فحش ابھی تک اسی علاقے کے مختلف بلاکوں میں دوڑتی جا رہی تھی۔ شہریار بھی اس کی جانب دیکھ لیتا اور بھی ہولے سے اس کا ہاتھ چھو لیتا۔ اس کا عمر چہرہ فحش سے دک رہا تھا۔ وہ دونوں اپنی اپنی سوچوں میں گم بیٹھے تھے کہ فحش والا نے بے بریک لگائے۔ بخت آور نے جھپکنے سے چونک کر سامنے دیکھا۔

چند پولیس والے سامنے کھڑے تھے۔ بخت آور کی جان پر بن گئی۔ اس کے ہاتھ جھپکنے سے ہونے لگے۔ کہیں اس نے پولیس کو خبر تو نہیں کر دی۔ اگر وہ یہیں دھر لے گئے تو.....

لے بھر میں اس کے ذہن میں ہزاروں دوسو چمن پھیلا کر کھڑے ہو گئے۔ اس کا سانس طلق

کے لئے تیار کرنے لگی۔

ٹیکسی پورج میں رکی۔ تو شہر یار نے باہر نکل کر کرایہ ادا کیا۔ پھر محوم کر دوسرے دروازے کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر بڑے ادب سے بولا۔ ”آئیے۔“

بخت آور چادر سنبھالتی ہوئی باہر آئی۔ شہر یار نے ٹیکسی کا دروازہ بند کر دیا اور بخت آور سے بولا۔ ”آئیے۔ چلیے۔“

بخت آور نے غور سے چاروں طرف دیکھا۔ کوئی شاندار تھی۔ لائن سرسبز و شاداب تھا۔ روٹوں کے گرد گتے ہوئے پورے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ بیلیوں اور پاڑ کی باقاعدہ تراش خراش کی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی آباد ہے اور اس کی باقاعدہ دیکھ بھال ہوتی ہے۔

بخت آور کچھ بچکائی اور اس نے شہر یار کی طرف دیکھ کر کہا۔

”شہری! یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو؟“

”آجائے نا۔ آپ خود دیکھ لیجئے۔“ اس نے برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے

کہا۔

بخت آور بھی دو ایک سیڑھیاں بھلا لگ کر اس کے برابر آگئی۔

”شہری! کچھ بتاؤ تو سہی تاکہ یہاں کون لوگ رہتے ہیں۔ تم انہیں میرے بارے میں کیا بتاؤ گے۔“

”اوہو۔ بھی کیوں پریشان ہوتی ہیں آپ۔“ شہر یار نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”آپ فکر نہ کریں۔ یہاں سب اپنے ہی ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ بخت آور نے اپنا ہاتھ جھڑ لیا۔

”تم مجھے سیدی طرح سے بتاؤ کہ یہ کس کا گھر ہے؟ آخر تم میرا تعارف کس حوالے سے کراؤ گے۔ کچھ مجھے بتاؤ تو سہی نا۔ مجھے تو سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“

”آپ تو ایسے ہی گھبرا جاتی ہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔

”یہ غاسکار احمق سہی مگرا تا سہی نہیں کہ آپ کو کسی ایسی ویسی جگہ لے جائے۔ آپ سے کہا ہے تاکہ یہاں سب اپنے ہی ہیں۔“ فکروالی کوئی بات نہیں۔“

بخت آور نے اپنی چادر سے پیشانی کا پینہ صاف کیا اور بند دروازے کے پیچھے چھپے ہوئے چہرہ کا سامنا کرنے کیلئے خود کو ڈھکی طور پر تیار کر رہی تھی۔

شہر یار نے گھنٹی پر انگلی رکھی۔ ایک بار۔ دوبار۔ تین بار۔ اس نے مسلسل تین لمبی گھنٹیاں بجائیں۔

”شہری یہ تم ہو۔“ کسی مردانہ آواز نے پوچھا۔

بخت آور نے چمک کر سامنے دیکھا۔ وہ آواز انشوکام سے آئی تھی۔ شہر یار نے جواباً اپنا نام بتایا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھلنے کی آواز یوں سنائی دی جیسے کسی خودکار نظام کے ذریعے سے دروازہ کھولا گیا ہو۔

”آئیے۔ میڈم ہمارے غریب خاندان کو روٹی بخشجئے۔“ شہر یار نے دروازہ کھول کر پورے آداب کے ساتھ کہا۔

بخت آور اس کے ساتھ ہی ایک وسیع راہداری میں داخل ہوئی جس میں کئی دروازوں کی موجودگی بتا رہی تھی کہ کوئی کافی بڑی تھی۔ راہداری کے آخری سرے پر جا کر شہر یار نے ایک دروازے کے پینڈل پر ہاتھ رکھا اور دروازہ کھول دیا۔

○ ○ ○ ○ ○

”اے۔۔۔۔۔ اے۔۔۔۔۔ آنکھیں کھولو۔ اے۔۔۔۔۔ اے! آنکھیں کھول اٹھ جا۔ ارے اٹھ۔۔۔۔۔!“

سجاول کے کانوں میں ایک مہین سی آواز مسلسل آ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بہت دور سے پکار رہا ہے۔ یہ بھی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کوئی اسے پکار رہا ہے۔ یا محض اس کا خیال ہی اسے آواز بن کر سنائی دے رہا ہے۔ اس کے ذہن میں کوئی بات، کوئی یاد، کوئی احساس نہیں رہا تھا۔ اسے وقت کا، حالات کا، گرد و پیش کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کہاں تھا؟ ذہن پر جما ہوا خوف اسے آنکھیں بھی نہیں کھولنے دیتا تھا کہ نہ جانے کون سا منظر پیش آگاہ ہو؟ نہ جانے حالات کیسے ہوں؟

”اٹھ۔۔۔۔۔ اٹھ، آنکھیں کھول۔“ اسے پھر وہی آواز سنائی دی۔ اسے اپنی آنکھوں اور رخساروں پر لٹام سے اچھ کا کلس محسوس ہو رہا تھا وہی کلس اس کے بالوں سے الجھا۔ پھر انہی بالوں نے اس کے بالوں سے گھٹیاں بھر لیں۔

”اے۔۔۔۔۔ اٹھ۔“ اسے پھر وہی لٹام آواز سنائی دی۔ اسے بالوں میں ہلکا سا ہچکا محسوس ہوا۔ رفتہ رفتہ اس کا ذہن کام کرنے کے قابل ہوا۔ اسے سب کچھ یاد آ گیا۔ سارا بھروسا اس کی آنکھوں میں محسوس کیا۔ اسے یاد آ گیا کہ اسے ساپ نے ڈس لیا تھا۔ اور پھر وہ شاید

ہے ہوش ہو گیا تھا۔ اسے جھرجری سی آگئی۔ اس نے یہ یقین کرنے کو کہ وہ زندہ ہے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔

دھوئیں سے اُٹی ہوئی کچھ دیواریں اور سرکنڈوں سے بنی ہوئی بے ہنگم چھت اس کی نگاہوں سے نکل گئی۔

”اب اٹھو بھی۔ تم کب سے سو رہے ہو۔“ بھرائی نرم آواز نے کہا۔ سجاد نے آواز کی سمت دیکھا۔ اسے حیرت کے ساتھ ایک سوہم می تاریکی اور خوشگوار کا احساس ہوا۔ ایک پھولے پھولے کالوں والی سانولی سی نمی مٹی جی اس کے سر پرانے بیٹھی تھی۔ اس کے کانوں کے قریب دو چھوٹی چھوٹی چٹیاں لنگ رہی تھیں اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پا کر وہ جلدی سے بولا۔

”توبہ..... تم کتنا سوتے ہو۔ اب بس کرو تا۔ اب نہ سوتا۔ اگر تم نہ جاگے تو تم مر جاؤ گے۔ اچھا۔“

سجاد نے تیز نظر سے چاروں طرف دیکھا کہ کمرے میں اس بچی کے علاوہ اور کون ہے؟ لیکن وہ کوٹھڑی نما نیم تاریک خالی تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اور اس نمی سی لڑکی کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولا۔

”تم کون ہو؟“

”میں جھمبو ہوں۔“ اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

”مجھے یہاں کون لایا ہے؟“ سجاد نے پوچھا۔

”بابا۔ وہ بولی۔

”بابا..... کون بابا؟“

”میرا بابا۔“ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر مصممیت سے کہا۔

”بابا؟ بابا تمہارا کیا لگتا ہے؟“ سجاد نے اس کے بارے میں مزید جاننے کیلئے

استفسار کیا۔

”بابا..... میرا بابا لگتا ہے۔“ بھولا بھلا سا جواب ملا۔

”تم اس کی کیا لگتی ہو؟“ سجاد نے الٹ کربات پوچھنی چاہی۔

”میں اس کی جھمبو لگتی ہوں۔“ اس نے بھولپن سے بڑبڑا کر کہا۔ تو سجاد کو مٹی آگئی۔

اس نے دل ہی دل میں سوچا کہ بچے کتنے سادہ اور انجان ہوتے ہیں۔ شاید اسی لئے سب

سے زیادہ سبھی، گمن اور مطمئن بھی۔ اپنی چھوٹی سی صمدود دنیا میں محو۔ بچی نے اسے ہنستے ہوئے دیکھا تو خود بھی ہنس پڑی اور چپکٹی ہوئی بولی۔

”شکر ہے جو تم جاگے ہو۔ بابا کہتا تھا کہ اگر تم نہ جاگے تو تم مر جاؤ گے۔ بچی بچی مر جاؤ گے۔“

سجاد کو سب کچھ یاد تھا لیکن بچی سے حالات جاننے کو اس نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ ”اچھا؟ کیوں مجھے کیا تھا؟“

”ہا..... جھمبیں تو یاد ہی نہیں۔“ جھمبو نے بچکا نہ تجھ سے کہا۔ ”جھمبیں تو سانپ نے کاٹا تھا۔ میرا بابا سانپ کے زہر کا توڑ جانتا ہے۔ اس کے پاس منکا ہے۔ اس نے تیرے جگر پر منکا پھیرا تھا۔ نہیں تو تو نے نہیں چپتا تھا۔“

سجاد نے غیر ارادی طور پر اپنے پاؤں کی طرف دیکھا اس کے انگوٹھے پر اپنی بندھی تھی۔ اسے تاریکی میں ڈوبنا ہوا ہولناک منظر ایک بابا پر اڑا گیا جب زندگی کی آس دم توڑ رہی تھی۔

اس کا دل اس شخص کے لئے فکرا اور احسان مندی کے جذبات سے لبریز ہو گیا جس نے زندگی ایسی قیمتی شے اسے لوٹا دی تھی۔ اس نے بچی سے پوچھا کہ اس کا بابا کہاں ہے۔

”وہ قبروں پر پانی ڈالے گیا ہے۔“ جھمبو نے بتایا۔

سجاد کو اطمینان ہو گیا کہ وہ قبرستان ہی میں گورن کی کتیا میں پڑا ہے۔ لیکن اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ اور کون کون رہتا ہے۔ یقیناً اس بچی کے والدین بھی یہیں رہتے ہوں گے۔ جہاں جاننے کو اس نے بچی سے پوچھ لیا۔ اس نے سینے پر ہاتھ سا ہاتھ رکھا۔

”صرف میں اور میرا بابا۔“

سجاد کو قدرے اطمینان ہوا کہ اسے یہاں فی الفور کوئی خطرہ نہیں تھا۔ وہ کچھ روز یہاں گزار سکتا تھا۔ اس کا منہ خشک ہو رہا تھا۔ اس کے حلق میں کڑواہٹ سی گئی ہوئی تھی۔ اس نے سارے کمرے میں نظر دوڑائی کہ کہیں اسے کوئی پانی کا گمزا وغیرہ نظر آ جائے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اسے چھوٹی سی بچی سے اپنے لئے پانی منگواتے ہوئے جھک سی ہو رہی تھی۔ مجبوراً اسے جھمبو سے کہنا ہی پڑا۔

”جھمبو ذرا ایک گلاس پانی تولادے۔ بڑی پیاس لگی ہے۔“

”اچھا۔“ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ پھر جاتے جاتے پلٹ کر بولی۔

”بابا کہتا تھا کہ اگر تمہیں ہوش آجائے تو تمہیں ایک کنورہ دودھ کا دے دوں۔“

”دودھ۔“ سجاد نے دوہرایا۔

”دودھ ہوگا کھر میں؟“

”سندری ہے نا۔ ایک پیالہ دودھ تو دے ہی دے گی۔“ معصوم نے جوش سے کہا اور اپنی چھوٹی سی اداؤں سے سنبھلتی ہوئی کونگڑی سے برابر کھل گئی۔ سجاد وہیں چٹائی پر بیٹھا نہ جانے کیا سوچتا رہا۔

معصوم نے زیادہ دیر نہیں لگائی۔ دس پندرہ منٹ میں ہی دودھ کا کنورہ ہاتھ میں لئے کمرے میں موجود تھی۔

”واہ معصوم۔ تو تو بڑی ہوشیار ہے۔ اتنے بہت سے کام تو اکیلے ہی کر لیتی ہے۔“

سجاد نے کنورہ اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اپنی تعریف سن کر وہ خوش ہوئی اور شرما کر اس نے اپنا سالو لاچرہ اپنے شانوں پر جھکا

لیا۔ پھر جھپکتے ہوئے بولی۔ ”چاچا شکریہ تم ہوگی ہے۔ دودھ پینا ہے۔“

سجاد کو اس کے ننھے سنے ہوٹوں سے اپنے لئے چاچا کا لفظ بے حد اٹوکھا لگا۔ اس

نے کبھی کسی کے ساتھ کوئی رشتہ نہیں جوڑا تھا۔ وہ چھوٹی سی عمر میں ہی رشتوں اور محبتوں سے

اس طرح محروم ہو گیا تھا کہ اسے احساس ہی نہیں تھا کہ اپنی ذات کے ساتھ کوئی رشتہ جوڑ لینے

سے جذبول کا رنگ کس طرح نکھر جاتا ہے۔ دل میں کیسی گرم جوش اور محبت کی قدرتی جھلکی

طرح چھوئے لگتی ہے۔

معصوم ہی معصوم کے ہونٹوں سے پھوٹنے والا لفظ عیار اور سچائی میں ڈوب ہوا تھا۔ وہ

بغیر لاچ، بغیر کسی طلب کے اسے یہ رشتہ دے رہی تھی۔ اس نے دودھ کا کنورہ اس کے ہاتھ

سے یوں لے لیا جیسے وہ اسے کوئی خزانہ بخش رہی ہو۔ اسے دودھ بھی اتنا خوش ڈانڈ اور

شیریں محسوس نہیں ہوا تھا۔ جتنا اس وقت محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے ایک ہی سانس میں کنورہ

خالی کر دیا اور آستین سے منہ پر پچھتے ہوئے اس نے کنورہ اس کے ہاتھ میں تھمایا تو وہ اپنی

چنگیلی سیاہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”چاچا..... اور لاؤں۔“

سجاد کو اس پر پیار سا آگیا۔ وہ چھوٹی سی تھی لیکن اس نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کی

طلب نہیں ملتی تھی۔ اس نے جس کراس کی طرف دیکھا اور محبت سے بولا۔

”کچھ اپنے بابا کیلئے بھی تو دودھ رکھ لے کہ سارا مجھے ہی پلا دے گی۔“

”کوئی بات نہیں چاچا۔ بابا چائے پی لے گا۔“ اس نے جلدی سے کہا اور فوراً مزکر

کمرے سے باہر کھل گئی۔

سجاد بھی چٹائی سے اٹھا اور اس نے اس بے سرو سامان بے ڈھنگے کمرے کا جائزہ

لیا۔ جہاں ایک دو شین کے بکسوں اور چند برتنوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ معصوم جب تک دودھ سے

بھرا کنورہ پھر لے آئی۔ سجاد نے دودھ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کمرے کے کمرے ہی پینے

لگا۔

معصوم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور ہمین سی آواز میں بولی۔ ”چاچا۔ بابا کہتا

ہے دودھ اور وہاں پانی بیٹھ کر پیتے ہیں۔ کمرے کمرے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا۔“

سجاد نے سرسرا کر پیالہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ ”معصوم۔ تمہارا بابا ٹھیک کہتا ہے۔ پر

میں بیٹھ بیٹھ کر تھک گیا ہوں اس لئے کھڑا ہو گیا تھا۔ اچھا اب تم مجھے یہ بتاؤ کہ تمہارا بابا کب

آئے گا۔ یا میں اسے قبرستان میں جا کر دیکھوں۔“

”وہ مغرب کی اذانوں کے وقت آتا ہے۔ پھر آکر نماز پڑھتا ہے۔ میں روٹی پکاتی

ہوں وہ کھاتا ہے۔“ اس نے روانی سے بتایا۔

سجاد نے اس کے ننھے سنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ وہ کتنی چھوٹی اور معصوم تھی۔

اس کے تو ابھی گڑیاں کھیلنے کے دن تھے کہ مگر داری کے تھکا دینے والے دھندوں میں الجھ گئی

تھی۔ اس نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”معصوم۔ آج میں بھی یہاں روٹی کھاؤں گا۔ تم اتنی ساری روٹیاں پکا لو گی؟“

”ہاں چاچا میں پکا لوں گی۔ جب بابا کے پاس کوئی مہمان آتا ہے تو ساری

روٹیاں میں آپ پکاتی ہوں۔“ اس نے بڑے جوش سے بتلایا۔

”او معصوم..... او معصوم..... دیکھا۔ سندری نے ری تڑالی ہے۔ دیکھ دیکھ۔ ادھر آ۔“

دور سے کسی نے پکارا تو وہ چمک گئی۔ ”ہائے میں مر گئی۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ مار کر

’ی عمر رسیدہ عورت کی طرح کہا۔“ یہ موت جو کی سندری تو کہیں نکلتی ہی نہیں۔ پھر ری تڑا بیٹھی

ہے۔“

سجاد کو اس کی حرکتوں پر ہنسی آگئی۔ اس نے دروازے سے اسے دودھ کر نکلتے ہوئے

”اچھا..... اچھا! دوں گا۔“ بوڑھے نے اسے ہاتھ ملے کہا۔

”چل تو ذرا آگے جا کر چل تو بھر دے۔ روٹی بھی بیکار دے۔“

بھوسو روٹی پکانے کے لئے کمرے سے باہر چلی گئی تو سجاد اس سے پوچھنے بغیر نہیں رہ سکا کہ بھوسو کی ماں کادھر ہے جو اسے اتنی چھوٹی سی عمر میں گمربار کے دھندے سنبھالنے پڑ گئے ہیں۔

بوڑھے نے ایک آدھ بھری اور اس کا اداس چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا اور انگلی سے اشارہ کر کے نوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”مرضی..... اس اوپر والے کی مرضی..... مرضی اس نیلی بھرتی والے کی مرضی۔ یہی لفظ بار بار وہ ہراتے ہوئے وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ اور جیسے اپنے آپ ہی سے باتیں کرتا ہوا لڑکھانے والے قدموں سے کوفڑی سے باہر نکل گیا۔



انگلج بھی وہ بیدار ہوا تو سورج خاصا نکل آیا تھا۔ سیاہ دیواروں والی نیم تاریک کوفڑی کو بھی اس کی چٹکی سیلہ کڑوں نے اجلا کر دیا تھا۔ رات وہ بڑی دیر تک جاگتا رہا تھا۔ بیداری نے ان بیکل لمحوں میں وہ اپنے ہی کو کدھکھندوں میں الجھا رہا تھا۔ یہ خوف اس کے اندر کسی نہ کسی طرح چھپا کر کابو چوس رہا تھا کہ ملاں اس کے اس طرح اچانک غائب ہو جانے پر کون سے نہیں بیٹھا ہوگا۔ اسے یہاں چند روز کیلئے پناہ تو مل گئی تھی۔ لیکن یہ بھی ایک عارضی پناہ تھی۔ وہ یہاں کچھ روز ٹھہر کر رانی کی زندگی سے دھوکا کھاسا یہ دور بھٹانا چاہتا تھا۔ وہ استانی نہ مل کر اسے مجبور کر دینا چاہتا تھا کہ وہ رانی کی زندگی میں زہر نہ ڈھکے۔ اس کے بعد ہی وہ اپنے اس مستعد کی طرف متوجہ ہو جانا چاہتا تھا۔ جس کے لئے اس نے زندگی داؤ پر لگا رکھی تھی۔ اسے بھگ بھری کو تلاش کرنا تھا۔ اس کے بعد خواہ وہ چھانی چڑھ جاتا یا جیل کی سلاخیں اسے بھگ لیتیں۔

وہ اپنے بستر سے اٹھا اور گرد و پیش پر ایک نگاہ ڈالی۔ کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ ابابوڑھا گورکن اس کا دم دھندے سے لگ گیا تھا۔ اس چھوٹی سی چنگتی ہوئی چڑیا کی انداز میں سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ کمرے سے باہر نکلا تو اسے برآمدے میں برتن مانگتے

”اے بھگ لیتا۔“

”چا چا سلام۔“ اس نے گر بھجی سے کہا۔

دیکھا اور سوچا کہ اس کا بابا آگیا ہے۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس سے ملنے کے لئے تیار کرنے لگا۔ اس کی بلی کی کھائی کی آواز اور اس کے قدموں کی چاپ اسی کوفڑی کی جانب چلی آ رہی تھی۔ سجاد نے سنبھل کر دروازے کی طرف دیکھا۔

بھر چکی ہوئی کمرہ پر بے ترتیب بھجری داڑھی والے بوڑھے نے کوفڑی میں سر اٹھا کر اور چند ہی چند ہی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ سجاد نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سلام کیا اور تھپتھا جبکہ کراس کے پیروں اور ٹخنوں کو ہاتھ لگایا۔

بوڑھا اس کے اس تپاک اور تقصیم سے متاثر ہوا اور اس کے ہنسنے ہوئے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ”شاہزادہ۔ اب ٹھیک شکاک ہے نا؟“

”ہاں بابا! تمہاری بڑی مہربانی۔ تم نے تو مجھے نئی زندگی دے دی۔“

”اے خدا کا شکر کر پتر! جس نے تجھے دوبارہ زندہ کر دیا ہے۔ وہ ساہب تھا بڑا زہریلا۔ تیری تو قسمت اچھی تھی۔“ اس نے سر سے صاف اتارتے، چٹائی کو کھینٹ کر دیوار کے ساتھ لگاتے اور لالین جلا کر اس کی لوہ دم کرتے ہوئے رک رک کر کہا۔

”ہاں بابا حق ہے۔ اللہ کو شکور نہ ہو تو کچھ نہیں ہو سکتا۔“

سجاد نے ایک طویل سانس کھینچی اور چٹائی پر بیٹھ گیا۔ بابا بھی اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اور اس سے پوچھنے لگا کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ اور کدھر جانا چاہتا ہے؟ سجاد اس کی باتوں کے مناسب جواب دیتا رہا۔ پھر باتوں باتوں میں اس نے اسے یہ بھی دیا کہ وہ تلاش حاش کے سلسلے میں گاؤں گاؤں بھٹکتا پھرتا ہے۔ جہاں چار پیسے کی مزدوری مل جاتی ہے۔ وہیں کدھر رہتا ہے۔ اگر وہ برآمدے سے تو وہ کچھ روز اس کے یہاں قیام کر لے۔ بابا نے ایسی باتوں سے اس کی طرف دیکھا جو اسے اپنے دل میں جھانسی ہوئی محسوس ہوئیں اور اپنے سنے لہجے میں بولا۔ ”کچھ جوان میں غریب آدی ہوں۔ زندگی سے لڑتا نہ دیتا۔ یہاں پر اکیلا ہوں۔ زندگی آگے سے نہ پیچھے۔ تو نے اگر یہاں رہتا ہے تو سو سمجھ کر چلنا۔“ اس کے انداز میں واضح سمجھ اور تشویش تھی۔

سجاد اسے مطمئن کرنے کیلئے کچھ کہنا چاہتا تھا کہ بھوسو ہانتی ہوئی اپنی اور سنبھالتی کمرے میں آئی۔ ”بابا..... سندری بڑی شیطان ہو گئی ہے۔ اس نے مجھے بہت دھڑلایا ہے۔ ہاتھ نہیں آتی تھی۔ بابا اس کی ری بہت پرانی ہو گئی ہے تو اس کیلئے سنگھ لادے۔ اس نے پٹناتی سے بال پیچھے بٹاتے ہوئے اپنا تھمبایا جو ہر اور دھنسی سے پوچھا۔

سجاد کو اس کے اپنائیت برے انداز نے تروتازہ کر دیا۔ وہ اس کے برابر ہی زمین پر بیٹھ گیا اور رحمت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”معمو تو ان چھوٹے پھرنے ہاتھوں سے کتنے بڑے بڑے کام کرتی ہے۔“ اس کے ہونٹوں پر ایک شرمائی سی مسکراہٹ آئی اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس نے یہ بات کبھی نہ سنی ہو۔

”میرا دل چاہتا ہے معمو کہ میں تمہارے سارے کام کر دیا کروں۔ یہ برتن مانجھ دوں۔ ہانڈی پکا دوں۔ روٹیاں پکا دوں اور تم گڑیوں سے کیلیو۔ تم کیڑی کاڈا، پھوگول گرم کولکا چھپا کی کیلیو اور خوب مزے کرو۔“

”پر چا چا۔ میں کس کے ساتھ کیلیوں۔ میری تو کوئی سہیلی نہیں۔“ اس نے منہ سوکھا کر کہا۔ ”چا چا یہاں کوئی لڑکی مجھ سے نہیں ہوتی۔ کوئی میری سہیلی ہی نہیں بنتی۔ سب کہتی ہیں کہ قبروں والے کی بیٹی ہے۔“ اس کی معصوم آنکھیں نرم ہو گئیں۔

سجاد کا دل دکھ سے بھر گیا۔ اس نے بھی اس کی لڑکی کے بچپن کے دن بھولیوں کے بغیر کتنے تہا اور بے رنگ تھے۔ وہ ماں اور باپ کے سامنے سے خالی زندگی کی اذیت بغیر کوئی ٹھکھو کے کتنے صبر سے جمیل رہی تھی۔ وہ ماں اور باپ کے سامنے سے زندگی کے گونا گون ہنگاموں سے، منت خیزی آوازوں سے بہت دور یہاں اس شہر خوشال میں پڑی تھی۔ سجاد اسے اس کی تنہائی کا احساس دلا کر اسے کبھی نہیں کرتا چاہتا تھا۔ وہ اس کی معصوم جان کے لئے اس کی گوارا زندگی کو فتح نہیں بنانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس نے بات بدل دی اور خوش دلی سے بولا۔ ”معمو۔ میں جو تیرا چاچا تیرے پاس آ گیا ہوں۔ میں تجھ سے کھلا کروں گا۔“

”بچا چا۔“ معمو نے خوشی سے اپنی آنکھیں چمکیں۔

”بچا چا۔“ سجاد نے اس کے بالوں پر ہلکی سی چپٹ لگائی۔ اسے اپنا آپ بے ہنگام چمکا اور کچھ بدلا بدلا سا معلوم ہوا۔ اس کے منہ کا مزہ جو ہمیشہ کڑوا اور تلخ رہتا تھا اس میں ایک نیک شیرینی گھل گئی۔

معمو نے برتن دھو کر ایک طرف کھکا دیے تھے۔ لیکن وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا معمو نے اٹھ کر کمرے میں لنگے ہوئے چھپکے میں سے روٹی نکالی اور اسے پکارا۔ ”آ جا چا چا روٹی کھا لے۔“

سجاد اندر آ کر چٹائی پر بیٹھ گیا جہاں معمو نے اس کے لئے روٹی اور گڑ ایک چمکا

میں رکھ دیا تھا۔ وہ ناشتہ کر کے باہر نکلا تو معمو بیڑی پر بیٹھی دل صاف کر رہی تھی۔ اس کی آہستہ سنی تو اس نے سر اٹھایا۔

”چا چا۔۔۔۔۔ کہاں جا رہے ہو؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی کوئی بزرگ ہو۔

”ذرا کام سے جا رہا ہوں۔ جلدی آ جاؤں گا۔“ اس نے مسکرا کر بے حد زری سے کہا اور اس سے پوچھا کہ بابا کہاں ہے۔

”اپنی کپاری پر گیا ہے۔ گوڈی کرنے۔ پچھواڑے بابا نے سبزیاں اگائی ہوئی ہیں۔“ وہ تفصیل سے بتانے لگی۔

سجاد نے اسے خدا حافظ کہا اور ابھی اس نے برآمدے سے باہر پاؤں ہی دھرا تھا کہ معمو نے عقب سے چلا کر کہا۔ ”چا چا! ویر نہ لگانا جلدی آ جانا۔“

سجاد مڑ کر دیکھنے پر مجبور ہو گیا اس کا یہ اپنائیت بھرا انداز اس کے دل میں اتر گیا۔ وہ آگے نہ بڑھ سکا اور پلٹ کر اس کے قریب آیا اور اس کے برابر جھک کر بولا۔

”تو فکر نہ کر معمو۔ میں جلدی آ جاؤں گا اور تیرے ہاتھ کی بکری روٹی کھاؤں گا۔“ وہ کھٹکھٹا کر فز پڑی اور اس کی آنکھوں میں ستارے سے چمکنے لگے۔ سجاد نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا چل کھڑا ہوا۔

ہوئی تھی۔ دہلیز کے ساتھ ساتھ گھاس اگ آئی تھی۔

سجاد نے اعزازہ لگانے کو کہہ کر دروازہ کھلا ہے گاڑ کو ہلکا سا دھکا دیا تو دروازہ ڈولتا ہوا ہلکی سی چرچاہٹ کے ساتھ دا ہو گیا۔ آگے ویران سا منظر تھا۔ جہاں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ ارد گرد کوئی ایسی چیز نظر نہیں آتی تھی جس سے اعزازہ ہو سکتا کہ یہاں کوئی رہتا ہے۔

”منھن کو پار کر کے وہ اس دروازے تک پہنچا جو بنہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے قریب جا کر اسے دھکا دیا لیکن وہ کھلا نہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر سے کنڈی لگی ہوئی ہے۔ سجاد ٹھک گیا۔ یقیناً اندر کوئی موجود تھا۔ اسے لینے کے دینے پر سکے تھے۔ لیکن اب وہ خطرہ مول لے چکا تھا۔ اس نے دروازے پر دھک دی اور تھکی تھکی سی آواز میں کہا۔

”یہاں کوئی ہے؟ میں مسافر ہوں۔ مجھے پیاس لگی ہے۔ دو گھونٹ پانی پلا دو۔“
اس کی دھک کا کوئی جواب نہیں آیا لیکن اندر سے کچھ ایسی آوازیں سنائی دے رہی تھیں جیسے کوئی وہاں موجود ہے۔ سجاد نے اس مرتبہ ذرا زور سے دھک دی اور پکار کر کہا۔
”کوئی ہے تو دروازہ کھولو۔“ اس کی دھک سے بوسیدہ گاڑ زور سے ہلا، کنڈی شاید ڈھیلی تھی جو بھٹکا نکلنے سے گر گئی اور گاڑ دا ہو گئے۔ سجاد نے اندر جھانکا۔

یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گیا کہ وہ کمرہ چھوٹا سا باد پتی خانہ تھا۔ چوہے کے قریب ٹیلے سے پکڑوں میں ایک عورت بیٹھی کوئی کام کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔ بہت اور پریشانی میں وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکی اور دھشت زدہ آنکھوں سے اس کی طرف گھر گھر دیکھ رہی تھی۔

سجاد نے اس کی تسلی کیلئے جلدی سے کہا۔ ”بہن۔ مجھ سے ڈرو مت میں مسافر ہوں۔ پانی کے دو گھونٹ ہوں تو پلا دو۔ بڑی پیاس لگی ہے۔“

اس عورت کی آنکھوں کی دھشت کم نہیں ہوئی۔ اس نے دیوار کے ساتھ رکھے ہوئے گھڑے کی طرف اشارہ کیا لیکن منہ سے کچھ نہیں بولی۔ سجاد نے آگے بڑھ کر گھڑے سے لٹلی انڈیل کر پیا۔ گھڑے کا ٹھنڈا پانی فرحت بخش تھا۔ اسے تازگی کا احساس ہوا اس نے کٹورہ گھڑے پر ڈھک دیا اور ایک گاہ اس عورت پر ڈالی۔

وہ سیدھی سادی جوان دیہاتی عورت تھی۔ جس کے چہرے پر خوف اور پریشانی لکھی ہوئی تھی۔ وہ سراہ سکی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ سجاد کو وہ عورت مصیبت زدہ سی معلوم

استانی کا دروازہ آج بھی بند تھا۔ نہ جانے وہ کہاں گئی ہوئی تھی جواب تک نہیں لوٹی تھی۔ اس نے ادھر ادھر سے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن کسی کو اس کے بارے میں پتہ نہیں تھا۔ سجاد کو بڑی پاپوی ہوئی۔ آج کا دن بھی بیکار چلا گیا تھا۔ نامعلوم وہ آج وہاں آئی تھی بھی یا نہیں۔

اس کے پاس مہلت کم تھی اور اس کے ذمے بہت سے کام تھے۔ وہ جلد سے جلد اسے پایہ تکمیل تک پہنچا دینا چاہتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ آج اسے شہر چلا جانا چاہیے کہ وہاں کسی سے بھاگ بھری کے بارے میں کچھ معلوم کر سکے۔ کچھ لوگوں سے شہر میں اس کی شناسائی بھی تھی۔ مگر ان سے ملنے میں یہ اندیشہ تھا کہ وہ ملاں کو اس کے بارے میں آگاہ کر دیں گے۔

وہ بے خیالی میں ایک رستے پر یوں ہی چلا گیا جو شہر کی طرف جانے کے بجائے کسی اگلے گاؤں کی طرف جاتا تھا۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈے بھی لگی گھاس اور ہرے بھرے کھیت نظر آ رہے تھے۔ یکایک اس کی نگاہ ایک شگستہ سے مکان پر پڑی۔ اسے حیرت ہوئی کہ یہاں آبادی سے دور اس علاقے میں کون رہتا تھا۔ یا شاید وہ کوئی ویران مکان تھا۔ دور سے ایک شگستہ سی چار دیواری نظر آ رہی تھی۔

بلکی کی سی سرعت سے ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اگر آبادی سے دور یہ مکان خالی اور ویران تھا تو وہ یہاں بھی اپنا ٹھکانا بنا سکتا تھا۔ اگر قبرستان میں اسے کوئی خطرہ ہوا تو وہ یہاں پناہ لے سکتا تھا۔ یہی سوچ کر وہ اس شگستہ چار دیواری کی سمت چل پڑا۔

یہی لمبی گھاس اور سرکنڈوں میں راستہ بنا تو آگے بڑھا۔ اس نے دیکھا کہ مکان کی کئی دیواریں گری ہوئی تھیں اور جو کمرے کھڑے تھے ان کی حالت بھی اتنی خستہ تھی کہ ایک زوردار بارش بھی نہ سہہ سکیں۔ دروازے جیسے چوکت کے سہارے کھڑے تھے جن پر کالی گھاس

ہوئی جو نہ جانے کیوں آبادی سے دور یہاں تنہا رہنے پر مجبور تھی۔ معلوم نہیں اس کے ساتھ اور کون رہتا تھا؟ وہ ڈری ہوئی سی کڑی چدرنوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

سجاد نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔ ”بہن تو یہاں اکیلی رہتی ہے یا تیرے ساتھ کوئی اور بھی ہے۔“

اس نے گردن جھکا لی اور سر کو ایک ہمہی جنبش دی جس سے سجاد کو کچھ اندازہ نہیں ہو سکا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بولنے سے ڈرتی ہے۔ سجاد نے پھر ہوردی سے کہا۔ ”بہن تو مجھے پریشان لگتی ہے۔ کیا بات ہے؟ اس دیرانے میں اکیلی کیوں پڑی ہے؟ کوئی تیری خبر خیر لینے والا ہے یا نہیں؟“

اس نے بے چینی سے پہلو بدلا اور سوائی لنگہ اس پر ڈالی یوں جیسے کہہ رہی ہو کہ وہ چلا کیوں نہیں جاتا۔ سجاد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس کی موجودگی سے گھبرار ہی ہے۔ لیکن وہ اس کے بارے میں کچھ جانے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسی خیال سے اس نے ایک بار پھر پوچھا۔

”بہن یہاں تیرے ساتھ اور کون رہتا ہے۔ کوئی مرد بھی ہے۔“

عورت نے جھکا ہوا سر اٹھایا اور پھر ایک بے چینی کی نظر اس پر ڈالی۔ سجاد کو محسوس ہوا جیسے وہ گونگی ہے۔

مگر وہ بہری نہیں تھی۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی باتیں سن اور سمجھ رہی ہے۔ لیکن کوئی خوف اسے جواب دینے، بات کرنے سے روک رہا تھا۔ سجاد نے پھر ایک بار اپنی بات دہرائی اور اس سے پوچھا کہ وہ جواب کیوں نہیں دیتی۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے اسے چلا جانے کیلئے کہہ رہی ہو۔ سجاد کو کوشش ہوئی۔ اس نے اشارے سے اس سے پوچھا کہ کیا وہ گونگی ہے۔

وہ کچھ دور پریشان ہوئی۔ اس نے پہلے لٹی میں سر ہلایا پھر اسے اثبات میں جنبش دینے لگی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں کئی تیرے لگی۔ اس نے پھر اسے پلے جانے کا اشارہ کیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے خوف تھا کہ کوئی آ نہ جائے۔

سجاد کو اس پر بے حد حسرت آیا۔ وہ نہ جانے کون کتنی اسی اور کن حالات میں گھری ہوئی تھی۔ اسے اس کی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہئے تھا۔ اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ کر پلے جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر نہ جانے کیوں اس کا دل جا چکا کہ اس مصیبت زدہ، پریشان

حال عورت کو تسلی اور اطمینان کیلئے کچھ کہے۔ اس کا حوصلہ بڑھانے، اس کا خوف دور کرے۔ غیر ارادی طور پر اس نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور پورے غلوں اور چٹائی سے ہلا۔

”دیکھ بہن! اچھے اچھے بھائی سمجھ۔ اگر کوئی دکھ کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتا میں تیری مدد کروں گا۔“

وہ بک کر پیچھے ہٹی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو تیری کے ساتھ اس کے مانو لے رخساروں پر ڈھلنے لگے۔ اس کے لب یوں لرزے جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو لیکن پھر اس نے ہونٹ دانتوں سے دے دیا اور ادھنی سے بہتے ہوئے آنسو خشک کرنے لگی۔ سجاد کچھ دیر اس کی کھڑا رہا۔ مگر وہ کچھ بھی نہیں بولی۔

اس کے چہرے پر خوف بڑھتا جا رہا تھا۔ اور وہ پریشان نظروں سے اس کی طرف یوں دیکھتی تھی جیسے اس کی موجودگی سے بے حد پریشان ہو۔

سجاد بھی ان ڈھلکتے ہوئے آنسوؤں کے درمیان زیادہ دیر کھڑا نہیں رہ سکا۔ وہ اس کے دکھوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے کس مجبوری نے اس کے ہونٹوں پر تالے ڈال دیئے تھے۔ وہ اس کی مجبوریوں کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے پھر ایک بار اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ رکھا اور اس دیرانے سے باہر نکل آیا۔

.....

وہ جذبات کی شدت میں ڈوبا ابھرتا، لمبی لمبی گھاس میں سے راستہ بناتا جگہ جگہ گری ہوئی چار دیواری میں سے باہر نکلتا ہی چاہتا تھا کہ نیک ایک اس کے ذہن میں خیال آیا کہ اسے یہاں سے جانا نہیں چاہئے۔ یہ مصیبت زدہ عورت یہاں تنہا نہیں ہو سکتی تھی۔ یقیناً یہاں کوئی اور بھی رہتا یا جاتا تھا۔ اسے معلوم کرنا چاہئے تھا کہ یہاں اس کے ساتھ کون رہتا تھا؟ یا اس نے اسے یہاں قید کر رکھا تھا؟ عورت کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے نہیں سے اغواء کر کے لایا گیا ہے۔ اور یہاں چھپا کر رکھا گیا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے تلاشی نگاہوں سے گرد و پیش دیکھا کہ کہیں کوئی ایسی محفوظ جگہ ہے جہاں چھپ کر وہ اس شکستہ مکان کی گھرائی کر سکے۔ اس نے چاروں طرف کا جائزہ لیا اور محکم کر مکان کے پچھوڑے پنچا۔ اس طرف لمبی لمبی گھاس چھائیوں کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ شاید اس لئے کہ یہ عام کز رنگاہ نہیں تھی۔

اس طرف بھی ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ادھر مہری جھڑوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ وہ بسی بسی گھاس میں ڈر ڈر کر قدم رکھتا چاروں طرف دیکھنے لگا کہ اسے کہیں چھپنے کی محفوظ جگہ مل جائے۔ اچانک ٹوٹی ہوئی صہیر یوں اوجھلے ہوئے سرسبز گڑوں کے درمیان اسے ایک روشن دان نظر آیا۔

وہ بکھرے ہوئے لمبے میں سے راستہ بناتا اس طرف بڑھا کہ شاید وہاں سے اندر کا کوئی منظر نظر آتا ہو۔ پانی کے بہاؤ سے مٹی جمع ہو جانے کے باعث زمین کافی اونچی ہو چکی تھی۔ لیکن پھر بھی روشندان اس کے قدم سے زیادہ بلند تھا۔ سجاد نے ایک بڑا پتھر ٹھیس کر دیوار سے لگایا اور اس پر پتھر کی ایک سل رکھی۔ مضبوطی سے اس پر پاؤں جماتے ہوئے اس نے روشندان کے رستے کمرے میں جھانکنے کی کوشش کی۔ یہ دیکھ کر اسے خوشگوار سی حیرت ہوئی کہ روشندان سے کمرے کا سارا منظر صاف صاف نظر آ رہا تھا۔

سجاد نے وہیں پتھر پر کھڑے کھڑے اپنے عقب میں دیکھا۔ اس کے پیچھے صہیر اور ادھر مہری چھت تھی۔ دوسری طرف کھڑے ہوئے کسی آدمی کی نظر اس پر نہیں پڑ سکتی تھی۔ اسے قدرے تسلی ہوئی۔ وہ اس جگہ چھپ کر اس گہری عمرانی کمرستہ تھا۔ اس عورت کے دکھوں کا راز جان سکتا تھا۔

اس نے روشندان کے رستے پر ایک بار کمرے میں جھانکا۔ اسے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے فورے دیکھا۔ نیم تاریک کمرے میں وہی کوٹھی عورت بیٹھیلی سے پتھر کا رت تھی۔ وہ بار بار ہاتھ پٹی تھی اور رو بھی رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کی ہلکی سی سسکاری بھی اس تک آ جاتی تھی۔

پھر وہ کمرے کے دوسرے کونے کی طرف گئی۔ جوتھا ہونے کی وجہ سے سجاد کی نگاہوں کی پہنچ سے دور تھا۔ اسی لئے وہ چندوں کیلئے سجاد کی نگاہوں سے اونچل رہی۔ لیکن اس جانب سے ایسی آوازیں آتی رہیں جیسے کوئی نین کا بکس کھول رہی ہے۔ ان آوازوں کو سن کر سجاد کو یقین ہو گیا کہ وہ اس کمرے میں ہونے والی گفتگو کو سننے میں کامیاب ہو جائے گا۔

وہ تجسس نگاہوں سے کمرے کے اس جانب تکتا رہا جہاں وہ عورت نہ جانے کیا چیز تلاش کر رہی تھی۔ یا شاید کچھ رکھ رہی تھی۔ کچھ بعد وہ پھر کمرے کے اس گوشے میں نمودار ہوئی۔ اس کی چادر میں کوئی چیز چھپی تھی جسے وہ زار و تظار روٹی ہوئی بار بار چوم رہی تھی۔ پھر وہ

اسے یوں سینے سے لگالیتی جیسے کوئی بے حد عزیز ہے ہو۔

اس کے آنسوؤں کا کرب اس کی سسکیوں کی دہلی دہلی سی آواز بڑی اندوہناک تھی۔ اس کی ہچکیاں دل پر جاگتی تھیں۔ سجاد کو ایک ناقابل فہم دکھ نے چمکی چمکی کر دیا۔ نہ جانے وہ کون تھی؟ کس سے چھڑک رہی تھی؟ کس گہری بھاگ بھری تھی؟ جو ابھی قید تھائی کاٹنے پر مجبور تھی۔ وہ اسے بو بھگ بھری معلوم ہو رہی تھی۔ اس کی سسکیوں، اس کی بے قرار یوں میں اسے بھاگ بھری کی تصویر نظر آ رہی تھی۔

بھاگ بھری بھی تو اپنوں سے چھڑک کر نہ جانے کہاں دکھوں کے درمیان زندہ جتی گئی تھی۔ نہ جانے وہ کس دیرانے میں قید تھائی کاٹ رہی ہوگی۔ نہ جانے کن ہاتھوں میں اسی طرح مجبور اور بے بس بنا دی گئی ہوگی۔ نہ جانے کس جبر نے اسی کی طرح اس کی قوت گویائی چھین لی ہوگی۔

سجادوں کے اندر لاوا سا پکتنے لگا۔ اس کی رگوں میں خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس گہری عورت کی یہ حالت اس کے لئے ناقابل برداشت ہونے لگی۔ اس کا دکھ اور کرب بھاگ بھری کی اذیت کا رد پد دھار کا اس کے اپنے اندر اترنے لگا۔ سجاد نے خود کو مار کر اپنے آپ پر قابو پایا اور اپنی نم آلود آنکھیں زور سے پٹیچ کر پتھر سے نیچے اتر آیا۔

اس میں اس عورت کا کرب دیکھنے کا حوصلہ ختم تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ تو اس کے تڑپنے کا قماشاد دیکھنے کا بھی اس میں یارا نہیں تھا۔ اس نے دیوار کی پشت سے اپنی پشت لگا دی اور بے آس و مغصوم سا کوسو پنے لگا کہ وہ کس طرف روانہ ہوا تھا اور کدھر آ نکلا تھا۔ اس کے سارے کام ادھورے تھے۔ اس کی ساری تیک و دو بے مراد اور لا حاصل تھی۔ وہ جہاں پہنچتا جاتا تھا وہ رستہ اس سے دوری دور ہوتا چلا جاتا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بھول بھلیوں میں گھر کر رہ گیا ہے کہ کھینچنے کے سوا زندگی کا کوئی مفہوم ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جو بھی رستہ چھتا تھا۔ وہ اسے منزل سے دور لے جاتا تھا۔

اسے اسی طرح افسردہ ہوا یوں کھڑے کھڑے نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ اچانک دو بلیاں ایک دوسرے پر بھینچی، غرائشیں اور لڑھکتھیں اس کے قدموں کے سچ آ گئیں۔ سجاد نے چونک کر انہیں زوردار غور کر لگا دی وہ دونوں اس اچانک الفاظ سے گھبرا کر گرتی پڑتی تھیں اور ایک دوسری کے پیچھے بھاگتی ہوئی دوڑ نکلی گئیں۔

اور انہیں ایک بے بس عورت کے ساتھ ایسا غیر انسانی سلوک کرنے کا مزہ چکھا دے۔ لیکن وہ کچھ نہیں سکتا تھا سوا اس کے کہ وہیں کڑا سچ و تاب کا اور غصہ چٹا رہے۔

انہوں نے کھانا ختم کر کے اسے پکارا تو وہ گھبرائی ہوئی ڈری سہی کرے میں آئی۔ اور ان کے سامنے سے برتن سمیٹ کر لے گئی۔ وہ مکروہ آواز میں زوردار ڈکاریں لیتے ہوئے سرگرمی سے لگے۔ سستے تباہ کوئی تیز بو اور دھواں ہوا کے ساتھ اوپر اٹھ کر روشندان تک آئے گا۔

وہ ڈری ہوئی بے بس عورت اترے ہوئے چہرے کے ساتھ کرے میں آئی اور ان کے سامنے چائے سے بھرے بھاپ چھوڑتے پیالے رکھ گئی۔ ان میں سے ایک نے پیالہ اٹھا کر منہ سے لگایا اور سڑاک کی سی آواز کے ساتھ گھونٹ بھرا۔ دوسرا بھی ویسی مکروہ آواز میں چائے پینے لگا۔

چائے اور سرگرمی نے جیسے انہیں تازہ دم کر دیا۔ وہ اطمینان سے قہقہے لگا لگا کر آپس میں باتیں کرنے لگے۔

”یار گامی!..... چوہدری تو سنا ہے شکار پر چلا گیا ہے۔“ ان میں سے ایک نے کہا جس سے سہاول کو مطمئن ہو گیا کہ اس کے مخالف کا نام گامی ہے۔

”جمل اچھا ہے بار کچے وہ جب تک آئے گا تم یہاں بال ٹیک ٹھاک کر لیں گے۔“ گامی نے چنگی بجا کر سرگرمی کی راہ چھانڑتے ہوئے جواب دیا۔

چوہدری کے نام پر سہاول چونکا اور غور سے ان کی باتیں سننے لگا۔ اسے اعزاز ہو رہا تھا کہ یہ وہی چوہدری ہے جو رانی کا شوہر تھا۔

کچے نے اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا اور سرگرمی کے لیے لمبے لمبے سس لیتے ہوئے اس نے گردن پیچے ڈالی اور چمت کی طرف دیکھنے لگا۔ سہاول پلک پلک چمکنے میں روشندان سے پیچے ہٹ گیا۔ چمت کی طرف دیکھتے دیکھتے اس کی نگاہ روشندان پر بھی پڑ سکتی تھی۔ وہ روشندان سے پیچے ہٹ گیا۔ لیکن اس کے کان اسی طرف تھے ہوئے تھے۔

خامی دیر تک ان دونوں کی آواز سناتی نہیں دی صرف ہلکی ہلکی کھانسی کا شور اس کی ناعت سے ٹکراتا رہا۔ ماسطوم وہ دونوں کس سوچ میں گم تھے یا سو گئے تھے۔ اس نے پھر بڑی احتیاط سے جھانکا۔ وہ دونوں جھانکا چار پائیوں پر لیٹے ہوئے تھے۔ لیکن ان کا رخ دوسری

سہاول دکھ دینے والے تصورات کی دنیا سے باہر نکل آیا۔ اس نے سر جھٹک کر بالوں میں ہاتھ بھیرا۔ ارد گرد دیکھ کر اس نے سوچا کہ وہ رات کو آکر اس گھر کی گھرائی کرے گا۔ جن لوگوں نے بھی اس عورت کو یہاں رکھا ہوا تھا وہ یقیناً چھپ کر رات کو یہاں آتے ہوں گے۔ اس نے داہیں جانے کے لئے قدم بڑھا دیا ہی تھے کہ اسے کسی کے ہاتھ کرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ وہیں ٹھک گیا۔ اس نے غور سے سنا۔ آواز میں مردانہ تھیں۔ شاید کچھ لوگ اس طرف آئے تھے۔ یا یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے اس عورت کو قید کر رکھا تھا۔

وہ چند لمحوں میں دیکھا ان آوازوں کو سننا رہا تا کہ ان کی سمت کا اندازہ کر سکے۔ جلد ہی اس نے محسوس کر لیا کہ وہ آواز اس اور روشندان میں سے آ رہی تھیں۔ وہ بڑی احتیاط سے بنا کوئی آہٹ کئے اس پتھر پر چڑھا اور روشندان میں سے بھاگا۔

اس نے دیکھا عام دیوانہ وضع قطع کے دو آدمی چار پائی پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے نوالے چبانے کی مکروہ آواز سہاول تک بھی پہنچ رہی تھی۔ پھر ان میں سے ایک کھانا۔ شاید اس کا نوالہ اٹک گیا تھا۔ دوسرا گالی دے کر زور سے دھاڑا..... ”رجا!..... اور جا۔“ جلدی آ۔ پانی لے کر آ مر۔“

وہی گونگی عورت پانی کا کنوڑہ ہاتھ میں لئے دوڑی ہوئی آئی۔ پہلے نے پانی کا کنوڑہ پکڑ کر منہ سے لگا لیا۔ دوسرے نے دانت چیس کر اس عورت کو شوکر لگا لی۔ ”ہزار مرتبہ تجھے کہا ہے کہ پانی پہلے رکھا کر..... پینے نہیں کر رہی روئے میں پڑی رہتی ہے۔ اثر ہی نہیں ہوتا۔“ اس عورت کے منہ سے جھج گئی تھی۔ وہ لڑکھرائی ہوئی دیوار سے ٹکرائی اور وہیں ڈھے گئی۔ چند لمحوں کے ساتھ اسی طرح بے سدھ پڑی کا پتھر رہی۔ دوسرے نے پانی پی کر کنوڑہ منہ سے ہٹایا اور ایک غلیظ گالی کے ساتھ اس پر کھینچ مارا۔ ”یہ غرے اب کس کو دکھائی دے گا۔“

کٹورے کی چوٹ کے ساتھ اس نے ایک طویل سسکاری کی اور دیوار کا سہارا لے کر جلدی سے اٹھنے کی کوشش میں ایک بار پھر گر پڑی۔ پہلے نے اپنا بھاری جوتا اٹھا کر اس پر پھینکا۔ ”کیا ہو گیا ہے تجھے۔“ ناگوں میں دم نہیں رہا۔ اٹھ جلدی۔“

وہ کراہتی ہوئی ابھی اور پاؤں کھٹکتی ہوئی جلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی سہاول دانت چیس نہیں کر رہا۔ اس کا گامی چابا کہ کسی مصیحت کی پروا کئے بغیر ان کے درمیان جا بیٹھا

طرف تھا۔ بھرگامی کہنی کے سہارے اٹھا اور کچے سے مخاطب ہوا۔

”یار! کچھ شاہی محلے کی بھی خبر لی ہے۔ مڑھا کوئی گزیدہ تو نہیں کرے گا۔“

”انہیں..... اس میں دُشمن نہیں ہے۔ بس اپنی جان کی خیر منکر پڑا ہوا ہے۔“ کہنے لے

کہا۔

”پڑا ہے تو ہمیں کیا دیتا ہے۔ اپنا ہی بھلا کر رہا ہے۔ کوئی چوں چاں کی تو حزار ہا

دیس کے وچن پر۔“ گامی نے ہنس کر کہا اور چارپائی سے تقریباً آدھا دھڑا اٹھا کر بولا۔ ”یار

آج شیخ کا عہدِ خلیفہ پھیلے گا۔“

”ہائے ہائے۔ کس کا نام لے دیا۔“ کہنے نے سینے پر ہاتھ رکھ کر غصیلی سانس

بھری۔ ”کم بخت ناجی ہے کہ دل کھل لیتا ہے۔“

وہ چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھر قدرے رازداری سے بولا ”یار استانی کہاں غائب

ہو گئی ہے کچھ اس کا بھی پتہ کرنا تھا۔“

”مجھے تو لگتا ہے چوہدری اسے بھی اپنے ساتھ شکار پر لے گیا ہے۔ جس دن سے

چوہدری گیا ہے وہ بھی اس دن سے نظر نہیں آئی۔“

سجاد بھی چمک گیا۔ تو گویا نوبت یہاں تک پہنچی تھی۔ اسی لئے استانی کے

بارے میں کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ کہاں گئی ہے۔

”ہاں ابھی کیا پتہ۔ ان بڑے لوگوں کا کیا ہے جو ان کا دل چاہتا ہے کرتے ہیں۔ کوئی

پوچھنے والا نہیں۔ مصیبت تو ہم لوگوں کی ہے۔“

وہ دونوں آپس میں یونہی تکیں لڑاتے رہے۔ لیکن کوئی ایسی بات معلوم نہیں ہو

سکی جس کے ذریعے ان پر گرفت کی جاسکتی۔ نہ ہی اس عورت کے بارے میں کچھ پتہ چلا کہ

وہ کون تھی۔ اور دونوں اسے کہاں سے لائے تھے؟ ایک ہی جگہ بے حس و حرکت کھڑے

کھڑے سجاد آکر رکتھ ہو گیا تھا۔ ان دو جی ابھری آوازوں کی طرف کان لگائے لگائے وہ

وہی طور پر چور چور ہو گیا تھا۔ اس کے اعصاب جیسے ٹوٹ رہے تھے۔

وہ دونوں تکیں پہارے پڑے یونہی بک بک کر رہے تھے۔ سجاد اکتا گیا۔ اس

نے یہ غصہ نہ تو دیکھ لیا تھا۔ اس نے دل میں شان کی تھی کہ وہ اس مظلوم عورت کی مدد کر لے

کی پوری کوشش کرے گا۔ یہی سوچتا ہوا وہ آہستگی کے ساتھ اس پتھر سے اتر کر کچلی چاپ

سے ہی چپکے سے نکل گیا تاکہ اس مکان کی طرف آنے والے کبھی راستوں کو دیکھ بھال لے۔

.....

اسے پتہ چلا تھا کہ استانی واپس آگئی ہے اور سکرل مکمل کیا ہے۔ وہ اسی انتظار میں تھا

کہ کب استانی واپس آتی ہے۔ البتہ اسے یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ چوہدری بھی واپس آ گیا

ہے یا نہیں۔ اس نے بچوں کی چھٹی ہو جانے کا انتظار کیا تاکہ اسے وہاں آتے جاتے کوئی نہ

دیکھے۔ جب وہ وہاں پہنچا تو دروازہ کھلا تھا۔ سجاد نے دستک دی۔

دروازہ کھلی ہی دستک کے جواب میں مکمل گیا اور ایک سفید بالوں والی عرسیدہ

عورت نے گواڑوں میں سے جھانکنا اور جھٹی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ یہاں نوادر

تھا۔ اسی لئے اس عورت کے چہرے پر حیرت ابھرائی۔ سجاد نے مودب سلام کیا تو اس کے

چہرے کی تختی قدرے کم ہوئی اور اس نے سناٹ لہجے میں پوچھا کہ وہ کون ہے۔

سجاد نے گلا صاف کیا اور محاط لہجے میں استانی کے بارے میں پوچھا۔

”کیوں؟ تم اس کے بارے میں کیوں پوچھ رہے ہو۔“ اس نے کڑے تیروں سے

کہا۔

”مجھے استانی سے ضروری کام ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیا ضروری کام ہے پہلے مجھے بتاؤ۔ وہ ہر ایرے غیرے سے نہیں ملتی۔“ اس نے

رعزت سے جواب دیا۔

”یونی ضروری بات ہے اماں۔“ سجاد نے اپنی بات پر زور دے کر کہا۔ ”میں کوئی

مذاق نہیں کر رہا ہوں نہ ہی میرے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ تمہارے ساتھ سوال و جواب

کروں۔“

اس کے بدلے ہوئے لہجے پر اس عورت نے ٹھنک کر اس کی طرف دیکھا اور بولی۔

”بات کا کیا یہاں اندر ڈیوڑھی میں آکر تاک کر کیا بات ہے؟ مجھ سے اس کی کوئی بات چھپی

ہوئی نہیں۔“

سجاد نے ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی گلی میں موجود تو نہیں اور پھر اس کی ڈیوڑھی

کے اندر داخل ہو گیا۔ عورت نے اس کے پیچھے دروازہ بند کر دیا اور بولی۔

”ہاں۔ اب تاکو کیا بات ہے؟ استانی سے تجھے کیا کام ہے؟“

”اماں یہ استانی تیری کیا لگتی ہے۔“ سجاد نے پوچھا۔
”جتنے اس سے کیا؟“ وہ اکڑ پڑے ہوئی۔ ”تو بات کہ بات کیا ہے؟“

”بات یہ ہے کہ استانی سے کہہ دے کہ وہ یہاں سے چلی جائے۔ عورت ذات ہے اس کی بھلائی اسی میں ہے کہ اس علاقے سے کہیں اور چلی جائے۔ پڑوسی کسی ہے تو اسے اور بھی نوکریاں مل جائیں گی۔ یہاں اس کے لئے خنجر ہے۔ یہ اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔ ایسا نہ ہو بعد میں پچھتا پڑے۔“

”تیرے منہ میں خاک۔ یہ کیا بھارتیں بھجوا رہا ہے تو۔ اللہ اسے سبے خیراں رکھے۔ تو بے کون؟ اور کہاں سے آیا ہے؟ پتہ نہیں کیا بک رہا ہے؟ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔“
بڑھیا نے بھڑک کر کہا تو سجاد نے چڑ گیا۔

”اسی لئے تو کہا ہے کہ استانی کو بلا دے۔ تیری سمجھ میں میری بات نہیں آئے گی۔“
بڑھیا الجھ کر کچھ کہتا ہی جا رہی تھی کہ ڈیوڑھی میں ٹکٹے والے دروازے کے پٹ وا ہوئے اور ایک نوجوان لڑکی نے جھانک کر پوچھا۔

”کون آیا ہے اماں؟“
بڑھیا نے پلٹ کر دیکھا اور پشامی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔ ”لے نور تو آپ ہی اس سے پوچھ لے کہ یہ کیا کہتا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“
”کیا بات ہے جی۔“ اس کا انداز مہذب تھا۔

سجاد نے ایک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی۔ اس کا روشن چہرہ بے حد پرکشش اور دلربا تھا۔ اس نے بالوں کو دو چوٹیوں میں گوندھ رکھا تھا جس میں گلابی رین بندھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی طرف متوجہ دیکھ کر اس نے اپنا گلابی آنچل سر پر ڈال لیا تھا۔

سجاد نے اپنے لہجے کو شائستہ بنانے کی کوشش کرتے ہوئے اچھے لفظوں کا انتخاب کیا۔ وہ اس سے براہ راست بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔
”آپ چند منٹ کیلئے ایک ضروری بات سن لیں۔ اس اماں کی سمجھ میں تو کچھ نہیں آ رہا۔“

اس نے لمبے بھر کو سوچا اور پھر دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔ ”آپ اعد کرے میں؟“
جائیں۔“

سجاد لمبھی کانٹیں اور دہلیز پار کر کے کمرے میں داخل ہو گیا۔ استانی نور نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا اور خود کمرے میں بچھی ہوئی چار پائی پر بیٹھ گئی۔ بڑھیا بوڑھائی ہوئی پیچھے رہ گئی۔

سجاد کرسی پر بیٹھ گیا اور ضمیر نے ہوئے لیے میں بولا۔ ”بی بی میں یہ بات تمہارے بسے کیلئے کہہ رہا ہوں۔ تم یہاں سے فوراً کہیں چلی جاؤ۔“
”لیکن کیوں؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اس کیوں تو کہتم رہے دو۔“ سجاد نے قدرے اکڑ پین سے کہا۔ ”بس جو میں کہہ رہا ہوں اس کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ تو شریف گھر کی لڑکی ہے۔ تیرے لئے یہی بہتر ہے کہ یہاں سے چلی جا۔ اگر تجھے اپنی عزت عزیز ہے تو اس جگہ سے کوئی تعلق نہ رکھنا۔“

اس لڑکی کے دلکش چہرے پر حیرت اتری۔ اس نے اضطراب میں اپنی اٹھلیاں مروڑیں۔ پھر دم سے لہجے میں بولی۔ ”اگر میں تمہاری بات پر اعتبار کر لوں تو بھی مجھے اتنا تو پتہ چلنا چاہئے کہ آخر مجھے یہاں سے کیوں چلے جانا چاہئے اور پھر دیکھو نا مجھے تو یہاں مجھے نے بھیجا ہے وہ جب تک مجھے واپس نہیں بلائے میں کس طرح جا سکتی ہوں؟“
”تمہیں مجھے کی اور نوکری کی پڑی ہے۔“ سجاد نے قدرے درشتی سے کہا۔ ”اور اپنی عزت کی تمہیں کوئی فکر نہیں۔ اپنے ماں باپ کی۔ اپنے خاندان کے وقار کی تمہیں کوئی پروا نہیں؟“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ وہ بھی قدرے تلخ ہوئی۔
”مطلب یہ کہ یہاں کے چودہری سے خود کو بتی جلد چھٹا جانا جاتی ہو پنا۔ وہ ٹھوکر آ رہی ہے۔“ سجاد نے اچانک ڈرامائی لہجے میں کہا۔

وہ یکدم چوکی۔ اس کا چہرہ متحیر ہو گیا اور اس نے تجنی سے کہا۔ ”یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ چودہری سے میرا کیا تعلق؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ چودہری سے تمہارا جو تعلق ہے وہ گاؤں میں بچے بچے کی زبان پر ہے۔ سنا ہے وہ تمہیں اپنے ساتھ شکار پر بھی لے گیا تھا۔“

اس کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی ملائم اٹھلیوں کو ایک دوسرے میں

انکھا کر جیسے خود پر قابو پایا اور خود کو سنبھالنے ہوئے ہوئی۔

”آپ بہت غلط باتیں کر رہے ہیں۔ آپ یہاں سے چلے جائیں۔“ اس کے لیے میں لرزتی تھی۔

سجاد بڑے غور سے اس کی اضطرابی حرکات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کم عمر، ناتجربے کا راجہ ہوئی تھی۔ اسے اپنے جذبات چھپانے کا فن بھی نہیں آتا تھا۔ سجاد کو اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے اور چوہدری کے درمیان کوئی بات ضرور تھی اسی لیے اس نے کڑی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

”دیکھ لی لی! میں تو یہاں سے چلا جاؤں گا۔ لیکن میں تجھے یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ اگر چوہدری نے تجھے کوئی پتھر دے رکھا ہے تو تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم سمجھداری سے کام لو۔ اس کی تین بیویاں حویلی میں اس کی جان کو رو رہی ہیں۔ تو چھٹی بن کر ان میں شامل ہونا چاہتی ہے۔ کچھ متصل سے کام لے ورنہ بچھڑے گی۔“ وہ اتنا کہہ کر اٹھ آیا۔ استانی لوگوں کا ہکا بکا بیٹھی کی بیٹھی روہنگی۔

.....

وہ واپس آیا تو قبرستان کی فضا ویسی ہی اداس اور پرہیزگاری تھی۔ چاروں طرف بھیلی ہوئی چپ گھبر اور مغموم تھی۔ سوکھے پتے اس کے پیروں تلے چرمارہے تھے۔ قبرستان میں داخل ہوتے ہی اداسیاں جیسے روح میں اتر آتی تھیں اور دل میں جیسے کوئی قبر غودنے لگتا تھا۔

اس نے ایک اچھٹی ہوئی سی نگاہ دور تک بھیلی ہوئی قبروں پر ڈالی۔ کسی قبر پر بھی کوئی ای روح نہیں تھا۔ اس نے دھبی دل کے ساتھ سوچا کہ موت انسان کو زندوں سے کس طرح الگ کرتی ہے۔ معاً اسے خیال آیا کہ رانی کئی روز سے قبرستان میں نظر نہیں آئی تھی۔ شاید اس نے کمر والوں نے اسے روک رکھا تھا ورنہ تو وہ کیسی بیقرار رہی کے ساتھ اپنے بچے کی قبر سے ملتی رہتی تھی۔

اس کے دل کو جیسے کوئی بچہ کے لگنے لگا۔ وہ رانی کے بارے میں سوچنے لگا کہ وہ نہ جانے کس حال میں تھی۔ زندگی کے دیئے ہوئے صدموں کو کس طرح سہیل رہی تھی۔ وہ اگلے سے قدم لیتا گورن کی بھوپنڈی کے قریب پہنچ گیا۔ زندگی سے جی کم مہری مراد فضا میں اس کی یہ کنیا اور نوٹے ہوئے پچھریں سے اٹھتا ہوا دھواں زندگی اور حرارت کا انبساط لانا تھا۔ بھیکو کے خیال نے اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی افسردگی اور پڑھری کو لہرے کم کر دیا۔ اس نے طاقت بھرے انداز میں اپنے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھا اور اسے اوس سا ہوا۔ وہ اس بیٹھی سی تہا لڑکی کیلئے کوئی سوغات نہیں لاسکا تھا۔ کوئی گڑیا، کوئی گیند، کوئی پھوٹا سامتی کا کھلونا جسے دیکھ کر اس کے ببولے بھالے چہرے پر بچپن کا نٹ کھٹ پن بھاہا۔ وہ بچپن کے ان سہانے دنوں کا لمس محسوس کر سکے۔

یہی سوچتا ہوا وہ اس کے برآمدے میں داخل ہو گیا۔ جو اس کنیا کا باورچی خانہ بھی اہلن چولہے کے پاس بھسکے ہوئے تھے۔ اہلوں کی راگہ ابھی تک سلگ رہی تھی اور پاس کچھ

جھوٹے رتن اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے ابھی ابھی کسی نے کھانا کھایا ہو۔ سجاد نے سوچا شاید بابا نے کھانا کھالیا ہے۔ لیکن جھیمو تو اس کے بغیر نہیں کھاتی تھی وہ یہیں کہیں اس کے انتظار میں منہ بسور رہی ہوگی کہ اس نے آئے میں دیر کر دی ہے۔ اور وہ اس کے انتظار میں بیٹھی سوکھ رہی ہے۔ پھر اسے منانے اور اس کی تسکین منگی گھر کیا اس ننھے میں مزہ آئے گا۔

جھیمو کو تلاش کرتا ہوا وہ برآمدے میں سے ہوتا ہو کر اس کے طرف بڑھا۔ لیکن دفعتاً اسے پلٹ جانا پڑا۔ وہ جھکی کی سی سرعت کے ساتھ اناج رکھنے والے بڑے منکے کی اوٹ میں ہو گیا۔ دروازے میں سے باہر اور شاہو بوڑھے گورکن کے ساتھ باہر آ رہے تھے۔ سجاد سانس روک کر اور دیکھ گیا۔ گویا ملاں اسے بھولا نہیں تھا۔ جب ہی باہر اس کی تلاش میں یہاں تک آ گیا تھا۔ لیکن وہ ملاں کے ہاتھوں میں کھلونا نہیں بیٹا چاہتا تھا۔ اسے اپنے لئے بہت کچھ کرتا تھا۔ اسے اپنے گھر کی عزت کو بازار کی دلدل سے نکالنا تھا۔ وہ ایک بار پھر ملاں کے سامنے مجبور نہیں ہوتا چاہتا تھا۔

وہ بالکل دیوار کے ساتھ چپک گیا۔ وہ دونوں اس کے برابر سے گزرنے والے تھے۔ اسی وقت برآمدے کے دوسرے کونے سے جھیمو دوڑتی ہوئی اس طرف لپکی اور دور ہی سے پورے جوش سے چلائی۔ ”چا چا..... چا چا.....“

شاہو اور بابو نے یکدم پلٹ کر دیکھ لیا لیکن خیر گزری کہ ان کی نگاہ اس تک نہیں پہنچی۔ سجاد نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور چہرے کے پورے تاثرات کے ساتھ اسے خاموش ہو جانے کے لئے کہا۔ مگر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ وہ اپنی روش بدست چلی آ رہی تھی۔ سجاد اضطراری کیفیت میں یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہئے کہ اچانک بوڑھے گورکن کی ہلکے آواز نے جھیمو کے قدم روک لئے۔

”جھیمو..... او جھیمو..... مرجائیے۔“ بوڑھے کے بکھارے پر وہ وہیں ٹھہر گئی اور اس نے بوڑھے کی طرف دیکھا۔

”جھلی ہوئی ہے۔“ بوڑھے نے غصے اور کڑھائی سے کہا۔ ”چل جا کے سندری کو اعلیٰ کوٹھڑی میں باندھ دے۔ چوہری کا کتا بھگا ہو گیا ہے۔ کہیں اس طرف نہ نکل آئے۔“

جھیمو ٹھٹک سی گئی۔ اس نے ایک نگاہ سجاد پر ڈالی۔ ”بابا..... بابا..... وہ چا چا.....“

لفظ اس کے منہ میں ہی رہے اور بڑھے نے اسے جھڑک دیا۔ ”منستی نہیں تو میں کدھر رہا ہوں۔ وہ بھگا کتا اس طرف نکل آیا تو کبری بھی ہاتھ سے جانے گی۔“

جھیمو کا معصوم چہرہ ہر مردہ سا ہو گیا۔ وہ منہ بسور سے پلٹ گئی اور جھپٹنے ہوئے برآمدے کے ساتھ پڑے ہوئے پتھر پر سے نیچے اتر گئی جو بطور سیزم استعمال ہوتا تھا۔ سجاد کی جان میں جان آئی۔ اس نے آدھنی کا لہبا سانس کھینچا۔ اس کا مطلب تھا کہ بوڑھا اسے ان لوگوں کے حوالے نہیں کرتا چاہتا تھا۔

”یہ لڑکی کس کو چا چا چا کر رہی ہے۔“ کمر درے سے لہجے میں ابی ہوئی آواز سنائی دی۔ سجاد نے پہچان لیا وہ بابو کی آواز تھی۔ وہ چونکا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ بوڑھا اس کے جواب میں کیا کہتا ہے۔ بوڑھا کھانا یوں جیسے سوچے کیلئے وقت لینا چاہتا ہو۔ پھر ہاتھ ہوئے لہجے میں گویا ہوا۔

”پاڑی ہے۔ نہ بے چاری کی ماں نہ باپ۔ اپنے آپ سے ہی باتیں کرتی رہتی ہے۔ ہمیں کسی کو آواز مارتی ہے کبھی باپ کو۔ کبھی مائے کو، کبھی چاچے کو۔ اللہ کوئی ہے۔ اللہ کوئی۔“

”اچھا.....“ بابو کی آواز میں سے بھتی تھی۔ ”تمہاری کیا گلتی ہے؟“

”میری تو اسی ہے۔“ بوڑھے کا لہجہ ٹھنک گیا۔

”تجھیں کچھ ہو جائے تو اس کا کیا بنے گا؟“

”اللہ مالک ہے۔ دی کوئی سبیل کر دے گا۔“

”اچھا بابا ہم پھر آئیں گے۔ اگر کوئی اس علیے کا بندہ نظر پڑے تو اطلاع دینا۔ بہت بٹو ملے گا۔“

سجاد ہوشیار ہو گیا۔ لمحے بھر کو اسے خیال آیا کہ کہیں بوڑھا لالچ میں نہ آ جائے۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ خود پر شرمندہ سا ہو گیا۔ بوڑھے نے اگر اسے ان لوگوں کے حوالے کرنا ہوتا تو کبھی کار چکا ہوتا۔ وہ دونوں بوڑھے کو سلام کر کے برآمدے سے نیچے اتر گئے۔

سجاد تھوڑے انتظار کے بعد منکے کی اوٹ سے نکلا۔ بوڑھا پاؤں گھسیٹا اسی طرف آ رہا تھا۔ سجاد کو اس طرح سامنے کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اور اس نے گھبرائے ہوئے انداز میں پیچھے مڑ کر دیکھا۔ غالباً وہ اس بات سے خوفزدہ ہو گیا تھا کہ کہیں وہ لوگ واپس ہی نہ آ جائیں۔

سجاد نے اسے سلام کیا۔ بوڑھے نے سر ہلا کر بے رخی سے جواب تو دے دیا۔ لیکن اس کے چہرے سے محسوس ہوتا تھا کہ وہ بہت پریشان ہے۔ وہ ہاتھ ہوا برآمدے میں داخل

ہوا۔ سجاد اس کے ساتھ ہولیا۔ نہ اس نے کچھ پوچھا نہ بوڑھے نے کچھ کہا۔ وہ کھٹے کھٹے سے اعجاز میں آن کر چٹائی پر بیٹھ رہا۔ ایک بار سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور دو ٹوک لہجے میں بولا۔ ”جوان! بس اب تو یہاں سے کنارہ کر۔ ہم اپنا بوجھ آپ نہیں اٹھا سکتے تیرا بوجھ کس طرح اٹھائیں۔ تو ہماری جان چھوڑ دے۔ جا تیری بڑی مہربانی کی کہیں اور اپنا ٹھکانہ کر لے۔“ سجاد نے پہلے ہی سو گھ لیا تھا کہ بوڑھا کیا کہنے والا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہی چٹائی پر بیٹھ گیا اور انجان بن کر بولا۔ ”کیوں بابا مجھ سے ایسی کون سی غلطی ہو گئی ہے۔ کیا قصور ہو گیا ہے جو تو مجھے صاف جواب دے رہا ہے۔“

بوڑھے نے چند ہی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور دونوں ہاتھ بائدھ کر بولا۔ ”قصور تو ہم سے ہو گیا ہے یا! جو ہم نے تجھے یہاں اپنے پاس رکھ لیا۔ پر اب تو ہمیں معاف کر دے۔ میرے بندے ہاتھوں کی طرف دیکھ۔ دیکھ اب مجھ میں اتنا دم نہیں کہ تیرے پیچھے آنے والوں کے ساتھ جواب دہی کر سکوں۔ میں یہاں دنیا کے بکسیروں سے الگ ایک کونے میں پڑا ہوں۔ میں یہ گواہیاں روز نہیں بکھٹا سکتا۔“

”تو میرے باپ کی جگہ ہے بابا۔ میرے آگے پیچھے کوئی نہیں۔ میں تو دو گھڑی تیرے سامنے بیٹھا ہوں۔ لہجے آگیا تھا۔ کچھ میرے دل کا تو خیال کر۔“ سجاد نے اپنی آواز میں جذبات کی آمیزش کرتے ہوئے کہا تاکہ بوڑھے کے ہوردانہ احساسات کو چھیڑ سکے۔ لیکن بوڑھا سر جھکا کر بیٹھا زمین پر انگلیوں سے لکیریں کھینچتا رہا۔ اس نے ہونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں کہا نہ ہی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

سجاد اپنی جگہ سے اٹھا۔ ”چھا بابا اگر میں تجھ پر اتنا ہی بوجھ بن گیا ہوں تو میں چوں ہوں۔ چل کر کہیں اور ٹھکانہ کرنا ہوتا ہے۔ خدا کی زمین تنگ تو نہیں ہے کہیں نہ کہیں جگہ مل جائے گی۔“

”کہاں.....؟ کہاں چاچا!؟ تم کہاں جا رہے ہو۔ ابھی تو تم آئے ہو اور ابھی پھر جا رہے ہو۔“ جمبو اس کی آواز سن کر اس طرف لپکی۔

اس کے اس اٹھنا بیٹھنے کے اعجاز نے سجاد کو جیسے نئی زندگی دے دی۔ اس کی اس ایک بار پھر بندھ گئی۔ اس نے جمبو کا ٹھکانا ہاتھ تمام لیا اور تنگ کر اس کے ببولے ہمالے چہرے کے برابر اپنا چہرہ لاتے ہوئے بولا۔ ”جمبو تیرا ابھی یہاں نہیں رہنے دیتا۔“

”ہا..... ہائے۔ کیوں بھلا؟“ جمبو نے حیرت سے کہا اور جلدی سے اپنا ہاتھ چھڑا کر

وہ بڑھے کی طرف لپکی اور اسے سمجھوڑ دیا۔ ”بابا..... بابا۔ تو چاہے کو یہاں کیوں نہیں رہنے دیتا۔ کیوں نہیں رہنے دیتا۔“

بوڑھے نے اس کا بازو پکڑ کر اسے پرے دھکیلا۔ ”چل ہٹ آرام کر۔ دیکھا ہوا ہے میں نے تیرا چاچا۔“

اس کے کھٹے لہجے پر جمبو بوجھ کی مہربانی اس کا چہرہ اتر گیا۔ وہ چند لمبے اس کی طرف سے بھٹی سے دیکھتی رہی پھر دفعتاً بلند آواز میں رو پڑی۔

سجاد نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ ”چپ ہو جاؤ جمبو۔ شاباش دیکھ مت رو۔“

جمبو نے آنسوؤں سے جھپکے ہوئے ہاتھوں سے اس کا ہاتھ تمام لیا اور ہچکچوں کے درمیان بولی۔ ”چاچا!..... چاچا! جانتا تو جائے گا تو نہیں۔ جانتا چاچا۔ تو نہیں جانے کا نا..... بتا۔“ سجاد کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان روٹی ہوئی آنکھوں کو کیا جواب دے۔ اس کے آنسوؤں سے اس کا دل دکھ رہا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ان آنسوؤں کو بہنے سے روک دے یا پھر یہاں ایک منٹ غمیرے بغیر چل دے کہ ان اچھا کرتے آنسوؤں کو یوں بہنے دیکھنا سہل نہیں تھا۔

سجاد نے بوڑھے کو رکن کی طرف دیکھا کہ اعجاز لگا سکے کہ اس کے ارادے کیا ہیں۔ جمبو کے آنسوؤں اور ہچکچوں نے اس پر کوئی اثر کیا ہے یا نہیں۔ بوڑھا اپنے شانے پر ہاتھوں سے سر پر لپیٹا ہوا اپنی جگہ سے اٹھ رہا تھا۔ سجاد بدستور اس کی طرف دیکھتا رہا کہ وہ اٹھ کر کہاں جاتا ہے۔ اور اس سے بھی کوئی بات کرتا ہے یا نہیں۔ جمبو نے ابھی تک اس کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا اور اپنی بات دوہرا رہے جاری تھی۔

بوڑھا چاؤں کھیتا ہوا اس کے نزدیک آیا اور بیزار سے اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولا۔

”رہ لے بمبئی۔ رہ لے۔ تو یہاں رہ لے۔ پر اتنا سن لے کہ اگر اب کوئی تیرے پیچھے اپنا تو میں سے سمجھ نہیں مارنا۔ سیدھا صاف تیرا پتہ بتا دیتا ہے پھر تو جانے اور تیرا کام۔ سمجھا۔“

سجاد ایک ناقابل بیان خوشی میں اندری اور اندر بیگ گیا۔ بوڑھا اٹھا کہہ کر دروازے پر نکل گیا۔ جمبو نے سسکا کر اس کا بازو دھام لیا۔ ”دیکھا۔ دیکھا چاچا! بابا مان گیا نا۔ بس

چاچا اب تو کہیں نہ جاتا۔ یہیں رہتا۔ نہیں تو میں اکیلے رہ جاؤں گی۔“

.....

قبرستان میں صبح کسی اور رنگ میں آتی تھی۔ اداس اور بھیگ بھیگ سی۔ نہ کوئی آواز نہ صدا۔ نہ پانی گرنے کی آواز۔ نہ برف پگھلنے کی صدا۔ نہ بچوں کے رونے کا شور اور نہ ہی کوئی دوسری انسانی آواز۔ بس ایک سمبھیر خاموشی، پندوں کی بولیوں اور ان کے پروں کے پڑ پڑانے کی زندگی آئیر صداؤں سے گونجی اور پھر سناٹا چھا جاتا۔

وہ بوڑھے کو رکن کی بلنگی کھائی کی آواز سن کر جاگ تو جاتا۔ لیکن پڑا کرو نہیں بدلتا رہتا یا تھوڑی تھوڑی سی آنکھیں کھول کر غرضی سی جھیمو کو گھر کے سارے کام کا جانچتا ہے ہوئے دیکھتا رہتا اور سوچتا کہ وہ پھول سی ننھی بچی قبرستان کی خاموش ڈراؤنی فضا میں کس طرح پھلے پھولے گی۔ کس طرح اپنے اربابوں کو سوار کی۔ اپنی کول تھناؤں کے رنگ کس طرح سجاوے گی۔ ابلے ابلے پتے کیونکر دیکھے گی۔

کاش وہ اس کے لئے محبت بھر کر، رنگ برنگے کھلونے، ہسکیاں، سیلیاں، زندگی اور آوازیں مہیا کر سکتا اور اس کی جھولی کو شادمانیوں اور مسرتوں سے بھر دیتا۔

وہ گھر کے کام کرتے ہوئے جب بھی اس کے برابر سے گزرتی اس کو پکار لیتی۔

”چل چاچا! اب اٹھ جا۔ دیکھ دن نکل آیا ہے اب اٹھ جا۔“

مگر وہ اسی طرح پڑا کرو میں بدلتا۔ وہ بوڑھے کو روٹی کھلا کر اس کے پاس آ کر کھڑی ہوتی اور پوری آواز میں چلاتی۔

”چاچا روٹی کھانی ہے تو کھا نہیں تو میں سندری کو کھلا دوں گی۔ چائے پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جائے گی تو میں گرم نہیں کروں گی۔“

وہ فوراً ہی آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھتا اور ہنس کر کہتا۔

”نہ نہ جھیمو۔ تو نے اگر میری روٹی سندری کو کھلا دی تو میں کیا کروں گا۔“

وہ باہر جانے کیلئے نکلتا ہے لہذا تو جھیمو کی شیریں آواز اس کے ساتھ ساتھ ہوتی ہے اسے جلدی داہیں آ جانے کیلئے کہتی رہتی۔ یہ سہانی آواز زندگی کی کڑی دھوپ کو گوارا بنا دیتی تھی۔ وہ بھی سوچ کر نکلتا تھا کہ آج وہ اس کو بھی غمیرت سے کچھ مہلوں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اسے یہ انداز ہو گیا تھا کہ ان جرائم پیشہ لوگوں کا تعلق گاؤں کے چوہدری سے تھا۔ اور وہ ان کی پشت پناہی کرتا تھا۔

وہ گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر ہولیا تاکہ اس ٹھٹک مکان تک پہنچ سکے۔ وہ اپنی دھن میں چلا جاتا تھا کہ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے اسے پکارا ہے۔ اس نے چونک کر دیکھا سرسوں کے کھیت میں ساگ پختی ایک عورت اسے اشارے سے بلارہی تھی۔ سجاد نے غور سے دیکھا اور اسے یاد آیا کہ وہ استانی نور کی ملازمہ تھی۔ وہ لمبے لمبے ایک بھرتا اس کے قریب چلا گیا اور اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور بولی۔ ”تو ہی ہے نا جو استانی نور سے ملنے آیا تھا۔“

سجاد نے اشیاء میں سر ہلایا تو وہ بڑھیا رازدار سے بولی۔ ”تو جو بات اس دن دن میں چونک آیا تھا اس نے تو میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔ میں نے تیری اور نور کی ماری باتیں بھی سن لی تھیں۔ پتر پتر تو میری جان کو لگ گئی ہے۔“

”اها! خالی تیرے فکر کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ کچھ استانی کو بھی تو سمجھا۔“ سجاد نے زور دے کر کہا۔

”میں کیا سمجھاؤں پتر! وہ آپ سیانی ہے۔ چار بھاعتیں پڑھ گئی ہے تو اب وہ ہمیں بھی پڑھاتی ہے۔ اس نے ہماری کیا سنتی ہے۔ نا کچھ ہے۔ لڑکی ذات ہے۔ اس موت جو گے لی باتوں میں آگئی ہے جو پہلے ہی میں تن میں بیویاں کر کے بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے گھٹ گھٹ ہانی بیا ہے۔ یہ نا کچھ بیوقوف لڑکی اس کے سامنے کیا ہے۔ اس نے اسے ایسے بزرگ مارے ہیں کہ وہ دیوانی ہو گئی ہے۔ آگے پیچھے اس کو کوئی خبر ہی نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا ہو سکتا ہے اها۔“ سجاد نے مایوسی سے کہا۔ ”جب لڑکی آپ ہی اپنی ہی ہو رہی ہے تو میں یا تو کیا کر سکتے ہیں؟“

بڑھیا پریشانی سے کچھ سوچ رہی تھی۔ پھر بولی۔ ”میں اور تو تو کچھ نہیں کر سکتے لیکن وہ کر سکتا ہے۔“

”وہ کون؟“ سجاد نے تجسس لہجے میں پوچھا۔

”دشاداس کے چاچے کا پتر ہے۔ اس کے بچپن کا سنگیتر ہے۔ اگر وہ کالے منہ والا اناں کا بچہ ہوتا تو بات یہاں تک نہ پہنچتی۔“

”وہ ہے کہاں؟“

”اس کی بھی خوب پوچھی۔“ بڑھیا نے غصے سے سر جھٹکا۔

”بس ماں پوچھ کر گئے سر پہ کوئی بڑا نہیں۔ وہ کلم کلا جائیداد کا مالک ہو گیا ہے۔ دن

رات چہرہ اڑانے پر اس نے کمر باندھی ہے۔ ایک کلو میٹر ریشمی کے پتھر میں بڑ گیا ہے۔ نور کو تو پوچھتا تک نہیں۔ سو سوٹنے دیتا ہے۔ اس نے عرضی پر چڑھ کر کے یہاں نوکری کر لی اور وہاں سے نکل آئی۔ دلاشا نے پلٹ کر نہیں پوچھا کہ کہاں گئی۔“

”میں نے بچپن سے اسے پالا ہے۔ گودیوں کھلایا ہے۔ اس کے گھر کا ٹنک کھایا ہے۔ اس کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ گھر رہتی ہوں۔ پر کہاں کہاں اسے بچاؤں۔ جہاں جہاں لڑکی ہے۔ وہ موت جوگا دلاشا اسے سنبھال لیتا تو میری روح بھی آرام سے نکلتی۔ مجھے بھی سکھ کا سانس آتا۔“

سجاد نے غور سے اس کی بات سنی اور بولا۔ ”تم تو کہتی ہو کہ وہ کسی بازاری عورت کے بیچے پڑا ہوا ہے پھر وہ کہاں اس کی پروا کرے گا۔“

”پر میں کہتی ہوں اگر اسے پتہ چلے تو کیا خبر اسے غیرت آ ہی جائے۔ یہ اس کے خاندان کی عزت ہے۔ اس کے تائے کی بنی ہے۔ اچھی بھلی پر مٹی لکھی ہیر لڑکی ہے۔ پر اس کی نظر میں نہیں چھتی۔ اس کم ذات ریشمی نے اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے۔“

”تو پھر؟“ سجاد نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھی اور راز داری سے بولی۔

”پتر! تو بس اتنا کر دے کہ ایک بار اس سے جا کر مل لے۔ میں تجھے اس کا پتہ دے دوں گی۔ تو اس کے سامنے جا کر میرا لیتا اور اسے تمام معاملہ سمجھا دینا۔ وہ کچھ بھی کہی اسے خاندان کی غیرت تو ہوگی۔ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کرے گا۔ اللہ تیرا بھلا کرے۔ میں اسے یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ نہیں تو میں آپ چلی جاتی۔ پتر تو یہ کام کر دے تیرا دو جگ میں بھلا ہوگا۔ مجھ غریب سے دعا نہیں لے گا۔“

سجاد نے لمبے عمر کو سوچا اور سر جھٹک کر بولا۔

”اماں! میں سوچتا ہوں کہ اس معاملے میں پڑ کر کہیں کوئی اور معیت نہ ملے پڑ جائے۔“

”نہیں۔ نہیں پتر۔ ایسی بات نہیں ہوگی۔ تو دلاشا کے سامنے میرا نام لے گا تو وہ لحاظ کرے گا۔ اسے میں نے گودیوں کھلایا ہے۔ تو صرف میرا پیغام اسے دے دیتا۔ بس۔ تیرا کام، تو اتنا ہی ہے۔ باقی وہ خود سنبھال لے گا۔“ وہ پرامید آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتی ہوئی بولی۔

سجاد کو انکار کر کے اس کی آس توڑنا اچھا نہیں لگا۔ ابھی اس نے منہ نہیں کیا تھا کہ وہ یہ کام اپنے ذمے لے گا یا نہیں۔ لیکن بڑھیا کی تسلی کیلئے اس نے دلاشا کا پتہ اس سے معلوم کر لیا۔ بڑھیا نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اسے دعا مانگ دینے لگی۔

.....

بڑھیا آگے بڑھ گئی۔ لیکن سجاد کو ایک نئی سوچ کے حوالے کر گئی۔ وہ وہی کھڑا سوچتا رہا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ رانی کا خیال اب بھی اس کے دل سے نہیں ہوا تھا۔ اس کی روتی ہوئی آنکھیں اب بھی اس کی یادوں میں جھانکتی تھیں۔ وہ اسے کبھی دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے دکھا اپنی جھولی میں ڈال لیتا چاہتا تھا۔ اسے رانی کی خاطر بڑھیا کی بات پر عمل کرتا تھا۔ دلاشا یقیناً اپنے خاندان کی عزت کی خاطر استانی نوکر کو یہاں سے لے جائے گا۔

استانی نور کے منظر سے اوجھل ہو جانے سے شاید رانی کا شوہر گھر واپس آ جائے۔ ابھی سوچ کر وہ قبرستان واپس جانے کے بجائے شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ لیکن راہ میں اس کا خیال بدل گیا۔ اس نے دلاشا کے ڈیرے پر جانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اس بازار میں جا پہنچا جہاں دلاشا کا آنا جانا تھا اور جس کی وجہ سے دلاشا استانی نوکر کی پروا نہیں کرتا تھا۔

اماں نے اس عورت کا نام نیلم بتایا تھا۔ اس کے یہاں تماش بیٹوں کی کثرت دیکھ کر اندازہ لگا مشکل نہیں تھا کہ دلوں پر حکومت کرتی تھی۔

ساری فضا ٹھنڈی دھڑوں کے چھناکوں سے گونج رہی تھی۔ ایک بے حد حسین اور نازک اندام لڑکی کے گورے گورے پاؤں قاتلین پر تھرک رہے تھے۔ اس کے اٹھنے ہوئے قدموں اور تھرکتے ہوئے زاویوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ نفس میں کتنی مہارت رکھتی ہے۔ وہ اشتیاق بھری بے باک نگاہوں میں ڈولی ہوئی اپنی قاتل اداؤں سے ہر جانب بحر جھونک رہی تھی۔ ماری محفل جیسے اس کی منہ میں تھی۔ وہ جیسے دلوں پر حکومت کرنے کے لیے نکلے ہوئی تھی۔

سجاد نے سوچا شاید یہی خلیم ہوگی۔ اگر کر کا مکتیر اس کا دیوانہ تھا۔ تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔ تو ریشمی سیدھی سادھی گھریلو لڑکی کے پاس نہ یہ ادا نہیں تھیں۔ نہ سن نہ دلکشی۔ اہل محفل کی نگاہیں اس کی دلکشی میں جذب ہوئی جاتی تھیں۔ اچانک ایک خیال بجلی کی سی سرعت سے سجاد کے ذہن میں آیا اور اسے چور چور کر گیا۔ نہ جانے اس کی بہن ہماک بھری کہاں تھی؟ اور کس حال میں تھی؟ وہ بھی کسی بازار میں اسی طرح تماشے کی چیز بن گئی ہو۔ کہیں اس کی مجبوری بھی اسے اسی طرح نہ بچا رہی ہو۔

سجاد کے روئیں روئیں میں ایک عجیب بے چینی جاگ اٹھی۔ لمحے اسے زخمی کر کر کے گزرنے لگے۔ اس کی نینے چمکائی آواز اسے بچو کے لگانے لگی اسے وہاں پہلے بھر مہر نامی دشوار ہو گیا۔

گنا ختم ہو گیا اور وہ مختصر و چمکاتی پھولے ہوئے سانسوں کے ساتھ ناز آفریں ادا نہیں لے گاؤں کے سہارے بیٹھ کر اہل محفل کی داد کیٹنے لگی۔ اس کے چاروں طرف قالمین پر نوٹ ہی نوٹ بکھرے پڑے تھے اور وہ گرد و پیش کو ایک عجیب فاتحانہ انداز میں دیکھ رہی تھی۔

ایک اور قص کے لئے لوگوں کا اصرار بڑھنے لگا۔ وہ مسکرا کر براہ انکار کرتی رہی۔ قریب ہی پاندان کھولے بیٹھی اویز عمر نائیکہ نے ایک سازندے کو اشارہ کیا۔ اس نے اٹھ کر قالمین پر سے سارے نوٹ سمیٹ لئے۔ تاپنے والی کی شفاف پیشانی پر پل سا آگیا۔ نائیکہ نے اس کا زیورات سے سجا ہوا خوبصورت ہاتھ تھاما اور اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر ابرو سے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ پل کر اٹھی اور اس نے مختصر وڈوں میں ڈوبے ہوئے بلوریں پاؤں غصے میں قالمین پر پٹختے۔ جس سے ساری محفل میں مختصر وڈوں کے جھمکے سے بکھر گئے۔

اہل محفل نے دادی۔ سازندوں نے ساز دست کئے۔ گانے والی نے ایک شوخی کا غزل کا مصرع اٹھایا اور اس کے بیروں میں حرکت ہوئی۔ وہ ایک بار پھر محفل کے درمیان آ کر اپنی اداؤں کا جادو جگانے لگی۔ اس کا جلوہ حسن اور ناز واد کی بجلیاں چاروں اور ترپے لگیں۔ اہل محفل ہجوم ہجوم اٹھے۔ بعض اس کا نام لے کر بھی داد دے رہے تھے جسے سن کر سجاد کو مایوسی ہوئی۔ وہ نیلم نہیں تھی۔ وہ بے چین سا ہو گیا اور ادھر ادھر نظر پھیرا کر دیکھنے لگا کہ کوئی اور چہرہ نظر آئے جسے نیلم کہا جا سکے۔ اہل محفل اس رقص میں اس قدر مگن تھے کہ وہ کسی سے کوئی استفسار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

نغمہ ختم ہو گیا۔ وہ مختصر و چمکاتی۔ غزلیں اگلیوں والے حنائی ہاتھ سے آداب کر کے مسکراتی ہوئی ایک چمن کے پیچھے غائب ہو گئی۔ اہل محفل اس کے حسن کے قیدیے گئے ایک دوسرے سے ہنسی مذاق کرتے اٹھنے لگے۔ سجاد سوچنے لگا کہ ان ہی تماشا بینوں میں کوئی دلشاد بھی ہو گا لیکن وہ اسے پہچانتا نہیں تھا۔

نائیکہ لوگوں کو خنس خنس کر رخصت کر رہی تھی۔ وہ کسی پر کوئی تھرہ کستی کسی سے کوئی

ذمعی جملہ کہتی۔ کسی کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ کسی کو کوئی اشارہ کرتی۔ کسی سے کوئی فرمائش اور کسی سے کوئی وعدہ۔ سجاد اس کی نظروں سے بچنے کی کوشش کر رہا تھا کیونکہ اس کی جیب میں اسے دینے کیلئے چھوٹے تھانے وہ اس کی کوئی فرمائش ہی پوری کر سکتا تھا۔ وہ اس کی نظروں سے بچتا۔ ان کمرؤں کی طرف دیکھ رہا تھا جن پر چھتیس پڑی ہوئی تھیں تاکہ اندازہ لگ سکے کہ نیلم کا کمرہ کون سا ہے لیکن اسے کچھ نہیں چل رہا تھا اور ہجوم چھٹتا جا رہا تھا۔

اچانک اس کے پہلو میں کسی نے ہلکا سا ہتھکا دیا۔ سجاد نے پلٹ کر دیکھا۔ ایک سازندہ اسے آنکھ سے اشارہ کر رہا تھا۔ سجاد نے سواہر لکھا ہوں سے اس کی طرف دیکھا وہ مسکرایا اور اس کے قریب ہو کر ہوئے سے بولا۔ ”جہیں نیلم نے بلایا ہے۔ وائیں سے تیسرا کمرہ۔“ وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھ گیا۔

سجاد کے سارے وجود میں سنسنی کی لہریں دوڑ گئی۔ اس کی نگاہ غیر ارادی طور پر کمرؤں کی قطاری کی طرف گئی۔ پھر اس نے دانے طرف دیکھا۔ تیسرے کمرے کے دروازے پر بھی دیکھی ہی چلن پڑی ہوئی تھی۔ جیسی دوسرے کمرؤں پر تھی۔ وہ من ہی من میں حیران بھی ہو رہا تھا کہ نیلم کے از خود اسے بلا بھیجا تھا۔ پھر اسے خیال آتا کہ کہیں سازندے کو کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی۔ ایسا نہ ہو کہ وہ اس کے کمرے میں چلا جائے اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

اتنے سے وقت میں اس کے ذہن میں ہزاروں خیال آئے اور سیکڑوں اندیشوں نے اسے دھلایا لیکن اس کا یہ ارادہ سب پر برابری تھا کہ اسے ہر صورت نیلم سے ملنا ہے۔ خواہ اس کی اسے سختی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ وہ تو پہلے ہی اس سبتجو میں تھا۔ اس پر یہ سب اپنے آپ ہی بنا تھا۔ خواہ حقیقت تھی یا کوئی غلط فہمی کم از کم اسے اس کا موقع مل رہا تھا کہ وہ نیلم کے ساتھ بات کر سکے۔

سجاد نے ماحول کا جائزہ لیا۔ سبھی اپنے آپ میں مگن تھے۔ نائیکہ بان لگا لگا کر کچھ لوگوں کو دیتے ہوئے اندروں کی جنبش اور آنکھ کے اشاروں میں راز و کنا کے مکتگو کر رہی تھی۔ دالان میں بھی کچھ لوگ بیٹھے آپس میں خوش گپیاں کر رہے تھے۔ سجاد نے موقع غنیمت جانا اور دوسروں کی نظر بچا تو وہ وہی طرف سے تیسرے کمرے کے دروازے کے باہر جا پہنچا۔ اس نے جلدی سے چمن پٹائی۔ دروازے کے کواڑ ڈھیلے سے بند تھے۔ اس نے ذرا سا دھکیلا تو دروازہ کھلیا۔ جالی کے پھینک لگائی پردوں کے آکر بارہ ڈرینگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی صاف نظر آ رہی تھی۔ سجاد نے پردہ ہٹایا اور اس کا ٹکس ڈرینگ ٹیبل کے آئینے میں

اجرا۔ نیلم کے حسین نگس نے اسے آئینے میں سے دیکھا اور مسکرا کر بولی۔ ”آجاؤ۔“

سجاد کو قدرے حوصلہ ہوا اور اس نے ایک تیز نگاہ سارے کمرے پر ڈالی۔ وہ اس کی جانب پشت پھرائے بیٹھی تھی۔ اس کی پشت پر پڑی ہوئی لمبی سیاہ چوٹی میں مویجے کے بکھرے گندھے ہوئے تھے۔ سارے کمرے میں مویجے کی سوسوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ سرخ دہیز قالین پر گن گن کر قدم رکھتا اس کے قریب پہنچا۔ وہ کچھ لچکا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح سے شروع کرے۔

وہ ایک دلچسپ اور ادا کے ساتھ آٹھ تہڑ کیلے لباس کو سمیٹتے ہوئے ابھی۔ سجاد نے بغیر کسی تہدید کے پھوٹتے ہی کہا۔ ”تم نے مجھے بلایا تھا؟“

اس کی مسکراہٹ گہری ہو گئی اور اس نے بغیر کوئی لفظ کہے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیوں؟“ سجاد نے اٹھڑپے سے پوچھا۔

”بس۔“ وہ مترنمی کے درمیان کہتے لگی۔ ”ڈل چاہ رہا تھا۔“

سجاد نے کچھ حیرت۔ کچھ چڑچڑے پن سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”مطلب۔۔۔۔۔“ وہ دھیرے سے ٹنگٹنگی اور اپنے وجود کی دلاؤ پر خوشیوں لئے ہوئے اس کے مقابل آن کر کھڑی ہوئی۔ ”لو۔۔۔۔۔ مجھے پچانو۔“

سجاد غیر ارادی طور پر دو قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس نے ایک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ ایک خوبصورت چہرہ تھا جس کے دلاؤ پر نقوش کو کشمار اور انجی ستوار ہوا تھا۔ سجاد کے لئے وہ ایک حسین چہرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں اس کی شناخت کسی نام یا کسی یاد کے حوالے سے نہیں تھی۔

”نہیں۔ میں تمہیں نہیں پہچانتا۔“ اس نے سناٹ لہجے میں جیسے اسے اطلاع دی۔ اس کا مسکراتا ہوا چہرہ اداس سا ہو گیا۔ ”اچھا تم بھول گئے ہو۔ میں تو تمہیں کبھی نہیں بھولی۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ ہوتے ہو۔“

سجاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا اور کھر دے سے لہجے میں بولا۔ ”سیدھی طرح بات کرو۔ پٹیلیاں نہ بھجواؤ اور یہ نہ کہو کہ اس کے ساتھ کرنا۔ مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ کہ یہ سب تم کس کے اشارے پر کر رہی ہو۔“

”مجھے غلط نہ سمجھو۔“ اس نے سیاہ گھنیری پگھوں کو ہولے سے جمنش دی۔

”میں بھلا تمہارے ساتھ کمرے میں کروں گی۔ آج اگر قسمت سے مل گئے ہوتو اتنی بے رخی سے بات نہ کرو۔“

سجاد ٹھکڑا سا ہو گیا کہ وہ کسی چال میں تو نہیں پھنس گیا۔ یہ عورت نہ جانے کون تھی؟ وہ اس کو جانتا تک نہیں تھا۔ وہ کئی بار بھاگ بھری کی تلاش میں یہاں وہاں گیا تھا۔ کتنی سی ایسی عورتوں سے ملا تھا۔ شاید یہ انہی میں سے کوئی ایک تھی۔ لیکن وہ اس کو نہیں پہچانتا تھا۔ سجاد نے تجسس نگاہیں سارے کمرے میں دوڑائیں تاکہ ماحول اور فضا کا جائزہ لے سکے۔ اس نے عائشہ اس کی توثیق کو پچان لیا اور بس کہہ گئی۔

”تم آجے مگر کمند کیوں ہو۔ آرام سے بیٹھ جاؤ۔ یہاں تمہارے لئے کوئی خطرہ نہیں۔“ اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ سجاد کو چٹکا ہوا گیا اس نے آگے بڑھ کر نیلم کی گردن دونوں ہاتھوں میں دبوچ لی اور دانت چیں کر بولا۔ ”یہ کون ہے باہر۔۔۔۔۔ تاکہ یہ کون ہے؟“

نیلم نے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیئے اور گھٹتی ہوئی آواز میں بولی۔

”شاید۔ شاید خالہ۔۔۔۔۔ خالہ ہوگی۔“

”کون خالہ؟“

”میری گردن تو چھوڑنا کہ میں کچھ بول سکوں۔“

سجاد کو یکفخت احساس ہوا کہ اس کی گرفت کچھ زیادہ ہی سخت ہو گئی تھی۔ نیلم کی شفاف پیشانی پر پسینے کی ہوندیں چمکتے لگی تھیں۔ اس نے غلت میں اس کی گردن چھوڑ دی اور ذخوڑ لہجے میں بولا۔ ”مگر تو نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو یاد رکھنا۔“

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ٹانگیہ کی آواز بھی سنائی دی۔ ”نیلم او نیلم۔ جواب کیوں نہیں دیتی۔ دروازہ کھول باؤ دلشاد آیا ہے۔“

وہ ناراض ناخفا ہونے کے بجائے سکرا دی اور دونوں ہاتھوں سے اپنی سرمریں گردن جھلاتے ہوئے اس نے لمبا سانس لیا۔

”میں نے کہا تھا کہ باہر خالہ ہے۔“

دستک پھر بولی اور ٹانگیہ کی آواز سنائی۔ ”نیلم دروازہ کیوں نہیں کھولتی۔ باؤ دلشاد تجھے پوچھ رہا ہے۔“

دلشاد کے نام نے پھر سجاد کو چٹکایا۔ اس نے نیلم کی طرف دیکھا کہ اس کے اعزاز

”کیا مصیبت ہے؟“ وہ بڑبڑائی۔ پھر اس نے پلٹ کر سجاد کی طرف دیکھا اور آنکھ سے اسے نظروں سے گزاریا۔ اسے پیچھے کواڑ بند کرنی ہوئی وہ باہر نکل گئی۔

سجاد نے آگے بڑھ کر جھنجھی لگا دی۔ وہ عجیب گھٹو کے عالم میں تھا۔ حالات کا یہ رخ اور نلیم کا اقلات دونوں اس کے لئے ناقابل فہم اور حیران کن تھے۔ اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ وہ نلیم سے کہاں ملا تھا۔ اور وہ اسے اتنی اچھی طرح سے کیسے جانتی تھی۔ اس نے گہری نگاہ سے کہہ کے کا جائزہ لیا۔ وہ ایک عام سی جھنجھی سی جھانک تھی جہاں کوئی خاص قابل ذکر بات نہیں تھی۔ اس نے دروازوں اور کھڑکیوں کی طرف بھی دیکھا کہ اگر کوئی بھاگتا ہو جائے تو کس طرف سے نکلے گا۔ اس میں آسانی ہو گئی۔

دروازے پر کھٹکا سا ہوا۔ سجاد پوچھنا ہو گیا۔ اس کے ذہن میں سوچ کی ایک تیز رو دوڑی۔ کیا خبر دروازے کے اس طرف نلیم ہے یا کوئی اور۔ کہیں یہ کسی سازش کی کڑی تو نہیں تھی۔ وہ مستعدی سے چاروں طرف دیکھتا ہوا دروازے کے قریب پہنچا۔ دروازے پر پھر بھکی سی دستک ہوئی اور نلیم کی مدد میں آواز سنائی دی۔ ”میں نلیم ہوں۔ دروازہ کھول دو۔“

سجاد نے جتنی گرائی اور خود ایک طرف ہو گیا۔ دروازے کھلا اور نلیم اندر داخل ہوئی۔ اس نے اپنے پیچھے دروازہ بند کر دیا۔ سجاد نے اطمینان کا سانس لیا۔ نلیم نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا اور ہنک پر بیٹھ گئی۔

”آؤ بیٹھو۔“ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔ وہ کچھ تھکی تھکی لگتی تھی۔ سجاد نے اس کی جینس کو کٹھنر اعزاز کر دیا اور کھڑے کھڑے بولا۔

”یہ دروازہ کون ہے؟“

”نلیم نے کہاں ایسے ایسے پروچکا کہ اس کی طرف دیکھا اور فہم نہ ہوئی۔“

”آؤ آرام سے بیٹھو کسی۔ پھر یہ بھی پوچھ لینا کہ دروازہ کون ہے؟“

سجاد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ نلیم نے رنجیٹ چنگ پوش پر اپنا سر میں گداز ہاتھ پھیرا اور خوشی سے بولی۔ ”یہاں آؤ بیٹھو میرے پاس۔“

”فضول بک بک نہ کرو۔ سیدھی طرح سے میری بات کا جواب دو۔“ سجاد نے تیزی سے چڑھا کر برسی سے کہا۔

وہ دھم سے فہم نہ ہوئی۔ ”تم تو مجھ سے بہت ہی بے رخی برتتے ہو۔ خیر جیسی تمہاری مرضی۔ اچھا یہ تو بتاؤ۔ تمہیں تمہاری بہن بھاگ بھری لگتی ہے؟“

”کیا کہتے ہیں۔ دروازہ کا نام اس کے حسین چہرے پر کیسے رنگ بن کر چمکتا ہے لیکن اس نے دیکھا کہ اس کا رنگ کچھ خاص نہیں بدلا۔ اس نے اسے اشارے سے ایک طرف ہو جانے کو کہا اور خود جا کر دروازہ کھولنے لگی۔

سجاد جلدی سے کمرے کے ایک ایسے گوشے میں ہو گیا کہ اگر کوئی اچانک کمرے میں داخل ہو تو اسے نہ دیکھ سکے۔ اس نے خود کو کسی غیر متوقع صورتحال کیلئے تیار کر لیا۔

”خالد۔ اس سے کہہ دے کہ میری طبیعت اچھی نہیں۔“ نلیم نے دروازے میں سے جھانک کر کہا۔

”وہ کب مانے گا۔“ نلیم کی آواز سنائی دی۔

”خالد تو اس سے کہہ دے کہ آج میں نہیں مل سکتی۔ ٹال اس کی طرح۔“ نلیم کی آواز میں بیزاری کی جھلک تھی۔

”کچھ عرصے کا کام ہے۔ نلیم۔ وہ روز کا آنے والا ہے۔“

”روز کا آنے والا ہے تو میں کیا کروں۔ کسی دن جہاں بھی تو چھوڑے گا۔ بس میں نے کہہ دیا ہے کہ میں آج اس سے نہیں مل سکتی۔“ نلیم کا لہجہ قطعی تھا۔

”سیرے پاس اندر ہے کون جو آج حیرے تیرے ہی بدلے ہوئے ہیں۔“ وہ جہانم جیلا

اعزاز میں پوچھنے لگی۔

”تو خودخواہ شک نہ کیا کر خالد! بس کہہ دیا ہے تاکہ آج میرا جی اچھا نہیں ہے۔ کسی طرح اسے ٹال دے۔“ نلیم نے اتنا کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔ کٹری لگائی۔ پردے برابر کئے اور چھوٹے چھوٹے قدم رکھتی چنگ پر بیٹھ گئی۔

سجاد نے کان باہر کی آوازوں کی طرف لگا دیئے کہ دروازہ خاموشی سے چلا جاتا ہے۔ کوئی بھاگ نہ کھڑا کرتا ہے۔ لیکن کوئی آواز سنائی نہیں دی۔ نلیم اس کی طرف متوجہ ہوئی اور ملامت سے بولی۔ ”آؤ بیٹھ جاؤ۔“

دروازے پر پھر زور دار دستک ہوئی۔ سجاد نے مستمرانہ نگاہوں سے نلیم کی طرف دیکھا۔ وہ سر جھٹک کر غصے میں اٹھی اور دروازے کے دروازہ کھول کر چلائی۔ ”کیا مصیبت ہے خالد! دو کھڑی آرام کرنا بھی حرام ہو گیا ہے۔ اب کیا ہوا ہے؟“

”ہوٹا کیا ہے۔ وہ تیرا یا نہیں مانتا۔ دھرتا دے کر بیٹھا ہوا ہے۔ کہتا ہے دیکھ کر بغیر نہیں جاؤں گا۔ چل آؤ۔ تمہو دیر اس سے بات کر لے۔“ نلیم کی آواز سنائی دی۔

سجاد پر جیسے ہلکی سی آن گری۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا نہ رہ سکا اور تیزی سے اٹھ کر بولا۔
”جہیں یہ سب کس نے بتایا ہے؟“ وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور مفاہمت کے اہداز میں بولی۔ ”اتنے پریشان کس لئے ہوتے ہو۔ مجھے تم ہی نے تو بتایا تھا۔ تمہیں یاد نہیں؟ جب تم نے آکر میرا گھاڑا دیا تھا۔“

سجاد کو خوف سے پھیلی ہوئی ہراساں آنکھیں یاد آئیں۔ چلوں پر چلتا ہوا بیگ ستارہ یاد آگیا۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ آنکھیں اب بھی اس کی طرف ایک عجیب سی حسرت لئے دیکھ رہی تھیں۔ سجاد نے ایک سرد آہ بھری اور کرسی پر ڈھے سا گیا۔ اسے اپنی ناکاکی کے احساس نے جیسے مار دیا۔ اتنے طویل سفر میں اسے بھاگ بھری کہیں نہیں ملی تھی۔ اتنا کچھ چھیلنے کے باوجود وہ بھاگ بھری کے تئیں کے تئیں کاٹ سکا تھا۔

نیلیم کچھ دیر یونہی اسے مغموم سا بیٹھے ہوئے دیکھتی رہی۔ پھر ہولے ہولے پاؤں دھرتی اس کے قریب آئی اور اس کے بالوں میں نرمی سے اٹھایاں پھیرنے لگی۔ سجاد کو اس کے اس لمس میں ایک طاعن شہقت کا گماڑا محسوس ہوا۔ اس کا یہ انکسارت اسے ایک ڈھارس، ایک سہارا محسوس ہوا۔ اب سے چند لمحے پیشتر اس سے جو نفرت سی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک نئی نئی موانست اور ایک انجانے تعلق میں بدل گئی۔ دکھ، مایوسی اور ملال کے اس لمحے میں وہ جیسے دکھ بانٹنے والی، مایوسیوں کو زائل کرنے والی اور ملال میں شریک ہو جانے والی لگنے لگی۔ وہ اسی طرح سر پکڑے بیٹھا رہا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

وہ اس کے قریب کھڑی اس کے بالوں کو طاعنت سے سہلائی رہی۔ نہ اس نے کچھ کہا نہ سجاد نے ہی اسے مخاطب کیا۔ وہ اپنے دکھوں میں گھلتا رہا۔ وہ اس کے دکھوں میں چپکے چپکے گھلتی رہی۔

پھر اس نے ہولے سے اس کا شانہ چھوا اور اتنی مدھم آواز میں بولی جیسے سناٹا ٹوٹ جانے سے ڈرتی ہو۔

”کچھ کہو تو سی۔“

سجاد نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور بچھے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”کیا کہوں۔ کہنے کو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ کہنے کو میں نے اتنا لبا سزا کر لیا ہے۔ لیکن منزل کی طرف ایک قدم بھی نہیں بڑھا۔“

”بھاگ بھری کا کچھ پتہ نہیں چلا؟“ اس نے پوچھا۔

سجاد نے نفی میں سر ہلایا اور اپنے ناخن چپانے لگے۔
”کھوئے ہوئے لوگ بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ کبھی کبھی تو انہیں ڈھونڈنے میں مریں بیت جاتی ہیں۔“ وہ افسردگی سے کہنے لگی۔

سجاد پر مایوسی کا غبار چھا گیا۔ بھاگ بھری کا مغموم چہرہ۔ اس کی آنسو بھری نگاہیں اس کی نگاہوں میں پھر گئیں۔ نہ مطلق اس کی قسمت میں اس سے ملنا تھا بھی یا نہیں۔ وہ کبھی اسے دنیا کے بے رحم ہاتھوں سے چھڑا بھی پائے گا یا نہیں۔
نیلیم کچھ لمحے اس انتظار میں رہی۔ شاید وہ کچھ بولے گا۔ پھر خود ہی پوچھنے لگی۔ ”تم بھاگ بھری کے بارے میں سوچ رہے ہو۔“

سجاد نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”میں نے اسے کہاں کہاں تلاش نہیں کیا۔ پر اسے تو جیسے زمین کھائی ہے یا آسمان گھل گیا ہے۔ کہیں اس کی خبر نہیں ملتی۔ کسی طرف اس کا کوئی نشان۔ کوئی اتہ پتہ نہیں۔“

”تم ہمت نہ ہارو۔ مایوس نہ ہو جاؤ۔ کوشش کرتے رہو۔ ڈھونڈنے سے تو خدا بھی مل جاتا ہے۔ تم اسے تلاش کرتے رہے تو کبھی نہ کبھی اسے ضرور پالو گے۔ میرا دل کہتا ہے وہ تم سے ضرور ملے گی۔“ نیلیم اسے تسلی دیتے لگی۔

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا۔ بغیر یہ سوچے، بغیر یہ جانے کہ یہ الفاظ کن ہونٹوں سے ٲا رہے ہیں۔ وہ لفظ اسے سکون دے رہے تھے۔ اسے ہارنے، اسے ٹوٹ کر ٹکھر جانے سے روک رہے تھے۔

وہ کچھ دیر یونہی بالکل چپ بیٹھا رہا۔ اب ایک اس کی نگاہ گھڑی پر پڑی۔ وہ چونکا۔ اسے یہاں آئے ہوئے کافی وقت ہو گیا تھا۔ اس نے سر جھٹک کر اس پریشان خیالی سے بچھا چھڑایا اور نیلیم سے براہ راست ہی پوچھ لیا۔ ”یہ لاشا کون ہے؟“

وہ اس غیر متعلق ذکر پر چونکی۔ ”تم لاشا کا کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”کوئی وجہ ہے تو پوچھ رہا ہوں۔“ سجاد نے سنجیدگی سے کہا۔

لیکن وہ ہنس پڑی۔ ”میں نے سمجھا شاید تم اس سے رفاقت محسوس کر رہے ہو۔“

سجاد ہنس پڑا۔ ”تم اس بازار اور اس کے طور طریقوں سے کبھی باہر نہ نکلتا۔ اب جو تم پوچھ رہا ہوں اس کا مجھے سیدھا سیدھا جواب دو۔“

”کیا؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

رہے ہو؟

”بس ایک وجہ ہے نا۔“

”اگر میں وجہ پوچھوں تو۔“

”وہ بھی تمہیں بتا دوں گا۔ لیکن تم پہلے میری بات کا جواب دو۔“

”تمہاری بات کا جواب۔“ اس نے ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔

”تمہاری بات کا جواب یہ ہے کہ وہ مجھے ایک گمراہ بنا چکا ہے۔“

”واقعی۔“

”ہاں واقعی۔ کہتا تو وہ یہی ہے۔ اور کہتا ہے کہ وہ قول کا پکا ہے۔ وہ مجھے کوٹھے کی اس

ات سے نکال کر کمر کی عزت دینا چاہتا ہے۔“ وہ لفظ قول تول کر کہنے لگی۔

”تو پھر۔ اس میں دیر کیا ہے۔“ سجاد نے کرید۔

”دیر۔“ اس نے ایک طویل سانس لیا اور جھکے جھکے سے لہجے میں بولی۔

”دیر تو میری طرف سے ہی ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ ہم بھی عورتوں پر مرد بھی اعتبار

نہیں کرتا۔ پھر معاشرہ کہاں جینے دیتا ہے۔ طعنے ملتے ہیں۔ لوگ سارے خاندان پر اٹھایاں

اٹاتے ہیں۔ یہ بات تو نسلوں تک چلتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میں شرافت کی زندگی گزاروں

لیکن ہر لمحے شہادت دور کرتی رہوں۔ اپنے ماتھے سے طواف کا لیبل یا مٹائی رہوں۔ کل کو

اگلی نسل پر بھی یہی الزام لگے گا کہ وہ طواف کی اولاد ہیں۔ سجاد! میں اپنا عذاب آپ جھیلنا

چاہتی ہوں۔ کیلی۔ تمہا۔ میں اسے اگلے زمانے۔ اگلی نسل تک نہیں پہنچانا چاہتی۔“

سجاد کو اس کی باتوں میں حقیقت کی آغ محسوس ہوئی۔ اس نے افسردہ ہو کر سو جا کر

یہاں ہر کوئی اپنی اپنی بیجوریوں میں یوں زندہ چتا ہوا ہے کہ چاہے بھی تو اس حصار سے نہیں نکل

سکتا۔ اس نے تاسف سے سر جھکا اور چند لمحے خاموش رہی۔

نیلیم بھی چپ بیٹھی رہی۔ پھر اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے قریب آ کر اپنا کول ایسا

باتھ اس کے شانے پر رکھ کر بولی۔

”سجاد۔ آؤ کچھ اچھی باتیں کرتے ہیں۔ آج تم اتفاقاً ملے ہو تو اس وقت

لوہوں سوگ میں برباد نہ کرو۔ اسے کم از کم میرے لئے ایک حسین یاد بنا دو جس کے آسرے

میں زندگی کی تحفیں کو گوارا بنا لوں گی۔“

”مجھی اس رشتہ کا پوچھ رہا ہوں جو تمہارے دیدار کے بغیر جاتا نہیں چاہتا تھا۔“

”اسی سے تم اعزازہ لگا لو کہ وہ میرا کتنا بڑا پرستار ہے۔“

”ہوں۔۔۔ اور تم۔“ سجاد نے ہلکی سی مڑ کے ساتھ کہا۔

”میں۔“ وہ زخمی سی ہنسی بول دی۔ ”میرا تو اعتبار ہی نہیں۔“

”تمہیں۔ تم ٹھیک ٹھیک بتاؤ۔ وہ تو تمہارا دیوانہ ہے۔ کچھ تمہارے دل میں بھی اس کی

جگہ ہے۔“ سجاد نے اس کے خوبصورت چہرے میں اس کے دل کو بڑھنے کی کوشش کی۔

وہ یکبارگی اداس سی ہو گئی۔ نکلا ہونٹ دانتوں تلے دبا کر کچھ سوچتی رہی پھر شرمیلی

دوشیزاؤں کی طرح آٹھل کا پلہ اپنی اٹھی پر لپٹتی ہوئی بولی۔

”اگر میں کہوں کہ میرے دل میں کسی کی جگہ ہے تو وہ تم ہو تو تم کبھی نہیں مانو گے۔

ہے نا۔ کبھی میری بات پر یقین نہیں کرو گے۔ تم کبھی مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے۔“ اس نے دواڑ

گھنیر سی پٹکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور اس کی آنکھوں کی گہری اداسی جھیلوں میں ایک

بیباکی آرزو کا کول تیرے لگا۔

کوئی اور لمحہ ہوتا تو شاید سجاد اسے جھڑک دیتا یا ڈانٹ دیتا۔ لیکن اب سے کچھ دیر

پہلے جو اس کے ساتھ انجانا سا تعلق پیدا ہو گیا تھا اس نے اس کی بات کو التفات کے قابل

دیا۔ اس کے لہجے کے گمراہ اور اس کی آنکھوں کی التجا اس پر اعتبار کرنے لگے۔ سجاد نے

التفات کی برت سکا اور لامحنت سے بولا۔ ”ان باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ملے گا۔ تمہیں نہ مجھے۔“

”یہ کوئی کاروبار تو نہیں ہے جس میں نفع نقصان دیکھا جاتا ہے۔ تمہیں یہ سب کچھ

میں اس لئے نہیں کہہ رہی ہوں کہ تم پر اپنا حق جتان چاہتی ہوں۔ یہ تو میرے دل کی بہت گہری

بات ہے۔ جسے میں صرف تمہیں بتانے کو ترس رہی تھی۔“

سجاد نے سر کو یونہی سے مٹی سی جنبش دی۔ اسے ان لطافتوں میں ایٹنے کی فرصت ہی

کب تھی۔ وہ لمحے کے ایک بے حد چھوٹے سے حصے میں بھی کسی زلف کے سائے میں اطمینان

کا سانس نہیں لے سکتا تھا۔ وہ ہر طرح کے حالات اور جذباتی لحظوں سے گزرتا تھا۔ اس کے

نزدیک اب ان باتوں کی اہمیت نہیں رہی تھی۔ اس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔

”خیر! بس اس بات کو سہیں چھوڑ دو اور مجھے رشتہ کے بارے میں بتاؤ۔“

نیلیم نے اپنے سیاہ گھنیرے بالوں میں اٹھایاں اٹھائیں اور غور سے اس کی طرف

دیکھتی رہی۔ پھر جیسے بارے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”تم رشتہ کے بارے میں اتنا کیوں پوچھ

لیکن وہ تنہا سا چھلا اس کی بیماری کھردری انگلی میں پھنستا بھی نہیں تھا۔ نیلم کی چنگی آنکھوں کی جوت مدھم مدھم پڑ گئی۔ وہ اداسی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

سجاد نے چھلا اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

”نیلم! میں اسے کہاں سنبھالنا پھروں گا۔ تم اسے اپنے پاس ہی رہنے دو۔ اگر یہ میری انگلی میں آ جاتا تو ٹھیک تھا مگر اب میں اسے کہاں رکھوں گا۔ تم اسے اپنے پاس ہی رکھو۔ میرے پاس تو یہ گم ہو جائے گا۔“

نیلم نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گئی۔ سجاد بھی کوئی لفظ بولے بغیر پھسلے دروازے سے باہر نکل آیا۔

وہ نہیں چاہتا تھا کہ اسے دن کی روشنی میں کوئی نیلم کے کوحے سے اترتا دیکھے۔ اسی لئے وہ اندھیرے اندھیرے سے نکل آیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ صبح ہونے سے پہلے واپس قبرستان پہنچ جائے گا۔ نیلم نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ دلشاد سے بات کر کے اسے قائل کرے گی کہ وہ نو رکی طرف لوٹ جائے۔ اسی لئے اس نے دلشاد سے ملنے کا ارادہ ترک کر دیا تھا۔

وہ بیڑھیاں اتر کر بچے آیا اور تیز قدموں کے ساتھ بازار میں سے گزرا۔ بازار میں اس وقت اکا دکا لوگ بھی تھے۔ اور ان میں سے اکثر نئے میں دھت لڑکھڑاتے ہوئے راستہ تلاش کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس نے سر جھکایا اور قدموں کو کچھ اور تیز کیا وہ چاہتا تھا کہ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے نکل جائے۔

دفعتاً پان سگریٹ کے ایک کھوکھے کی اوٹ میں سے کوئی بیماری شے اس کی گدی پر اتنے زور سے گئی کہ اس کی آنکھوں کے سامنے شرارے سے ناچ اٹھے۔ اسے چکر آ گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتا ایک واراہر ہوا۔ اس کے ہونٹوں سے آواز بھی نہیں نکلی اور وہ وہیں ڈھے گیا۔



دروازہ کھلتے ہی بلند آہنگ موسیقی کا شور تھا تو کوئی خوشبو اور سگریٹ کے دھوئیں کا ایک مرغیلا سا ان کی طرف لپکا۔ بخت آدھ سے سوچ کر سنبھل گئی کہ اس کمرے میں اس گھر کے کین موجود ہوں گے۔ شہر پارے اسے ہمراہ لئے ہوئے کمرے میں داخل ہوا اور کمرے میں موجود لوگوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”ہیلو بوائز۔“

وہ نیلم سے جلد ہی رخصت ہو گیا۔ حیات کی تخیلوں کا ذائقہ اس کے رگ و پے میں اس طرح کھلا ہوا تھا کہ اسے معمور زلفوں کی جھاڑوں، گداز بانہوں کا سایہ اور کئی دلیلیں پہلو کی ہم نشینی اچھی نہیں لگتی تھی۔ اس نے نیلم کی باتیں کچھ سنیں کچھ ان سنی کر دیں۔ وہ نہ جانے کب سے کسی دل کے محرم کو ترسی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے دل کی ساری باتیں، اپنے سب سے پیٹھے لپٹے اور محبت کے سب سے اچھے لفظ اس کے ہمراہ کر دیے۔ وہ چلنے لگا تو وہ جلدی سے بھگی۔

”ذرا ٹھہرنا۔“

سجاد نے مڑ کر دیکھا۔

”کیوں! کیا کچھ اور بھی کہنے کو رہ گیا ہے۔“

”ہاں۔ ایک بہت ضروری بات۔“ اس نے ڈریسنگ ٹیبل پر سے اپنے زیورات کا بکس کھولتے ہوئے کہا۔

سجاد نے استہساہ نہ لگایا۔ اس کی طرف دیکھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ وہ اس بکس میں سے کوئی چیز نکال کر اس کے قریب آئی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر ایک سستا سادھات کا چھلا اس کی تھیلی پر رکھتے ہوئے بولی۔

”سجاد۔ یہ میرا چھلا ہے۔ یہ میں نے اس وقت ایک سیلے سے خریدا تھا جب میں ابھی ستارہ نہیں بنی تھی۔ یہ چھلا مجھے یاد دلاتا رہتا ہے کہ کبھی میں بھی ایک سیدھی سادی شہر لڑکی تھی۔ یہ مجھے بہت عزیز ہے۔ سجاد۔ میں نے تمہیں بھاگ بھری بن کر چاہا ہے اور بھاگ بھری کی سب سے قیمتی ستارہ بھی ہے۔ اسے تم رکھ لو۔ میری نشانی سمجھ کر۔ شاید یہ بھی تمہیں میری یاد دلادے۔“

سجاد نے اسے اٹھایا۔ اس نے تمام کر دیکھا اور اپنی چھوٹی انگلی میں پہننے کی کوشش کی

قالین پر اوڑھے، سیدھے، آڑے ترچے لینے اور بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھیں ان پر مرکوز ہوئیں۔ ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ لہرایا جس میں اس نے جلا ہوا سگریٹ پکڑ رکھا تھا اور زور سے چلایا۔

”ویل کم۔ ویل کم۔ خوش آمدید۔ چشم ماروشن دل ماشاد“
 ”آپ ہیں۔ میڈم بخت آور۔“ اس نے بخت آور کو دونوں شانوں سے پکڑ کر سب کے سامنے کر دیا۔ وہ سب سیدھے ہو بیٹھے اور اشتیاق اور دلچسپی کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگے۔ بخت آور نے دیکھا کہ وہ تعداد میں جارتے۔ اور سب کے سب شہریار کے ہم عمر تھے۔
 ”یہ ہماری مہمان ہیں۔ کچھ روز ہمارے ساتھ رہیں گی اور اب تم سب انہیں الوؤں کی طرح دیکھنے کے بجائے اپنا اپنا تعارف کراؤ۔ جلدی جلدی۔ فائنٹ“
 صوفے کے ساتھ فلک لگائے ایک عام شکل و صورت کا لڑکا ٹانگیں بہا رہے بیٹھا تھا۔
 ”مجھے شجاع کہتے ہیں۔“ اس نے سگریٹ کا دھواں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”میں پاشا ہوں جی۔“ نسیمی منی واڈمی والا ایک لڑکا بولا۔
 ”میرا نام یوٹی ہے۔“ تیسرے نے کہا۔ اس کی کھٹی مونچھیں اس کے ہونٹوں پر چمکی ہوئی تھیں اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے قریب بیٹھے ہوئے لڑکے کو چمکایا جو تھوڑی گردن میں گھسائے بیٹھا تھا۔ وہ کشادہ چہرہ پیشانی اور کھٹکھٹے بالوں والا وجہہ نہ جوان تھا۔
 ”یہ سارٹ ہے جی۔“ یوٹی نے اس کے بازو کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا لیکن وہ متوجہ نہیں ہوا۔ اسی طرح بیٹھا رہا۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ شہریار نے پوچھا۔
 ”یہ آج لمبی پرواز پر ہے۔ اس نے دو سگریٹ چڑھا لیے ہیں۔“
 بخت آور اندری ہی اندر پریشان سی ہو گئی۔ لیکن اس نے ان پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ اسے اس بات نے شدید الجھن میں ڈال دیا تھا کہ وہ سب کے سب لڑکے یہاں کیا کر رہے ہیں۔

”تشریف رکھئے۔“ یوٹی نے خوش اخلاقی سے کہا۔
 شہریار نے ایک صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ بخت آور کچھ متذبذب سی اس پر غور رہی۔ شہریار یا اس قالین پر اتنی باقی مار کر بیٹھ گیا۔ وہ تینوں بھی کھٹکتے ہوئے قریب آگئے۔ صرف سارٹ ویاور کے سہارے اسی طرح گرد و پیش سے بے خبر رہا۔

”میڈم! ہم یہاں آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔“ پاشا نے مسکرا کر کہا۔
 ”میڈم! آپ کے آنے سے ہمارے اس غریب خانے میں بہار آگئی ہے۔“ شجاع

۱۷۱

”میڈم۔ آپ بہت خوبصورت ہیں۔“ یوٹی نے کہا۔
 بخت آور ان کی بھانت بھانت کی بولیوں اور بے باک نگاہوں سے پریشان سی ہو گئی۔ شاید وہ کسی غلط جگہ آگئی تھی۔ شاید اس نے شہریار کے ساتھ آکر غلطی کی تھی۔ لیکن اب تو وہ یہ قدم اٹھا چکی تھی۔ اسے کسی نہ کسی طرح اس کے ساتھ نباہنا پڑتا تھا۔ اس نے اپنے الجھے کو باز مل جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”شہریار! تم مجھے یہ بتاؤ کہ یہ کس کا گھر ہے؟ یہاں کون لوگ رہتے ہیں؟ اور تم مارے شریر بچے یہاں اکٹھے ہو کر کیا کر رہے ہو۔“
 اس نے جان بوجھ کر انہیں کم عمری کا احساس دلانے کی کوشش کی تاکہ ان کے اور اس کے درمیان ایک بزرگ نہ فاصلہ برقرار رہ سکے۔

”ایک۔ دو۔ تین۔ آپ نے تین سوال کئے ہیں۔“ پاشا نے اگھبوں پر گن کر بتایا۔
 ”آپ کے پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ مالک مکان کا گھر ہے۔“ شجاع بولا۔
 ”دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ یہاں صرف ہم لوگ ہی رہتے ہیں۔“ شہریار نے

نہا۔

”اور آپ کے تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس وقت ہم سارے شریر بچے اکٹھے ہو کر صرف اور صرف آپ کا انتظار فرما رہے تھے کیونکہ شیریں نے ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ آپ کو لینے جا رہا ہے۔“ یوٹی گویا ہوا۔
 ”لیکن۔ تم لوگ یہاں اکیلے..... میرا مطلب ہے بالکل اکیلے رہتے ہو؟“ بخت آور نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ پاشا نے سعادت مندی سے سینے پر ہاتھ رکھا۔
 ”اکیلے۔ بالکل اکیلے۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں۔“
 ”اور تمہارے والدین۔ بہن بھائی۔ گھر کے دوسرے لوگ.....؟“
 ”گھر، والدین۔ بہن بھائی وغیرہ وغیرہ یہ سارے لفظ۔ یہ سارے رشتے ہماری دشمنی اور ہماری زندگی میں نہیں۔ بالکل نہیں۔“ یوٹی نے ہاتھ بلند کر کے لٹی میں سر ہلاتے

ہوئے کہا۔

”نہ ہماری کسی کو ضرورت ہے نہ ہمیں کسی کی ضرورت ہے۔“ شجاع نے ایک لکائی۔
 ”دیکھئے میڈم۔ سارٹ کو ہوٹل سے نکال دیا گیا۔ بولی کو اس کے ڈیڑی نے دھکے
 دے کر گھر سے باہر کر دیا۔ اس چہارے پاشا کے گھر کی آبادی ہی اتنی ہے کہ اس کے لئے اس
 کے گھر میں کوئی جگہ ہی نہیں۔ شجاع کو ویسے ہی اپنے گھر کی فضا راس نہیں آتی۔ رہ گیا یہ
 خاکسار۔ آپ کا خادم تو یہ توجہ رہا ہے۔ کبھی یہاں..... کبھی وہاں..... کبھی کہاں۔“
 شہریار نے بڑے ڈرامائی انداز میں تفصیل سے بتایا۔

”مگر اس جگہ کا کرایہ تمہارے کھانے پینے کا کیا ہوتا ہے؟“ بخت آور نے سوال کیا۔
 ”وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔“ پاشا بولا۔
 ”چھوڑیے میڈم اس ایک دو کے چکر کو۔ یہ آپ کا مسئلہ نہیں ہے۔“ بولی لالابی پنا
 سے بولا۔

”نہیں بھئی۔ اب مجھے یہاں کچھ روز رہنا ہے تو مجھے اس بارے میں کچھ معلوم تو ہونا
 چاہئے نا۔“

”سمندر میں غوطہ لگا کر ہی اس کے اسرار سمجھ میں آتے ہیں۔ آپ بھی یہاں رہیں گی
 تو رفتہ رفتہ سب کچھ جان جائیں گی۔ ابھی سے کیوں نگر میں پرتی ہیں۔“ شہریار نے لہجہ دیا۔
 بخت آور کو اطمینان نہیں ہوا۔ وہ ابھی کچھ کہا ہی چاہتی تھی کہ اچانک ایک آواز نے
 اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

”روٹی..... روٹی۔ تم اب تک کہاں تھیں میری جان۔ تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں
 تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔“ سارٹ اس کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔
 ”یہ کون ہے؟“ بخت آور نے پریشان ہو کر کہا۔

”بتایا نہیں آپ کو۔ یہ سارٹ ہے۔ بے چارہ..... محبت کا مارا ہے۔“ شہریار نے
 اطلاع دی۔

”روٹی..... مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ جنہیں مجھ سے کوئی جدا نہیں کر سکتا تم
 سب کچھ ٹھکرا کر میرے پاس ضرور آؤ گی۔ مجھے یقین تھا۔“ وہ سرخ آنکھوں سے اس کی طرف
 ایک نیک دیکھا ہی طرف لڑکھاتا ہوا چلا آتا تھا۔

”شہریار! سمجھاؤ اسے کچھ۔“ بخت آور نے گھر کا کہا۔

”آپ گھبراہٹ نہیں۔ یہ یوں ہی جبکہ کر خاموش ہو جائے گا۔ اسے دن میں
 ایک آدھ مرتبہ روٹی کا دورہ ضرور پڑتا ہے۔“ وہ بولا۔

اس نے قریب آ کر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ ”روٹی! میری جان! شکر ہے تم آگئیں۔“

”سٹ۔“ شجاع نے نعرہ مارا۔

”بس۔ بس یار باب ہوش میں آ جا۔ سین اوکے ہو گیا ہے۔“ بولی نے اس کا ہاتھ

پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

”اوئے یار باب اس روٹی کی تیج کرنا چھوڑ دے نہیں تو اس کا باپ تیری ٹانگیں توڑ

دے گا۔“ پاشا نے اس کا شانہ ہلایا۔

”نہیں نہیں۔ تم مجھے دھوکا نہیں دے سکتے۔ یہ دیکھو روٹی آگئی ہے۔ اب اس کا باپ

کچھ نہیں کر سکتا۔ دو دو میرے پاس آگئی ہے۔“ اس نے پھر اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”بس کر یار! یہ روٹی روٹی سن کر تو کان پک گئے ہیں۔“ بولی نے ہزار سی سے کہا اور

اسے پھر وہیں بٹھاتے ہوئے بولا۔

”چلو یار! ابھی سی چائے کا انتظام کرو۔ میڈم کا آج یہاں پہلا دن ہے۔“

.....

بخت آور نے ان کے اور اپنے درمیان ایک فاصلہ قائم رکھا تھا۔ وہ ان کے ساتھ
 زیادہ کھلی ملی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی اسے ان سب کے درمیان رہنا بہت عجیب اور پراسرار سا
 لگتا تھا۔ وہ سب کے سب لڑکے عمر میں بھی اس سے چھوٹے تھے اسی لئے وہ ان پر اپنے
 بڑے پن کا رعب بھی جماتی تھی۔ وہ سب کے سب اس کے التفات کے خواہاں تھے۔ ان
 میں سے ہر ایک اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتا تھا۔

اسے بظاہر یہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ لیکن اس کے لئے دن بھر بیکار بیٹھنا بھی دوجہ
 تھا۔ کھانا وہ بازار سے لے آتے تھے۔ صفائی کی انہیں کوئی پروا نہیں تھی۔ دوسرے تیرے دن
 ایک صفائی کرنے والا آتا جو تمام گھر کو اچھی طرح بھڑا پونچھ دیتا۔ مالی باہر لان میں کام کرتا
 رہتا۔

ان سب کی دنیا عجیب تھی۔ چھوٹی سی آزاد دنیا جس میں سب آزاد تھیلے اور اپنی مرضی
 کے مالک تھے۔ زندگی روک ٹوک، نہ کسی کا ڈر نہ خوف۔ وہ سب کے سب اپنے پسندیدہ انداز
 میں زندگی گزار رہے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے انہیں کوئی نگر، کوئی اندیشہ کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ

اپنی مرضی سے سوتے، مرضی سے جاگتے۔ کبھی دن بھر سوتے رہتے اور راتوں کو جاگتے۔ کبھی تاش کھیلنے، کبھی ناچنے، کبھی گاتے، کبھی اودھم مچاتے اور ایک دوسرے سے بات بے بات لڑتے۔

وقت گزرتا جا رہا تھا۔ لیکن بخت اور ایک جگہ پر ٹھہر گئی تھی۔ مستقبل کی فکر اسے ہر لمحہ پریشان رکھتی تھی۔ مگر شہر یار اس سلسلے میں زیادہ سنجیدہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی اس موضوع کو چھیڑتی وہ بات سمجھا کر کہیں اور لے جاتا۔ بخت اور آتا جاتی۔

”شیریں تم بھی اپنے اس اہل کی طرح مجھے ملنے کی کوشش نہ کرو۔ یاد رکھو اب میں تمہاری پروا بھی نہیں کروں گی۔ میں خود ہی کسی طرف نکل جاؤں گی میں تمہاری محتاج بن کر نہیں رہ سکتی۔“

”او ہو ہو ہوا کی حماقت نہ کیجئے گا۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا۔ ”آپ کو پتہ ہے کہ اسی بلاک میں قبلہ و کعبہ اہل بھی رہتے ہیں۔ کہیں ملاقات ہوگئی تو پھر آپ ہی ٹھیکے گا۔“

”کیا مطلب؟“ بخت اور ابھی۔

”آسمان انھوں میں مطلب یہ ہے کہ قبلہ و کعبہ اہل اس کوٹھی سے کوئی پانچ چھ نمبر پرے رہتے ہیں۔ کہیں آپ کی ان سے ہی ملاقات نہ ہو جائے۔“

”فضول باتیں نہ کرو۔ یہ کیس طرح ہو سکتا ہے۔“ بخت اور کو یقین نہیں آیا۔

”یہ ہو سکتا نہیں ہو رہا ہے اور اس لئے ہو رہا ہے کہ جس چیز کو چھپانا ہوا ہے بالکل عین سامنے رکھ دینا چاہئے۔ کیونکہ ہمارے یہاں کوٹھی ہوئی چیزوں کو ڈھونڈنے کے لئے دوہرا تک جانے کا رواج ہے۔ نزدیک کوئی نہیں دیکھتا۔ قبلہ اہل تو یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ آپ ان کی ہمسائی بھی ہو سکتی ہیں۔“

بخت اور حیران رہ گئی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ شہر یار اتنا ہوشیار ہو سکتا ہے۔ وہ کچھ کہنے ہی والی تھی کہ دروازہ کھلا اور بولنی اندر داخل ہوا۔

”شیریں..... ہاں آ رہا ہے۔“

”ہاں۔“ شہر یار گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”ہاں ہاں۔“ بولنی نے دہرایا۔

”جہیں کس نے بتایا؟“ شہر یار نے غلٹ میں سوال کیا۔

”بیٹا آیا ہے۔“ بولنی نے اکٹھے سے کوئی اشارہ کیا۔

”اوئے۔ مارے گئے۔“ شہر یار نے سر جھکا۔

”مجھے ابھی تو ڈاکا ڈنٹ بھی چپک کرتا ہے۔“

”جلدی کرو۔ جلدی۔ دوڑو نہیں تو چگا ڈٹے نظر آؤ گے۔“ بولنی نے چٹکی بجا لی۔ تو

شہر یار واقعی دوڑتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

بخت اور کو ان کی گفتگوں کو قتب ہوا۔ ہاں کا ذکر آج اس نے پہلی بار سنا تھا۔ شہر یار

جس طرح اس کا نام سن کر بدحواس ہوا تھا اس سے بخت اور کو اس کی شخصیت کے بارے میں

اندازہ لگانے میں دیر نہیں لگی۔ وہ مشکری ہو گئی۔ وہ لوگ اسے کچھ زیادہ ہی پراسرار معلوم

ہونے لگے۔ اس نے غور سے بولنی کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی کھٹی مونچھوں کو بل دیتا اس کی

طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک سرگرد دینے والی چمک تھی۔ اس کی سیاہ

مونچھوں میں چھپا ہوا ہونٹ مسکرایا۔

”آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“

بخت اور نے اس کی بات کو نظر انداز کر دیا۔

”ہاں کون ہے؟“

”ہاں کو گولی داریں۔“ اس کی نگاہیں اس کے وجود کو کھردرے پن سے چھونے

لگیں۔ وہ اس کے سینہ مقابلے کڑا ہوتے ہوئے بولا۔

”میڈم! ابھی تو ڈاکا ڈنٹ بھی میں تو دیا کریں نا۔“

بخت اور کو بھر پوری سی آگئی۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک ڈراپے والی دالری سے

اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

”یہ گھر صرف شہر یار ہی کا نہیں۔ آپ یہاں رہتی ہیں تو آپ کو ہم سب کو وقت دینا

چاہئے۔ ہم سب یہاں اکٹھے رہتے ہیں۔ ہم ہر چیز میں برابر کے حصے دار ہیں۔ آپ پر ہمارا

بھی حق ہے۔ آپ اکیلے شہر یار کی ملکیت نہیں ہیں۔“

”میں کسی کی ملکیت نہیں ہوں سمجھے تم۔“ بخت اور نے پیچھے ہٹ کر درمئی سے کہا۔

”نہی میں کوئی چیز ہوں جسے تم برابر سے تقسیم نہ کرو۔ آئندہ اس قسم کی بات نہ کرنا۔“

وہ بے ساختہ ہنس پڑا۔

”آپ جہاں تمہیں آ اور جو کچھ تمہیں ہمیں سب معلوم ہے۔ سب جانتے ہیں ہم۔ اس

لئے آپ کو زیادہ بننے کی ضرورت نہیں۔“ اس کا چہرہ اس کے لہجے کی ملاحظت سے میل نہیں کھا

بخت آور کیلئے انکار کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ کھڑی ہوئی اور بونی کے پیچھے پیچھے چلے گئی۔ وہ نہ انکار کر سکتی تھی نہ کوئی اعتراض۔ نہ کچھ پوچھ سکتی تھی نہ کچھ کہہ سکتی تھی۔ شہریار پتہ نہیں کہاں غائب ہو گیا تھا اور وہ بونی کے ساتھ چلے پر مجبور تھی۔ یہ سوچتی ہوئی کہ باس نہ جانے کون ہے؟ نہ جانے اس نے اس کے لئے کون سا جال تیار کر رکھا ہے۔ قسمت کے ترس میں اب اس کے لئے کون سا تیر تھا۔ طویل راہداری طے کرنے کے بونی نے ایک کونے میں پڑی ہوئی الماری کو کھولا اور اس کے اندر یوں داخل ہو گیا جیسے کوئی دروازہ ہو۔ بخت آور حیران سی کھڑی رہ گئی۔ بونی نے پلٹ کر پیچھے دیکھا اور بولا۔

”آ جا بیٹے“

بخت آور نے ڈرتے ڈرتے الماری کے اندر قدم رکھا۔ بظاہر وہ الماری ہی معلوم ہوئی تھی لیکن اس کے اندر ایک خفیہ دروازہ تھا۔ بخت آور کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک ایسی بھول بھلیاں میں پھنس گئی ہے جس سے باہر نکلنے کا شاید اسے کوئی راستہ نہ ملے۔ وہ بددل اور پشیمند سی اس کے پیچھے پیچھے یوں پاؤں دھردی تھی جیسے موت کے سفر پر جاری ہو۔

یہ دروازہ ایک تہہ خانے کے زینے پر کھلا تھا جس کی نیم تاریک فضا سنگریلوں کے دھوئیں اور تمباکو کی بو سے بھری ہوئی تھی۔ وہ سب کے سب قالین پر یہاں وہاں بکھرے ہوئے بیٹھے تھے۔ بخت آور نے ایک تیز نظر سے چاروں طرف باس کی جستجو میں دیکھا لیکن ابھی اس کی آنکھیں نیم تاریکی میں صاف طور پر دیکھنے کے قابل نہیں ہوئی تھیں اس لئے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو سکا۔

”آ جاؤ۔“ ایک بھاری آواز کی گونج سارے تہہ خانے میں بھیل گئی۔

○ ○ ○ ○ ○

سجاد ل غفلت سے ہوشیار ہوا تو اس کے سر کے پچھلے حصے میں درد تھا۔ اس کے ہونٹ ایک تھوڑے اور نہ کا ڈانٹہ کیسا سا ہوا رہا تھا۔ اس کا ذہن ابھی تک ماؤف تھا۔ اسے ٹھیک طرح سے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اپنے گرد و پیش دیکھا وہ ایک بے سرو سامان کمرے میں پڑی ہوئی چار پالی پر پڑا تھا۔ اس نے سر جھٹکا اور اپنے حواس مست کرنے کی کوشش کی۔ اسے ایک ایک کر کے سارے واقعات یاد آنے لگے کہ کس طرح

رہا تھا۔ اس کی نظروں میں بختی اور بے رحمی تھی۔ بخت آور کو اس کی بات نے چور چور کر دیا۔ رسوائیوں کے یہ داغ شاید اس کی پیشانی سے کبھی نہیں مٹ سکتے تھے۔ وہ کتابھی سفر کیوں نہ ملے کر لیتی اس بازار میں گزرے ہوئے دنوں سے بھاگ نہیں سکتی تھی۔ اس نے بمشکل خود پر قابو پایا اور ہتے ہوئے لہجے میں بولی۔

”میں تمہاری کسی بیچ بات کا جواب نہیں دیتا چاہتی۔ ہاں اتنا سن لو کہ میں بہت جلد یہاں سے چلی جاؤں گی۔“

وہ حقارت سے ہنسا۔ ”آپ کہیں نہیں جاسکتیں۔“

”میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔“ بخت آور نے غصے سے کہا۔

”آپ پابند ہیں۔“ وہ جیسے چراتے ہوئے بولا۔

”میں کسی کی پابند نہیں ہوں۔“ بخت آور نے شدید غصے میں کہا۔

”کہاں ہے شہریار! اسے بلاؤ۔ میں ابھی یہاں سے جانا چاہتی ہوں۔“

بونی نے آگے بڑھ کر اسے بازو سے پکڑ کر صوفے پر بٹھا دیا اور ایک ایک لفظ چپا کر بولا۔

”میڈم! اب آپ کے اعتبار میں کچھ بھی نہیں رہا۔ شہریار کیا اس کا باپ بھی کچھ نہیں کر سکتا۔ اب آپ کے متعلق باس فیصلہ کرے گا کہ آپ کو کیا کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے۔“

بخت آور بھونچکی سی رہ گئی اس نے پریشانی سے بونی کی طرف دیکھا۔ وہ اونچا لمبا مرو جیسے ایک دیوار کی طرح اس کے راستے میں کھڑا تھا۔ بخت آور کو محسوس ہوا جیسے وہ کسی جال میں جھنسنے لگی ہے۔ کسی قہقہے میں کس دی گئی ہے۔ بے بسی کی کیفیت میں اس نے سر پکڑ لیا۔

”میڈم! آپ گلہ نہ کریں۔ آپ ہم سب کے ساتھ بہت خوش رہیں گی۔“ بونی نے اس کے بالوں کو ہلکے سے چھو کر کہا۔ بخت آور نے سر جھٹکا اسی وقت دروازہ کھلا اور شہریار نے اندر جھانکا۔

”کن بکروں میں ہوتے۔“ اس نے پاتی پن سے آنکھ دبائی۔

”کیا خبر ہے؟“ بونی نے پوچھا۔

”باس پانچ منٹ میں پہنچنے والا ہے۔ تم انہیں لے کر چلو۔ جلدی۔ جلدی۔“ اس نے چنگی بجاتی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

”چلے میڈم۔“ پلیز۔“ بونی نے طرز سے لہجے میں غم ہو کر کہا۔

اس پر حملہ ہوا تھا اور پھر سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

اس وقت بھی اس کے چاروں طرف نیم تاریکی ہی تھی۔ یوں مظلوم ہوتا تھا جیسے وہ کسی تہہ خانے میں ہے۔ سجاد کو جبر پھری سی آگئی۔ اس خیال نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیئے کہ بالآخر وہ دشمنوں کے ہاتھ آ ہی گیا تھا۔ پر یہ کون لوگ تھے اسے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔ یقیناً یہ ملاں کے لوگ ہی ہو سکتے تھے۔ وہی اس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔

وہ کچھ دیر گھرایا ہوا سارہا۔ پھر اس نے خود کو سمجھایا۔ سارے دھوسوں اور اندیشوں کو ذہن سے جھٹک کر اپنے حواس بحال کئے اور یہ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ اس نے اپنے حوصلوں کو پست نہیں ہونے دیا۔ نہ ہی خوف اور پریشانی کو خود پر سلا ہونے دیا۔ اس نے خود کو ہر طرح کے حالات سے مقابلہ کرنے کیلئے تیار کر لیا اور اٹھ کر دروازے پر دستک دے ڈالی تاکہ تذبذب اور بے یقینی کی اس کیفیت سے چھٹکارا حاصل کر کے اور اسے اندازہ ہو سکے کہ وہ کن لوگوں کے چنگل میں ہے۔

دروازہ فوراً ہی یوں مکمل کیا جیسے کوئی دروازے کے ساتھ ہی بیٹھا ہوا تھا۔ سجاد کو کچھ ہو گیا۔ وہ چند قدم پیچھے ہٹا اور اس کی ساری حیات بیدار ہو گئیں۔ ایک لازم پیشہ شخص اٹھ آیا۔ اس کے کامدھے پر رائلنگ تھی اور اس کے چہرے پر دشمنی۔ اس کی ہنسی جیسے بد مزاجی تھی تو ہوئی تھیں۔

”بیٹے جاؤ۔“ اس نے سختی سے حکم دیا۔

سجاد اپنے بے ضرر ہونے کا تاثر دیتا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے بغیر کسی اعتراض کے قہیل کی۔ وہ چار پائی پر بیٹھ گیا تو اس نے پوچھا۔

”کچھ روٹی پانی چاہئے؟“

اس کے پوچھنے پر سجاد کو کبھی بھوک کا خیال آیا۔ لیکن اس سے بڑھ کر سگریٹ کا طلب تھی۔ اس نے بے تکلفی سے کہا۔

”پارا پیلے ایک سگریٹ تو ملاؤ۔ پھر کچھ بھی لیس کرے۔“

اس شخص کی آنکھوں میں ہلکی سی حیرت ابھری۔ اس نے جیب سے سگریٹ کی ڈبہ نکال کر اس کی طرف اچھالی۔ سجاد نے سگریٹ سلگایا اور وہ تین لمبے لمبے کش لئے اور اس سے بولا۔

”ہاں یار! اب کوئی روٹی پانی کا بندوبست بھی ہو جائے تو کیا ہی کہنے۔“

وہ شخص اب بھی اس کے اطمینان پر کچھ متعجب سا نہایت پیچھے دروازہ بند کر کے باہر نکل گیا۔ سجاد کو کچھ تسلی ہوئی کہ وہ جن لوگوں کے چنگل میں بھی تھا۔ وہ کم از کم اس سے شریفانہ برتاؤ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن ابھی یہ اندازہ نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کون لوگ تھے۔

سجاد کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ شخص جلد ہی ایک ٹرے میں کھانا لے آیا اور اس کے سامنے رکھ کر پھر کمرے سے باہر چلا گیا۔ کھانا کچھ زیادہ برائے نہیں تھا۔ پھر سجاد کو بھوک بھی لگی تھی۔ اس نے رغبت سے کھایا اور برتن ایک طرف رکھ کر پھر دروازے پر دستک دے ڈالی۔ اس کا چہرہ وار شاید چونکا تھا۔ کیونکہ اس کی دستک کے جواب میں اس نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا۔

”کیا بات ہے؟“ اس نے اکڑ پڑے سے سوال کیا۔

”یہ برتن ہے جاؤ۔“ سجاد نے برتنوں کی طرف اشارہ کیا۔ ”اور مجھے بتاؤ کہ میں کس کا مہمان ہوں؟“

اس نے برتن اٹھاتے ہوئے خشمگین نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بے رخی سے کہنے لگا۔

”مجھے کچھ پتہ نہیں۔“

”اچھا۔ جنہیں کچھ پتہ نہ ہو۔“ سجاد نے تسخیر سے کہا۔

”تو مجھ کو بادشاہ ہو۔ ان سے پوچھ کر آؤ۔ جنہوں نے تمہیں میرے چہرے پر بٹھایا ہے۔ میرا وقت بڑا قیمتی ہے۔“

اس نے تیوریوں پر پل ڈال کر اس کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے جانے کیلئے مڑا۔ سجاد نے عقب سے کہا۔

”یار! ایک چائے کا پیالہ بھی لیتے آنا۔“

کھانا کھانے اور سگریٹ پینے کے بعد وہ تازہ دم ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر سارے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواروں کو ٹھونک بجا کر دیکھا۔ روشندان کی بلندی کا اندازہ لگایا لیکن کوئی ایسی جگہ نظر نہیں آئی جہاں سے وہ باہر نکل سکتا۔

مقرر کی عداوت نے اسے اسے جال میں لا پھینکا تھا۔ وہ کہاں سے چلا تھا؟ اور کہاں آن پہنچا تھا؟ اس کے سارے کام احمورے اور جھیل کو ترس رہے تھے۔ اس خیال نے اسے

کے جواب میں فوراً ہی کچھ نہیں کہہ سکا۔ لیکن اس نے کچھ عجیب، کچھ متذبذب اور پر تشویش نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ سجاد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ دانشا نہیں ہے۔ وہ محض فوری سنبھل گیا اور جنگ لہجے میں بولا۔

”تم میری بات کا جواب دو۔ جو میں نے پوچھا ہے وہ تائید“
 ”اگر تم دانشا نہیں ہو تو دانشا سے کہو کہ خود مجھ سے ملے۔ اور جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لے۔“

اس شخص نے کچھ کہا تھا۔ لیکن پھر کچھ سوچ کر خاموش ہی رہا اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔



چوڑی پیشانی، مختصر بالے سیاہ بالوں اور لمبی کھائی ہوئی گھنٹی مونچھوں والا اونچا لمبا شخص دانشا تھا۔ اس کی سرخ و زردوں والی خشار آلود آنکھوں میں رقابت کی چنگاریاں سنگ رہی تھیں۔ اس نے حقارت سے سجاد کی طرف دیکھا اور مونٹوں سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ لیکن اس کی کڑی نگاہوں نے اس کی غرور سے حتی ہوئی گردن نے سجاد پر ظاہر کر دیا کہ وہ دانشا ہے۔

وہ بیٹھا نہیں۔ کرسی پر پاؤں دھر کر کھڑا ہو گیا اور اکھڑ پٹنے سے بولا۔

”ہاں کہو۔ کیا کہتے ہو۔ میں دانشا ہوں۔“

سجاد نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا۔ وہ بہترین لباس پہنے ہوئے تھا جو اس کے ذہبہ سرا پہ بہت بیچ رہا تھا۔ سجاد کو اس کا یہ پرغور انداز اچھا نہیں لگا۔ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے وہ اس سے بالکل مغرب و مستشرق نہیں ہوا اور پر اعتاد لہجے میں بولا۔

”مجھے پتہ چل گیا ہے کہ تم دانشا ہو۔ اگر مجھ سے بات کرنی ہے تو آرام سے بیٹھ کر کرو۔ یہ فرعونوں کی طرح کسی اور کے سامنے کھڑے ہونا۔“

دانشا دے تھکتے غصے سے پھڑکنے لگے۔ اس نے ایک طویل سانس یوں کھینچا جیسے مانپ پھنکار مارتا ہے۔ اس نے پاؤں سے ہی ایک کرسی کو دھکیلا اور بڑے غصے سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھا گیا۔

سجاد نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا۔

”ہاں یار! پوچھو تم نیلم کے بارے میں کیا پوچھنا چاہتے ہو۔“ وہ اس کی دکھتی رگ

افردہ اور بددل کر دیا۔ وہ بے چین سا ہو کر کمرے میں بیٹھنے لگا کہ دروازہ کھلا اور اونچے قد کا ایک خوش پوش آدمی کمرے میں داخل ہوا۔

سجاد نے تنقیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے کس طرح مخاطب کرتا ہے۔ اس شخص نے ایک بھر پور نگاہ اس پر ڈالی اور مصافحے کے لئے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔

”اوائے سردارے۔ چائے لے آ۔“

اس نے سجاد کو بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سردار چائے کے دو کپ انہیں تمنا کر کمرے سے باہر نکل گیا تو وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔

”تم نے چائے مانگی تھی نا۔ لو پیو۔“

سجاد نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔

”تمہاری مہربانی لیکن یہ تو بتاؤ کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔ تم کس کے بندے

ہو؟“

”ہم اللہ کے بندے ہیں۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

سجاد کو بھی اس پر حیرت پڑی آگئی۔

”بندے تو سب ہی اللہ کے ہیں۔ مگر یہاں اللہ کی مخلوق کے بندے بننے کا زیادہ رواج ہے۔ تم میری مہمان داری کرنے تو مجھے یہاں لائے نہیں ہو۔ سیدی طرح بتاؤ کہ آظم معاملہ کیا ہے۔ تمہارا وقت ضائع ہونا میرا۔“

”تو ٹھیک ہے بھائی! تجھے جلدی ہے تو ہمارے پاس بھی وقت نہیں۔ بس تم بھی سیدھے سیدھے یہ بتاؤ کہ نیلم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟“ اس کے چپے ہوئے لہجے کا انداز تھممانہ تھا۔

سجاد نے اطمینان کا سانس لیا کہ ان لوگوں کا تعلق ملاں سے نہیں تھا۔ ورنہ وہ نیلم کی بات نہ کرتے۔ یقیناً وہ نیلم کے چاہنے والوں میں سے کوئی تھا۔ جو نیلم کو اس پر مہربان دیکھ کر برہم ہو گیا تھا۔ سجاد نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم دانشا تو نہیں؟“

دانشا کے نام پر وہ شخص چونک سا گیا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔ وہ اس

چیمبر کر اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ نعلیم کے بارے میں کس حد تک بخیرہ ہے۔

دشاد نے دانت پیسے اور لفتہ چپا کر بولا۔

”میں بات میں بھیر بھیر کرنے کا عادی نہیں ہوں۔ تم مجھے سیدمی طرح بتا دو کہ نعلیم

سے تمہارا کیا معاملہ ہے؟“

”معاملہ کچھ نہیں ہے یا رام تو اس لین کے بندے ہی نہیں۔“ اس نے بے نیازی

سے اسے الجھانے کو کہا اور عمدہ خاموش ہو گیا۔

دشاد تھملا یا اور اس نے نیکی سے پہلو بدلا اور دانت بھیج کر بولا۔

”تمہاری اس سے کوئی پرانی جان بچکان ہے؟“

”تم اس بات کو چھوڑ دو۔ جان بچکان ہے یا نہیں میں تو یہاں تمہاری کھوج میں آیا تھا۔

اسی لئے اس کے کوٹھے پر چلا گیا تھا کہ پتہ چلا تھا کہ تمہارا وہاں بہت آتا جاتا ہے۔“

دشاد نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”سنا ہے تمہاری استانی نور سے رشتہ داری ہے؟“

دشاد بڑے زور سے چونکا اور ایک دم سیدھا ہو بیٹھا۔

”تم نور کو کس طرح جانتے ہو؟ کہاں ہے وہ؟“

سجاد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ اس بات سے بے خبر ہے کہ نور گاؤں میں پڑھاتی ہے۔

شاید وہ اس سے چھپ کر وہاں پہنچتی تھی۔ وہ قدرے محتاط ہو گیا اور سنبھل سنبھل کر بولا۔

”وہ بہت ابھری بی بی ہے۔ سب اس کی قدر کرتے ہیں کہ اس نے گاؤں کے سکول کو

آباد کیا ہے۔ لیکن۔“

”لیکن کیا؟“ وہ بے تاب سے بولا۔

”یار ذرا تحمل سے سنتا۔ تجھے تو پتہ ہی ہے کہ گاؤں کے چوہدری اور جاگیرداروں کے

وکیلے کیا ہوتے ہیں۔ بس چوہدری اس کے سکول کے چکر لگانے لگا ہے۔ استانی نور کی

ملازمہ اس کی طرف سے بہت گھر مند ہے۔ اس نے مجھے تمہارا پتہ دیا تھا کہ میں جا کر تمہیں

بتاؤں۔ وہ تمہارے خاندان کی عزت ہے اور شاید تمہاری منگھیری بھی ہے۔ تم اس کو سنبھال لو

اچھا ہے۔“

”چوہدری کی ایسی کی بھی۔“ دشاد نے منہ ہی منہ میں کوئی کالی بکی۔

”بہ بڑھیا پچا پچے کتنی ہی پہلے اس کو لے کر غائب ہوئی تھی۔ یہ اس کا ساتھ نہ دیتی تھی۔“

وہاں سے باہر قدم نہیں نکال سکتی تھی اور اب پیغام بھیجتی ہے۔ میں ان دونوں کو سیدھا کر

اؤں گا۔ شام سے پہلے پہلے اسے یہاں نہ لے کر آ جاؤں تو دشاد نام نہیں۔“

”یار ذرا صبر سے۔ حمل سے۔ استانی کا کوئی قصور نہیں ہے۔ وہ تو بڑی شرافت سے

رہتی ہے۔ معاملہ چوہدری نے ہی۔۔۔۔۔“

”میں سمجھتا ہوں قصور کس کا ہے؟ نہ وہ مگر سے قدم باہر نکالتی نہ یوں دوسروں کی

نظروں میں آتی۔ پر تم فکر نہ کرو میں سب سمجھ لوں گا۔ تمہارے واپس پہنچنے سے پہلے پہلے ہی

میں سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک کر لوں گا۔“

اجانک کچھ دور اسے ایک سایہ سا حرکت کرتا نظر آیا۔ پہلے تو اس نے اپنا دھم بکھتے ہوئے اسے نظر انداز کر دیا لیکن پھر اس کا دھیان اس جانب گیا۔ وہ سایہ اب بھی وہاں موجود تھا۔

سجاد کی دم جھڑیوں کی اوت میں ہو گیا اور سانس روک کر اس طرف دیکھنے لگا۔ یہ دیکھ کر وہ لمبے بھر کو کانپ گیا کہ دو سائے سفید کفن میں لپٹے ایک قبر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آیا۔ نہ معلوم یہ کوئی ایسی منظر تھا یا اس کا حقیقت سے بھی کوئی تعلق تھا۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ وہ ساکت سا کھڑا اس طرف کھنگلی باندھے دیکھتا رہا۔

اجانک ان میں سے ایک کفن پوش قبر کی پانچسی کے اندر اتر کر غائب ہو گیا۔ دوسرا بھی جیسے ہوا میں تیرتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے قبر کے اندر چلا گیا۔ خوف اور وحشت سے سجاد کو غنڈے پیٹنے آ گئے۔ وہ اس خوفناک منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا لیکن اسے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں آ رہا تھا۔

وہ دم سادھے چپن کھڑا رہا۔ ایک کفن پوش قبر کے اندر سے نکلا اور اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی پھر اسے سنٹی کی سی آواز سنائی دی۔ سجاد چونکا۔ اس کا دماغ منظر کی ہولناکی نے ماؤف سا کر دیا تھا کیا ایک بیزار ہو گیا۔ خوف اور حیرت کی کیفیت رفتہ رفتہ زائل ہونے لگی اور وہ بڑے غور سے اس طرف دیکھنے لگا۔ قبر میں سے ایک سرا بھرا اور آہستہ آہستہ یوں باہر آیا جیسے بیڑہیاں طے کر رہا ہو۔ اس نے ایک بڑا بکس ایک جانب سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے بکس کو دوسری جانب سے پکڑ ہوئے دوسرا شخص بھی باہر نکل آیا۔ ان کے چلنے کے اعزاز سے معلوم ہوتا تھا کہ بکس کا کافی بھاری ہے۔ ان دونوں نے بکس کو ایک جانب رکھا اور پتھر کی مجلس رکھ کر قبر کو بند کر دیا۔ پھر بکس کو اٹھایا اور بے ترتیب قبروں میں سے راستہ بنا تے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہو گئے۔

سجاد خاموش کھڑا انہیں دیکھتا رہا۔ اس کا یہ وہم تو نکل گیا تھا کہ وہ کوئی بدرجہس یا آیب تھا۔ اس کا خیال چاہا کہ ایک بار قبر کے قریب جا کر دیکھے کہ اس میں کیا ہے۔ لیکن پھر اس نے یہ سوچ کر ارادہ ملتوی کر دیا کہ اگر وہ لوگ کسی کام سے دوبارہ آ گئے تو اس کے حق میں اچھا نہیں ہوگا۔

اس نے قبرستان کے اس گوشے کو نگاہ میں رکھ لیا اور کچھ نشانیوں بھی ذہن نشین کر لیں۔ اگر کوئی کی کنیا کی طرف چل پڑا۔ وہاں بھی ستانے کا راج تھا۔ گو کہ اندر کرے میں سورہا تھا۔ سجاد کوئی آہٹ پیدا کئے بغیر برآمدے میں بیٹھے فرش پر لیٹ رہا۔

وہ گاؤں پہنچا تو رات کا بچھلا پہر تھا۔ آخری تاریخوں کے چاند کی روشنی زرد بہار اور مدھم تھی۔ رات کی سیاہی میں ستارے چھوٹے چھوٹے سنہری دھبوں کی طرح چا بہ جانے ہوئے معلوم ہو جتے تھے۔ قبرستان کی طرف جانے والی پکڑ پکڑی پریاؤں رکھے ہوئے اس کی آنکھوں میں مسمو کا تازہ چہرہ چمک اٹھا۔ اسے اس ساری تک و دو میں دواڑھائی دل نگ گئے تھے۔ مسمو یقیناً روز اس کا انتظار کرتی ہوگی۔ اس کے لئے کھانا پکا کر رکھتی ہوگی اور رات گئے مایوس ہو کر رو پڑتی ہوگی۔ اور اسے کوئی کستی نیند کی آغوش میں چلی جاتی ہوگی۔ اس کے دلجو میں ایک ناقابل فہم دکھ ساریت کر گیا۔ وہ آج بھی خالی ہاتھ ہی تھا۔ شہر جا کر بھی وہ اس کے لئے کوئی تحفہ، کوئی سوغات نہیں لا سکا تھا۔ وہ اپنے سیدھے قدم رکھتا قبرستان میں داخل ہوا۔ اس نے سوچا کہ اس وقت بوڑھے گورہ کو کبے آرام کرنا مناسب نہیں ہوگا وہ چپ چاپ جا کر برآمدے میں ایک طرف چا رہے گا۔ صبح جب اجانک بھیجے ہوئے دیکھے گی تو حیران رہ جائے گی۔ پھر اس سے روتے گی۔ اسے کوئی سی۔ اسے کھری کھری ستانے کی اور پھر آپ ہی آپ من جانے کی اور اس سے پوچھے گی۔ ”چاچا۔ روٹی کھاؤ گے؟“

قبرستان پر ہو کا عالم غاری تھا۔ وہ جھجلی طرف کی ٹوٹی ہوئی دیوار میں سے اندر داخل ہوا۔ صدر دروازے کی طرف سے پتھر کا کرا آتے ہوئے کسی سے سامتا ہو جانے کا خطرہ محسوس تھا۔ سو سکے پتے اس کے قدموں تلے چرمر کی آواز دینے لگے تو اس نے اپنی رفتار کو اور دھما کر دیا۔

رات کی تاریکی میں کھلی ٹی زرد چاندنی نے قبرستان کے پرہول منظر میں خوف و حیرت کو گوندھ دیا تھا۔ چاروں طرف جھجکی ہوئی قبروں کو دیکھ کر دل میں ہول سے اٹھنے لگے۔ سجاد نے اپنی آنکھوں کو دور تک دیکھنے سے روکا اور اپنے راستے پر نظر کرتا ہوا چلے لگا۔

نے یہاں بھرنے پر کیوں ٹوکا ہے۔ شاید وہ بھی اس بارے میں کچھ جانتا تھا لیکن اتنی آسانی سے وہ اسے یقیناً کچھ نہیں بتائے گا۔ اس سے کچھ معلومات حاصل کرنے کے لئے ہوشیاری کی ضرورت تھی۔ اسے باتوں میں لگانے کو وہ آگے بڑھا اور بوڑھے کے ہاتھ سے کدال لپیٹے ہوئے بولا۔

”لا بابا۔ باقی کام میں کر دوں۔ تو تھک گیا ہے اب۔“

بوڑھے نے بے نیازی سے سر جھٹکا اور کدال ہاتھ سے نہیں چھوڑی۔ ”نہیں بچہ۔ ابھی میرے ہڈ گڈوں میں باقی نہیں بچر۔ میری تو عمر زری ہے اسی مٹی سے گل بات کرتے، اس مٹی سے کیلتے۔ اس کے ساتھ رہتے بیٹے۔“

”چھوڑنا بابا۔ تو تھوڑی دیر آرام کر لے۔ باقی قبر میں کھود دیتا ہوں۔“

”رہنے دے بیٹا۔ اب کام ہی کتنا رہ گیا ہے۔“ وہ بے دلی سے بولا۔

”نہیں بابا۔ لاوے نا یہ کدال۔ میں کھود دیتا ہوں۔“ سجاد نے اصرار کیا۔

”تو نے پہلے بھی یہ کام کیا ہے؟“ اس نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”نہیں بابا۔“ سجاد نے نفی میں سر ہلایا۔ ”پوہ کیوں سا مشکل کام ہے۔ زمین ہی تو کھودنی ہے۔“

”زمین ہی تو کھودنی ہے۔“ بابا نے فحش سے اس کی بات دہرائی۔

”یہ مذاق نہیں ہے۔ سمجھا تو۔ کڑی گڑھا نہیں کھودنا۔ قبر کھودنی ہے جو بندے کو پیار سے سنہال لے جیسے ماں کی گود سنہال لیتی ہے۔“

”اچھا۔ اچھا بابا۔ ٹھیک ہے۔ تو ناراض کیوں ہوتا ہے۔ تم بتاتے جانا میں کام کرتا جاؤں گا۔ اچھا ہے یہ ہنر بھی سیکھ لوں۔“ سجاد نے بوڑھے کا موڈ درست کرنے کو جلدی جلدی چند ہنسلے کہے۔

بوڑھا تھکاوٹ سے نڈھال ہو چکا تھا۔ وہ تھوڑی پس و پیش کے بعد رضامند ہو گیا۔ اس نے کدال سجاد کے حوالے کی اور ہانپتا ہوا اچھ مٹی کے ڈھیر پر بیٹھ گیا۔ سورج کی چلتی شاعیں انہیں پسینے میں نہلا رہی تھیں۔ سجاد نے آگے بڑھ کر آدھ کھدی قبر میں جھانکا۔ بوڑھے نے خاص گہرائی تک کھدائی کر لی تھی۔ شاید وہ صبح سے ہی اس کام میں لگا ہوا تھا۔ سجاد بوڑھے سے پوچھ کر کھدائی کس طرف سے کی جائے کی قبر کے اندر اتر گیا۔ زمین کی گہرائی میں اسے ایک نامعلوم سی شخصک کا احساس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی خوف کی ایک تیز

اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھا تھا۔ اس کا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ برآمدے میں بچے فرش پر لیٹے لیٹے اس کے کپڑے مٹی سے بھر گئے تھے۔ کرا کر رختہ بھر گئی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولی کر گرد و پیش دیکھا لیکن دور و نزدیک کوئی نہیں تھا۔ اسے یاد پڑا تھا کہ ایک دو بار جمیو اسے چگانے کو لپکا رہا تھا۔ لیکن اس پر نیند کا اس قدر غلبہ تھا کہ وہ اٹھ نہیں سکا تھا۔ اب تو جمیو کہیں نظر نہیں آتی تھی۔

سجاد نے اٹھ کر کپڑے جھاڑے اور چھینکے میں سے روٹی نکال کر کھائی جو غائب جمیو نے اسی کی خاطر پکائی تھی۔ رات کا سارا واقعہ کسی فلم کے مناظر کی طرح ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا۔ اسے قبر اور اس تک جانے والا راستہ بھی یاد تھا۔ اس نے کچھ دیر جمیو اور بابا کا انتظار کیا لیکن جب وہ کہیں نظر نہیں آئے تو وہ اٹھ کر اس جانب چل پڑا جہاں رات اس نے قبر کھلی ہوئی دیکھی تھی۔

رات کی پراسرار تاریکی کی نسبت دن کی روشنی میں سب چیزیں بہت مختلف نظر آ رہی تھیں۔ وہ راستہ جو اس کے ذہن میں تھا اس جیسے کتنے ہی راستے جا بجا بکھرے پڑے تھے۔ مٹی کی ڈھیریاں سب ایک جیسی تھیں۔ سجاد کچھ چکرا سا گیا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور ایک سرے سے دوسرے سرے تک پکی قبروں کا ایک ایک کر کے جائزہ لینے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس قبر کے پھروں کو قدرے ڈھالا ڈالا ہونا چاہئے تاکہ نیکو انسان کن پوٹوں سے قبر کو نکالنے والی سلوں کو پوٹوں کی ایک دوسرے پر رکھ دیا تھا۔ وہ ایک ایک قبر کو چھو کر دیکھنے میں اس قدر مگن ہوا کہ اسے پتہ نہیں چلا کہ قبر ہی ایک آدھ کھدی قبر کی مٹی کے ڈھیر میں سے بوڑھا گورکن ہاتھ میں کدال پکڑے اس کے قریب آن رکا اور کڑھکی سے بولا۔

”اوتے جواناں! تو یہاں قبروں سے بچ کیا کر رہا ہے؟“

”کچھ نہیں بابا۔“ سجاد نے غلط میں جواب دیا۔

”گورنری میں نہ تو تھا نہ جمیو۔ میرا دل نہیں لگا۔ میں تم دونوں کو ہی دیکھ رہا تھا۔“ گورکن نے قدرے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ سورج کی گرم چمکیلی کرنوں سے اس کا پسینہ میں بیگہ ہوا سانولہ چہرہ جب جب زاویوں میں ڈھل رہا تھا۔ وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ”مٹی قبریں ساری چوڑیوں کی ہیں۔ کوئی باہر کا بندہ یہاں بھرے تو وہ برا مانا جائے۔“

”عزراض کرتے ہیں۔ زمین جو ان کی ہے۔ مالک جو ہیں وہ اس قبرستان کے۔“

سجاد ٹھٹکا۔ اس نے بوڑھے کی بات پر غور کیا۔ اسے شک سا ہوا کہ اسے بوڑھے

لفظ اس پر قیامت بن کر نوٹ رہا ہے۔ اس کے قدموں تلے جیسے زمین و ہفتی جاتی تھی۔ اس پر جان کنی کا سا عالم طاری تھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ رانی کی قبر خود اپنے ہاتھوں سے کھود کر آیا ہے۔ اپنی محبت کا مدفن اس نے آپ تیار کیا ہے۔

اس کے سارے وجود سے جیسے کوئی زندگی کی حرارت، قوت اور سارے دلوں سے کھینچ کر لے گیا تھا۔ وہ ایک کھوکھلے وجود کے ساتھ وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کی کچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ کس طرح ہوا ہے؟ کس نے کیا ہے؟ کس کے ساتھ ہوا ہے؟

”یار! تو کیوں اتنا بدحواس ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے؟“ بوڑھے نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے چونکا لیا۔

”کچھ نہیں بابا! کچھ نہیں۔“ اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹے اور مرے ہوئے

قدموں کے ساتھ گور کن کی لکڑی تک پہنچا۔ اس کے دھوئیں سے سیاہ پڑے ہوئے ننگ سے

کمرے میں چٹائی پر ڈھے گیا۔

.....

وہ گور کن کے نیم تاریک کمرے میں یوں پڑا ہوا جیسے راکھ کا ڈھیر ہو۔ اس کے اندر نہ کوئی آس تھی نہ ختماء نہ آرزو۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر شے ختم ہو گئی ہے۔ سارے جذبے سر گئے ہیں۔ زندگی سے سارے رشتے ٹوٹ گئے ہیں۔ انسانوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ جنازہ لانے والوں کی آوازیں اسے سنائی دیتی رہیں۔ لوگوں کی آوازیں اس کے کانوں میں پڑتی رہیں۔ اس کی کپٹیاں سنسناتا لگیں۔ اس کے دل و دماغ میں جیسے جھکڑے چلنے لگے۔ باہر لوگ رانی کو زمین کی گہرائی میں اتار رہے تھے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ اٹھ کر اس کے جنازے کو کندھا ہی دے دے۔ اس کی قبر پر ایک مٹی مٹی ہی ڈال دے۔ کسی طرح اس کی ایک آخری جھلک ہی دیکھ لے۔ لیکن اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ اسی طرح دونوں ہاتھوں میں سر پکڑے چور چور سا بیٹھا رہا۔ اور لوگ باہر رانی کو مٹی کے حوالے کرتے رہے۔

”چاچا! چاچا!“ بھیمو دوڑتی ہوئی آئی اور دھب سے اس کے پاس چٹائی پر بیٹھ گئی۔

سجاول کو جیسے خبر ہی نہیں ہوئی۔ وہ اسی طرح غم میں ڈوبا ہوا بیٹھا رہا۔

”چاچا! چاچا!“ اسے سوچ نہ پا کر بھیمو نے اس کا بازو ہلایا اور استغیاق سے بولی۔

”چاچا! چاچا!“ باہر جنازہ آیا ہے۔ بوے دونوں بعد۔ آج بابا کو پوچھے ملیں گے تو وہ شہر جا

لہرے اسے کچپکا دیا۔ اس کی چٹائی پر ٹھنڈے پسینے کے قطرے ابھرنے لگے۔ قبر کے اندر ہونے کی دہشت نے اسے گلے گلے خوف میں دھنسا دیا تھا۔ ایک لمحے کے ہزاروں برسے میں اس کے ذہن میں اس کی ساری بد اعمالیاں بجلی کی سی سرعت کے ساتھ دوڑ گئیں۔ اس کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی کدال اسے منوں بھاری محسوس ہونے لگی۔

”شباباش جواناں!“ بوڑھے کی آواز پر وہ چونکا۔ وہ قبر کے منہ پر کھڑا اسے ہدایات دینے لگا کہ اسے کس طرف اور کتنی کدال کرنی ہے۔ سجاول سر جھک کر کام میں مصروف ہو گیا اور اس نے اپنا دھیان کدال کی طرف لگا لیا۔

کام خاصا وقت طلب تھا۔ پھر سجاول کو مشقت کی عادت بھی نہیں رہی تھی۔ جلد ہی اس کا سانس پھول گیا اور وہ تھکاوٹ بھی محسوس کرنے لگا۔ زمین کے اندر ہونے کی وجہ سے اسے کچھ ٹھنڈی سی بھی محسوس ہونے لگی۔ اتنا بھی قیمت تھا کہ کام کچھ زیادہ نہیں تھا۔ بوڑھا آدھے سے زیادہ کام تو پہلے ہی ختم کر چکا تھا۔

”چل۔ آ جا باہر کا۔ بس ہو گیا کام۔“ اسے بوڑھے کی صدا سنائی دی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ قبر پر ایک الوداعی نگاہ ڈال کر اس نے سوچا کہ انسان کا زندگی سے ناٹ ٹوٹ جانے تو بھی دھرتی سے اس کا رشتہ باقی رہتا ہے۔ اسے پناہ میں لینے کے لئے دھرتی اپنی آغوش کھلتے پیار سے کھول دیتی ہے۔ وہ کدال کو ٹکا کر اس کا سہارا لیتا ہوا ایک کر قبر سے باہر آ گیا۔ اس کے ہاتھ۔ پیرو اور کپڑے سب مٹی مٹی ہو رہے تھے۔

بوڑھے نے جگ کر قبر میں جھانک کر دیکھا تو جیسے اپنے آپ سے بڑا۔

”چلو کام ختم۔ بیڑا پار۔ اب قبر جانے اور اس کا مہمان۔ ہم نے تو اپنا فرض ادا کر دیا۔“

”بابا۔ کون مر گیا ہے۔ یہ کس کی قبر بنائی ہے۔“ سجاول نے پوچھا۔

بوڑھے نے ایک آہی بھری اور افسردگی سے بولا۔ ”یہاں ایک جھلی تھی نا۔ سارا دن

اپنے بچے کی قبر پر روٹی دیتی تھی۔ وہ مر گئی ہے۔ بچے کے جیسے پیاری پائل ہو گئی تھی۔“

”کون؟ کون؟“ وہ لڑکی رانی؟“ سجاول نے بے بسی سے پوچھا۔

”ہاں..... وہی رانی۔ کیا اونچی لمبی سوئی کڑی تھی پر نصیب سو بے نہیں لائی تھی۔ غلوں

نے اسے کھالیا۔“

بوڑھا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا لیکن سجاول کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ایک ایک

وہ اس کا دل رکھنے کو اس کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے اس کی آنکھ کھول کر دیکھی۔ اپنے دو بچے کو اپنی سانس سے گرم کر کے بادی بادی اس کی دلوں آنکھوں پر رکھا اور اس سے پوچھنے لگی۔

”کیوں چاہا۔ کچھ آرام آیا؟“

سجاول کے رستے زخموں پر جیسے کسی نے ایک پھاہا سا رکھ دیا۔ اس نے پیار سے اس کے پھولے پھولے گال چھتے پتے۔

”ہاں چھہو۔ اب میری آنکھیں بالکل ٹھیک ہیں۔“

”شکر ہے۔“ جھممو نے جلدی سے کہا۔ پھر اسے معا کچھ یاد آیا اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر بڑی بوڑھیوں کی طرح بولی۔

”ہا..... ہائے۔ جو لمبے پر ہانڈی چڑھی ہوئی ہے کہیں جل ہی نہ جائے۔“ وہ دوڑ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

سجاد بھر اپنے ساتھ کرے میں تھا رہ گیا۔ غلوں، پشیمانوں اور پچھتاؤں میں گھرا ہوا۔ اکیلا۔ سرکنڈوں سے بھری ہوئی چھت جیسے اس کے سر پر آ رہی تھی۔ دھوئیں سے سیاہ پڑی ہوئی دیوار پر ہر لمحے اس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ گہری شام۔ رات کی طرح سیاہ اور افسردہ ہو گئی تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ اندر ہی قبر میں تھا۔ اسے جبر جبری سی آگئی۔ اسے رانی کا خیال آیا جو بھری جوانی میں دکھ سہ سہ کر قبر میں اتر گئی تھی۔ اور وہ زندگی سے کوئی نصیحتی نفرتی جھین کر بھی اس کی جمولی میں نہیں ڈال سکا تھا۔ اس نے اپنی کوشش کر کے سکھ کے جو ان اس کے آگے میں اتارنا چاہتے تھے۔ وہ تو ابھی انہیں تراش بھی نہیں سکا تھا۔ وہ اس کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکا تھا۔ سوائے اپنے اناڑی ہاتھوں سے اس کی قبر کھودنے کے اس سے کچھ بھی نہیں بن پایا تھا۔

وہ غیر ارادی طور پر اٹھا اور بے ترتیب قدموں کے ساتھ کھڑکی سے باہر نکلا۔ مگر یہ
انتانات میں بدل چکی تھی۔ جنازے کے ساتھ آئے والے لوگ تدفین کے بعد واپس جا چکے
تھے۔ قبرستان کے سائے میں اداسی کے رنگ کھلے پے تھے۔ خاموشی موت کی طرح پریوں
کو فلکیں کر دینے والی تھی۔ وہ قبروں میں سے راستہ بناتا خود میں کھوپا اندریضی اندر آنسو بہاتا
تو قبر کی طرف چلا جو اس نے اپنے ہاتھوں سے کھودی تھی۔ جو اس کی تمام آرزوؤں اور
کلام حسن کو کافن تھی کہ اسے زور پر غموں کی۔ وہ بے خیالی میں سنبھل نہیں سکا۔ ایک قبر کے

کر میرے لئے بہت ساری چیزیں لائے گا۔ چوڑیاں، پرامہ، لال جتی۔“

جہاں نے سر اٹھا کر افسردگی سے اس کے معصوم چہرے پر چٹکتی ہوئی خوشی کو دیکھا اور سوچا کہ وہ فحشی معصوم لڑکی کس طرح سمجھانے کہ اس کی زنجی بھری متاعِ لٹ گئی ہے۔ اس کا کچھ بولنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ یونہی گم سم بیٹھا رہا۔ اس نے نہ بولوں کی۔ نہ ہاں۔ یونہی بے سمت نہ جانے کہاں دیکھا رہا۔

اس کی لا تعلقی نے مجھ کو کونا راض کر دیا۔ وہ برا ماننے ہوئے بولی۔

”چاچا! تو تو میری بات ہی نہیں سنتا۔“

”سن رہا ہوں بھئی۔ سن رہا ہوں۔“ سجاد دل نے بے دلی سے اکھڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

مجموعہ نے اپنا سانو لا چہرہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ چند لمحہ حیرانی سے بکٹی رہی پھر اس نے اپنا لٹام ہاتھ اس کے رخسار سے لگایا۔ کچھ دیکھا اور ہجرت سے بولی۔

”ہا..... ہائے چا چا..... تو رو رہا ہے۔“

سجادوں چونک گیا۔ اس نے غیر ارادی طور پر اپنی آنکھوں اور رخساروں کو ہمتی کی پشت سے رگڑا۔ اسے حیرت ہوئی کہ اس کے رخسار کیسے تھے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جمہور نے بڑے لگاؤ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور معصومیت سے کہنے لگی۔

”چاچا..... کیا بات ہے؟ مٹانا چاہا! تو کیوں رو رہا ہے۔ تو اتنا بڑا ہو کر روتا ہے۔“

سجاد کو اس کے معصوم انداز میں چپے ہوئے لگاؤ نے ایک چوٹی لگائی۔ اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر رو پڑے۔ پریشانی سے اس نے اپنے بال نوچے اور اپنے برابر کھڑی ہوئی۔ جمجمہ کی طرف دیکھا جو قہر مند سی سے اپنا معصوم چہرہ اٹھائے اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے یا کر وہ محبت سے بولی۔

”بس چاچا! اب نہ روتا۔“

مگیا۔ اس نے ملائمت سے اس کے بالوں کو سہلایا۔

”نہیں جمعو۔ میں رو نہیں رہا۔ میری آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ اسی لئے پانی نکل رہا ہے۔“

”لا جا جا۔ میں دیکھوں۔“ تمہیوں نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

تعبیر کا سہارا لیکر وہ بمشکل منہ کے بل گرنے سے بچا۔ ٹھوکر سے اس کے انگوٹھے کا ناخن اکھڑ سا گیا۔ درد کی شدہ یہ نہیں نے اسے بے چہن کر دیا۔ اس نے پاؤں اٹھا کر اوپر رکھا اور درد کی نہیں کو کم کرنے کے لئے اسے دایا۔ چاک اس کی نظر قبر کے تعبیر پر پڑی جو اس کا دھکا کھٹنے سے نیرھا سا ہو گیا تھا۔ سجاد نے کچھ ٹھہرا کر اسے سیدھا کرنے کی کوشش کی تو یوں معلوم ہوا جیسے وہ اپنی جگہ سے اکھڑا گیا ہے۔ سجاد نے فوراً سے دیکھا تو اسے عموں ہوا جیسے وہ پتھر کی سلوں کے درمیان بغیر مصالے کے پھنسا دیا گیا تھا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ مٹا اسے کھلی ہوئی قبر اور کھن پوش پر اسرار سائے یاد آئے۔ تو رات کا سارا منظر اس کی نگاہوں میں گھوم گیا۔

اس نے ذرا سا زور لگا کر دیکھا تو اسے اندازہ ہوا کہ کئی قبر میں سنگ مرمر کی سلیں ایک دوسرے کے ساتھ یوں ہی اٹکا کر رکھی گئی تھیں۔ وہ ٹھٹک گیا۔ یہ قربیتنا وہی تھی جس میں سے ان پر اسرار سایوں نے بکس نکالا تھا۔ بھرے کو اسے جبر جبری سی آگئی لیکن تجسس نے اسے ہمیز دی۔ اس نے اصرار اور دیکھ کر ایک سل کو ہلانے کی کوشش کی۔ اسے کافی زور لگانا پڑا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور ایک سل کو کھکھ میں کا سیاب ہو گیا۔ قبر کے اندر کا غلام نظر آنے لگا۔ لیکن تار کئی نگاہ کے راستے میں حائل تھی۔ اس نے دوسری سل کو دھکیلنے کے لئے زور لگایا ہی تھا کہ اسے اپنے عقب میں قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خطرے کی بوسوگھ کر یکدم پیچھے ہٹا۔

اسے حیرت ہوئی۔ بوڑھا گو کہ اپنی کدال سر سے بلند اٹھا نے اس پر وار کرنے ہی والا تھا کہ اس کے اچانک پلٹ جانے سے اس کے ہاتھ اوپر کے اوپر اٹھے رہ گئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں وحشت اور غصہ تھا۔

”اوئے ظالما.....“ وہ دانت پیس کر منہ میں کچھ بوڑھایا۔ اس نے یوں ٹھٹھے سے کدال زمین پر پھینک دی جیسے اپنی ناگاہی پر اسے بہت صدمہ ہوا ہو۔ سجاد نے زمین پر پڑی ہوئی کدال کو دیکھا۔ بوڑھے کے تہود دیکھے اور سوچا کہ اگر وہ ایک لمبے کی تاخیر بھی کرتا تو پوری قوت سے اٹھی ہوئی کدال اس کے جسم پر کوئی نہ کوئی زخم چھوڑ چکی ہوتی۔

سجاد نے حیرت سے پھر بوڑھے کے غصے کو دیکھا۔ اسے یقین نہ آیا کہ بوڑھا کبھی کسی ایسی ویسی سرگرمی میں ملوث ہو سکتا ہے۔ بوڑھا بھی شمشکین نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔ ”اوئے جوانان۔ کیوں مرے ہوؤں کی مٹی پلید کرتا ہے۔ کچھ خدا کا خوف کہ قبروں کی بے حرمتی نہیں کرتے۔ اس پتھر کو اٹھا کر واپس رکھ دے جہاں سے اٹھایا ہے۔“

سجاد نے پھر غور سے بوڑھے کی طرف دیکھا کہ وہ کس اعجاز میں یہ بات کر رہا ہے۔ کیا وہ اس تمام واقعے سے بے خبر ہے یا اس میں شریک ہے لیکن وہ کوئی اعجاز نہیں لگا۔ کابج تک بوڑھا پھر اسے ملامت کرنے لگا۔

”اوپار!..... تجھے اپنی موت یاد نہیں جو دوسروں کی قبروں کی بے حرمتی کرتا پھر رہا ہے۔ مسلمان کی قبر کو کھلنے کا حکم نہیں۔ اللہ سے ڈر۔ اٹھا..... رکھ اس پتھر کو واپس میرے سامنے۔ جلدی کر جلدی!“

سجاد بوڑھے کے قریب ہوا اور راز داری سے بولا۔

”بابا میری ایک بات تو سن لے۔ میں تجھے ابھی بتاتا ہوں کہ میں نے یہاں کیا دیکھا ہے۔“

”نہیں نہیں۔ باتوں میں عام ضائع مت کر۔ تو قبر بند کر جلدی۔ بات پھر کر لینا۔“

بوڑھے نے دھائی دی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کی جان پر پنی ہوئی ہے۔ اس کا چہرہ اترا گیا تھا اور وہ گھبرایا ہوا تھا۔

سجاد نے جلدی سے کہا۔ ”بابا میں نے رات دو تین بندوں کو قبر میں اترتے دیکھا ہے۔ انہوں نے یہاں سے کوئی کس نکالا ہے۔ تجھے کیا پتہ بابا آج کل کیا کچھ نہیں ہوتا۔ تو تو اندر اپنی کو غمزی میں ہوتا ہے اور لوگ، یہاں نہ جانے کیا کچھ کرتے پھرتے ہیں۔ میں بھی چاہتا ہوں.....“

”بس کر یا راس کر۔ بڑی ہو گئی۔“ بوڑھے نے جھنجھلا کر اس کی بات کاٹ دی۔

”تجھے میں نے کہا جو ہے کہ قبر بند کر دے۔ تو سننا کوئی نہیں۔“

سجاد کو اچھا ہوا کہ اس کی بات سن کر بوڑھا گو کہ ناکل حیران نہیں ہوا بلکہ کچھ اندر گھبرا گیا۔ یوں معلوم ہوا تھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ جتنی جلد ممکن ہو قبر بند کر دی جائے۔ سجاد نے قدر سے ہنسی دے کہا۔

”کیوں بابا! تو کیوں چاہتا ہے کہ میں یہ قبر نہ کھولوں۔ مجھے پتہ تو کرنے دے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے میں اسے اپنی ذمہ داری پر کھولوں گا۔ حرام نہیں آئے گا۔“

”ادو۔ پارا تو باز کیوں نہیں آتا۔ مجھ غریب پر ترس کھا دو۔ جا۔ اپنا راستہ لے۔ چل یہاں سے۔ کیوں اپنی اور ہماری جان کا ڈنٹن ہو رہا ہے۔“

بوڑھے کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ سجاد نے اصرار نہیں کیا اور بغیر کچھ کہے

چتر کی سل اٹھا کر قبر کو بند کر دیا۔ تعویذ کو سیدھا کر کے چھایا اور ہاتھ جھڑتا ہوا بوڑھے کے قریب آکر بولا۔

”بابا مجھے لگتا ہے کہ کوئی بات ہے جو تیرے اندر خوف بن کر بیٹھی ہوئی ہے۔ جو تجھے اندری اندر کھاتی رہتی ہے۔ آخر کیا بات ہے؟ جس نے تجھے اتنا پریشان کر دیا ہے۔ کہیں ان لوگوں نے تجھے کوئی دھمکی تو نہیں دی۔“

”چل اداؤں پار! خواہو ادا نہ ہوا۔ تو کن پکڑوں میں پڑ گیا ہے۔ بس اپنے کام سے کام رکھ تو یہ تیرے حق میں اچھا ہے۔“

اس نے کدال اٹھائی اور چل پڑا۔ سجاد بھی تیز قدم اٹھاتا ہوا اس کے برابر آ گیا اور اس کے ہاتھ سے کدال لیتے ہوئے بولا۔

”بابا! کچھ تو بتا۔ میں بھی حیرے بیٹوں جیسا ہوں۔ تجھے اپنے باپ کی جگہ سمجھتا ہوں۔ تجھے کیا دکھ ہے۔ کیا پریشانی ہے۔ کچھ بتا تو سہی۔“

بوڑھے نے سر جھٹک کر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے جنہیں اس نے معمولی کی پشت سے بار بار صاف کیا لیکن وہ اس کے رخساروں پر بہہ بہہ کر اس کی سفید داڑھی میں جذب ہوتے چلے گئے۔

سجاد کو بوڑھے کی کسمپرسی پر ترس آیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے بوڑھے کے اندر چلنے والا دکھ اس کی آنکھوں کے رستے آنسو بن کر بہہ رہا ہے۔ سجاد کا دل احساسِ ہمدردی اور جذبہِ رحم سے بھر گیا۔ وہ اس کی تسلی کے لئے کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس نے بولے سے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور اسے کئی بار نرمی سے چھیڑا۔

بوڑھا خاموشی کے ساتھ ڈولے ہوئے قدموں سے اپنی کنیا کے قریب پہنچ گیا۔ برآمدے میں بیٹھی ہوئی عیسو کو دیکھ کر بوڑھے نے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کر لیں عیسو لپک کر ابھی اور بوڑھے کے قریب آکر چمکی۔

”بابا۔ پچھلے گئے؟“

اگتائے ہوئے دنگی بوڑھے نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور اس کے سر پر ہلکی سی جھپکی لگا کر آگے بڑھ گیا۔ عیسو نے سجاد کا ہاتھ پکڑ لیا اور منہ بسور کر بولی۔

”چاہا! بابا! یوں کیوں نہیں؟“

”سجاد! نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ چھیڑا۔“

”وہ تھا کہ ہوا ہے! سارا دن تو سخت کرتا ہے تو بس جلدی سے روٹی پکا دے۔ بابا کو بھوک لگی ہے۔“

”اچھا چاہا! اس نے فرماں برداری سے کہا اور دوڑ کر پھر چولہے کے پاس جا بیٹھی اور اپنے ننھے سنے ہاتھوں سے سارے کاج ستوار نے مگی۔

”سجاد! اندر کمرے میں چلا آیا جہاں بابا چٹائی پر یوں بیٹھا تھا جیسے اپنا سب کچھ لٹا بیٹھا ہو۔ اسے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر اس نے سر اٹھایا۔

”آ جا پتر۔“ اس نے یوں کہا جیسے اسی کے انتظار میں ہو۔

سجاد اس کے برابر ہی چٹائی پر چپ چاپ بیٹھ گیا اور سعادت مندی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ بوڑھے نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی بوڑھی آنکھوں کے گوشوں پر آنسو نکلے ہوئے تھے۔

”پترو نے مجھ سے پوچھا تھا نہ کہ عیسو کی ماں کدھر ہے۔“

سجاد نے پوری طرح سے متوجہ ہو کر ہنکارا بھرا۔

”ہاں بابا۔“

بوڑھے نے سانس سے سر ہلایا اور ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولا۔

”اس لمائی کو وہ ظالم لے گئے ہیں اپنے ساتھ۔ زور زور دیتی ہے۔“

”کون؟“ اس نے پوچھا۔

بوڑھے نے اپنے سیکے صاف سے اپنی افسردہ آنکھیں پونچھیں۔

”وہی کہیں جنہوں نے قبر میں اڑا بتایا ہوا ہے۔ ان بدعاشوں نے تو قبروں کو بھی نہیں چھوڑا۔ موت بھول گئی ہے انہیں اپنی۔ قبریں تو ان کے لئے نخل ہو گئی ہیں۔“

”پر وہ عیسو کی ماں کو کیوں لے گئے؟“

”کیا بتاؤں پتر۔“ اس نے آہی بھری۔ ”بس نصیبوں کے پتھر ہیں۔ ہم غریبوں کی قسمت میں غم کو ریں ہی لکھی ہیں۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے قبر کھدائی تھی۔ میں شام تک انکار کرتا رہا پر وہ جنازہ لے کر نہیں آئے۔ میں نے کہا شاید وہ جنازہ دو گاہ شریف لے گئے ہیں۔ صبح جو میں قبروں کو پانی دیتا ٹھیک ٹھاک اس طرف آیا ہوں تو کیا دیکھا ہوں مکمل قبر بند ہو گئی ہے۔ اوپر پکا چوڑا بن گیا ہے۔ تعویذ لگا ہوا ہے۔ میری تو زندگی یہاں گزری ہے۔ میں

اس کے چپے چپے کو جانتا ہوں۔ ایک چتر بھی ادھر سے ادھر ہو جائے تو مجھے پتہ چل جاتا ہے۔

میں نے قبر کو دیکھنے کی کوشش کی کہ یہ معاملہ کیا ہے کہ ان کا بندہ بچھ گیا۔
وہ لیفٹ چپ ہو گیا جیسے گچے میں پھنسا سا اڑا ہوا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ایک بار پھر ٹپک پڑے۔ سچاؤ کو اس پر بے حد ترس آیا۔ وہ بوڑھا اور ناتوان شخص حالات کی غشیوں اور زمانے کی ستم راندوں کے مقابلے میں بہت کمزور تھا۔ سچاؤ نے اس کی تسلی کیلئے ہمدردی کے کچھ لفظ کہے تو وہ آنسو پونچھنے لگا اور دھمکے ہوئے لہجے میں بولا۔

”خدا انہیں عارت کرے۔ وہ میرا منہ بند رکھنے کو مجھ کو کیا ماں کو اپنے ساتھ لے گئے زبردستی۔ انہوں نے میری ایک بیٹی نہیں۔ نہ اس غرضی کی فریاد پر کان دھرا۔ میری محسوس دہمی جی کو اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ تو ابھی مجھ کو باپ کا غم نہیں بھولی تھی کہ ان ظالموں نے۔“
وہ ایک بار پھر روڑا اڑا اور بچپن کے درمیان جیسے اپنے آپ سے بولا۔

”پتہ نہیں دوں گا کہ بھاری کہاں ہے۔ کس حال میں ہے۔ کیا بیت رہی ہے اس پر۔“
سچاؤ تڑپ اٹھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہ ذمہ تمنا اس کے سینے پر بھی نہیں ہر دوسرا شخص ایک ایسا ہی گھاؤ اپنی چھاتی پر لے لیا بیٹا ہے۔ بوڑھے کے دکھ کا دار اس کے اپنے وجود پر بھی پوری شدت سے پڑا تھا۔ اس کے سینے کا ناسور بھی رسنے لگا تھا۔ اسے مجھ کو کیا ماں کے روپ میں بھاگ بھری نظر آنے لگی۔ بوڑھے کی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسو اسے اپنے باپ کی روٹی ہوئی آنکھوں کا منظر دکھانے لگے۔

بوڑھا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ ”میں تو مردوں میں مردہ ہو گیا ہوں۔ پتہ نہیں کہ بھاری کس حال میں ہے۔ مجھے مجھ کو فکر نہ ہوتی تو میں کب کا پولیس میں بیان داخل کر دیتا۔ میرا کیا ہے۔ مجھے اور جی کر کیا کرتا ہے۔ میرا تو دنیا سے دل ہی بھر گیا ہے۔ پر مجھ کو کیا بچا رہی پتہ نہیں کہاں ہے؟“

سچاؤ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔
”بابا تو حوصلہ رکھ۔ اللہ بڑا کارساز ہے۔ وہ تیری ضرورت سے گا۔ تیرے دکھ کے دل کا ضرور کشیں گے۔“

بوڑھے سے سراٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا اور گھبراہٹ سے لہجے میں بولا۔
”اللہ ہی اللہ۔ بس اللہ ہی اللہ۔“



سچاؤ کی آنکھ مکی تو بوڑھے کی کوٹھڑی سیاہ اندیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ مکمل تاریکی

والی لائٹیں کبھی کی بچھ چکی تھی۔ تاریکی کی سیاہ دھیر تہہ نے سب کچھ نگہ بوں سے اوجھل کر دیا تھا، بوڑھا گورکن تھا جو سو رہا تھا۔ اس کے خزانوں کی آواز وقفے وقفے سے سنائی دیتی تھی۔ سچاؤ نے اپنی قمیض کا کف ہٹا کر گھڑی دیکھی۔ اندھیرے میں چمکتی ہوئی سویچوں نے بتایا کہ رات آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے۔ بوڑھا خوب گہری نیند سو رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ کچھ بڑبڑانے بھی لگتا تھا۔ سچاؤ رات کے ابتدائی پہر میں اس نے بھی سو گیا تھا کہ بوڑھے کو اطمینان ہو جائے کہ وہ بے خبر سو رہا ہے۔

وہ ہاتھ کا کتیرہ بنا کر چپٹ لیٹا۔ بہت دیر تک سوچتا رہا۔ بوڑھے کی پریشانیوں نے اسے اپنے غم بھلا دینے تھے۔ اس کے سینے پر بھی دیے ہی ذمہ تھے جن سے بوڑھے کا سینہ داغ داغ تھا۔ وہ بوڑھے کی پریشانیوں اور غموں کو بہت قریب سے محسوس کر رہا تھا۔ وہ ہر صورت اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اور دل ہی دل میں کہتا ہی منصوبہ بناتا اور توڑتا چلا جا رہا تھا۔ وہ جرائم پیشہ لوگ تھے اور انہیں یقیناً چوہدری کی پشت پناہی حاصل تھی ورنہ وہ اتنی دیدہ دلیری سے بوڑھے کی بیٹی کو ریغمال نہ بنا لیتے۔ ان پر ہاتھ ڈالنے کے لئے بڑی احتیاط اور ہوشیاری کی ضرورت تھی۔

سوچ سوچ کر اس کا ذہن ماؤف سا ہو گیا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا۔ بالآخر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے نونل ٹوٹی کر اپنے جوتے تلاش کئے اور بیٹھ کر آواز پیدا کئے۔ بے پاؤں بوڑھے کے برابر سے گزر کر باہر آ گیا۔ جوتے اس نے باہر آ کر پہنے اور قبرستان پر ایک نگاہ ڈالی۔ اسے خیال آیا کہ مٹی کی ان ڈھیر یوں سے کہیں رانی بھی سوری ہے۔ اس کے ان میں ایک ٹیس سی اٹھی۔ اس نے بھی سوچا بھی نہیں تھا کہ پھولوں ایسی رانی یوں خاک میں مل جائے گی۔ اس کے اندر ایک جولا بھی کرکٹیں لینے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ اس چوہدری کی دن دبوچ لے جس نے رانی کو بھری جوانی میں قبر میں اتار دیا تھا۔ جس نے زندگی بھر اسے اہلوں کی سولی پر چڑھانے رکھا تھا۔

اس نے سر جھک کر دل میں کچھ غانا اور ہونٹ چپاتا ہوا قبرستان میں گھس گیا۔ وہ دل تو لے کر قدم رکھتا اس قبر کی طرف بڑھ گیا جو پر اسرار سرکمیوں کا مرکز تھی۔ اسے دور سے مللی گھس پھسرا اور سلوں سے ٹکرانے اور گڑگڑانے کی آواز سنائی دی۔ وہ جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو کر آہستہ آہستہ بنا آہٹ کے آواز کی سمت بڑھنے لگا۔ کچھ فاصلے طے کر کے اس نے کھنی نما یوں میں سے نگاہ کا رستہ تلاش کیا اور قبر کی سمت دیکھا۔

ہوش آگیا تھا۔ سجاد کو کھلا کر بڑکا اور اس نے ایک بار میں ہی اپنا گھاس اس سے چھڑا کر پے در پے کی گھونٹے اندھا دھند چلا دیے۔ اس کے حلق سے عجیب سی آوازیں نکلیں اور اس نے سر ہٹا کر سجاد کے سینے پر اتنے زور سے ٹکرا دیا کہ وہ چکر اٹھ گیا۔ اس شخص نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا اور اس سے لپٹ گیا۔ قبر کے گڑھے میں دونوں بری طرح جھمٹ کھٹا ہو گئے۔ خشک بھر پوری مٹی ان کے ناک اور منہ میں گھسنے لگی۔

بظاہر وہ معمولی جسامت کا آدمی تھا لیکن خاصا مضبوط تھا۔ اپنی جان بچانے کے لئے وہ جان لڑا دینے پر تیار تھا۔ سجاد کو اس پر قابو پانے میں مشکل ہو رہی تھی۔ کتنی ہی دیر دونوں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی جان توڑ کوشش کرتے رہے لیکن سجاد بالآخر اس کی گردن دوپٹے میں کھسک گیا۔ اس نے بہتری جھد کی مگر سجاد نے اپنی گرفت ڈھیلی نہیں ہونے دی اس کی مزاحمت میں کمزوری آگئی تو سجاد نے ایک زوردار گھونٹا اس کی کینچی پر رسید کیا۔ اس نے تڑپ کر خود کو اس کی گرفت سے چھڑا تو لیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہیں ڈھیر ہو گیا۔

سجاد کی سانس بحال ہوئی تو اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ ان کی اس تکلیف سے قبر کا گڑھا کافی بڑا اور گہرا ہو گیا تھا۔ بھر پوری مٹی اندر ہی اندر جھنکی چلی گئی تھی نہ جانے اس ہاتھ پائی میں کتنا دقت صرف ہو گیا تھا۔ سجاد کو اس کا کچھ اندازہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھی یقیناً اسے تلاش کر رہے ہوں گے۔ یہ سوچ کر اس نے شانے سے اپنا پٹا اتارا اور اس کے ہاتھ اور پاؤں تختی سے باندھ دیے۔ جب میں پڑا ہوا دریاں اس کا منہ بند کرنے کے کام آیا۔ قبر میں اتنی عجائبات پیدا ہو چکی تھیں کہ وہ آرام سے وہاں پڑا رہ سکتا تھا۔

اسے وہیں چھوڑ کر سجاد نے اپنے پڑے جھارے اور بمشکل قبر سے باہر نکلا۔ چاند کی مدھم روشنی میں باہر دریائی اور سانے کا راج تھا۔ وہ آہستہ آہستہ جھاڑیوں کی اوٹ میں بچتا چھپاتا قبر کی طرف بڑھا۔ قبر کھلی ہوئی تھی۔ شاید وہ لوگ ابھی تک اندر ہی تھے۔ سجاد نے احتیاط سے خود کو جھاڑیوں میں چھپا لیا اور قبر کی گھرائی کرنے لگا۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ تھوڑی ہی دیر میں ان میں سے ایک کا سر باہر آیا۔ ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اس کی دہلی دیہی آواز سنائی دی۔

”دونے..... او دوئے۔“

لیکن دوتا وہاں ہوتا تو کوئی جواب دیتا۔ سجاد دلچسپی سے اس کی گھبراہٹ کو دیکھ رہا

تین گھنٹوں پر ہی قبر پر سے طعنے بھرا رہے تھے۔ وہ دم سادھے ان کی طرف دیکھتا رہا۔ ان میں سے پہلے ایک قبر کے اندر اترا۔ دوسرے دونوں باہر کھڑے رہے۔ پھر اس کا سر قبر میں سے باہر نکلا اس نے غالباً ان دونوں سے کچھ کہا یا کوئی اشارہ کیا اور دوسرا نکھن پش بھی اس کے پیچھے پیچھے قبر میں اترا۔ باہر کھڑا ہوا شخص چاروں طرف اس طرح دیکھنے لگا جیسے اعزاء لگا رہا ہو کہ اگر کوئی خطرہ تو نہیں۔

اچانک ایک خیال سجاد کے دل میں آیا۔ اس نے ایک پلی بھی نہیں سوچا اور بجلی کی سی تیزی سے اس پر عمل کر گزرا۔ اس نے پیچھے کی سی بھرتی سے لپک کر اس شخص کو قہقہے سے دبوچ لیا۔ وہ اس اچانک افتاد سے بری طرح گھبرا گیا۔ اس کے بدن پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ قبرستان کی فضا کے اثر سے شاید وہ یہ سمجھا تھا کہ وہ کسی آسیب یا بدروح کی گرفت میں آگیا ہے۔ اس کے حلق سے کچھ عجیب و غریب آوازیں نکلیں اور اس نے خود کو پھرانے کیلئے مزاحمت کی۔ سجاد اس کے لئے پہلے سے تیار تھا۔ اس نے ایک زوردار ہاتھ اس کی گدی پر رسید کیا۔ ننانوے بیٹھا تھا۔ کوئی آواز نہ گئی۔ بغیر وہ اس کی گرفت میں ڈھلا پڑ گیا۔ سجاد نے جلدی جلدی اسے ایک وزنی پوری کی طرح پش پڑا اور قریب ہی مٹی جھاڑیوں میں گھس گیا۔ وہاں رک کر اس نے اپنا سانس بحال کیا۔ اسے پش پڑا اور جھاڑیوں کی اوٹ لیتا وہ بابا کی کوفٹری کی طرف چل پڑا۔

اسے اٹھا کر چلنے میں سجاد کو کوئی زیادہ دقت نہیں ہوئی۔ وہ چھوٹے قد کا ایک مختصر انسان تھا اور بے ہوش ہو چکا تھا۔ اچانک ایک قبر کو چھلانگتے ہوئے سجاد کا پاؤں پھسلنا لکڑی کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی اور وہ پش پڑا دے ہوئے بوجھ کے ساتھ ٹوٹی ہوئی قبر میں جا پڑا۔ یہ سب کچھ لمحے بھر میں اس طرح ہو گیا کہ اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ بھر پوری مٹی۔ ٹنگر اور ٹوٹی ہوئی کوئیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ٹکڑے کچھ دیر اس پر مسلسل گرتے رہے۔ بھر پوری مٹی میں گرنے کی وجہ سے اسے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن اس شخص کا بوجھ اسے اٹھ نہیں دے رہا تھا۔ مٹی بھر پوری ہونے کی وجہ سے مسلسل کھسک رہی تھی۔ وہ کبھی سے سہارے بمشکل اٹھا اور اس نے غور سے ارد گرد دیکھا۔ وہ قبر میں خاصی گہرائی تک گرے ہوئے تھے۔ ایک لمحے کو سجاد کے وجود پر خوف کا لرزا دینے والا سایہ پڑا۔ اپنی قبر کی تاریکی کے خیال نے اس کے روئے کھڑے کر دیئے۔

اسی وقت اس شخص نے یکدم اچانک کر اس کا گھا دبوچ لیا۔ نہ جانے اسے کس وقت

کسی اور کو لے کر نہ آ جائیں سجاد مل پھر اپنی کینن گاہ سے نکلا اور اس قبر پر جا پہنچا جہاں اس نے اس آدمی کو ہاتھ کر رکھا تھا۔ اس نے اوپر کھڑے کھڑے جبکہ قبر میں جھانکا۔ چاند کی مہم رشتی قبر کی تاریکی کو زائل نہیں کر پائی تھی لیکن غور کرنے پر وہ اس شخص کی سفید کفن نما چادر کو ایک دھبے کی مانند دیکھ سکا تھا۔ وہ احتیاط سے قبر کے گڑے میں اترا۔ وہ شخص نیم بے ہوش سا پڑا ہوا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے خود کو پھرانے کی غاصی جدوجہد کی ہے۔ اس کے بندھے ہوئے پاؤں کی پکھڑیں گہریں کھلی ہوئی تھیں۔ اس کو کش میں شاید وہ تھک گیا تھا یا قبر کی دہشت نے اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ وہ بے سادہ ہوا پڑا تھا۔

سجاد نے اسے ہوشیار کیا تو وہ ڈر سا گیا۔ تاریکی میں اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ سجاد نے پاؤں کی ٹھوک سے اسے اٹھنے کا اشارہ دیا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے کئی کی دیوار سے پشت لگا لی۔ اس نے یوں بار بار سر جھکا جیسے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہو۔

سجاد نے اس کے منہ پر بندھا ہوا مال کھول دیا اور چاقو اس کی کپٹی پر رکھ کر درستی سے بولا۔

”غیب فیک بتاؤ تم کس کے بندے ہو۔ تم نے قبر میں کیا اڈا بنا رکھا ہے۔ سچ بولنا اور نہ ہی قبر کو تیری قبر بتاؤں گا۔“

وہ شخص ذرا بھی مرعوب نہیں ہوا۔ اس نے بڑی بے نیازی سے منہ کھول کر اپنی زبان کی طرف یوں اشارہ کیا جیسے بولنے سے معذوری ظاہر کر رہا ہو۔

سجاد نے چاقو کی ٹوک سے اسے کچھ کا سادیا۔

”یہ اداکاری کسی اور کے سامنے کرنا۔ سیدھی طرح بتاؤ تم کس کے بندے ہو۔“

اس کے منہ سے عجیب سی آوازیں نکلیں۔ اس نے اپنا منہ کھول کر کچھ اشارے کے اور کچھوں کی طرح بہیم آوازیں نکال کر جیسے اسے کچھ سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

سجاد نے غور سے اس کی طرف دیکھا لیکن نیم تاریکی میں کچھ دیکھنا محال تھا۔ اس نے اپنی جب سے ہاتھ نکالی اس کی تلخی جلائی جس کے دروغوی شعلے نے اس شخص کے لباساں چرے کو تاریکی میں ایک ڈراؤنی تصویر کی طرح نمایاں کر دیا۔ اسے اپنی طرف دیکھتے

”یہ پا کر اس نے پھر اپنا منہ کھولا۔

سجاد نے دیکھا کہ اس کی زبان کئی ہوئی تھی۔ وہ بے طرح جھنجھلیا۔ رات بھر کی

تھا۔ دو نے کی طرف سے کوئی جواب نہ پا کر وہ اچھل کر باہر نکلا۔ اس نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ آوازیں دیں، جھاڑیوں کو ہلایا جلیا اور پھر واپس قبر میں اتر گیا۔ اس کے انداز میں گھبراہٹ تھی۔ اب اس کا ساتھی بھی باہر آیا۔ سجاد نے دم سادہ لیا۔ وہ اسے پکارے جھاڑیوں میں جھانکتے تلاش کرتے اس طرف آ رہے تھے جہاں سجاد چھپا کھڑا تھا۔ سجاد نے سانس روک لیا اور بڑی احتیاط سے اپنے قدموں منہ دائرے کی شکل میں آہستہ آہستہ اس طرح کھنسنے لگا کہ وہ کسی طرف بھی آئیں وہ مخالف سمت میں ہو۔ تاریکی نے بھی اس کی مدد کی۔ وہ جھاڑیوں کو دیکھ کر آگے بڑھ گئے لیکن سجاد اتنے سے عرصے میں پینہ پینہ ہو گیا۔

اس نے دیکھا کہ وہ گورکن کی کینا کی طرف جا رہے تھے۔ سجاد پریشان ہوا۔ وہ یقیناً بوڑھے اور جھمکو ہر اسان کریں گے۔ وہ جلدی جلدی جھاڑیوں سے نکلا اور ان سے کچھ فاصلہ رکھ کر ان کا تعاقب کرنے لگا۔

وہ کچھ دیر تیز چلتے رہے پھر ایک دم واپس پلٹ آئے۔ سجاد انفرافری میں ایک قبر کے چوترے کے پیچھے اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکا تھا۔ اس نے کان ان کی آہٹ پر لگا دینے اور سانس روک لی وہ اس کے برابر والی قبر کے قریب سے گزرے اور پھر قبر کی سمت چلے گئے۔ سجاد کوسلوں کے اٹھانے اور کھٹنے کی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ جلدی میں قبر بند کرنا بھول گئے تھے۔

سجاد نے جھاک کر دیکھا۔ وہ جلدی جلدی قبر بند کر کے پھر گورکن کی کینا کی طرف چل پڑے تھے۔ وہ کچھ فاصلہ رکھ کر پھر ان کا پیچھا کر لگے۔ وہ سیدھے گورکن کی کینا میں گئے۔ اندھیرے میں ان کی تاریج کی روشنی یہاں وہاں دائرے بنانے لگی۔ پھر دونوں نے ایک دوسرے سے کچھ کہا جو سجاد کی سمجھ میں نہیں آیا۔ غالباً وہ یہی کہہ رہے تھے کہ بڑھا سوا ہوا ہے۔ خیریت گزری کہ وہ بوڑھے سے کوئی تعرض کے بغیر واپس پلٹ آئے۔

کانی دیر وہ اپنے ساتھی کو ادھر ادھر تلاش کرتے رہے۔ کئی بار وہ اس کوئی نوٹی قبر کے پاس سے بھی گزرے جہاں اس کا ساتھی بندھا پڑا تھا۔ لیکن انہیں کچھ پتہ نہ چلا۔ سجاد فاصلہ رکھ کر ان کا پیچھا کرتا رہا بالآخر وہ ناکام اور پریشان ہو کر واپس چلے گئے۔ ان کی آنکھیں کی باتیں جو کچھ کچھ سجاد کے کان میں بھی پڑتی تھیں ان سے کبھی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ساتھی کے اچانک غائب ہوجانے پر غصے پریشان ہیں۔

وہ چلے گئے تو سجاد نے اطمینان کا سانس لیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد کہ کہیں وہ پھر

محنت بیکار مچی تھی۔ وہ شخص اس کے لئے ایک بیکار سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ اس کا جی چاہا کہ یہ چاقو اس کے سینے میں اتار دے لیکن پھر وہ ضبط کر گیا۔ اس معذور شخص کو مار کر اسے کیا حاصل ہو سکتا تھا جو نہ جانے کس کے ہاتھ کا کھلوتا تھا۔ اس نے غصے سے اسے دھکا دیا اور خود قبر کے ٹڑے سے باہر آ گیا۔

رات کا چھپلا پھر تھا۔ ستاروں کی آنکھیں جھپک رہی تھیں۔ کہیں دور سے چہرہ کی اذان بھی سنائی دے رہی تھی۔ اس وقت کچھ بھی کرنا مناسب نہیں تھا۔ صبح ہونے ہی والی تھی۔ وہ کپڑے جھاڑتا ہوا بوڑھے کی کنیاء کی طرف چلا۔

ابھی وہ برآمدے کے قریب ہی پہنچا تھا کہ اس پر نارنج کی روشنی پڑی اور اس کے ساتھ ایک سایہ سا اس کی طرف لپکا۔

”سنو دلاؤ دے جہیں بلایا ہے۔“

.....

بخت آور نے آواز کی ست دیکھا۔ اسے حیرت کے ساتھ مایوسی ہوئی۔ وہ سب جسے باس کہہ رہے تھے ایک بالکل عام سا ڈھیلا ڈھالا انسان تھا جس میں کوئی بات متاثر کرنے والی نہیں تھی۔ وہ ان لڑکوں سے عمر میں کچھ زیادہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے معمولی کپڑے پہن رکھے تھے اور بڑی بے تکلفی سے قالین پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے انداز میں ایسی بے نیازی تھی جیسے اسے کسی کی پرواہ نہ ہو۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے سر سے پاؤں تک گہری نظر سے دیکھا اور یوں سر ہلایا جیسے اسے ناپسند نہیں کیا۔ پھر اپنے قریب ہی قالین پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”آؤ۔ یہاں بیٹھو۔“

بخت آور کے اندر ایک انجانا سا خوف گبولے کی طرح اٹھ رہا تھا۔ ان سب کی نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ ابھی تک دروازے کے قریب ہی کھڑی تھی۔

”چلیں نا۔“ بولی نے اسے ٹھوکا دیا۔

وہ چونک گئی اور ایک ایک قدم جیسے گن گن کر سمجھتی اس کی جانب بڑھی۔

”بیٹھو.....!“ بھاری آواز میں حکم تھا۔

وہ کئی سنائی سی وہیں بیٹھ گئی۔ یہ سارا ماحول، سب باتیں اسے وحشت میں مبتلا کر رہی تھیں۔ اس کے گلشن چہرے کی گلابی رنگت زرد پڑ گئی تھی۔ اس نے اپنا چہرے اپنے شانے پر جھکا لیا تھا۔ اس کا واسطہ مردوں سے پڑتا رہا تھا۔ لیکن اس پر اسرار ماحول میں اتنے سارے مردوں کے درمیان وہ خود کو بے حد اکیلا اور خوفزدہ محسوس کر رہی تھی۔

باس نے اس کی ٹھوڑی تلے انگلی رکھ کر اس کا جھکا ہوا چہرہ اودھچا کیا اور سپاٹ سے لہجے میں بولا۔

”تم بہت خوبصورت ہو لیکن خود کو اتنا اثر میلا کیوں ظاہر کر رہی ہو جیسے کوئی گھریلو لڑکی

ہو۔“

اس کے دھار دار لفظ، اس کی جھپتی ہوئی نظریں بخت آدر کے وجود میں تیروں کی طرح جیست ہو گئیں۔ اسے اپنا آپ بڑا ہی حق محسوس ہوا۔ اس کے ہامی کا قہقہہ جیسے اس کے وجود میں بس گیا تھا۔ وہ جس طرف بھی جانی تھی یہ قہقہہ اس کے ہامی کا گواہ بن کر اس کے ساتھ ساتھ چلن تھا۔ اس نے لرز کر باس کے ہاتھ کو جھٹک دیا اور ایک بھر پور نظر اس پر ڈالی۔ وہ بھی اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اور جیسے اس کی نظر کا خنجر تھا۔

”دیکھو۔“ اس نے نظر ملتے ہی باس نے بڑے دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔
 ”اس طرح تو کام نہیں چلے گا۔ ہمیں یہ شرمنا، لچانا نہیں چاہیے۔“
 بخت آدر نے اچھے ارادے کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی۔

”سنو۔“ وہ دہنگ لہجے میں بولا۔ ”جس جگہ سے تم آئی ہو وہاں تم نے مردوں کے بارے میں بہت کچھ جان لیا ہوگا۔ مردوں کی فطرت، ان کا برتاؤ، ان کی کمزوریاں، ان کی خامیاں سب تمہارے علم میں ہوں گی۔ بس یہی سب کچھ چاہئے کہ تم مردوں کی توجہ حاصل کر کے کسی کمزور لمبے سے فائدہ اٹھا سکو۔“

بخت آدر ساکت سی ہو گئی۔ وہ ابھی تک اسی ایک مدار میں ہی محو رہی تھی۔ ہر بار وہی مقام اس کے سامنے آ جاتا تھا جس سے بھانے کیلئے وہ ہر وقت ہر سمت پناہ کیلئے کھتی رہتی تھی۔ لیکن اس کے لئے پناہ شاید کبھی نہیں ملتی۔

باس کے بات کرنے کا انداز ایسا تھا جیسے حکم دے رہا ہو یا فیصلہ بنا رہا ہو۔ اسے کسی کی رائے حاصل کرنے یا رضامندی جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ بخت آدر کو پچھتاؤں نے گھیر لیا۔ کاش وہ شہر یار کی باتوں میں نہ آئی ہوتی تو یہاں ان سب کے درمیان روانہ ہوتی۔ اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اس کا طبع خشک ہو گیا۔ اس کی ہمتیں جواب دینے لگیں۔ باس کے انداز سے یہ چلن تھا کہ وہ کوئی دھارے نال یا کوئی بات سننے کا عادی نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس نے آخری کوشش کرنے کی گمان لی۔ اپنی ہمتوں کو جمع کرتے ہوئے اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری اور لپکتی ہوئی بولی۔

”مجھے یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہرا۔ میں جلد ہی۔۔۔۔۔“

”یہ فیصلہ کتنا تمہارا کام نہیں کہ تمہیں یہاں کتنی دیر ٹھہرنا ہے۔“ باس نے حقارت سے اس کی بات کاٹ دی۔ ”تم صرف یہ بات ذہن میں رکھو کہ تمہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں۔“

بخت آدر دھک سے رو گئی۔ اس نے فحی چہرے کے ساتھ شہر یار کی طرف دیکھا شاید وہ اس کی جگہ مگر کرے۔ لیکن وہ سر جھکانے بیٹھا قائلین پر اٹھایوں سے لکیریں کھینچ رہا تھا۔

بخت آدر نے پھر احتجاج کرنا چاہا۔ ”لیکن میں ایسا کوئی کام۔۔۔۔۔“
 ”بٹ نہیں۔“ باس نے پھر نخوت سے اسے ٹوکا۔ ”آج کی اس سینگ میں سارے آداب دیکھ لو۔ میں کسی طرح کی کوئی بے قاعدگی برداشت نہیں کیا کرتا۔ تمہیں کیا کرنا ہے۔ کس وقت کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے اس کے بارے میں تمہیں ہدایت ملتی رہیں گی اور میرا خیال ہے کہ تم اتنی سمجھدار ضرور ہو کہ اپنا برا بھلا بھیج سکو۔“ اس کے لہجے میں اس کے اٹل مکروہ ارادوں کی پھلکاری تھیں۔

بخت آدر کیم کر یوں خاموش ہو گئی جیسے زبان و انتوں تلے کٹ گئی ہو۔ وہ ہراساں سی اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔ لیکن وہ دوسروں کی طرف متوجہ ہو چکا تھا۔

اس کے بعد اس نے اور بھی بہت کچھ کہا۔ کچھ ہدایات دیں۔ کچھ ڈانٹا پھلکارا۔ کچھ حساب کتاب لے لے اور جانے کیا کچھ کیا۔ بخت آدر کے لیے کچھ بھی نہیں پڑ رہا تھا۔ نہ وہ ان کی سرگرمیوں کے بارے میں جانتی تھی نہ اسے ان کے پیچیدوں کی کچھ خبر تھی۔ وہ سب کے سب چپ بیٹھے تھے اور یوں توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے جیسے کسی میں کچھ بولنے کی نہ جرات ہو نہ ہمت۔

باس نے اپنے قریب پڑی ہوئی چھڑی اٹھائی اور چلنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سب فوراً ہی اٹھ کر احراما کھڑے ہو گئے۔ بخت آدر پر خوف، دشت، نفرت اور مایوسی کا اس قدر غلبہ تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

باس نے ترجیحی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ گھبرا کر اٹھنے لگی۔ باس نے چھڑی سے اس کے شانے کو کچھوئے ہوئے اسے بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا اور بولا۔

”بیٹھی رہو۔ بیٹھی رہو۔ آخر تم خاتون ہو اور خاتمن کا بھر حال احرام کرنا چاہئے۔ اور ہاں تمہیں جو کچھ کرنا ہے وہ تمہیں بولی بتا دے گا۔ دیریں گزر وغیرہ اچھی طرح کر لینا میں نہ تو کوئی غلطی پسند کرتا ہوں نہ معاف کیا کرتا ہوں۔“

بخت آدر نے سہم کر سر جھکا یا اور غصوڑی اپنے منہ سے سوچنے لگی کہ تقدیر کی یہ گردش کبھی ختم بھی ہوگی؟

قیامت بن گیا تھا۔ بولی نے گاڑی ایک شاعرانہ دکان کے سامنے روک دی تھی۔ بخت آدر کی جان پر نئی تھی۔ اس کے اعصاب مجھنے لگے۔ اسے خود پر قابو نہیں رہا۔ اس نے آگے جھک کر بولی کا شانہ بھجھوڑ ڈالا۔

”بولی۔ بولی واہیں چلو واہیں۔ مجھ سے کچھ نہیں ہو سکے گا۔ مجھے واہیں لے چلو۔ نہیں تو میں پاگل ہو جاؤں گی۔“ وہ ہسٹریائی انداز میں چیخیں۔

بولی نے گاڑی جلدی سے ایک طرف لے جا کر پارک کی اور اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔

”کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔“

”میں پاگل ہو گئی ہوں۔ تم واہیں چلو۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔ میں تمہارا بھانجا پھوڑ دوں گی۔ تمہارا کچا چھسا کب کتا دوں گی۔ نہیں تو مجھے واہیں لے کر چلو۔“ اس نے دشت زدہ آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”حوصلہ رکھیں میڈم۔ آپ خواہواہ ہی اتنی گھبراہٹ میں ہیں آپ کو ہوسلے کر چلتا ہوں۔ آپ کچھ ٹھنڈا وغیرہ پی کر اپنی طبیعت بحال کریں۔ کچھ دیر آرام کریں میں باس کو فون کر دیتا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔ تم باس کو فون نہ کرو۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ میں خود اس سے بات کر لوں گی۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر مقرراری سے بولی۔

”آپ بات کریں گی اور باس سن لے گا۔“ وہ طوطی جیسے لہجے میں بولا۔

”میڈم! آپ اس کو جانیں نہیں وہ ذرا اور قسم کا بندہ ہے۔ اسی لئے میں کہہ رہا ہوں کہ آپ خود کو سنبھالیں۔“

”نہیں نہیں۔ تم واہیں چلو۔“ بخت آدر نے اصرار کیا۔

”میڈم ایک مرتبہ پھر سوچ لیں۔ باس ہمارے اختصار میں ہو گا۔ ہم خالی ہاتھ گئے۔“ اس نے بات ادھر ہی چھوڑ دی۔

”خالی ہاتھ ہوا اس سے بہتر ہے کہ ہم یہاں بکڑے جائیں۔ مجھے سخت گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ میں یہ کام نہیں کر سکتی۔“

بولی نے تیسری چڑھا کر سر جھکا اور پلٹ کر گاڑی سٹارٹ کر دی۔ وہ معمول سے زیادہ تیز گاڑی چلاتا ہوا بہت کم وقت میں اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔ اس نے اتر کر پچھلا دروازہ

پر دے والی سیاہ چٹکیل کار میں بے حد قیمتی ساڑھی اور زیورات پہنے سیاہ چشمہ لگائے بخت آدر پچھلی نشست پر یوں بیٹھی تھی جیسے وہ خود نہ ہو اس کی جگہ کوئی اور بیٹھا ہو اس کے دل پر آنسو گر رہے تھے۔ وہ تو سکھ اور آزادی کی تلاش میں نکلی تھی۔ اس نے تو کتناہ سے دامن بچالینا چاہا تھا لیکن وہ گمناہ کے زہر آلود کانٹوں میں الجھتی چلی جا رہی تھی۔ اس نے بہتیرا انکار کیا تھا لیکن بالآخر اسے ہار مانتی ہی پڑی تھی۔

اگلی سیٹ پر بولی ڈرائیور کی وردی پہنے بیٹھا گاڑی چلا رہا تھا۔ اس کی متحرک چٹکیلی آنکھیں سامنے کے چھوٹے آئینے میں اسے بار بار اشتیاق سے لپکتی تھیں اور گھنی مونچھوں میں چھپا ہوا اس کا ہونٹ مسکا تھا۔

”آج آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔“ وہ پرستاش لہجے میں کہہ رہی تھی۔

بخت آدر نے ان سے کئی کردی اور پورے کی اوٹ سے باہر دوڑتی ہوئی سرنگی سڑک کو دیکھتی رہی۔ اسے یہ حد گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ باس کی دی ہوئی ہدایات ایک ایک کر کے سب اس کے ذہن سے نکل جاتی تھیں۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کی پھیلیاں پیسے میں بیگ رہی تھیں۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا۔

”میڈم ہوشیار رہیے گا کوئی غلطی ہو گئی تو میںیں پر دھر لے جائیں گے۔“ بولی نے پھر اسے مخاطب کیا تو وہ ڈری گئی۔ اسے ٹھنڈے پیسے آگے لگے۔ اس کا حلق تنگ ہو گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس کے گلے میں پھندا سا پڑا ہوا ہے لیکن جان نہیں نکلتی تھی۔ بولی شاید اس کی گھبراہٹ کو تاڑ گیا تھا اسی لئے بولا۔

”میڈم! آپ بہت گھبراہٹ ہوئی لگ رہی ہیں۔ اب اتنی بھی پریشان نہ ہوں۔ ٹھکر نہ کریں کوئی ایسی دیکھی بات ہوئی تو میں سنبھال لوں گا۔ آپ ذرا حوصلہ کریں اور تیار ہو جائیں۔“

اس نے گاڑی کی رفتار مدھم کر دی۔ وہ اسی خاص دکان کی تلاش میں تھا جہاں سے اسے زیورات کے چند مخصوص سیٹ کسی طرح ساتھ لانے تھے۔ پھر انہیں ملتی زیورات سے بدل کر واہیں کر دیتا تھا۔ باس نے یہ منصوبہ بڑی ہوشیاری سے بنا کر انہیں ایک ایک تحصیل سمجھا ہی تھی لیکن اس وقت بخت آدر کے ذہن میں سوائے خوف اور پریشانی کے کچھ بھی نہیں تھا۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک ایک بل جیسے

کھولا اور تھپی سے بولا۔

”چلے۔ اب اس کے پاس آپ ہی بیٹھی ہیں۔ آپ نے میرا ریکارڈ بھی مفت میں خراب کیا۔“

بخت آور جو ساکت سی بیٹھی تھی چونک کر گاڑی سے باہر آئی۔ اس نے خود کو سنبالا۔ اپنی ہمتوں کو یکجا کیا اور یہ سوچ لیا کہ وہ اس سے مقابلہ کرنے کی پوری کوشش کرے گی۔

باس نے ایک تنہیدی نگاہ کے ساتھ اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور تیسری چڑھا کر بولا۔

”نا کام واپس آئی ہو؟“

بخت آور کا سر غیر ارادی طور پر اٹھتا میں مل گیا۔ اس نے کچھ کہنے کو نہ کھولا ہی تھا کہ باس نے شجاع سے کہا۔

”اس کو لے جاؤ اور عمرانی میں رکھو۔ ذرا کھانے پینے میں پرہیز رہے۔ خیال رہے کہ خاتون ہے۔ احترام میں کوئی فرق نہ آئے۔“

”میری بات تو سنیں۔“ بخت آور نے پھر اسے مخاطب کرنے کی کوشش کی لیکن اس نے توجہ نہیں دی۔

شجاع نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑ لیا اور اسے تقریباً ٹھیکتا ہوا اپنے ہمراہ لے چلا۔ بخت آور نے بے جا رگی سے ایک نگاہ سارے کمرے میں دوڑائی۔ شہر پار دیوار کے ساتھ لگا ہوا سر جھکا بٹھا تھا۔ باقی سب بھی خود میں گمن تھے۔ کوئی اس کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس نے جھک کر اپنا بازو چھڑا لیا اور تھپی سے بولی۔

”چھوڑ دو مجھے۔ میں خود چل سکتی ہوں۔“

وہ اس کے آگے آگے چل پڑا۔

”آجانیے..... تشریف لائیے۔“

وہ اپنی رسمی ساڑھی سنبھالتی ہوئی اس کے پیچھے ہوئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ایک کمرے کے باہر نکلا۔ اس نے دروازہ کھول کر اسے اندر آنے کے لئے کہا۔ بخت آور

چپ چاپ اندر چل گئی۔ اس نے ایک نگاہ چاروں طرف دوڑائی وہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں چھوٹا سا فرنیچر اور ایک بیڈ تھا۔ شجاع نے اپنے پیچھے دروازہ بند کیا اور ایک نگاہ اس کے

سر پر ڈالی اور قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

”میڈم۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اس سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کریں۔ آپ کو شاید پتہ نہیں کہ اس شخص کے پاس دل قسم کی کوئی چیز نہیں۔ اسے دم وغیرہ بھی نہیں آتا۔“

بخت آور نے کھو کر اس کی طرف دیکھا۔

”تم اپنا مشورہ اپنے پاس رکھو۔ میں خوب جانتی ہوں تم جیسوں کو۔ تم سب ایک سے ہو۔“

وہ دفعتاً قریب آگیا اور اسے شانوں سے قہام کر بولا۔

”آپ قسم لے لیں ہم ایسے نہیں ہیں۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکتا ہوا بولا۔

”پیچھے ہٹو۔ دفع ہو جاؤ۔“ بخت آور نے غصے سے اسے پرے دھکیلا۔

وہ فٹس پڑا۔ ”ہم اتنے بڑے بھی نہیں ہیں۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔“

بخت آور نے منہ پھیر لیا۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھری۔

”ٹھیک ہے میڈم! آپ کی قسمت۔“ وہ کمرے سے باہر نکل گیا اور دروازہ بند کرتے ہوئے بولا۔

”ہائے ہائے میڈم۔“

.....

”ہائے ہائے میڈم۔“ یہ آخری آواز تھی جو اس نے سنی۔ اس کے بعد اسے کوئی انسانی آواز سنائی نہیں دی۔ وہ تھکا بیٹھی اپنے ساتھ ہی بائیں کرتی رہی۔ اپنے آپ میں ہی الجھی رہی۔ گرد آلود حالات کی گرد کو اپنے سارے وجود پر جتے ہوئے دیکھی رہی۔

دن سے شام ہوئی اور شام کو رات نے آن پکڑا۔ دن بھر کی تھکاوٹ اور فانی الجھن نے اسے چور چور کر دیا تھا۔ اس کا ذہن اور جسم دونوں ہی غڑ حال ہو چکے تھے۔ یہاں کے

ماحول اور مطالبات نے اسے ڈرا دیا تھا۔ اسے اپنا آپ بڑا غیر محفوظ سا معلوم ہو رہا تھا۔ اونچی چھت، ٹھیکین دیواروں اور بند دروازے میں بھی اسے یوں لگ رہا تھا جیسے کسلے آسمان تلے بے

سائبان کھڑی ہے۔ سارے موسموں کے دکھ سہنے، ساری راتوں کے طراب جھیلنے کیلئے۔ رات سنسان ہو گئی، گھبرائی اور تاریک ہوئی۔ بنا آہٹ کے گزرتی گئی۔ بخت آور نہ

جانے کیا سوچتی رہی اور کرسی پر بیٹھ بیٹھے سو گئی۔ رات کے پیچھے پھر اس کی آنکھ کھلی تو اس کا سارا بدن ٹوٹ رہا تھا۔ اس نے ابھی تک وہی ساڑھی پہن رکھی تھی جو جس اس نے پہنی تھی۔

اس نے اٹھ کر الماری کھولی۔ وہ خالی تھی۔ اس نے غصائیاں کے دروازہ کھول کر دیکھا وہاں ایک

مردانہ سلپنگ سوٹ لٹکا ہوا تھا۔ بخت آور نے دروازہ دھکیلا۔ وہ لاک تھا۔ کھڑکی کھولی اس میں لوہے کی مشبوط جالی لگی ہوئی تھی۔ سارے راستے بند تھے۔ کوئی در کھلا نہیں تھا۔

اسے دیوار میں زندہ چپے جانے کا احساس ہوا۔ بھٹکنے سے اسے بے حال کر دیا۔ وہ بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی واپس کمرے میں آئی اور چنگ پر ڈھے کر چنگیوں سے رونے لگی۔ تنہائی تھی اور وہ۔ نہ کوئی مہربان کو دیکھی۔ نہ کوئی محبت بھرا سینہ۔ نہ کوئی آنسو پونچھنے والا تھا نہ تسلی دینے والا۔

وہ نہ جانے کب تک بھٹکی رات کے سیاہ انچل میں بیٹھکے ستارے ناچتی رہی اور تھک کر نامعلوم کب سوئی۔ اس کی آنکھ کھلی تو سورج دھپٹا ابلے دن کی سوعات چاروں طرف بانٹ چکا تھا۔ بخت آور نے آنکھ کھول کر دیکھا۔ کمرے میں دن کا اجالا برس رہا تھا۔ قبریں ابھی تک روشن تھیں۔ دن کی روشنی کو دیکھ کر اس کی قدرے دو حواس بند ہو گئی۔

اس نے اٹھ کر روشنیوں میں گھس گھس کر اسے غسٹا خانے میں چلی آئی۔ اس نے پانی کا قلم کھولا لیکن پانی نہیں آ رہا تھا۔ ٹب میں تھوڑا پانی موجود تھا۔ اس نے اسی سے منہ ہاتھ دھویا اور کمرے میں چلی آئی۔

اس نے سارے کمرے کا جائزہ لیا یہ کمرہ دوسرے کمروں کی نسبت چھوٹا تھا۔ روشندان بہت اونچا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کمرے کو رہنے کے لئے کم استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ یہ مناسب طور پر آرائش نہیں تھا۔ بدرنگ قالین، پرانی کرسیاں اور ایک بیڑ۔ یہی اس کی کل کالائز تھیں۔

بخت آور صوفے پر بیٹھ کر حالات کو سنے انداز سے دیکھنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ ان میں سے کوئی ایک ضرور آئے گا اور اس سے معاملہ کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اسی انتظار میں رہی اور قارئین بیٹھے بیٹھے تھک گئی لیکن کسی نے خبر نہیں لی۔ اسے بھوک بھی محسوس ہونے لگی۔ اس نے کل سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ آج بھی دن رات سے طے کیلئے تیزی سے بوستا چلا جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بھوک کا احساس بھی بڑھ رہا تھا۔ بخت آور نے اپنی بھوک کو پانی سے تسکین دینی چاہی اور اٹھ کر غسٹا خانے کا قلم ایک مہربانہ چنگول کر دیکھا شاید آگیا ہو لیکن پانی بند تھا۔

بھوک کے ساتھ پیاس کی شدت بھی بڑھنے لگی لیکن ٹب میں تھوڑے سے پانی کے علاوہ پانی کہیں نہیں تھا۔ ٹب کی تہہ میں بیٹھا پانی پینے کو اس کا دل نہیں مانا۔ مگر اس کے

ذہن میں پیاس کی بات گونج رہی۔

”ذرا کھانے پینے سے پرہیز کرنا۔“

وہ کانپ گئی۔ اس کے اندر یہ اندیشہ بار بار ناگ کی طرح چمن پھیلانے لگا کہ اسے بھوکا پیاسا رکھا جائے والا تھا۔

بخت آور نے اس شخص راستے میں بہت کچھ جھپٹا تھا۔ اس کی روح تو ہمیشہ سینہ سپر رہی تھی لیکن جسم بالآخر ہار گیا تھا۔ جسم کی ضرورتوں نے اسے مات دے دی تھی۔ شاید ایک بار پھر آزمائش کا دور شروع ہونے والا تھا۔ ایک بار پھر اسے جسم اور روح کو ہم آہنگ کرنے کے لئے ہلے صراط سے گزرتا تھا۔ وہ بہت دیر تک خاموش اور ہراساں ہی بیٹھی رہی۔

وقت تھا کہ کھٹنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ وہ کبھی اٹھ کر کمرے میں چھلنے لگتی۔ کبھی چنگ پر لیٹ جاتی۔ کبھی چھت کو کھوڑے لگتی۔ کبھی دروازہ پر نظر کر لی لیکن کوئی نہیں آیا۔ نہ کوئی آہٹ ہوئی نہ کسی کے قدموں کی چاپ ہی کمرے کے باہر سے گزری۔ نہ کوئی آواز سنائی دی۔ یہ موبہم امید ہوئے ہوئے معدوم ہونے لگی کہ شاید کوئی آجائے۔

خاموشی ہی خاموشی، تنہائی ہی تنہائی اس کے چاروں جانب پھیلی ہوئی تھی۔ بخت آور کا دل گھبرانے لگا تھا۔ بھوک اس کے پیٹ میں اپنے کو کیلئے نچے گاؤنے لگی تھی۔ پانی پینے کی شدید طلب اس کے حلق میں کانٹنے لگی تھی۔ اس پر بزمردی اور نقاشی جھانے لگی تھی۔ وہ خود بے طرح پریشان ہوئی۔ جسم کے مقابلے روح کو کھوڑ کر دے لگے۔ وہ کمرے میں بدل بدل کر ہار گئی لیکن اس کی جھلتی ہوئی آنکھوں کو تیندر کی غنڈک نے چھوا تک نہیں۔

اس نے کمرے میں ٹھٹھتے، بستر پر کمرے میں بدلنے، غسٹا خانے کی کھڑکی کی لوہے کی جالیوں میں سے اندھیرے کو کھٹکے دوسری رات بتادی۔ بھاری اور تنہا رات صدیوں کی طرح ٹھٹھٹھٹ کر گزرتی رہی۔ بھوک کا احساس جو پہلے کسی عفریت کی طرح اسے اندر ہی اندر کھا رہا تھا اب نقاب تھابت اور کمزوری میں بدل گیا۔ اس سے اٹھنا محال ہو گیا لیکن کسی نے اس طرف تھما ک کر بھی نہیں دیکھا اور دن اس پر قیامت ڈھا تا ہوا گزر گیا۔

پیاس نے اس کی زبان کو کھڑکی کا ٹکڑا بنا دیا۔ وہ ابھی۔ ابھی سے قدم دھرتی غسٹا خانے میں بیٹھی۔ ٹب کی تہہ میں بیٹھے ہوئے تھوڑے سے پانی کو چلوں سے پیتے ہوئے اسے کراہت نہیں آئی۔ اس کے اندر ممانعت کرور پرتی جاری تھی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا تھا اس کا حال خراب ہوتا تھا۔ اس کے اعصاب، اس کی سوچنے سمجھنے اور فیصلہ کرنے کی قوتیں ٹھٹھکی جاتی تھیں۔

ہموک اس کے سارے وجود کو دیکھ کر طرح چاٹ رہی تھی۔ وہ کسی جاہ حال مسافر کی طرح بار بار کسی جانب سے مدد آنے کی آس میں دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔

اس کے کان آجوں پر گئے ہوئے تھے لیکن کوئی آہٹ نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ ماہوی کے اقصاء سمندر میں ڈوبی جا رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ کمرہ ہی اس کی قبر بن جائے گا۔

ایسا لگتا تھا جیسے وہ لوگ اسے یہاں بند کر کے بھول گئے ہیں یا یہ جگہ چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ اس نے کئی بار دروازہ کھٹکھٹایا، آواز دیں۔ دیوانوں کی طرح باہر نکلنے کا کوئی راستہ تلاش کرتی رہی لیکن لا حاصل۔ اسے نہ دنوں کی تسخیر یا دوسری نہ رات دن میں تیز رہی۔ اس کے لئے اچلے اور تاریک لمحوں میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ہر گزرنے والا لمحہ ہموک میں اضافہ کرتا تھا۔ روٹی کی طلب بڑھاتا تھا۔

نہ جانے کتنے روز بعد دروازہ کھٹکنے کی آواز آئی لیکن بخت آدرو کو بھی محسوس ہوا جیسے یہ بھی کوئی جھوٹا آواز کی ساعت کا فریب ہے۔ اس میں بھٹنے کی طاقت بھی نہیں رہی تھی۔ وہ بستر پر پڑی رہی اور بھیچھی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھتی رہی۔

دروازے میں بولی اور شجاع کے چہرے نمودار ہوئے۔ وہ ہانپک جھپکے ایک ہی سانس دیکھتی رہی۔ وہ دونوں قریب آ گئے۔ بولی کے ہاتھ میں کبھی شرواب کا گلاس تھا۔

”اٹھیے میڈم“ وہ بولا۔

بخت آدرو نے بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی لفظ بولنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ شجاع نے جبکہ کراے اٹھایا اور سہارے سے ہٹ کر بٹھا دیا۔ بولی نے گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس کے خشک ہونٹوں نے نمی کو چھوڑا تو اسے محسوس ہوا جیسے اس ایک گلاس میں اس کی زندگی سیال بن کر تیز رہی ہے۔ اس نے بے تابی سے دو تین گھنٹہ اس طرح لئے جیسے کوئی چپکھا گلاس سے پانی پینا سیکھتا ہے۔ کچھ اس نے پیا کچھ اس کے ہونٹوں سے بہہ کر اس کی گردن پر تر کر گیا۔

یہ چند گھنٹہ اس کی تسکین کے لئے ناکافی تھے۔ وہ قناعت سے بھرتی ہوئی اسی طرح بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے ابھر آئے تھے۔ اس کے دل پر اچھرے کی رونق ماہ پرچمی تھی۔

بولی نے انگلی سے اس کا رخسار چھوا۔

”میڈم! آپ کی ضد نے آپ کا کیا حال بنا دیا ہے۔ مجھے انفسوس ہے لیکن میں آپ کو اور جوں جوں نہیں کر سکتا۔ اس کا بکلی حکم ہے کہ آپ کو صرف ایک ہی گلاس دیا جائے جس سے آپ بات کرنے کے قابل ہو سکیں۔“

بخت آدرو کچھ کہنے کے قابل نہیں تھی۔ اس کا ذہن ماؤف ہو رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ نہیں آ رہا تھا۔ شجاع نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا۔

”چلے میڈم! ذرا باس کے درشن کر آئیں اور اسے بھی اپنے درشن کرا دیں۔ کیا پتہ وہ آپ کے راتیں میں اضافہ کر دے۔“

وہ بٹسا اور اس کی تسخیر آمیز بولی میں بولی بھی شامل ہو گیا۔ اس نے دوسری طرف سے آکر اس کا بازو پکڑ لیا اور دونوں نے اسے اٹھا کر اس کے قدموں پر کھڑا کر دیا۔

.....

سجاول کو رانی کی موت نے بالکل ہی تباہ کر دیا تھا۔ اسے چوہدری اور استانی نور کے قہر سے دلچسپی نہیں رہی تھی لیکن ولشاد کا پیغام ملنے پر ایک بار پھر رانی کے دکھوں کی نہیں اس کے اپنے سینے میں اٹھنے کی تھی جسے چوہدری کے یہ وفا نیوں نے غمیری جوانی میں شہمی کا رزق بنا دیا تھا اور اب وہ استانی نور کی زندگی سے کھیلنے پر آمادہ تھا۔

اسے رانی کے دکھوں اور محرمیوں کا حساب دینا ہی چاہئے تھا۔ وہ اس قابل تھا کہ اس سے رانی کی زندگی میں مکمل جانے والی نیکیوں کا حساب گمن گن کر لیا جاتا مگر سجاول تباہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ ولشاد اس کی فکر کا آدمی تھا وہ اس کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال سکتا تھا۔ نہ جانے اس نے اسے کیوں بلایا تھا اور اس نے اس کے ٹھکانے کا پتہ کیونکر چلا لیا تھا حالانکہ سجاول نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں رہتا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خاصا پائرا آدمی تھا۔ اس سے ملنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ اس کے ڈر لیے چوہدری سے رانی کی محرمیوں کا بدلہ لے لیا تھا۔

مکی سوچ کر وہ اس کے ڈیرے چلا آیا تھا۔ اس کے ملازم اس کے ساتھ عزت سے فائز آئے۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں اس کے بارے میں علم ہے۔ انہوں نے ولشاد کے بارے میں بتایا کہ وہ رات سے باہر گیا ہوا ہے جلد واپس آ جائے گا۔

سجاول کو نیکم کا خیال آیا یقیناً وہ اسی کے یہاں ہو گا۔ یہ سوچ کر نہ جانے کیوں وہ ۱۶ ماہ ہو گیا۔ پھر اس نے سر جھٹک کر خود کو ملامت کی۔ بھلا اسے نیکم سے کیا لینا دینا۔ ایک

دلشاد کیا نہ جانے اور کتنے اس کی زلف گرہ گیر کے اسیر تھے۔

وہ دیر تک دلشاد کے انتہار میں اس کی بیشک میں بیٹھا رہا۔ پھر بیکار بیٹھے بیٹھے اسے یورپ ہوتے ہوئے گئی تو وہ ذرا گھومنے پھرنے کے ارادے سے باہر نکلا۔ اس کی آنکھوں میں لمے بھر کو نلیم کارٹکین سراپا لہرا گیا۔ وہ اس کے شہر میں آیا تھا تو بلا سبب ہی اس کی شہر آکھیں یاد آ گئی تھیں جو ہمیشہ راہ نکلنے کا وعدہ کرتی تھیں۔

وہ دلشاد کے ملازم کو تھوڑی دیر بعد آنے کا کہہ کر اس کی بیشک سے نکلا اور مرکز کی دروازے تک جانے والی گلی نما روش ملے کرتے ہوئے اس نے دیکھا کہ شوخ ریشمی کپڑا میں لمبوں کوئی عورت بار بار پیچھے پلٹ کر دیکھتی ہوئی تیزی سے اندر داخل ہوئی اور دیوار کے ساتھ بنے ہوئے ایک خراب کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔

وہ گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ ظاہری شبہت سے وہ کسی اچھے گھرانے کی معلوم ہوئی تھی۔ وہ اس کی موجودگی سے بے خبر بالکل دیوار کے ساتھ چلی ہوئی تھی۔

تب تک سہاول اس کے برابر پہنچ چکا تھا۔ وہ اس کی آہٹ سن کر بے طرح پریشان ہوئی اور اس نے ہراساں نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کو اس کے ہونٹ لرزے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ سہاول کو وہ کوئی معینیت زدہ معلوم ہوئی۔ نہ جانے وہ کون سی کس کے خوف سے یہاں جھپکی ہوئی تھی۔ شاید اسے مدد کی ضرورت تھی یہی سوچ کر سہاول نے نرمی سے اسے مخاطب کیا۔

”بی بی تو کون ہے؟“
اس کی موٹی موٹی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ کبھی ہوئی بولی۔
”بھائی مجھے تھوڑی دیر کیلئے یہاں پناہ دے دو۔ کچھ لوگ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس کے اعزاز میں منت اور بے چارگی تھی۔

سہاول کو اس پر ترس آیا۔ نہ جانے وہ کس معینیت میں گرفتار تھی جو ایک غیر مگرہ ایک انجانے شخص سے پناہ مانگ رہی تھی۔ اس نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھرپور کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ اس کے بال کمر گھٹے تھے اور ایک اپ سے سنورے ہوئے چہرے پر ہینہ چمک رہا تھا۔ وہ کوئی جرائم پیشہ عورت تھی یا حقیقتاً کوئی معینیت زدہ تھی۔ اس کے

سہاول نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور دروازے میں سے باہر بھاگ کر دیکھا کہ اس کا تعاقب کرنے والوں میں سے اگر کوئی نظر آ جائے تو وہ اعزازہ لگا سکے کہ وہ کس قسم کی عورت ہے۔ اسے کچھ دور پولیس کا ایک موزن سائیکل کھڑا ہوا نظر آیا۔ کچھ لوگ اسی طرف آ رہے تھے۔ سہاول فوراً دروازے سے باہر آ گیا۔ تب تک وہ لوگ قریب پہنچ چکے تھے۔
”چوہدری صاحب! یہاں کوئی عورت تو نہیں آئی؟“ ایک نے پوچھا۔

”نہیں یار۔ میں نے تو کسی کو نہیں دیکھا۔ ابھی اندر سے آ رہا ہو۔“ اس نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

”کمال ہے۔ پھر مگر یہاں۔ وہ ایسا گلی میں گھسی گئی۔“ اس شخص نے تعجب سے کہا۔
”معاملہ کیا ہے بھائی صاحب؟“ سہاول نے پوچھا۔

”وہ عورت اور اس کا ساتھی زیورات کے دو چار سیٹ دھوکے سے لے کر نکلے ہیں۔ مالک کو پتہ چل گیا۔ اس نے شور مچایا لیکن تب تک وہ کار میں بیٹھ کر فرار ہو گئے۔ یہ پولیس والا بھی ان کا پیچھا کرتا ہوا یہاں تک آیا ہے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے کار کو چھوڑ دیا اور خود گلیوں میں کھیں غائب ہو گئے ہیں۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا کہ کدھر گئے ہیں۔“

”تمہیں کہیں ہوں گے۔ جا کہاں سکتے ہیں۔“ سہاول نے پوچی کہہ دیا۔
”اچھا۔ ہم آج کل گرد کیچتے ہیں۔“ وہ آگے بڑھ گئے۔

سہاول کچھ دیر وہیں کھڑا اس کی طرف دیکھا رہا۔ وہ کافی دور نکل گئے تو وہ اندر آیا۔ وہ عورت ابھی تک وہیں کھڑی تھی۔ اس نے ہونٹوں سے کچھ نہیں کہا بس اچھا آمیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں کچھ ایسا کرب اور مقلوبیت تھی کہ سہاول میں وحش میں پڑ گیا کہ اس کے بارے میں جو کچھ ابھی وہ لوگ کہہ رہے تھے وہ سچ ہے یا کوئی فریب۔ اس کا چہرہ کسی شاطری یا جرائم پیشہ عورت کا نہیں تھا۔ وہ پریشان، خوفزدہ اور ستائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

سہاول نے قدرے نرمی سے پوچھا۔ ”باہر لوگ تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ تم کہاں سے واردات کر کے بھاگی ہو؟ تمہارا ساتھی کدھر ہے؟“

وہ پوری جان سے لرز گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے اپنے سر کو اثبات میں جھنسن دی۔ پھر اس نے فوراً ہی نفی میں سر ہلایا اور اس کی بڑی بڑی دلکش آنکھوں کے پانے چمک گئے۔ اس کے ہونٹ کاٹنے پر کدھر کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

سجاد کو اس پر دم آنے لگا۔ یوں گل تھا جیسے وہ کسی معیت میں پھنس چکی تھی۔ اس نے اس خیال سے کہ کوئی اسے یہاں دیکھ نہ لے اسے ملاطمت کے ساتھ مخاطب ہوا۔ ”باہر لوگ تمہیں تلاش کر رہے ہیں تم تھوڑی دیر انداز کر بیٹھ جاؤ۔ وہ لوگ چلے جائیں گے تو پھر تم بھی نکل جانا۔“

اس نے ایک متذبذب نگاہ اس پر ڈالی اور چمکی ہوئی بولی۔ ”میں یہاں نہیں رہنا چاہتی۔“
 ”تھوڑی دیر بعد میں چلی جاؤ گی۔“
 ”کہاں جاؤ گی تم؟ کہاں ٹھکانہ ہے تم کو لوگوں کا۔ یہاں کھڑی رہیں تو کوئی آتا جاتا تمہیں دیکھ لے گا۔ میں کہتا ہوں اندر چل کر بیٹھو۔“

اس نے کچھ سوچا پھر اس کے ساتھ چل پڑی۔ سجاد اسے دلشاد کی بیشک میں لے آیا۔

”بیٹھو۔“ اس نے ایک نشست کی جانب اشارہ کیا۔ وہ کبھی سناٹا کی وجہ سے بیٹھ رہی۔ سجاد نے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔
 ”آخر یہ قصہ کیا ہے؟ تم جہاں پہنچ گئی تو نہیں ہو تو پھر.....“ اس نے بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اس نے نکلا ہونٹ داٹوں تلے دبا یا اور دیکھی سے لہجے میں بولی۔
 ”یہاں تم صبح سمجھو۔ میں جہاں پہنچ نہیں ہوں۔ میں تو بے آسرا اور بے سہارا ہوں۔ ان برے لوگوں کے درمیان پھنس گئی ہوں۔ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ کہاں جاؤں؟“ اس کا بچہ رندہ گیا اور وہ خاموش ہو کر جیسے آسودہ ضبط کرنے لگی۔

اس کی آنکھوں کا دکھ جیسے سجاد کے رگ و پے میں سرایت کر گیا۔ اس کے اداس چہرے میں اسے بھاگ بھری کا بھولا ہوا چہرہ نظر آنے لگا۔ وہ بھی کسی سجاد کی بھاگ بھری ایسی بہن تھی جو دنیا کے نیوے میزے راستوں میں بھٹک کر رہ گئی تھی۔ اسے بھاگ بھری کے خدوخال صحیح طرح سے یاد نہیں رہے تھے لیکن اس کی روٹی ہوئی سیاہ آنکھیں جو اسے ہر دم اپنی جانب کھینچتی ہوئی مظلوم ہوتی تھیں اس عورت کی آنسو بھری آنکھوں جیسی ہی تھیں۔ سجاد کو اس کا دکھ جانا چھٹا سا مظلوم ہوا۔ اس نے ہمدردی اور غلوں سے اپنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

”بی بی تو میرے لئے بہن جیسی ہے۔ تو.....“
 دروازہ کھلا اور دلشاد کا ملازم اندر آیا۔ اس عورت کو کمرے میں دیکھ کر وہ لمبے بھر کو لٹک

گیا۔ پھر اس نے مسکرا کر آکھ دیا اور محفوظ ہو کر سناٹا انداز میں بیٹھیں اچکا کیں۔ سجاد سوچ ہی رہا تھا کہ اس سے کیا کہے کہ وہ وہی سناٹا انداز میں نکلا اور ایک سنی خیر اشارہ کر کے کمرے سے یوں باہر نکل گیا جیسے اسے رازداری کا یقین دل رہا ہو۔

سجاد کچھ غل سا ہو گیا۔ وہ عورت بھی بے چینی سے پہلو بدلتے گی۔ پھر کچھ رک رک کر بولی۔

”آپ..... آپ میری وجہ سے پریشان نہ ہوں۔ خدا کی زمین بہت بڑی ہے میں کہیں نہ کہیں چلی جاؤں گی۔“
 ”لیکن وہ لوگ جو تمہیں تلاش کرتے پھرتے ہیں ان کا کیا کرو گی؟“ سجاد نے سوال کیا۔

وہ دوپٹے کے آئچل کو اٹھ کر لپیٹنے لگی۔ کچھ دیر خاموش متذبذب سی رہی پھر جھٹلا سے لہجے میں بولی۔ ”اگر آپ میری تھوڑی سی مدد کریں۔ مجھے کہیں کوئی کام دلا دیں تو میں آپ کا احسان عمر بھر نہیں بھولوں گی۔“

سجاد نے سر ہلایا۔ ”میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اس وقت تمہیں کہاں پناہ دلوانی جائے کہ تم ان لوگوں کی نگاہ سے بچ سکو۔ ورنہ اگر تم باہر نکلیں تو کسی نہ کسی کے ہاتھ آ جاؤ گی۔“
 وہ امید بھری نگاہوں سے اس کی جانب کھنکے گی اور سجاد عجیب آرائش میں پڑ گیا۔ وہ تو خود بے آسرا ہے لیکن کتنی چنگ کی طرح ڈونڈا پھرتا تھا۔ وہ اس عورت کو دنیا کی دشمنی سے کیوں کر بچائے گا۔ وہ اسے یہاں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ دلشاد کوئی زیادہ اچھے کردار کا انسان نہیں تھا۔ اس کے گھر میں کوئی عورت نہیں تھی۔ اگر وہ اس وقت یہاں آ جاتا تو اس واقعے کو نہ جانے کس رنگ میں دیکھتا۔ معاے گل کا خیال آیا لیکن پھر یہ سوچ کر اس نے اس امکان کو نظر انداز کر دیا کہ اس عورت کے پیچھے نہ جانے کون لوگ پڑے ہوئے تھے۔ وہ نہ جہاں پہنچ لوگوں کی آک کھائی۔ گل کے پاس اسے لے جانا خود گل کو معیت میں جلا کرنے کے مترادف تھا۔

وہ اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لینا چاہتا تھا تاکہ دلشاد کی نگاہ اس پر نہ پڑے لیکن کوئی ایسا محفوظ ٹھکانہ نہیں تھا جہاں وہ اسے چھپا سکتا یا پھر اس کے ذہن میں گورنر کی کسٹیاں آئی۔ اس نے اس عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔

”تم جس قسم کی زندگی کی عادی ہو تمہیں وہ سب کچھ تو نہیں مل سکے گا۔ ہاں اگر تم

واقعی ان لوگوں سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہو تو میں تمہیں ایک ایسی جگہ پہنچا سکتا ہوں جہاں تم محفوظ رہو گی۔“

اس کا اداس اور پرمردہ چہرہ کل اٹھا۔ اس نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا لیکن ہونٹوں سے کچھ نہیں کہہ سکی۔

سجاد نے اپنے کندھے پر سے چادر اتار کر اس کی طرف بڑھائی۔

”لو اسے اچھی طرح سے لپیٹ لو اور اٹھو..... چلو۔“

”کہاں؟“ اس نے چادر اوڑھتے ہوئے پوچھا۔

”مجھ پر اعتبار کرو اور چلنے کی تیاری کرو۔“ اس نے چنگی بجا کر کہا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ کہیں وہ اس عورت کو قبرستان لے جا کر بوڑھے گورنر کے لئے کوئی مصیبت تو نہیں کھڑی کر دے گا۔ وہ لمحے بھر گورنر کی یاد اور کڑے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

”جی جی جتنا تم نے کوئی جرم تو نہیں کیا کسی کے ساتھ جرم میں شریک تو نہیں؟“

اس نے یوں شاکی نظروں سے اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات سے اسے بہت صدمہ پہنچا ہو۔ پھر افسردگی سے بولی۔

”بھائی! تمہیں میرے کہے پر یقین نہیں تو میں کیا کہوں۔ اگر کہتے ہو تو قسم لے لیتا ہوں۔“ اس کی آواز بھرا گئی اور ایک آنسو اس کے رخسار پر پھل گیا۔

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات ضرور تھی جو دل پر جا کر اثر کرتی تھی۔ سجاد کو جیسے آپ سے آپ یقین آ گیا۔ اس نے سر ہلایا اور اسے اپنے ہمراہ چلے کیلئے کہا۔ وہ کچھ گھبراہٹ ہوئی سی ڈرڈر کر پاؤں رکھتی اس کے ساتھ چل پڑی۔

دشاد کی جو بولی سے نکل کر وہ کچھ دیر پیدل چلے۔ اس نے چادر خوب اچھی طرح سے لپیٹ رکھی تھی جس میں اس کا ادھا چہرہ بھی چھپ گیا تھا۔ اس سے یہ اندیشہ ڈرامہ ہو گیا تھا کہ وہ پکچان لی جائے گی۔ جلد ہی انہیں تانگہ مل گیا۔ سجاد نے اسے بسوں کے اڈے پر چلنے کیلئے کہا۔

کوچوان نے ٹھوڑے سے کوچا جب لگایا اور منہ سے ٹھوڑے سے کوچا لے کر آوازیں نکالیں۔ ٹھوڑے نے آہستہ آہستہ رفتار بگڑ لی۔ وہ ہمکنی ہوئی سی خود کو چادر میں لپیٹے بیٹھی تھی۔ سجاد اس کے برابر بیٹھا سوچ رہا تھا کہ وہ اس کے بارے میں گورنر سے کیا کہے گا کہ چاک اس نے ہو لے سے اس کا بازو یوں دبایا جیسے متوجہ کرنا چاہتی ہو۔ سجاد نے چونک کر اس کی

طرف دیکھا۔ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”وہ لوگ پیچھا کر رہے ہیں۔ وہ لوگ پیچھا کر رہے ہیں۔“

”کون لوگ؟“

سجاد نے پریشان ہو کر ساری سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ ٹریفک معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ کوئی ایسے مشکوک لوگ نظر نہیں آ رہے تھے لیکن اس عورت کے لہجے سے لگتا تھا جیسے اس نے کسی کو پکچان لیا ہے۔

سجاد نے دلی زبان سے کہا۔

”شور نہ مچانا۔ خاموشی سے بیٹھو۔ آرام سے تباؤ کون کون پیچھا کر رہا ہے۔“

”کالی کار۔ کالی کار میں۔“ وہ گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

سجاد نے پھر سڑک پر نگاہ دوڑائی۔ تانگے سے کچھ فاصلے پر ایک سیاہ کار دھیمی رفتار سے یوں چلی آ رہی تھی جیسے تانگے کی رفتار کا ساتھ دے رہی ہو۔ ٹل کھائی ہوئی مونچھوں والا ایک نوجوان سنٹرنگ پر تھا جس کا اوپر کا ہونٹ اس کی ہنسی مونچھوں میں چھپ گیا تھا۔ اس کے اساتھ کی نشست پر اس کی عمر کا ایک نوجوان بیٹھا تھا جس کی چھوٹی چھوٹی سی داڑھی تھی۔ پچھلی نشست پر بھی کچھ لوگ تھے مگر وہ صاف طور پر نظر نہیں آ رہے تھے۔

”خاموشی سے بیٹھی رہو۔ شور نہ مچانا۔ حوصلہ رکھو۔“ سجاد نے دلی زبان میں کہا اور کار کی طرف دیکھا۔

وہ لوگ مناسب فاصلہ رکھے ہوئے تھے۔ سجاد پوری طرح سے ہوشیار ہو گیا۔ اس کا ذہن تیزی سے کام کرنے لگا۔ اس وقت وہ سنشیا یا بسوں کے اڈے پر نہیں جا سکتے تھے۔ وہ لوگ تعاقب میں تھے اور آسانی سے ان کا سراغ لگا سکتے تھے۔ وہ گاڑی میں تھے اور ان کے پاس ہتھیار بھی ہو سکتے تھے۔ کچھ سوچ کر سجاد نے تانگے والوں کو ایک دوسرے راستے کی طرف چلنے کو کہا۔ تانگے والے نے مڑ کر مستحق خیر خواہوں سے اس کی طرف دیکھا اور ٹھوڑے سے ایک دوسری سڑک کی جانب موڑ دیا۔ سیاہ کار اب بھی ان کے تعاقب میں تھی۔

یہ سڑک نسبتاً تنگ تھی۔ اس لئے اس راستے پر ٹریفک کارش بھی بڑھا ہوا لگتا تھا۔ فٹ پاتھ پر خواتین فریڈن کے تجاویزات نے سمیٹ کر اور چنگی کا احساس سوا کر دیا تھا۔ سجاد اسی لئے دس والے علاقے میں نکل آیا تھا کہ وہ لوگ خواتین انہیں روکنے یا حملہ کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ وہ بے حد چونکا رہا تھا۔ اور بڑے غیر محسوس انداز میں ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے

دل ہی دل میں یہ منصوبہ بنالیا تھا کہ وہ تانگے کو کسی مناسب جگہ روک کر شہر کی تنگ اور بھول
بھلیوں ایسی گلیوں میں انہیں بھٹکانے کی کوشش کرے گا۔

”باؤجی۔ جانا کس طرف ہے؟“ تانگے والے نے پوچھا۔

اس عورت نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ سہاول بھی کچھ سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے
سست کا تعین اب تک نہیں کیا تھا۔ وہ شہر سے پوری طرح واقف بھی نہیں تھی۔ نہ ہی اس کی نگاہ
میں کوئی ایسا نمک تھا جہاں وہ کچھ دیر محفوظ رہ سکتا۔ اسے گلو کی کیفیت میں پا کر تانگے والے
نے پھر پوچھا۔

”کیوں جی۔ کہاں جانا ہے؟“

سہاول اسی دیکھ بھلیا ہٹ سے باہر نکل آیا۔ غیر ارادی طور پر ہی ایک علاقے کا نام
اس کے ذہن میں آیا اور اسے قدرے اطمینان ہو گیا۔ اس نے تانگے والے کو راستہ بتایا اور خود
کار کی طرف دیکھا جو ان سے مناسب فاصلہ رکھے ہوئے تھی۔ اسٹینڈنگ پر بیٹھا ہوا موچھوں
والا آدمی بھی کسی اپنے ساتھی سے کوئی بات کرتا اور دونوں قہقہہ لگا کر جہنہ لگتے۔ یوں محسوس
ہوتا تھا جیسے وہ اس ہم سے بڑا لطف اٹھا رہے ہیں۔ وہ یوں بے پروائی سے اپنا تعاقب جاری
رکھے ہوئے تھے۔ جیسے انہیں یقین تھا کہ وہ بڑی آسانی سے اپنے ٹھکانہ کو بے بس کر لیں گے۔
وہ عورت انہیں دیکھ کر لرز رہی تھی اور بار بار چادر سے خود کو اچھی طرح ڈھکنے کی کوشش کر
رہی تھی۔ تاہم ایک اور تنگ سی سڑک پر مڑ گیا جس کے کچے کناروں پر دھول اڑ رہی تھی۔
سہاول نے اپنی جیب سے ایک کرنٹی فوٹ کال کر بڑے غیر محسوس اعزاز میں تانگے والے کی
طرف بڑھا یا اور پی زبان سے بولا۔

”یہ اپنا کر ایہ رکھو اور وہ سامنے گلی کے پاس تاکہ روک دینا۔“

ان کے اور ساتھ کار کے درمیان ایک سرے سے لدا ہوا ریزہ اور ایک گدھا گاڑی
پھنس گئی تھی۔ سہاول نے آہستگی کے ساتھ اس عورت کو مخاطب کیا۔

”بات سنو۔ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ اپنے ہوش و حواس بحال رکھو۔ جیسے ہی تاکہ
رکے تم نیچے اترنے کی کوشش کرنا اور جس طرف میں کہوں اس طرف چل پڑنا۔“

تانگے والے نے گہری نظر سے ان کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہا۔ اس نے
ٹھوڑے کی گائیں سمجھیں اور اسے گلی کے کنارے پر روک دیا۔ کار اور ان کے درمیان اب بھی
سرے پے والا ریزہ پھنسا ہوا تھا۔ قسمت ان کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ آسانی سے گلیوں کی بھول

بھلیوں میں گم ہو سکتے تھے۔

سہاول جلدی سے تانگے سے اتر ا۔ وہ عورت بھی گرتی پڑتی نیچے آئی۔ سہاول نے اس
کا ہاتھ پکڑا اور جلدی سے گلی میں گھس گیا۔

”وہ لوگ چھپا کر بس گئے۔“ وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

”تم ان کا فکر نہ کرو۔ حوصلہ رکھو۔ جب تک وہ یہاں پہنچیں گے ہم آگے نکل جائیں
گے۔“ سہاول نے دم دم لہجے میں اسے تاکید کی اور اس کا بازو سمجھ کر اسے تیز چلنے پر مجبور کر
دیا۔ وہ بے ترتیب قدموں سے اس کی رفتار کا ساتھ دینے کی کوشش کرنے لگی۔ سہاول ہر آنے
والے سوز مڑتا چلا گیا۔ وہ گلیوں کی بھول بھلیوں میں ان سے بہت آگے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ
ہاتھی کا ہتھی اس کے برابر چل رہی تھی۔ اونچی نیل کے ساتھ اس کے لئے تیز چلنا دشوار ہو رہا
تھا۔ اس کی نیل کی تنگ تک سے گلی گونج رہی تھی۔ گلیوں میں آمد و رفت کچھ زیادہ نہیں تھی۔
کہیں کہیں کوئی عورت اپنے مکان کا قہقراہو رہی تھی۔ کہیں بچے کھیتی کے ٹکے سے پانی بھر
رہے تھے۔

جو بھی وہ ایک تنگ گلی کا موڑ مڑے تعاقب کرنے والوں میں سے ایک نوجوان عین
ان کے مقابل تھا۔ وہ گلیوں کی بھول بھلیوں میں سے ہوتا ہوا کسی اور جانب سے اس طرف پہنچ
گیا تھا۔ ان دونوں کا اچانک سامنے پا کر وہ ٹھنکا اور اس کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔ وہ
عورت دھک سے رہ گئی۔ سہاول بھی ایک لمحے کے چھوٹنے سے صے کیلئے ساکت ہوا لیکن پھر
فوراً ہی اس عورت کا بازو پکڑ کر یوں آگے بڑھا جیسے اس شخص سے اسے کوئی سروکاری نہ ہو۔
وہ لپک کر سامنے آ گیا۔ اس کا جو ہاتھ جب میں تھا یقیناً اس میں پتھول تھا۔

”جان عزیز ہے تو اسے چھوڑ کر خضفے سے خضفے چل جاؤ۔“ وہ دانت سمجھ کر بولا۔
سہاول فوراً ہی تنہا چل گیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑی جرات سے
بولا۔

”ذرا سنبھل کے مایاں! تم ہمارے علاقے میں ہو۔ میں ابھی ایک آواز دوں تو
تمہاری ہوا کا بھی پتہ نہیں چلے گا۔“

اس کے بے خوف انداز پر اس نے قدرے تعجب سے سہاول کی طرف دیکھا۔ سہاول
گھبرایا نہیں اور کڑی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے جارحانہ انداز میں بولا۔

”میں سب پتہ ہے تم کیا کرتے ہو جراتے ہو اور پولیس تمہارے پیچھے کیوں گئی تھی۔“

اپنی خیریت چاہے ہو تو چپ چپاتے یہاں سے نکل جاؤ رن۔۔۔۔۔ اس نے دانت چس کر بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔

اس کے لہجے کا اعتماد یا اس شخص کے دل کا چہرہ وہ لہجے بھر کو متذبذب ہوا۔ سجادول نے یونہی ایک کلمے دروازے کی طرف اشارہ کر کے اس عورت سے کہا۔

”چل۔۔۔ تو چل تا تا۔۔۔ کالے کے گھر۔ میں اس سے بات کر کے ابھی آتا ہوں۔“ وہ غاہر کرنا چاہتا تھا کہ یہ اس کی جان بچان کا علائقہ ہے۔ وہ عورت کچھ متذبذب ہوئی۔ چادر میں سے جمنا تھی ہوئی اس کی سیاہ گٹھن آنکھوں نے بھی ہوئی حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا لیکن دوسرے ہی لمحے اس نے جیسے حالات کا اندازہ کر لیا اور نپے تلے قدم رکھی اس مکان کے دروازے میں داخل ہو گئی۔

وہ شخص قدرے شہنشاہ۔ اس نے گرد و پیش یوں دیکھا جیسے کسی امداد کا منتظر ہو۔ سجادول نے بغیر کچھ کہے اسے چلے جانے کا اشارہ کیا۔ اس نے دانت چس کر اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پھر بھی مقابلے کی دعوت دے رہا ہو اور یوں کچھ قدموں سے دوسری کئی میں گھس گیا۔

سجادول کچھ دیر اس انتظار میں رہا کہ وہ واپس تو نہیں آ جائے گا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر اس مکان کی ڈیوڑھی میں جھانکنا جس میں وہ عورت داخل ہوئی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ لگی کسری تھی وہ اسے اچانک دیکھ کر ڈیڑھی مٹی اور گہرائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”وہ چلا گیا ہے یا نہیں؟“

سجادول نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری خیال نہیں کیا اور اسے جلدی چلنے کا اشارہ کیا۔ وہ چادر لٹکتی ہوئی ڈنگلاتے قدموں کے ساتھ اس کے پیچھے چلی آئی۔

اب ان کے ساتھ آگے چلی کھیلنا ممکن نہیں تھا۔ کبھی پناہ لے بغیر چارہ نہیں تھا۔ اچانک ایک خیال سجادول کے ذہن میں آیا۔ اسے حوصلہ سا ہو گیا۔ اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ یہ علاقہ کچھ کم کا دیکھا بھلا ہی تھا۔ وہ اسے ساتھ لے ہوئے چلتا بچتا وہاں آ پہنچا جہاں اسے امید تھی کہ وہ کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر سانس لے سکتا تھا۔

وہ بالا خانے کی سیرمیاں دیکھ کر کھٹی اور گہرا کراس سے پوچھنے لگی۔

”یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔“

”وہ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ توڑی دیر یہاں پناہ لینی ہی پڑے گی۔“

سجادول نے تیزی سے کہا امداد اسے سیرمیاں چڑھنے کو کہا۔ وہ آنکھوں میں ہراسانی

لے کچھ متذبذب سی یوں کھڑی رہی جیسے کچھ میں کچھ نہ آ رہا ہو۔ سجادول نے اس کا ہاتھ پکڑا اور دھشتی سے بولا۔

”اب چلو بھی تاکہیں وہ آ ہی نہ جائیں۔“

وہ زبردستی اس کے ساتھ سیرمیاں چڑھتی ہوئی کشادہ دیوان خانے میں داخل ہوئی۔ دیر جیتی کالین پر رنگین چٹیکے گاؤں کیلے، پامدان اور سازوں کو دیکھ کر وہ کھٹی۔ اس نے حیران ہو کر چاروں طرف دیکھا پھر ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نگاہ اس نے کمرے کے ساز و سامان پر ڈالی اور ایک نگاہ سجادول پر۔ اس کا چہرہ دھک اٹھا۔ وہ بھری ہوئی شیرنی کی طرح اس پر جھپٹی۔

”کھینچے۔۔۔۔۔ ذلیل۔۔۔ یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو۔ تم نے بہن کہہ کر مجھے دھوکا دیا ہے۔ جہیں نہیں شہنشاہ آئی۔ تم مجھے جس جگہ لے آئے ہو۔“

”سیری بات سنو۔“ سجادول نے اس کی دھڑکن کا کیا تمام لیں۔

”بکواس مت کرو۔ مجھے کچھ نہیں سنتا۔ میں ایک منٹ یہاں نہیں رک سکتی۔ چھوڑو مجھے۔ میں جاری ہوں۔“

شورن کر کھجلی طرف تھار میں بنے ہوئے کمرے میں سے کچھ کی چلمیں اٹھیں۔ کچھ بے رنگ چہروں نے سوالیہ نشان لے ہوئے باہر جھانکا۔ بھدے جسم والی نائیکہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو سنبھالتی باہر چلی ہوئی باہر نکلی۔

سجادول نے کبھی جتنی عورت کا بازو پکڑا اور اسے زبردستی گھسیٹا ہوا نیلم کے دروازے پر پہنچا اور چلن اٹھا کر زور سے دستک دی۔

دروازہ فوراً رعبی کھل گیا اور نیلم کا دلربا پیکر نظر آیا۔ سجادول کو دیکھ کر اس کے دلشیں چہرے پر خوشی کا رنگ چکا۔ اس نے پیچھے ہٹ کر اس کے لئے راست چھوڑ دیا۔ سجادول تیزی کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ اس نے ابھی تک اس عورت کا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اسی بھاگ دوڑ اور ہاتھ پائی میں چادر اس کے سر سے ڈھلک گئی تھی۔ اس کے سیاہ بال کھل کر بکھر گئے تھے۔

نیلم وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ ایک تنگ اس کی طرف دیکھتی چلی گئی۔ پھر رکے رکے قدموں سے اس کی طرف بڑھی اذرا۔ اسے دونوں شانوں سے تمام کر بولی۔

”ہائے۔۔۔۔۔ بخت آور احم نہ یہاں کہاں؟“

سجادول نے حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دونوں میں

پرانی شناسائی تھی۔ بخت آور سپید چہرے کے ساتھ یوں کھڑی تھی جیسے اسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔
 نیکم کے چہرے کا رنگ بھی اڑا اڑا سا تھا۔ یوں جیسے کچھ نہ سمجھ نہ پاری ہو۔

اسی وقت نائیکہ اپنے قتل قتل کرنے و دھوکے کے ساتھ کمرے میں داخل ہوئی۔

”اے ہے..... نیکم! سنا ہے بخت آور آگئی ہے۔“ اس کی نگاہ میں پھنسی ہوئی آواز
 میں مکروہ صرست کی جھلک تھی۔

”ہائے! میں مددے۔ میں قربان۔“ بخت آور کو دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی
 اور اسے نیکم سے غیلہ دھرتے ہوئے اپنی ہاتھوں میں لے کر بولی۔

”ماں واری۔ آج کتنا خوشی کا دن ہے۔ میری بیٹی اپنے کمر آگئی ہے۔ میں مددے
 میں قربان۔ میری بیٹی۔ ماں کو نہیں بھولی۔“

وہ نہ جانے کیا کچھ کہہ رہی تھی۔ اور سچا دل بڑی حیرت اور تعجب کے ساتھ یہ سب کچھ
 دیکھ رہا تھا۔ اسے اس عورت کی اداکاری پر حیرت بھی ہو رہی تھی اور غصہ بھی آ رہا تھا۔ اس نے
 خواہ مخواہ اسے کتنا پریشان کیا تھا اور اب بھی تھقی دیدہ دلیری کے ساتھ اس سے جھگڑا کر رہی تھی
 کہ وہ اسے یہاں کیوں لے کر آیا تھا۔

”آپا۔ اب اسے چھوڑ دیجیے نا۔ آرام سے بیٹھتے تو دو۔“ نیکم نے آگے بڑھ کر اسے
 نائیکہ کی گرفت سے چھڑا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی مانند سلطہ
 ہو رہا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اپنے ہوش میں نہیں۔ نائیکہ کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ
 اب بھی اس پر مددے قربان ہو رہی تھی۔

دوبارہ پر گئے ہوئے کلاک نے گھنٹہ بجا کر گزرتے ہوئے وقت کا احساس دلایا۔
 سچا دل نے چونک کر اپنی کھڑی دیکھی۔ اسے اس دھڑ دھوپ میں غامضی دیر ہو چکی تھی۔ اسے
 واپس جانا چاہئے تھا شاید رشاد اپنی حویلی واپس بھی گیا ہو۔ وہ عورت تو اپنے ٹھکانے پر پہنچی ہی
 گئی تھی۔

اس نے نیکم کو مخاطب کر کے کہا۔ ”اچھا۔ میں چلتا ہوں۔“

نیکم نے چونک کر اس کی طرف یوں دیکھا جسے اس کی بات نہ سمجھی ہو۔ پھر اس نے
 افسردگی سے ایک نگاہ بخت آور کے قتل چہرے پر ڈالی اور تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

”جار ہے ہو؟“ وہ اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

”غصہ جاؤ ذرا۔ ذرا غصہ۔“

”کیا بات ہے؟“ سچا دل نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ نہ جانے کیوں اس کا
 یہاں دم سا گھٹنے لگا تھا۔ اس معصوم چہرے والی عورت کو اس ماحول میں رہے بے دیکھ کر اسے
 کچھ عجیب سا دکھا اور پریشانی ہو رہی گی۔

نیکم نے کچھ کہنے کیلئے نہ کھولا۔ کچھ جھکی پھر اس نے ہلٹ کر نائیکہ اور بخت آور کی
 جانب دیکھا۔ پھر کچھ کہنا چاہا لیکن پھر رک گئی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں غمی ہو رہی تھیں۔
 سچا دل نے اکتا کر سر جھٹکا۔ نیکم ہیبت سے رخصت کے لئے کوجھیلنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے
 چلنے کی غمائی اور چلن اٹھا کر کمرے سے باہر نکل آیا۔

نیکم اس کے پیچھے پیچھے دالان تک آئی۔ سچا دل نے اس کے قدموں کی چاپ پر مڑ کر
 دیکھا اور ملے بھر کو غم کیا۔

”اچھا نیکم۔ اس وقت تو میں جلدی میں ہوں۔ مقدر ہوا تو پھر کبھی اسی طرح یوں ہی
 چلنے چلے ملاقات ہو جائے گی۔“

نیکم نے پھر کچھ کہنا چاہا لیکن وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا میز صیوں تک پہنچا اور تیز تیز
 میز صیاں اتر گیا۔ نیکم وہی کھڑی ہاتھ پٹی روگئی۔

.....

وہ نیکم کے یہاں سے نکل تو آیا تھا لیکن یہ اندیشہ بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا کہ کہیں
 بخت آور کو تلاش کرنے والے لوگ اس کی تاک میں نہ ہوں۔ وہ اسے بخوبی پہچانتے تھے لیکن
 اب پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ انہیں آسانی سے بتا سکتا تھا کہ بخت آور وہیں پہنچ گئی
 تھی جہاں اس کا ٹھکانہ تھا۔ پھر ان کی مرضی تھی کہ اسے تلاش کریں یا کوٹھے والوں سے پھندا
 لینے پھریں۔

تھوڑی دور پیدل چل کر وہ ایک سواریوں والے تانگے میں بیٹھ گیا۔ تاکہ تقریباً پھر
 چکا تھا۔ بس ایک آدھ سواری کی ہی مزید تنقید تھی۔ کوچوان کم عمر اور چلبلا تھا۔ وہ راست
 جاتوں اور تانگے کے سامنے آ جانے والوں پر مزے مزے کے فقرے کہہ رہا تھا۔ اس کی شوخی
 اور چلبلی پن نے اسے شہزادی کی یاد دلادی جو اسی طرح شوخیاں کرتی تاکہ چلبلیا کرتی تھی۔ نہ
 جانے وہ ملاں سے بیچ کر کہاں گئی تھی اور کس حال میں تھی۔ اس روز کے بعد اس کے بارے
 میں کچھ پتہ ہی نہیں چلا تھا۔ نہ ہی اسے اتنی فرصت ملی تھی کہ اس کے بارے میں پتہ چلا تا۔
 وہ اسی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اسے اپنے پہلو میں کسی سخت چیز کی جھین ہی محسوس ہوئی۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کے برابر بیٹھے ہوئے مسافر نے پتول کی نال اس کے پہلو سے لگا رکھی تھی۔ اسے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پاکر اس نے پتول کی نال پر دباؤ بڑھا دیا اور بیٹھے ہوئے ہونٹوں اور درشت لہجے میں تانگے والے سے بولا۔

”تا نگہ روگو۔“

تانگے والے نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید اس کی نظر پتول پر پڑی تھی کہ یکدم اس نے گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں۔ گھوڑا جھٹکتے ہوئے مسوں کے ساتھ رکے رکے رک گیا۔ سجاد کے لئے کوئی انتہائی اقدام کارآمد نہیں رہا تھا۔ بھرے بازار میں وہ لوگوں کو حجبہ کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وہی گروہ ہے جو بخت آرد کا پچھا کر رہا تھا۔ ایک نیلی کار تانگے سے کچھ ہی فاصلے پر گئی تھی۔ اس شخص نے اسے اتارنے کا اشارہ کیا۔ وہ بغیر کچھ کہے بچے آتیا اس نے غالباً تا نگہ بان کو پیسے بھی نہیں دیئے اور اس کے پیچھے پیچھے بچے آتیا۔

فٹ پاتھ کے ساتھ گئی ہوئی گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ سجاد کو اس کے اندر بیٹھ جانا پڑا اور گاڑی فرارے بھرنے لگی۔ سارا راستہ خاموشی سے کٹا اور گاڑی ایک شاندار کونجی کے پورج میں آن رکی۔ وہ بے خوفی سے ان کے ساتھ باہر نکلا اور ان کے ساتھ ساتھ چلا ہوا انگریزی سی راہداری میں پہنچا۔ ایک چھوٹے سے دروازے میں وہ جھک کر داخل ہوئے جہاں دیواروں کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے کچھ نوجوان قاتلین پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ کمرے کی فضا سگریٹوں کے دھوئیں سے دھندلی دھندلی سی ہو رہی تھی۔ تمباکو کی تیز بو نے سجاد کو بھی سگریٹ کی طلب کا احساس دلایا لیکن وہ ضبط کر گیا۔

کمرے میں آراستگی کا کوئی سامان نہیں تھا۔ وہ جس قاتلین پر کھڑا تھا وہ بے حد جیتی اور دیز تھا۔ اس کے مقابل دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا ڈھیلا ڈھالا سا شخص تعلیم یافتہ معلوم ہوتا تھا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اس پر ایک کڑی نگاہ ڈالی اور بھاری آواز میں حکم بھر کر بولا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

سجاد بیٹھ گیا تو اس نے بڑی بے تکلفی سے سوال کیا۔

”ہاں بھئی۔ تم نے بخت آرد کو کہاں پہنچایا ہے۔“

سجاد کو اب کچھ بھی چھپانے کی ضرورت نہیں تھی اس نے بے نیازی سے کہا۔

”وہ تو وہیں پہنچ گئی ہے جو اس کا اصل ٹھکانہ تھا۔“

”کہاں؟“ وہ کڑے سے لہجے میں پوچھنے لگا۔

”کیوں؟ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کا اصل تعلق کہاں سے تھا۔“ سجاد نے بھی ٹیکھا

بھیا پٹایا۔

”تو تم اس کے مامے گتے تھے جو سارا دن اسے لئے لئے بھرتے رہے ہو؟“ وہ

بڑک کر بولا۔

”اپنے آپ میں رہو سمجھے۔“ سجاد نے بھی غصے سے کہا۔

”جب اس نے مجھے سے بناہا مگھی تھی تو میں اسے کوئی شریف عورت ہی سمجھ رہا تھا۔“

وہ ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازے میں سے ایک لڑکا تیزی کے ساتھ اندر داخل

ہوا اور اس کے برابر بیٹھ کر قدرے گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔

”باس وہ لوگ پہنچ گئے ہیں۔“

اس کے چہرے کا رنگ کچھ بدلا لیکن وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور اپنے ایک ساتھی سے

4 بولا۔

”اسے بند رکھو۔ میں ابھی آ کر دیکھتا ہوں۔“

سجاد نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے

کوئی پریشانی ہے۔ پاس کے دو ساتھی اس کے گرد گرد آکھڑے ہوئے۔ وہ ان کے ساتھ اٹھا

اور دروازے سے نکل رہا تھا کہ اس کی نظر دیوار کے ساتھ لگی ہوئی ایک لڑکی پر پڑی۔ وہ سیاہ

برقع میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کا میک اپ سے رنگین چہرہ کھلا ہوا تھا۔ رنگی سیاہ نقاب کو اس

نے اپ اسٹک سے رکتے ہوئے ہونٹوں میں دبایا تھا۔ راہداری میں روشنی کم تھی اس کا چہرہ

صاف نظر نہیں آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوتا جیسے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

وہ ان دونوں کے ساتھ آکر بڑھ گیا اور اس نے بھی خیال کیا کہ وہ اس کا وہم ہی تھا۔

وہ اسے ایک کمرے میں دھکیل کر غائب ہو گئے۔ سجاد بے حد مدبّرہ ہوا۔ وہ ان

لوگوں میں کہاں آن پہنسا تھا۔ اسے بوجھ بھی کئی تھی اور پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے

سے ملحق کوئی غصا خانہ بھی نہیں تھا جہاں وہ پانی کے دو گھونٹ بھر کر اپنی پیاس بجھا سکتا۔ نیند

آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ کوئی آہٹ کوئی صدا کہیں قریب سنائی نہیں دیتی تھی۔ اس عالم میں

رات کا تپ بہت دشوار تھی۔

جواب میں ایک لمبی کراہ یوں سنائی دی جیسے کسی نے کچھ کہتے کہتے ہونے سمجھنے لگے ہوں۔ سجاد پھر اسی سمت چند قدم اور بڑھا اور راستے میں آ جانے والی میز یا کرسی سے ٹکرایا جسے وہ اندھیرے میں دیکھ نہیں سکا تھا۔ خاموشی سے لمبیز فضا میں بے ہنگم سا شور اٹھ پڑا۔ سجاد دل دم سادہ کر دیوار کے ساتھ لگ گیا اور کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ کوئی متوقع خطرہ اس کی جانب پھٹتا تو نہیں۔ ڈراؤنے لمحے اس کے برابر سے گزرتے رہے۔ ایک دو تین۔ ایک کے پیچھے ایک۔ بہت سارے لمبے گزرے لیکن کچھ نہیں ہوا تو اس نے پھر اندھیرے کے پردے کو اپنی آواز سے چاک کیا۔

”کون ہے؟ یہاں کون ہے؟“

اس کے سوال کا جواب ایک طویل سسکاری کے سوا کچھ نہیں تھا لیکن اس نے آواز کی سمت کا تعین کر لیا اور قدرے بے خوفی سے آگے بڑھا۔ اچانک اس کے پاؤں کسی سے ٹکرائے۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی فرش پر پڑا ہے۔ وہ جلدی سے بچے جھکا اور اس نے اپنے ہاتھوں سے ٹوٹنے ہوئے پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

اس کے ہاتھ خنڈے پڑتے انسانی جسم سے ٹکرائے اور اسے سانسوں کی آواز سنائی دی۔ کبھی ڈھیلی۔ کبھی تنی ہوئی۔ سجاد نے پھر پوچھا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں پڑی ہے؟ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ زخمی ہے۔ اسے دم مہم یں کراہتی ہوئی آواز سنائی دی۔

”سجاد۔ سجاد۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔“

سجاد دھک سے رہ گیا۔ یہ کون تھی جس نے اس کی آواز پہچان لی تھی۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ آخر وہ کون ہو سکتی تھی جو اس کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔ اس نے گھبرا کر اسے اندھیرے میں ٹوٹتے ہوئے کہا۔

”سجاد میرا وقت آ گیا ہے۔ اب میں نہیں بچوں گی۔ تم تم میرے پاس۔“ اس نے ہشکل یہ لفظ ادا کئے مگر قطرہ کھل کرنا شاید اس کی ہڈی رگڑی سانسوں کیلئے تھا۔ سجاد بے حد پریشان ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ مرنے ہوئی لڑکی کون ہے جو اس کو اچھی طرح سے جانتی ہے۔ اس کی ثقاہت سے لرزتی آواز بھی پہچانی نہیں جا رہی تھی نہ ہی وہ اندھیرے کا کھوکھٹا اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھ سکتا تھا۔ وہ اس کے سامنے شاید موت سے قریب آئی جا رہی تھی مگر وہ اس کے خشک ہونٹوں کو ایک قطرے سے پانی سے بھی سیراب نہیں کر سکتا تھا۔

وہ کافی دیر کمرے میں ٹھہرا رہا۔ پھر بستر پر لیٹ کر سونے کی کوشش کی لیکن خالی پیٹ نیند کو آواز دینا مشکل معلوم ہو رہا تھا۔ مگر کوشش بدل بدل کر اور چھت کو گھور گھور کر وہ اکتا سا گیا۔ پریشان ہو کر اٹھا اور ادھر ادھر باہر دیکھنے لگا مگر کمرے میں کوئی ایسی کھڑکی وغیرہ نہیں تھی جس سے وہ زور آزمائی کر سکتا۔

پھر اس کی نگاہ کمرے میں ایک کونے میں رکھی ہوئی پرانی سی الماری پر پڑی۔ تھوڑی کوشش سے وہ کھولنے میں کامیاب ہو گیا۔ اندر یوں ہی الم غم بھرا بڑا تھا مگر کام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ اس نے دروازہ کھینچ کھینچ کر دیکھنے شروع کئے لیکن ان میں بھی کچھ خاص نہیں تھا۔

اچانک دروازہ کھینچا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے ساری کی ساری الماری ہی اس کے سر پر آ رہی ہے۔ وہ دیک کر پیچھے ہٹا تو دیر دیکھ کر وہ لمبے لمبے گھبراہٹوں میں رہ گیا کہ الماری کے اندر ایک خفیہ دروازہ کھل گیا تھا۔ اس کے سارے جسم میں سنسنی کی لہری دوڑ گئی۔ وہ کچھ دیر تذبذب ماحول کھرا رہا کہ اندر جانے یا نہیں مگر پھر اس نے ہمت باہمی اور جبکہ کر اس چھوٹے سے غلیہ دروازے میں داخل ہو گیا۔

آگے تاریکی ہی تاریکی تھی۔ کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ شاید کہیں اسے روشنی جلائے کہ جن مل ہی جاتا لیکن اس میں خطرہ تھا۔ نہ جانے اس اندھیرے میں کیا کچھ پوشیدہ تھا۔ اندھیرے میں ایک دیوار کا سہارا لیتے ہوئے قدم قدم آگے بڑھنے لگا۔ اس کی ساری حساس پوری طرح سے بیدار تھیں اور وہ چونکے پٹنے سے اندھیرے کے اس خاموش سمندر میں اتارتا جا رہا تھا۔

ایک ایک ایک آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گیا اور پوری توجہ دینے لگا کہ آواز کس سمت سے آ رہی ہے۔ اور کس کی ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی شخص کرب سے کراہ رہا ہے۔ سجاد نے غور کیا تو اسے لگا جیسے وہ آواز نسوانی ہے۔

معاذے اس لڑکی کا خیال آیا جو اس نے باس کے کمرے کے باہر دیکھی تھی۔ شاید وہی تھی۔ نہ جانے اس پر کیا گزری تھی جو اس کی کراہوں میں درد اور آواز تھی۔ سجاد انداز سے آواز کی سمت بڑھا۔ اسے خیال تو آیا کہ وہ کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے مگر آواز کے درد نے اسے ایک بار پھر اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ وہ کچھ اور اس کی طرف بڑھا اور اس نے صدا دی۔

”کون ہو تم؟ تم کون ہو؟“

اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ اسے اٹھا کر کمرے میں لے جاتا۔ وہاں کم از کم روشنی تو تھی اس نے اس کے شانوسے ہاتھ رکھ کر اسے اٹھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
 ”آؤ میں تمہیں کمرے میں لے جاتا ہوں۔ وہاں روشنی ہے۔ میں تمہارے زخم تو دیکھوں کہ تم کتنی زخمی ہو۔“
 ”نہیں۔ نہیں۔“ وہ یوں کراہی جیسے اس کو کوئی زخم دیکھا ہو۔

”مجھے اسی اندھیرے میں مر جانے دو۔ بس تمہاری دیر میرے پاس بیٹھ جاؤ۔ تمہوئی دیر۔“

”گھبراؤ مت۔ ہمت سے کام لو۔ تم جی جاؤ گی۔ میں ابھی دروازے کھٹکھٹا کر انہیں بلاتا ہوں۔“

”اب میں جی کر کیا کروں گی؟“
 سجاد لگتا تھا۔ کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے قدرے زور دے کر کہا۔

”کچھ بتاؤ تو سہی۔ تم کون ہو؟ مجھے کس طرح جانتی ہو؟“
 ”میں..... میں“ اس نے لپکتی سانسوں کے درمیان کہا۔ ”شہزادی ہوں۔“

سجاد کے دل پر قیامت سی گزرتی۔ اس نام نے جیسے اس کے اندر ہر جہد و ہالاکہ دیا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ شہزادہ اور چنگل شہزادی جو زندگی کی حرکت و حرارت سے ہر پورستی یوں اس کے سامنے زخم زخم وجود لے کر زندگی کی بازی ہار جائے گی۔ اس نے ہلکے ہلکے ہاتھ اس کے زخمی وجود پر، کئے اور دیکھے ہوئے لہجے میں بولا۔

”شہزادی..... تو یہاں کہاں؟“

اسے وہ لمحے یاد آ رہے تھے جب عرس کی رات شہزادی اس سے کہہ رہی تھی ”سجاد! ہم دونوں یہاں سے نکل چلیں۔“ اسے اس کی شریک بلی۔ اس کی شوقیان، اس کی انٹیلیجیاں یاد آ رہی تھیں۔ مگر اب تو کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔

اس کے جواب میں شاید اس نے کچھ کہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے ایک درد بھری کراہ لگی۔ سجاد اس پر جھک گیا۔ شہزادی کی زبان شاید اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس نے نہ جانے کیا کیا لیکن سجاد کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اس نے بہت غور کیا تو اسے صرف ایک لفظ ملا ہی سمجھ میں آیا۔ ملاں کا نام ایک انکارے کی طرح اس کی ساعت میں اتر گیا۔

اسے ساری بات سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ وہ بس باتوں لڑکی اس کے ہاتھ آگئی تھی اور آج اس حال میں اس کے سامنے سارے اور زندگی کی کشش میں اسیر تھی۔ اس کے اندر جھک سے چلے گئے۔ وہ معصوم سی سادہ لڑکی زمانے کی غبتوں کے طوفان میں ایک تنہی کی طرح بہہ گئی تھی۔ سجاد نے بھر گھبرا کر اسے ہانسنے کی کوشش کی۔

”شہزادی..... شہزادی۔ میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔ تم زندہ رہو گی۔ تم زندہ رہو گی۔“

اس نے ہنگامی سی اور بے سادہ ہوگی۔ سجاد نے نٹول کر اس کی سانسوں کی حدت کو محسوس کرنا چاہا لیکن اس کے سرد ہوتے وجود میں کوئی حرارت نہیں جاگی۔ سجاد کے ہاتھوں سے زندگی جھلسکتی چلی گئی۔ سجاد آپ سے آپ وہ سب کچھ پڑھنے لگا جو گاؤں کے مولوی صاحب نے بچپن میں اسے یاد کرایا تھا۔ اس کی پگلیں نمی ہو گئیں۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اندھیرے کے پردے میں جو کچھ اس اور محسوس کر رہا ہے وہ حقیقت ہے۔ ابھی ابھی جس زخم زخم وجود نے اس کے ہاتھوں میں دم توڑا ہے وہ شہزادی ہی ہے۔ اس کا دل جیسے کسی نے ٹپکی میں لے لیا تھا۔ اس نے بھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ شوقیان اور شرارتوں نے معصوم بچہ کی طبیعت شہزادی یوں بیکہ کیلے ختم ہو جائے گی۔

یہ ایک تہہ خانے میں بلی بلی کی سی روشنی پھیل گئی۔ سجاد نے چونک کر چاروں طرف دیکھا۔ یہ کسی نے روشنی بجلائی تھی۔ مدھم بجلی کی روشنی میں اس کی آنکھوں کو دیکھنے اور پہچاننے میں مدد دے لگ گئی۔

اس کے مقابل باس کھڑا تھا۔ وہ کچھ گھبرا ہوا اور پریشان معلوم ہوتا تھا۔ سجاد خود بھی نوٹ نوٹ کر گھبرا رہا تھا۔ شہزادی کی لاش اب نظر آنے لگی تھی۔ اس کے کپڑے نیچے اوڑھے تھے اور چہرے پر خراشیں تھیں۔ اس کی آدھ کھلی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں سے جیسے اے تھ جھانک رہی تھی۔ وہ یوں ساکت سا کھڑا تھا جیسے وہ زندہ نہ ہو۔ باس نے اسے مخاطب کیا۔

”پولیس کا چھاپا پڑا ہے۔ ساری کوشش کو انہوں نے گمیرے میں لے رکھا ہے نہ جانے ان کون ان کے ہمتے چھہ کیا ہے۔ کچھ پتہ نہیں کہ وہ کس وقت یہاں تہہ خانے میں پہنچ جائیں۔“

سجاد نے کھوٹی کھوٹی نگاہوں سے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے اس کی بات نہ سمجھا

ہو۔ اس کے ذہن میں سے ابھی تک شہزادی کا دل نہیں بیکر نہیں نکلا تھا جو اس کی آنکھوں کے سامنے دغم پڑی تھی۔ اس کا دل ہر شے سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ اسے جیسے کسی کی کوئی پروا نہیں رہی تھی۔

ہاس نے اس کا شانہ ہلایا۔

”بارگم کہاں کھوئے ہوئے ہوئے بچے کی تدبیر کرنی ہے تو کر لو۔ نہیں تو پولیس کے ہاتھ آگئے تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ وہ کیا کیم کرتے ہیں۔“

سجاد نے ہونٹ چپا کر اس کی طرف خالی خالی نظروں سے دیکھا اور شہزادی کے مردہ جسم کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”یہ سب کس نے کیا ہے؟“ اس کا لہجہ بے حد درشت تھا۔

”مجھے تو پتہ نہیں۔“ ہاس نے بے نیازی سے شانے اچکا۔

”یہ واقعہ تمہارے ٹھکانے پر ہوا ہے اور تمہیں پتہ نہیں؟“ سجاد آگ بگولہ ہو گیا۔

”آرام سے یاد آرام سے۔ یہ اس قسم کی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ یہاں سے نکلا جا چے ہو تو کھو نہیں تو بعد میں پولیس نے تمہیں اس لاش کے ساتھ گرفتار کر لیا تو.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور اسے طے کا اشارہ کیا۔

سجاد کے پاؤں جیسے کسی نے ہاتھ دے دیے۔ وہ اپنی جگہ پر کھڑا شہزادی کے جان و جد کی طرف حسرت و یاس سے دیکھتا چلا جا رہا تھا۔

”یار۔ چلا ہے تو چل۔“ ہاس کی آواز میں آگے بڑھتی تھی۔

”میں صرف اس لئے کہہ رہا ہوں کہ تیرا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ خیر خواہ نہیں پھنستا چاہئے۔ اگر تو یہاں رہ کر اس لاش کا سوگ منانا چاہتا ہے تو مجھ کو مرضی.....“

سجاد نے چوک کر دیکھا۔ ہاس نے ایک خفیہ دروازہ کھول لیا تھا جہاں سے زعمی کی طرف جا سکتا تھا۔ نہیں تو اس کا مقدر تاریکی اور موت تھی لیکن نیلے کا یہ لہجہ صدموں پر محیط ہو گیا تھا۔ یہ چند قدم کا فاصلہ اس کے لئے بھل صراط کا سفر بن گیا تھا۔ کھانا شہزادی کے نرم و نازک و جدو کو یہاں اس تاریک تہہ خانے میں سڑنے کے لئے چھوڑ دے۔ اس سوچ نے اسے جکڑ لیا۔ اس کا دل شہزادی کی میت کو یوں بے گور و کفن چھوڑ کر جالے نہیں مانتا تھا۔

”یار کیا بات ہے؟ کہیں تم اس لڑکی کو جانتے تو نہیں؟“ ہاس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔

سجاد نے سر جھک کر اٹھا کر کیا تو وہ جیسے حتیٰ لہجے میں بولا۔

”اچھا یار اگر تو نے پلٹنا ہے تو چل ورنہ نہ جانا ہوں۔“

اس کے پیچھے چل پڑنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ وہ اپنے اندر ہونے والی موسلا دھار بارش کی پروا کئے بغیر شہزادی کی لاش کے برابر سے گزر کر ہاس کے ساتھ ہو لیا۔

ہاس خفیہ دروازے میں یوں داخل ہوا جیسے خفیہ میں اتر گیا ہو۔ سجاد بھی اس کے ساتھ ساتھ تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی سی میز میاں تھیں جو دونوں تاریکی میں اندازے سے آگے پیچھے اترتے رہے۔ آخری میز پر ہاس نے مڑ کر دیکھا۔ سجاد بھی رک گیا۔ آگے شاید پھر کوئی دروازہ تھا جو ہم تاریکی میں ہونے کی طرح نظر آ رہا تھا۔

”دیکھ۔ اس گیت سے پار آؤ اور دینا ہے۔ میرا خیال ہے ہم ہمیں پر طے کر لیں کہ آؤ اور دنیا میں ہم دوست ہوں گے یا انہی۔“ وہ ایک ایک لفظ تول کر بولا۔

سجاد کا دل و دماغ سب کچھ وہیں شہزادی کی لاش کے پاس تہہ خانے میں تھا۔ وہ الجھا ہوا سا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آ رہا تھا۔ اس نے پوچھی بے یقین سے لہجے میں پوچھا۔

”کیا مطلب ہے تمہارا.....؟“

”میں جی دار اور داروں کو لوں کی قدر کرتا ہوں۔ اگر تم چاہو تو میرے ساتھ دوستی کا رشتہ رکھ سکتے ہو۔ ہم ایک دوسرے کے کام آ سکتے ہیں۔“

سجاد نے لمبے لمبر کو سوچا۔ اس کے ساتھ دوستی رکھنے میں بظاہر کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ وہ تو پہلے ہی تاریکی کی دنیا کا راہی تھا۔ ملاں سے قطع تعلق کے بعد اسے کسی سہارے یا آسے کی ضرورت یقیناً تھی۔ وہ تمہارا دنیا کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ اسے اس کی پیشکش قبول کر لی جتنی چاہے تھی۔ اسی خیال سے اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”ہم دوستوں کے دوست ہیں۔“

”تو ہو گئی بات۔“ اس نے تیزی سے کہا اور اپنی گیت بغیر آواز کے کھول لیا اور اوپر کا دروازہ باہر نکال کر کچھ دیر ارد گرد کا جائزہ لیتا رہا پھر اس کی طرف پلٹ کر بولا۔

”ابھی تو رستہ صاف ہی لگتا ہے۔“

”چلو پھر جلدی کرو۔“ سجاد نے کہا۔

اس نے پھر ایک بار باہر جماع تک تلی کی اور گیٹ سے باہر قدم رکھا۔ سچا دل بھی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

بھگ کی گلی بالکل سناٹا اور تاریک تھی۔ رات کے پچھلے پہر کا سکوت چاروں طرف برس رہا تھا۔ اس گلی کی جانب زیادہ تر مکانات کی پشت تھی۔ رات گہری ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مکانات اندر سے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں بجلی کی لائٹ دکھائی دے رہی تھی۔ ان کی ساری جیس جیس جاتی تھیں اور وہ چمکنے پھانے سے ایک دوسرے کے برابر چل رہے تھے۔ گلی مختصر اور تاریک تھی۔ وہ جیسے ہی اس کے موڑ پر پہنچے ہماری قدموں کی چاپ نے ان کے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیں۔ سچا دل کے دل میں ادا بننے کا ایک کانٹا سا کھٹکا۔ اگر پولیس نے اسے ہاس کے ساتھ گرفتار کر لیا تو؟ تو تاکر وہ گناہ بھی اس کے نام لکھے جائیں گے۔ اس خیال سے ہی اسے بھر جھری سی آگئی۔ وہ ٹھٹھک کر کیا۔

ہاس نے اسے تیز چلنے کا اشارہ کیا اور گلی کا موڑ مڑ گیا۔ سچا دل بھی قدم بڑھا کر اس کے ساتھ ہی گلی کا موڑ مڑا۔ علاقے کا چوکھڑا ان کے سامنے تھا۔

”ختم کون ہو؟ اس وقت کدھر کو جاتی ہے؟“

ان دونوں نے قدم نہیں روکے۔ ہاس نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے ہلے ٹکلفی سے کہا۔

”اوغاں سمجھا کر دنا۔ اس وقت ہم کدھر سے آ سکتی ہے۔ دعا کر کہ بیوی کی آنکھ نہ کھلی جائے۔“

پشمان نے گوشت میں دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی سی تیز آنکھوں سے انہیں جانتا ہوا بات سمجھ کر ہٹا ہوا بولا۔

”خوب چلو۔ کسی دن تو تمہارا بیوی کا آنکھ کھل ہی جائے گا۔“

ہاس نے ہنستے ہوئے اس کے ہاتھ پر یوں ہاتھ مارا جیسے اس کی بات کا بہت مزہ لیا ہو اور راز داری سے پوچھنے لگا۔

”یار خان! اس طرف راستے میں کہیں پولیس والے تو نہیں تھے۔ ہمیں کہیں گھری نہ جائیں۔ خواہ وہ آوارہ گردی میں دھریں گے۔“

”ختم تم پولیس سے نہیں بچ سکتی۔ وہ سارے علاقے میں گشت کرتا ہے۔ یہاں کچلی طرف ایک گولی پر چھاپا جو پڑا ہے۔“ خان کی ہماری آواز سے ساری گلی کوچ بھٹی۔

”کوئی نہیں یار! ہم کونسا چوری کر کے بھاگے ہیں۔ جو پولیس سے گھبراہٹیں۔ پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ وہ اور وقت ضائع نہ کریں۔“ ہاس نے خوش طبعی سے کہا۔ اور چوکیدار سے نزدیک ہو کر بولا۔

”جیب میں تو اس خال نے ایک پیسہ نہیں رہنے دیا۔ پولیس کو کہاں سے چڑھاوا چڑھائیں گے۔“

چوکیدار بھی نفس پڑا۔ اور انہیں بے ضرر سمجھ کر بولا۔ ”خوب تم ادھر چھوٹی گلی میں سے نکل جاؤ۔ آخر میں ایک ٹوٹا ہوا مکان خالی پڑا ہے۔ اس میں گھسوا اور کچلی طرف نکل کر سڑک پر چڑھ جاؤ۔“

”اوجہ خان! جیو۔ اللہ تمہیں وطن لے جائے۔“ ہاس نے زعمہ دلی سے نعرہ لگایا۔ اور وہ دونوں اسے سلام کرتے ہوئے ایک اور تاریک گلی میں مڑ گئے۔

گلی زیادہ طویل نہیں تھی۔ ٹوٹا ہوا خالی مکان چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا۔ انہوں نے ادھر ادھر دیکھا۔ زندگی سوری تھی۔ گرد و پیش کوئی ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ مٹی روڑے اور ٹوٹی ہوئی اینٹوں کے ٹکڑوں کو پھلتا کتے وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئے کسی نے لٹکار کر کہا۔ ”غصہر جاؤ۔“

اس غیر متوقع آواز نے انہیں لرزادیا۔ اور ٹھٹھک کر وہیں ساکت ہو گئے۔ ہاس کا ہاتھ فوراً اس کی جیب پر گیا۔ دونوں نے ایک ساتھ دیکھا۔ ٹکمرے ہوئے بالوں اور بے ترتیب

دازمی والا دیکھ کر اجماع رہا تھا۔

”کون ہوتا؟“ وہ چلا یا۔

دونوں نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ وہ کوئی پاگل تھا۔ وہ دائیں بائیں جھولتا بار بار ان سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کون ہیں؟ اور یہاں کیوں آ گئے ہیں؟

”سلا پاگل ہے۔“ ہاس نے دہی زبان سے کہا اور دونوں اسے نظر انداز کرتے ہوئے پچھلے دروازے کی طرف بڑھ گئے۔ وہ اپنا دھڑوہراتا ہوا کتے پیچھے پیچھے آیا۔ لیکن وہ دروازے کی ٹوٹی ہوئی چوکت عبور کر گئے۔ سامنے سڑک نظر آ رہی تھی۔

.....

وہ بس کے اڈے کی طرف نہیں گئے۔ نہ ہی انہوں نے انٹیشن جانے کا سوچا۔ ہاس کا خیال تھا کہ انہیں کسی سے لفت لے لینی چاہیے۔ سچا دل نے اس کی طرف دیکھا۔ ”لیکن تم جانا

قریب پہنچ کر ہولے سے اس کے بالوں کو چھوا۔ وہ شاید بیٹھے بیٹھے سو گئی تھی۔ اس کے چھونے سے وہ ایک دم ڈری گئی اور اس کے ہونٹوں سے چیخ نکلی تھی۔ اس نے گھبرا کر اس کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے پچان نہ پائی ہو۔۔۔

”جھنجھو! جھنجھو! آنکھیں کھول کر دیکھ۔ میں ہوں تیرا چاچا۔ سجاد نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اس کے بالوں کو سہلانے لگا۔

وہ چند لمحے خالی خالی آنکھوں سے اس کی طرف یوں دیکھتی رہی۔ جیسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا ہو۔ سجاد نے اس کے رخسار جھپٹائے۔ ”جھنجھو! جھنجھو! دیکھ میں آ گیا ہوں۔“

”چاچا! اس کے ہونٹوں سے ایک سسکاری نکلی۔“ ”تو کہاں چلا گیا تھا ہمیں چھوڑ کر۔ تو دیکھ تو بابا کتنا پیار ہے۔ ہمارے پاس نہ دوانی ہے نہ پیسے۔ نہ کوئی یہاں آتا ہے۔ میں کیا کر دوں یہاں اکیلی۔ کدھر جاؤں۔“ اس کی آواز رندہ لگی اور آنسو اس کے سناٹوں پر رخصاؤں پر پھیل آئے۔

”بس۔ بس۔ بس۔ اب رونا مت۔“ سجاد نے اس کے آنسو پونچھ دیئے۔ ”میں آ گیا ہوں نا۔ بابا کو دوانی لا کر دوں گا۔ اسے حکیم صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔ تو ٹھہر نہ کر۔ دیکھنا بابا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

اس کے چہرے پر اطمینان کی چمک آئی۔ اس نے ددڑ کر بابا کا شانہ ہلایا۔ ”بابا! بابا! دیکھ چاچا آ گیا ہے۔ دیکھ بابا! چاچا آ گیا ہے۔ یہ تجھے دوانی لا کر دے گا۔ تجھے حکیم صاحب کے پاس لے جائے گا۔ بابا! تو بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کون ہے؟“ بوڑھے کی غنودگی میں ڈوبی ہوئی آواز جیسے کہیں بہت دور سے سنائی دی۔ سجاد بوڑھے پر جھکا اور اس کی بغل ٹھولی۔ اسے تیز غارتھا۔ جس نے اسے غافل کر رکھا تھا۔ اس نے بھی بوڑھے کا شانہ ہلا کر اسے ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔

”بابا ہوش کر۔ دیکھ میں آ گیا ہوں۔“ بوڑھے نے اپنی چوٹی چوٹی آنکھیں بمشکل کھولیں۔ جن میں سیلا سیلا پانی بھرا ہوا تھا۔ اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے پچان نہ پایا ہو۔ پھر جیسے کسی اور لمحے میں دیکھنا ہوا ہوا۔ ”تھہر بڑا! تو آ گیا۔“

سجاد کو محسوس ہوا کہ بوڑھا اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اس لئے اس نے اسے باور کرانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ کون ہے۔ نہ جانے وہ کس کے بھلاؤ سے میں تھا۔ یا اس کے

کہاں چاہے ہوں؟“

”میرے پاس دو چار ٹھکانے تو ہیں۔ لیکن میں وہاں جانا نہیں چاہتا۔ کچھ لڑکے پولیس والوں کے ہتھے چڑھ گئے ہیں۔ اگر انہوں نے کچھ بیک بکا دیا۔ تو معیت ہو سکتی ہے۔ اس لئے میں چاہتا ہوں کہ کچھ عرصہ بالکل الگ ہو کر گزاروں۔ زیر زمین۔ کیا تمہارے پاس کوئی ایسی جگہ ہے؟“

”جگہ۔“ سجاد نے سوچا۔ اسے گورکن کی کٹیا کا خیال آیا۔ وہ وہاں پناہ لے سکتا تھا اور کچھ عرصہ وہاں گزار سکتا تھا۔ وہیں وہ اس کو جانچ بھی سکتا تھا کہ جو کچھ وہ دعوے کرتا ہے۔ ان میں کتنی صداقت ہے۔ وہ کس حد تک اس کے لئے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔

اسی خیال سے اس نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”ہاں میرے پاس ایک جگہ ہے۔ جہاں تم کچھ روز الگ ٹھہک رہ سکتے ہو۔“

”تو پھر موٹی بات۔“ وہ اپنا ہاتھ بوڑھا کر بولا۔ ”دوستی کی ہے تو امتداد تو کرنا ہی پڑے گا۔“

دونوں نے ایک ٹوک پر لفٹ لی اور قبرستان جانے والی سڑک کے قریب اتر گئے۔ کچھ دور پیدل چل کر وہ قبرستان کی چار دیواری کے قریب پہنچے۔ قریب ہو رہی تھی۔ پاس ارد گرد پھیلی ہوئی قبروں کو یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے اسے کبھی قبرستان دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ سجاد نے یونہی بات کرنے کی خاطر کہا۔ ”یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ صرف ایک بابا ہے اور اس کی لڑائی۔ یہاں جنہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔“

باس خاموش ہی رہا اور جواب میں کچھ نہیں بولا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے دل پر دہشت کی چھائی تھی۔

گورکن کی کٹیا نظر آنے لگی تھی۔ لیکن معلوم ہوتا تھا۔ جیسے بوڑھا ابھی تک اٹھا نہیں۔ ورنہ تو وہ اذانوں کے ساتھ ہی اٹھ کر وضو وغیرہ کرنے میں لگ جاتا تھا۔ وہ آگے آگے کے برآمدے میں داخل ہوا۔ اور اس نے جھانک کر کمرے میں دیکھا۔ بوڑھا چٹائی پر بے مددہ سا پڑا تھا۔ اس کے قریب ہی جھیمو گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔ کمرے میں لائین کی مدد مدم کی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

سجاد کو حیرت ہوئی۔ یہ جھیمو صبح ہی صبح اس طرح کیوں بیٹھی تھی۔ وہ تو صبح ہونے تک سوئی رہتی تھی۔ بابا اسے آوازیں دے دے کر بگاتا تو ابھی تھی۔ سجاد نے جھیمو کے

ذہن میں کون ایسا تھا۔ جس کے آنے کی آس اس کی سانسوں کی ڈوری کے ساتھ بندھی تھی۔
 ہاس جو پہلے ہاتھ باندھے کچھ اعتبار اب اور کراہیت کے سے عالم میں الگ الگ سا
 کھڑا تھا۔ وہ بھی ذرا قریب آ گیا۔ اور جبکہ کر بڑھے کی طرف دیکھنے لگا۔

سجاد نے ہولے ہولے بوڑھے کا بازو تھپتھپایا۔ اور اسے حوصلہ دینے کو بولا۔

”ہاں بابا! میں آ گیا ہوں۔ میں نے تیرے پاس نہیں آنا تھا۔ تو کس کے پاس آنا
 تھا۔ آنکھیں کھول۔ دیکھ میں آ گیا ہوں۔ تیرا قد بڑھا۔“

بوڑھے کے سستے ہوئے جھروں بھرے چہرے پر تازگی کی ایک لہری لہرائی۔ اس کی
 آنکھوں کے پتھوں میں حرکت ہوئی۔ اس نے پھر ایک بار ایک گدلی گدلی آنکھیں کھولیں۔ جن
 میں اشتیاق اور ایک طویل انتظار کے بار آور ہونے کی خوشی تھی۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن
 قنات اور بخار کی سختی نے اسے کچھ نہیں کہنے دیا۔ لیکن اس کے بوڑھے چہرے پر بھرتی
 طمأنینہ تار ہی تھی کہ اس نے اس کی بات سن لی تھی۔

سجاد نے جیسو سے کہا۔ ”بابا کا بخار تیز ہے۔ تو تھوڑا پانی کنورے میں ڈال کر لے
 آ بابا کے سر پر گیلی چٹایا رکھنی ہیں۔“

جیسو دوڑ کر پانی لے آئی۔ پھر اس نے کپڑے کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا اور عالم
 کوئی کپڑا موجود نہ پا کر اپنی میلی اور مٹی کا پلہ بھگو کر ہی بابا کے سر اور پیشانی پر رکھنے لگی۔
 ”بابے کی حالت ٹھیک نہیں۔“ سجاد نے ہاس سے کہا۔

”ہوں۔“ وہ چونک گیا اور اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”کیا کھاتم ہے؟“

”میں کہہ رہا ہوں کہ بابا کی حالت ٹھیک نہیں۔ اسے دوائی کی ضرورت ہے۔“ سجاد
 نے وضاحت کی۔

ہاس کسی سوچ میں تھا۔ اس نے ایک نظر بوڑھے پر ڈالی اور پوچھنی اثبات میں سر ہلایا۔
 سجاد نے جیسو سے پوچھا۔ تو اس نے بتایا کہ وہ گاؤں کے حکیم کی دوائی اسے کھلا رہی ہے۔
 مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔

قصہ یہاں سے کافی فاصلے پر تھا۔ جہاں کوئی بہتر ڈاکٹر مل سکتا تھا۔ اس کے لئے کسی
 کا قہقہہ تک جانا ضروری تھا۔ سجاد ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ خود جائے بابا کو بھیجے۔ کہ چاچک
 بابا غفلت میں پھر بڑبڑایا۔ وہ پھر وہی نام لے رہا تھا۔

”یہ قدر کون ہے؟ تم جانتے ہو اسے۔“ ہاس نے پوچھا۔

سجاد نے لاطینی ظاہر کرنے کو نشانے اچکائے۔ وہ بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں
 جانتا تھا۔ لیکن جس اعزاز میں وہ اس کا نام لے رہا تھا۔ اس سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ قدر اس
 کا بیٹا تھا یا کوئی قریبی عزیز۔ سجاد کو یہ خیال آیا کہ کہیں وہ جیسو کا باپ ہی نہ ہو۔

یہی جاننے کو اس نے جیسو سے پوچھا۔

”یہ قدر کون ہے؟“

”رب جانے۔“ اس نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

بوڑھا اب بھی وقفے وقفے سے اس کا نام لے رہا تھا۔ سجاد اس پر جھکا اور اس کا
 شانہ ہلا کر پھر ایک بار بولا۔

”بابا! میں آ گیا ہوں۔ تو فکر نہ کر۔ اب تو ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک۔“

بوڑھا اب قدرے ہوش میں آ رہا تھا۔ اس نے اپنا سر تھمایا ہوا سا ہاتھ قنات سے اٹھا
 کر اس کے بازو پر رکھا اور ڈوپٹے ہوئے کچھ میں بولا۔ ”قدر بڑا۔ میرا دل کہتا تھا۔ تو ایک
 دن ضرور آئے گا۔ اپنے بڑے بیٹے کا کچھ غصہ کرنے۔ مجھے یہ تھا چڑ کہ تو آ جائے گا۔ آخری
 وقت میرے منہ میں پانی ڈالنے۔ مجھے مٹی دینے۔ جس طرح بڑ بچے اپنے ساتھ بھا کر لے گیا
 تھا۔ اسی طرح تو بڑ کے ساتھ بہتا میرے پاس آ جائے گا۔“

اس کے ٹوٹے پھوٹے تھروں اکڑے ہوئے لفظوں اور ڈوپٹے ہوئے لہجے سے
 سجاد کو قدر کی کہانی بتانے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے سر اٹھا کر ہاس کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ
 اس جگہ نہیں تھا۔ جہاں وہ کھڑا تھا۔ وہ شاید اسے اٹھا گیا تھا۔ اور طاقن میں رکھے
 ہوئے چراغ اور دوسری چیزوں کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ سجاد کو اندازہ ہو گیا کہ وہ بے حد
 تیز رہ رہا ہے۔

بوڑھا وقفے وقفے سے اپنی بے ربط باتیں دوہرائے چلا جا رہا تھا۔ سجاد نے اس کا
 کمرور سا ہاتھ تھاما اور نرمی سے بولا۔

”بابا! تو فکر نہ کر اللہ نے چاہا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں شہر جا کر تھرے لئے
 دوائی لاتا ہوں۔ بس تو مٹوں میں بھلا چکا ہو جائے گا۔“

”نہ۔ نہ۔ نہ۔ تو نہ جانا تو نہ جانا۔ اب مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔“ بوڑھے کی قنات
 آلود آواز اکڑے ہوئے سانسوں کے ساتھ پھر ڈوپٹے ابھرنے لگی۔

”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بابا۔ تو گھبرا مت۔ میں نہیں جانتا۔ میرا دوست جا کر دوا لی لے آئے گا۔“ سجاد نے بوڑھے کو تسلی دی۔

بوڑھا تھک کر کچھ غافل ہوا۔ تو سجاد اٹھ کر باس کے پاس آیا۔ وہ کچھ الجھا ہوا سا ابھی تک طاق میں رکھی ہوئی لائین کی جی بے خیالی میں بھی اونچی اور بھی سنبھلی کر رہا تھا۔

”یار! میرا خیال ہے۔ مجھے جیسے کچھ جانتا ہی پڑے گا۔ باپے کی حالت ٹھیک نہیں۔“ سجاد نے اسے مخاطب کیا۔

وہ کسی گہری سوچ سے چٹکا اور اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ ”یار اتم یہیں ٹھہرو۔ میں ذرا جیسے سے باپے کے لئے دوا لی لے آؤں۔ نہیں تو پتہ چار نہیں پڑے پڑے مر جائے گا۔“

”ہوں۔“ اس نے لمبی سی ہوں کی اور جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ بڑے کرنی نوٹ نکالے۔ ”یو۔ ڈاکٹر کو ساتھ لیتے آنا۔ جتنے پیسے مانگتے دے دیتا۔“

سجاد کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ بوڑھے کی کسبہ نے باس کو بھی متاثر کیا تھا۔

”نہیں یار اتم پیسے رکھو۔ میرے پاس ہیں۔ ڈاکٹر تو یہاں آنے پر راضی نہیں ہوگا۔ اسے یہاں لانا ٹھیک بھی نہیں ہوگا۔ میں اسے اچھی طرح حقیقت بتا کر دوا لی لے آؤں گا۔“

”نہیں۔ نہیں پکڑو۔ جیب میں پیسے اچھے ہوتے ہیں۔“ اس نے پیسے اس کی جیب میں ڈال دیئے۔

سجاد نے چلتے چلتے کہا۔ ”یار! میں جلدی آنے کی کوشش کروں گا۔ اگر تجھ سے ہو سکے۔ تو اتنا کر دینا کہ جب تک میں نہیں آ جاتا۔ تو باپے کے سامنے ذرا قدر بنا رہتا۔ بوڑھا آدمی ہے۔ کیا پتہ اس کی کتنی زندگی باقی ہے۔ ہمارا اتنا کر دینے سے وہ خوش ہو جائے گا۔ تو ہمارا کیا جاتا ہے۔“

باس نے نہ ہاں کی نہ نہیں۔ اور غم رضامندی سے سر ہلا دیا۔

○.....○.....○

سجاد دوا لی لے کر آیا۔ تو ساتھ کھانا بھی لیتا آیا۔ دوا لی کھا کر بوڑھے کی حالت سنبھل گئی۔ یا اس کے ذہن میں جینے سے مل جانے کا جو اطمینان پیٹھ گیا تھا۔ اس نے اسے آسودہ کر دیا۔ اس نے تھوڑا سا دودھ بھی پی لیا۔ اور بار بار آنکھیں کھول کر باس کی طرف دیکھتا رہا۔

”واہ بھئی۔ تم نے تو باپے کو خوب یقین دلایا ہے کہ تم قدر پرا ہو۔ وہ بار بار تمہیں دیکھ کر اطمینان کر رہا ہے کہ کہیں تم چلے تو نہیں گئے۔“ سجاد نے ہنس کر کہا۔

”اچھا ہے یار! اسی بہانے یہاں کچھ روز رہ تو لیں گے۔ دیسے یہ جگہ ہے محفوظ۔ تھوڑے دن یہاں گزارے جاسکتے ہیں۔“ وہ بولا۔

باس بے کی حالت سنبھل جانے پر جھیمو بہت خوش تھی۔ اس کا سالا چہرہ دکھ اٹھا تھا اور وہ حسب عادل معصوم معصوم سی خوش باتیں کرنے لگی تھی۔ سجاد کا لایا ہوا کھانا۔ جھیمو نے برتن میں نکال کر ان کے سامنے رکھ دیا تھا۔ دونوں نے رات سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ اس لیے بھوک خوب چمک اٹھی تھی۔ جھیمو کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے دونوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔

ہاتھ پوچھ کر سجاد نے اس کی طرف دیکھا۔ ”تو یار قدر! پھر تم یہیں ہوتا۔“

”اور تم؟“ اس نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔

”میں ذرا شہر جاؤں گا۔ ایک آدھ دن کیلئے۔ تھوڑا کام ہے۔“ سجاد نے جواب

دیا۔

”نہ چا چا! نہ۔ تو مت جانا۔“ جھیمو جو غافلانہ کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے اس کا دامن تھام لیا۔ ”مجھے ڈر لگتا ہے۔ تو بھلا پھر تیار ہو جائے گا۔ پھر میں کیا کروں گی اکیلی۔“

”قائل کا پتہ چل جاتا تو۔“ اس نے دانت کچکا کر منہ میں گالی بکی۔

”کس پر شک ہے۔“ سجاد نے پوچھا۔

اس نے عجیب سی نظروں سے اسے سر سے سر تک دیکھا اور منہ بگاڑ کر بولا۔ ”میں

یہاں کھڑا ہو کر شک میں لوگوں کے نام لیتا پھرتا ہوں۔“

سجاد شرمندہ سا ہو گیا۔ اور کچھ آگے بڑھ آیا۔ وہ گرد و پیش تلاش نکالوں سے دیکھ رہا تھا۔ کہ کوئی ایسی شے اس صورت نظر آئے۔ جس سے وہ کچھ معلومات حاصل کر سکے۔ لیکن خود لوگوں سے چھپ بھی رہا تھا کہ کسی کی نظروں میں نہ آجائے۔

ہال نما کرے میں اس نے سجاد کی گردن دیکھا۔ اونچے شیلے والی پگڑیوں، فوپیوں، بالوں سے بھرے ہوئے سروں اور چمکتے ہوئے گھنے سروں کے درمیان وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکا۔ اس نے قریب کھڑے ہوئے ایک آدمی سے پوچھا۔

”یار ارمیت کدھر رہتی ہے؟“

”میت پولیس نے مٹی ہے پوسٹ مارٹم کیلئے۔“ اس نے اطلاع دی۔

سجاد ادھر ادھر گھومتا پھرا کہ شاید کوئی کام کی بات ہی معلوم ہو جائے۔ لیکن بے سود۔ لوگ آپس میں پوچھ گویاں کر رہے تھے۔ قیاس آرائیاں جاری تھیں۔ جن سے اتنا ہی پتہ چل رہا تھا کہ اس کی جیب پر کسی دوسری گاڑی سے گولیاں چلائی گئی تھیں۔ دشا تو موٹے پر ہلاک ہو گیا تھا۔ اس کے دو محافظ شدید زخمی تھے اور بیان دینے کے قابل نہیں تھے۔

وہ اس کی حویلی میں بلا موقع گھومتے گھومتے آگیا تھا۔ دشا کے ساتھ اس کا کوئی جذباتی تعلق تو نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی اس کی موت نے اسے دھچکا لگا دیا تھا۔

پوسٹ مارٹم کے لئے مٹی ہوئی لاش ابھی تک وہیں نہیں آئی تھی۔ کسی نے بتایا تھا کہ سرکاری ڈاکٹر قبے سے باہر گیا ہوا ہے۔ رپورٹ کے لئے اس کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ پوسٹ مارٹم جلد نہ کرنے کی وجہ سے ہسپتال کے عملے اور دشا کے لواحقین میں باہمی بانی ہو گئی ہے۔ غرض جتنے جتنے تھے اتنی باتیں۔ لوگوں کے پاس کرنے کے لئے کچھ نہیں تھا۔ وہ لاش کے انتظار میں قارغ بیٹھے طرح طرح کی خیال آرائیاں کر رہے تھے۔

سجاد بھی کسی کمرے میں ہوتا۔ کبھی دالان میں۔ اور کبھی وسیع صحن میں۔ لوگوں کے مختلف گردہوں کی آپس میں گفتگوں کر سگندہ کڑیاں ملانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی دوران وہ برآمدے میں سے گزرا۔ تو اسے اچانک اپنا نام سنائی دیا۔ وہ ٹھٹک گیا۔ آواز نسوانی تھی۔

”یہ قدریر جو یہاں رہے گا تمہارے پاس۔ میں تیرا چاچا ہوں۔ تو یہ تیرا ماما ہے۔ پھر میں ایک دو دن میں واپس آ جاؤں گا۔ تو فکر نہ کر۔ اب بابا بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔ پھر بھی پیار نہیں ہوگا۔“ سجاد نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

محمود نے ایک نظر پاس کی طرف دیکھا۔ پھر جھجکی مٹی۔ وہ ابھی اس سے بے تکلف نہیں ہوئی تھی۔ پاس نے قریب آ کر اس کے بالوں پر اوپر سا ہاتھ پھیرا۔ لیکن منہ سے کچھ نہیں بولا۔ سجاد نے انہیں خدا حافظہ کہا اور قبرستان سے باہر نکل آیا۔

.....

وہ دشا کی حویلی پہنچا۔ تو اس کے باہر ایک بڑا انجم موجود تھا۔ اس کا ہاتھ ٹھٹکا۔ ضرور کوئی ایسی دیکسی یا بات تھی۔ اس نے کسی سے استفسار نہیں کیا اور سر جھک کر بھوم سے چلا۔ احاطے میں داخل ہوا۔ ایک جانب دشا کا ملازم کھڑا تھا۔ جو اسے پہچانتا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچا اور اسے متوجہ کیا۔

”کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟“

”جہیں نہیں پتہ۔“ وہ درستی سے بولا۔

”نہیں۔“ سجاد نے عاجزی سے کہا۔

”چودھری دشا دقت ہو گیا ہے۔“ اس کی آواز زردھ مٹی تھی۔

سجاد بھی دھک سے رہ گیا۔ گھرے دکھ اور مایوسی نے اسے بڑھوسا کر دیا۔ اسے انفسوس سا ہونے لگا کہ اس نے دشا سے ملنے میں اتنی دیر کیوں کر دی تھی۔ نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتا تھا اور اس نے اسے کیوں بلایا تھا۔ یہ ایک ایسی الجھن تھی جو اب کسی ریف نہیں ہو سکتی تھی۔

اس کے سارے منسوبے ایک مرتبہ پھر خاک میں مل گئے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ شاید دشا داس کا پست پناہ بن جائے۔ وہ اس کا آسرا لے کر اپنی بہن کو تلاش کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ رانی کو تڑپا تڑپا کر مارنے والے سے اس کی خرید ویں کا بدلہ لے لیتا۔ اور ملاں کے ہاتھ کا سکتا۔ جس نے شہزادی جیسی نٹ کھٹ اور بوری لڑکی کو بازار کی بیس بنا دیا تھا۔

دشا کے ملازم نے اسے گم سم دیکھ کر آگے بڑھ جانا چاہا۔ لیکن سجاد نے اسے روک لیا۔ ”بات سن یا قائل کا کچھ پتہ چلا؟“

اس نے فوراً پلٹ کر نہیں دیکھا۔ لیکن دل ہی دل میں حیران ضرور ہوا کہ یہاں کون اس کو جاننے والا ہے۔ پھر اس کا نام کسی نے لیا۔ تو سجاد نے گھوم کر دیکھا۔ برآمدے میں کوئی عورت سیاہ برقعے میں لمبوں کمزری تھی۔ اس نے ریشمی ثواب کو اس طرح ایک ہاتھ سے تمام رکھا تھا کہ اس کا اوجھا چہرہ چھپ گیا تھا۔ لیکن پھر مجری سجاد نے اسے پہچان لیا۔

”نیلیم!“ سجاد نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں اس کا نام دوہرایا۔ اور ادھر ادھر دیکھا کہ کہیں کوئی رکھتے تو نہیں رہا۔

برآمدے میں اکا دکا لوگ آ جا رہے تھے۔ نیلم ایک کمرے کے دروازے کی طرف بڑھی۔ سجاد بھی قریب آ گیا۔

”تم یہاں کہاں؟“ اس نے کہا۔

سجاد نے جواب نہیں دیا۔ وہ دروازہ کھولنے ہوئے ہوئی۔

”آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔“ وہ پردہ اٹھا کر اندر چلی گئی۔

سجاد کچھ جھجکا۔ پھر وہ بھی اس کے پیچھے اندر چلا گیا۔ وہ ایک دیہاتی طرز پر آراستہ بیٹھک تھی۔ جس میں ایک بڑا بیگ دو کرسیاں اور میز رکھا ہوا تھا۔

نیلیم یونہی ایک کرسی کے بازو پر ٹک گئی اور افسردہ سے لہجے میں ہوئی۔ ”ولشاد بھچارے کے ساتھ اچھا نہیں ہوا۔“

”ہاں۔“ سجاد نے اس کے اداس چہرہ پر ایک بھر پور نگاہ ڈالی۔ اس کی آنکھیں کچھ دیر پہلے بہہ جانے والے آنسوؤں کی خبر دیتی تھیں۔ بلی بلی کی سرخی ان کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھی۔

”تمہیں بہت افسوس ہوا ہے۔“ سجاد نے اس کی غیر معمولی افسردگی کو محسوس کر کے کہا۔

”ہاں۔ افسوس کی بات تو ہے نا۔ بھچارہ اچھا آدمی تھا۔“ وہ پرمردگی سے ہوئی۔

”کسی دن تمہیں میرے بارے میں بھی ایسی خبر خیر مل جائے گی۔“ یہ نہیں تم افسوس بھی کرو گی یا نہیں۔“ نہ جانے کیوں سجاد نے بلا ارادہ ہی کہہ دیا۔

”خدا نہ کرے۔“ اس نے بے ساختہ کہا۔

”ایسی باتیں کیوں منہ سے نکالتے ہو۔ ابھی تو تم نے بہت کچھ کرنا ہے۔“

”یہ نہیں تقدیر اس کا موقع بھی دیتی ہے یا نہیں۔“ سجاد نے ناپوی سے کہا۔

”سوچنا کچھ ہوں اور ہو کچھ جاتا ہے۔ سارے راستے بند ہی بند ملتے ہیں۔“

وہ چپ سی ہو گئی اور جیسے کسی بات کو دل ہی دل میں تو لیتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹ یوں لرزے جیسے کچھ کہا جاتا ہو۔ لیکن کہہ نہ پائی ہو۔ سجاد نے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“

”بات تو کچھ نہیں۔“ نیلم نے شینٹا کر سر جھکا۔ پھر گلا صاف کر کے ہوئی۔

”ہاں۔ میں نے تم سے پوچھا تھا کہ اس روز بخت آور تمہیں کہاں ملی تھی؟“

”بخت آور! کون بخت آور؟“ سجاد نے غائب دماغی سے کہا۔

”بھئی وہی لڑکی۔ جسے اس دن تم کو کھٹے پر لے آئے تھے۔“ نیلم نے یاد دلایا۔

”اچھا۔“ سجاد کو یاد آیا۔ اسی نے تو سارا کام بکا ڈا۔ میں دلشاد سے ملنے یہاں آیا تھا۔ دلشاد نے خود پیغام بھیج کر بلایا تھا۔ وہ کہیں کام سے گیا تھا کہ یہ مجھے ٹکرائی۔ میں نے تو معصیت زدہ سمجھ کر اس کی مدد کی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ وہ اس قسم کی عورت ہے۔ بس اسی کی وجہ سے اتنا خوار ہوا۔ آج یہاں آیا ہوں۔ تو یہ خبری ہے۔“

نیلیم نے پچھلا ہونٹ دانتوں تلے دالیا۔ اور مساف سی ہو کر ہوئی۔ ”تم نے اس کو غلط سمجھا۔ وہ بیماری والی معصیت زدہ ہے۔ قسمت کی ماری ہے۔ بتانا وہ کھٹے سے بھاگتی ہے۔ اتنا ہی کوٹھا اس کے پیش آتا ہے۔“

”تو کہیں مرکب کیوں نہیں جاتی۔ جو یوں خوار ہوتی پھرتی ہے۔“ سجاد نے حقارت سے کہا۔

نیلیم تھلا گئی۔ ”مرنا اتنا آسان نہیں۔ جتنا تم سمجھتے ہو۔ جتنے آرام سے تم کہہ رہے ہو۔“

سجاد اس کے ساتھ بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔ نہ جانے اس کی کیا مجبوریاں تھیں۔ کیسے مسئلے تھے۔ وہ عورت تھی۔ اور اپنی طرح کی عورتوں کے مسئلے اور مجبوریاں جانتی تھی۔ اسی لئے اس نے اس کی بات کو نظر انداز کر کے یونہی موضوع بدلنے کو کہا۔

”چلو جانے دو اس ذکر کو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”اور کیا بات کروں۔“ وہ غموزی تلے ہاتھ رکھ کر مایوسی سے کہنے لگی۔ ”بس طبیعت بگڑا چائی ہو گئی ہے۔“

”ولشاد کی وجہ سے۔“ سجاد نے پوچھا۔

سجاد کو کمرے میں بے چینی سے ٹھٹھلے لگا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس کے ساتھ یہاں یہ گزرے گی۔ وہ تہا ہوتا تو اور بات تھی۔ لیکن اب اس کے ساتھ نیلم بھی تھی۔ جس کے بارے میں اکثر لوگوں کو علم تھا کہ وہ دشاؤں کی منہو نظر تھی۔

”سجاد تم بھی آرام سے بیٹھ کر سو جا۔ اس طرح پریشانی میں تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آئے گا۔“ نیلم نے اس کی بے چینی اور بھکی کو محسوس کر لیا تھا۔

سجاد نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

سجاد نے بھی محسوس کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اسے سکون کی ضرورت ہے۔ وہ قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور اپنے اعصاب کا تناؤ دور کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

”میرا خیال ہے۔ ہمیں دروازہ دھککاٹنا چاہیے۔ کوئی آتا جاتا ہے۔ دروازہ کھول دے گا۔ دشاؤں کے سارے ملازم مجھے پچھانتے ہیں۔“ نیلم نے تجویز پیش کی۔

”پر میرا اہتمام اسے ساتھ ہونا ٹھیک نہیں۔“ سجاد نے کہا۔

”اس کو چھوڑ دو۔“ وہ بے نیازی سے کہنے لگی۔ ”میں کوئی کوئی خاندانی عورت ہوں۔ میرے ساتھ کسی کا ہونا کوئی ایسی بڑی بات نہیں۔“

”لیکن اب ہے۔ دشاؤں کو بچا ہے۔ اور سب اس کے ساتھ تمہارے تعلق کو جاننے ہیں۔ پولیس تو پھر معمولی معمولی باتوں کو بھی نہیں چھوڑتی۔ تمہیں وہ کچھ کہنے کے بجائے محسوس ضرور دھر لے گی۔ دشاؤں کا قریب سمجھ کر۔“

”نہیں۔ میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ سجاد میرے ہوتے تم پر آج بھی نہیں آ سکتی۔ وہ بے ساختہ کہنے لگی۔

سجاد نے غور سے اس کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں سچ کی نمی تھی۔ سجاد کو اس کا اس طرح کہنا اچھا لگا۔ لیکن حقیقت سے فرار ممکن نہیں تھا۔ اس نے ہلکی سی ہنسی کے ساتھ کہا۔

”یہ سب کہنے کی باتیں ہیں نیلم! یہاں تمہاری کوئی نہیں سنے گا۔ ان دولت والوں کے مقابلے میں عام لوگوں کی کون سنتا ہے۔“

نیلم اب جیسے کہ اس کی اور قدم قدم بستی اس کے نزدیک آئی۔ اس نے اپنا ملازم گورا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا اور کچھ کہنے والی تھی کہ دروازہ دھڑ سے کھلا۔ دونوں نے بوکھلا کر

”نہیں۔ اس کی وجہ تو نہیں۔“ وہ یوں کہنے لگی جیسے خود بھی اپنے جذبات کی تہ تک پہنچنے سے قاصر ہو۔ پھر مجھے اپنے آپ سے بولی۔

”پتہ نہیں کیا بات ہے۔ جس کی سمجھ نہیں آئی۔“

سجاد اس کے جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ دروازہ کھلا اور کسرتی جسم والا ایک لمبا تڑخ محسوس ہوا۔ دھککٹ کر اندر داخل ہوا اور سرخ آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ دانت جیس کر بولا۔ ”اچھا۔ تو یہاں بیٹھی ہے اپنے پار کے ساتھ۔ مجھے تو پہلے ہی شک تھا کہ سب تیرا ہی کیا دھار ہے۔ تو فکر نہ کر۔ میں نے تجھے چھوڑ دیا گا۔ نہ تیرے اس پار کو۔“

نیلم گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھی اور بونجلی سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سجاد کو لمے بھر تو اعزاز نہیں ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اور اس سے اس کا کیا مطلب ہے۔ وہ کچھ دیر ان کی طرف گھورتا ہوا مشغولت بکرا رہا۔ پھر اس نے یکدم دروازہ بند کر دیا۔ سجاد تیزی سے دروازہ کھولنے کیلئے آگے بڑھا۔ لیکن اس نے باہر سے کڑی لگا دی۔

سجاد نے دروازہ دھکیلا۔ لیکن وہ مضبوطی سے بند تھا۔ اس نے پلٹ کر نیلم کی طرف دیکھا۔ وہ زرد چہرے کے ساتھ سینے پر ہاتھ رکھے سراپہ کڑی تھی۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے سامنے آیا تھا کہ دونوں کو صورتحال سمجھنے اور اس پر یقین کرنے کو وقت چاہیے تھا۔

سجاد نے ناول میں داخل آتے ہوئے سچی سے کہا۔

”یہ کون تھا گا کیا بچہ۔ تم جانتی ہو اسے؟“

”ہاں۔ یہ دشاؤں کا رشید ہے۔ مگر یہ تو اچھا بھلا تھا۔ اسے پتہ نہیں کیا ہوا ہے۔“ اس نے تنقید چہرے کے ساتھ جواب دیا۔

سجاد کو بھی صورتحال کی سختی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ محسوس کوئی جتنی معلوم ہوتا تھا۔ باہر کڑی لگا کر وہ نہ جانے کیا کرنے والا تھا۔ اگر وہ پولیس کے سامنے کوئی ایسی سیدھی بات کہے گا تو بھی ان کے لئے مصیبت کھڑی ہو سکتی تھی۔

”سجاد! اب کیا ہوگا؟“ نیلم نے پریشانی سے کہا۔

سجاد نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ”تم آرام سے بیٹھو۔ کچھ سوچتے سمجھتے دو۔“

دیکھتے ہیں کہ کیا کرتا چاہیے؟“

وہ حیران حیران سی چپ چاپ پٹنگ پر بیٹھ گئی اور اضطراب میں ہاتھوں کی انگلیاں مردنے لگی۔

آنے کیلئے کہا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔ سجاد نے چند لمبے انتظار کیا تاکہ نلیم چند دم آگے بڑھ جائے تو وہ دروازے میں سے نکلے کہ اچانک اسے شور اور مغلطہ گائیوں کی گردان سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی نلیم کی چیخ بھی سنائی گئی۔

سجاد تیزی سے باہر نکلا۔ اس نے دیکھا کہ اسی جنوبی آدنی نے نلیم کو بالوں سے پکڑ رکھا تھا اور دانت پیس جیس کر کھ رہا تھا۔

”میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ تو جی نہیں سکتی میرے ہاتھ سے۔ کہاں ہے تیرا پاپا!“

نلیم اس کے ہاتھوں میں کسی ہنسی مٹی چڑیا کی طرح بے بس تھی۔ سجاد ایک لمحہ ضائع کے بغیر اس پر جا پڑا۔ اور جھٹ کر نلیم کو اس کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا۔ وہ شخص دیوانگی سے اس کی طرف پلکا۔ سجاد اس کے لیے تیار تھا۔ اس نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر وہ دیوانگی میں کسی بھیسے کی طرح طاقتور ہو چکا تھا۔ وہ اندھی قوت میں پھر سجاد پر بھجنا۔ لیکن وہ پھرتی کے ساتھ اس کے راستے سے ہٹ گیا۔ وہ اپنے ہی زور میں دوسرے کمرے کے کھڑے سے ہونے دروازے پر جا پڑا۔ اس کی چوٹ سے دروازہ ٹٹل گیا اور وہ اندھا دھند سیدھا اندر جا کر اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی سجاد نے بجلی کی سرعت سے دروازہ بند کر کے کٹری چڑھا دی۔

تب تک دلشاد کے دوسرے ملازم بھی آگئے تھے۔ وہ شخص بری طرح سے دروازہ بند رہا تھا۔

”یہ رشید کو کیا ہو گیا ہے۔ بالکل ہی پاگل ہو رہا ہے۔ مجھے تو جان سے مارنے لگا تھا۔“ نلیم نے اپنے بچے ہوئے ہال ہاتھوں سے برابر کرتے ہوئے کہا۔

”بس آپ باجی۔ ممد سے بے پیارے کا دماغ چل گیا ہے۔ بڑا افسوس ہے جی اس نے آپ کے ساتھ اتنی بدچیزیں کی۔“ وہ معذرت کرنے لگا۔

وہ شخص اب اسے زور سے دروازہ کھٹکھا رہا تھا کہ اس کی چوٹ بٹنے لگی تھی۔

”اس کا کچھ کر بھی نہیں تو یہ دروازہ توڑ دے گا۔“ نلیم نے انہیں متوجہ کیا۔

”اچھا آپ باجی! اب اس کو پکڑ رکھو کہ کسی ڈاکٹر کے پاس لے کر جاتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”اللہ ہی انہار کرے۔“

”اچھا میں چلتی ہوں۔ دلشاد کی لاش آئی تو مجھے اطلاع کرنا۔“ نلیم نے کہا۔

”ٹھیک ہے آپ باجی۔ جیسی آپ کی مرضی۔“ وہ بولا۔

دیکھا۔

وہ شخص دروازے میں کھڑا تھا۔ اس کے نقوش بگڑے ہوئے تھے اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ وہ دانت پیس کھڑا تھا۔

”الو کی بھئی! میں تجھے اور تیرے اس یار کو سیدھا کر دوں گا۔ تو کیا سمجھتی ہے کہ دلشاد کا کوئی نہیں۔“

سجاد تیزی سے اس کی طرف پلکا۔ لیکن وہ فوراً ہی مغلطات بکنا ہوا دروازہ بند کر گیا۔ سجاد نے بجلی کی ہی سرعت سے دروازے کو پورے زور سے دیکھنا چاہا۔ لیکن وہ شخص اس سے زیادہ پھر تیزا ثابت ہوا۔ اس نے فوراً ہی چھٹی چڑھا دی۔

سجاد اور نلیم نے ایک ساتھ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ محلے کی بگینی سے قطع نظر انہیں ہنسی آگئی۔ اس شخص کی یہ حرکت اتنی عجیب و غریب تھی کہ پہلا تاثر ہنسی کا ہی مرتبہ ہوتا تھا۔

”بالکل ہی پاگل ہو گیا ہے۔ یہ تو۔“ نلیم نے ہنستے ہنستے کہا۔

”ہاں پاگل تو ہے ہی۔ اور ساتھ ہی میں بھی پاگل بنا رہا ہے۔ اچھا اب آیا۔ تو اس کا کوئی بندوبست کرنا ہی پڑے گا۔“ سجاد نے کہا۔

”نہیں۔ اب اس کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم ایک طرف پردے کی اوٹ میں ہو جاؤ۔ میں دروازہ کھٹکتی ہوں۔ کوئی تو دروازہ کھولے گا۔ اگر وہی ہوا۔ تو تم اچانک قابو کر لینا۔ اگر کوئی اور ہوا۔ تو میں ظاہر کروں گی کہ میں کمرے میں اکیلی ہوں اور کوئی غلطی سے دروازہ بند کر گیا ہے۔“

سجاد کو بھی اس کی یہ تجویز معقول معلوم ہوئی۔ نلیم نے دروازہ زور سے کھٹکایا۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے پھر پوری قوت سے کئی بار دستک دی۔

تھوڑی دیر بعد باہر سے چھٹی کھٹنے کی آواز سنائی دی۔ سجاد چونکا ہو گیا۔ پھر دروازہ کھلا۔ نلیم نے قدر سے ہنسی سے کہا۔

”یہ کون دروازہ بند کر گیا ہے۔ پتہ نہیں میں یہاں بیٹھی ہوئی ہوں۔“

”خبر سے کون تھا؟“ جوا پاسی نے کہا۔

پھر نلیم کی آواز سنائی دی۔ ”بس تم جاؤ۔ میں نے دروازہ ہی کھلوایا تھا۔“

جاتے ہوئے قدموں کی صدا سنائی دی اور نلیم نے پلٹ کر اندر جھانکا اور سجاد کو

سجاد ایک جانب لاطلق سا کھڑا تھا۔ کسی کو یہ پتہ نہیں چل سکا تھا کہ وہ بھی نیلم کے ساتھ اس کمرے میں تھا۔ نیلم چلتے چلتے اس کے برابر ٹھہری اور ہولے ہولے بولی۔

”سجاد! انہیں ایک بہت ضروری بات بتانی ہے۔ فرمت ملے تو میری طرف آنا۔“
سجاد کچھ دیر اور دشاؤ کی حویلی میں ٹھہرا۔ لیکن لاش آنے میں ابھی کافی دیر معلوم ہوتی تھی۔ لوگ بھی اکتانے لگے تھے۔ کچھ اٹھ کر باہر جا رہے تھے۔ سجاد بھی دشاؤ کی حویلی سے باہر نکل آیا۔ ایک تندور پر بیٹھ کر اس نے کھانا کھایا۔ سگریٹ خریدے۔ بھر دت گزاری کیلئے اصرار دلا مگر وہ غصہ مچوٹا پھرا۔

معا سے خیال آیا کہ نیلم جاتے جاتے اسے اپنے یہاں آنے کی دعوت دے مٹی تھی۔ اس نے کوئی ضروری بات بتانے کا تذکرہ بھی کیا تھا۔ لیکن سجاد کا یہی خیال تھا کہ وہ یونہی کہہ مٹی تھی تاکہ وہ آنے بغیر نہ رہ سکے۔

اس نے سوچا کہ وہ نیلم کے یہاں کچھ وقت گزار سکتا ہے۔ تاکہ دشاؤ کے بارے میں پتہ چلا سکے۔ وہ جانا چاہتا تھا کہ اس کیس میں چودھری اور استانی نور کا کوئی ذکر آتا ہے یا نہیں۔

نیلم کے بالا خانے کی سبزیوں میں طے کر کے وہ اوپر پہنچا۔ تو بھدے جسم والی چٹوال ٹانگہ سے سامنا ہو گیا۔ اس نے یونہی دروازہ میں اسے سلام کر دیا۔ اس رعنوت سے ایک ٹھہہ اس کے سراپے پر ڈالی اور طرے لہجے میں بولی۔

”اللہ کی شان ہے۔ اب ایسے ایسے لوگ بھی نیلم سے ملنے کیلئے آتے ہیں۔“
سجاد نے سر جھٹک کر فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ بھلا اسے اس عورت کی پروا کیا تھی۔ جب نیلم بھی لاکھوں دلوں کی دھڑکن کے دل میں اس کے نام کی دھڑکنیں تھیں۔ اس نے بے ہنگم نیلم کے دروازے پر دستک دے ڈالی۔
نیلم نے فوراً ہی دروازہ کھول دیا اور مسکرا کر بولی۔ ”تم نے بہت دیر کر دی۔ خیریت تو تھی نا۔“

”ہاں۔ بس خیریت ہی ہے۔“ سجاد نے تھکے تھکے سے لہجے میں کہا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

”تھک گئے ہو شاید۔ کچھ دیر آرام کر لو۔“ وہ اپنے بیڈ کی طرف اشارہ کر کے بولی۔
”نہیں۔ میں یہیں ٹھیک ہوں۔“ وہ تانگیں پھارتا ہوا بولا۔

”ایسا بھی کیا تکلف ہے۔ آ جاؤ نا۔“

”نہیں بھئی۔ مجھے اس قسم کے نرم بستروں پر سونے کی عادت نہیں ہے۔“ وہ بے

نیازی سے بولا۔

”ہاں۔ تم مجھے وہ ضروری بات بتاؤ۔ جس کے لئے تم نے مجھے یہاں بلایا ہے۔“

”اچھا۔“ نیلم نے سر ہلایا۔ تو اس کے لیے آویزے اس کے رخساروں سے چھوٹے

کئے۔

”تو یہ بات ہے۔ اگر وہ ضروری بات نہ ہوتی۔ تو تم نہ آتے۔“

”شاید۔“ اس نے بالوں میں ہاتھ بھیرا۔ ”آنا۔ یا ہو سکتا ہے نہ بھی آتا۔ کچھ کہہ نہیں

سکتا۔“

نیلم نے ایک آہ سی بھری۔ ”ہاں سجاد! تم بھی کچھ نہیں کہتے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے

کیوں انتظار سارہتا ہے۔ یہ امید ہی رہتی ہے کہ تم بھی تو کوئی ایسی بات کہہ دو گے۔ جسے سننے

کو میں جنم جنم سے ترس رہی ہوں۔“

سجاد ہنسنا۔ ”بھئی نیلم۔ تم ایسی باتیں نہ کیا کرو۔ جو مجھے کچھ میں نہ آئیں۔“

نیلم تھلا ہوئی دانتوں تلے دبا کر نیم دا آٹھوں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ اسی

وقت دروازے پر زور سے دستک ہوئی اور ٹانگی کی آواز سنائی دی۔

”نیلم! نیلم!!“

نیلم چونک گئی۔ سجاد بھی کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا۔

”نیلم! اس نے پھر پکارا اور دروازہ کھٹکٹایا۔

”کیا ہے آ جا؟“ نیلم نے اٹھ کر دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

”وہ موت جی بخت آ اور پھر بھاگ گئی۔“ وہ پریشانی سے بولی۔

”تم سے کس نے کہا؟“ نیلم نے پوچھا۔

”مہر عبدالحکیم کا بندہ آیا ہے۔ کہا ہے وہ وہاں پہنچی ہی نہیں۔“

”چل۔ جانی ہے تو جانے دے۔ آپ ہی پھر پھرا کر واپس آ جائے گی۔ جس طرح

پہلے آئی تھی۔ تو خواہ مخواہ ٹکڑی میں نہ پڑ۔“ نیلم نے اکتا کہہ کر دروازہ بند کر لیا۔

سجاد کے کالوں میں دھڑکن کی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ بخت آ کے نام سے اسے

یاد آیا کہ یہ وہی عورت تھی۔ جس نے اس سے پناہ مانگی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ لیے لیے

سجاد لکجی اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ جلد سے جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا۔ وہ بیٹھا نہیں اور اس انتظار میں کھڑا رہا۔ نہ ٹیلم بات کرے تو وہ چلے۔
 ٹیلم نے دروازہ کھول دیا تھا۔ ٹائیکہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا کھسک پھسک کر رہی تھی۔ پھر وہ واپس چلی اور سجاد سے بولی۔ ”تم کھڑے کیوں ہو۔ بیٹھ جاؤ نا۔ تھوڑی دیر کیلئے۔ میں ابھی پانچ منٹ میں آئی ہوں۔ دیکھو جانا مت۔ خدا کیلئے۔“
 ”کیا کرتی ہو ٹیلم!“ سجاد جھنجھلایا۔
 ”میں نے یہاں بیٹھ تو نہیں رہتا۔“
 ”مت بیٹھنا۔ لیکن تھوڑی دیر تو کرو نا۔ جب تک میں نہ آ جاؤں تم جانا مت۔“ اس نے اصرار کیا۔ سجاد کو مجبوراً بیٹھنا پڑا۔

وہ جلدی آ جانے کا کہتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔
 سجاد کچھ دیر بیٹھا رہا۔ پھر بیزار ہو کر اٹھا۔ اور یونہی وقت گزارنے کو کمرے کے دروازے پر اور راستگی کو دیکھنے لگا۔ کمرہ غصا سے سجا ہوا تھا۔ آرام دہ بستر۔ جدید انداز کی کرسیاں۔ عمدہ قیمتی قالین اور شیش پہلو آئینے والا سنگھار کے سامان سے بھرا ہوا ڈریسنگ ٹیبل۔ اس کے پہلو دار آئینے میں سجاد کو اپنے کتے ہی عکس نظر آ رہے تھے۔
 اس نے غیر ارادی طور پر آئینے میں سے جھانکے ہوئے اپنے ہاتھ سارے نکسوں کو دیکھا اور کچھ نامد سا ہوا۔ اس کے کپڑے تلخے اور سلٹوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس کی داڑھی بے ترتیب تھی اور بال بھی جھجے ہوئے نہیں تھے۔ ان میں دھول کے ذرے جگہ جگہ اٹکے ہوئے صاف نظر آ رہے تھے۔

یونہی اس کو ٹیلم کا خیال آ گیا۔ وہ کتنی خوبصورت، کتنی اجلی، کتنی دلکش اور خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی۔ نہ جانے اس پر اتنی کیوں مہربان تھی۔ وہ اس کی جتنی ہوئی زندگی میں جیسے ہوا کے نرم جھونکے کی طرح سے تھی۔ لیکن وہ اس کی کنگلی اور سبک رفتاری سے خود کو مانوس نہیں کر پاتا تھا۔ ایسی ہی کسی لطافت کو اپنے گرد و پیش پا کر وہ نہ جانے کیوں الجھ سا جاتا تھا۔ اس کے دکھ اس کی محرومیاں اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی تھیں۔ اور وہ انہی میں گھویا ہوا کسی اور طرف دیکھ ہی نہیں پاتا تھا۔

اس نے اس کا کرا آئینے میں جھانکتے ہوئے اپنے ہی عکس سے نگاہیں جمالیں۔ اور پھر آ

گھومتا رہا تھا۔
 ٹیلم کچھ کھوٹی کھوٹی سی۔ کچھ پریشان سی کمرے میں آئی۔ اس کا حسین چہرہ دھواں دھواں سا ہو رہا تھا۔ سجاد نے قدرے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”کیا بات ہے؟ تم بہت پریشان ہو گئی ہو۔“
 ”ہں!“ اس نے ایک طویل آہ بھر کر کہا۔
 ”سوچا کچھ تھا اور ہو کچھ کیا۔“
 ”کیا مطلب؟“ سجاد نے پوچھا۔
 ”ہں۔ اب کیا کہوں؟“ وہ پاپوسی سے سر ایک جانب جھکا کر بولی۔
 ”کیوں؟ انکی کیا بات ہے؟“

”تمہیں کچھ نہیں۔“ اس نے ہونٹ چپائے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی اذیت اسے اندر ہی اندر چکے کے دے رہی ہے۔ اس کی پگلیں نرم سی ہو رہی تھیں۔
 ”آخر کوئی بات تو ہے۔ جو تم ایک دم اتنی پریشان ہو گئی ہو۔“ سجاد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

ٹیلم نے تمہوڑا سارخ پھیر لیا۔ شاید آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں کو چھپانے کیلئے۔ سجاد نے قدرے جھلا کر کہا۔
 ”اچھا۔ تم نہیں بتانا چاہتیں۔ تو نہ بتاؤ۔ مگر یہ تو بتا دو کہ تم نے مجھ سے کوئی ضروری بات کرنی تھی۔ تاکہ میں جاؤں۔“
 ”ضروری بات۔“ ٹیلم نے غائب دماغی سے کہا۔ ”ہاں ضروری بات۔ اچھا وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ تمہیں یہاں بلائے کو۔ ورنہ..... ورنہ بات تو کوئی نہیں تھی۔ ہاں بات تو کوئی نہیں۔“

سجاد کو صاف محسوس ہوا۔ جیسے کہ کچھ چھپا رہا ہے۔ لیکن وہ زیادہ اصرار بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا موڈ یونہی خراب سا ہو گیا تھا۔ وہ بیزار سا ہو کر اٹھ گیا۔
 ”اچھا میں چلا ہوں۔“

دروازے پر پھر دستک ہوئی اور ٹائیکہ نے پکارا۔ ”ٹیلم! ٹیلم! دروازہ تو کھولنا۔“
 ”غصہ درازا سجاد۔“ ٹیلم نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کر اسے بیٹھنے کو کہا اور خود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

”اچھا بھئی خدا حافظ۔“ سجاد نے الوداعی کلمہ کہہ کر بیڑھیاں اتر جانی چاہیں۔ لیکن نیلَم نے روک لیا۔

”سنو۔ ابھر کربک ملو گے؟“ اس نے بڑے ارمان سے پوچھا۔

”کہہ نہیں سکتا۔“ سجاد نے ابرو اچکا کر لاطلی کا اظہار کیا۔

”کوئی وعدہ تو کرنا سجاد۔ میں اسی کے سہارے وقت کاٹ لوں گی۔“

”فکر نہ کرو۔ زندگی ہوئی تو ملے رہیں گے۔“ اس نے بیڑھیاں اترتے اترتے کہا

اور پلٹ کر نہیں دیکھا۔

وہ بازار کی حدود سے بحفاظت نکل آیا۔ پہلے اس نے وٹا دی حویلی جانے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اس خیال کو ہڈن سے جھٹک دیا۔ ساحل پولیس کے ہاتھ اچکا تھا۔ اسے خواہ وہاں جا کر خود کو خطرے میں نہیں ڈالنا چاہیے تھا۔ اس کے قتل کا الزام کس پر لگتا ہے۔ یہ تو جلد یاد رہا۔ اسے پتہ چل ہی جاتا تھا۔

یہی سوچ کر اس نے واپس جانے کا قصد کر لیا اور بس میں سوار ہو گیا۔ وہ قبرستان کے قریب پہنچا۔ تو شام گہری ہو رہی تھی۔ کتنے درختوں کی اوٹ میں جھپکی ہوئی گورن کی کتیا میں ابھی روشنی نہیں چلی تھی۔ سب کچھ اندیرے میں ڈوبا ڈوبا سا نظر آتا تھا۔

وہ برآمدے کے ساتھ پڑے ہوئے پتھر پر سے پھلتا نکلا اندر داخل ہو گیا اور اس نے جھیمو کو آواز دی۔ اس کی آواز کا جواب نہیں آیا۔ اس نے برآمدے پر نگاہ ڈالی۔ چوہلا خضفا پڑا تھا۔ لائین اپنی جگہ موجود تھی۔ لیکن بھی ہوئی تھی۔ ایک طرف روٹیوں کا چھینکا اسی طرح لٹکا ہوا تھا۔ سجاد نے آگے بڑھ کر کمرے میں جھانکا۔ تاریک کمرہ بے آباد۔ چپ اور خاموش تاریکی سے بھرا ہوا تھا۔ سجاد کو تعجب ہوا۔ شام مغرب سے آگے بڑھ آئی تھی۔ جھیمو تو اس وقت قبرستان کی طرف نہیں جاتی تھی۔ پھر ہاں بھی تو تینیں تھا مگر ان سب میں سے کوئی ایک بھی نظر نہیں آتا تھا۔

”وہ سب کہاں جا سکتے تھے۔“ سجاد سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے جیب سے ماچس نکال کر لائین روشن کرنا چاہی۔ لیکن کچھ سوچ کر تیلی بجھا دی۔ اور بوڑھے کی کتیا کے چاروں طرف چکر لگا کر دیکھا۔ مگر کوئی سراغ نہیں ملا۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے کسی نے جادو کی چھڑی تھا کر ان سب کو لٹکا ہوا سے اوجھل کر دیا ہے۔

کرکری پر بیٹھ گیا۔ تھکاوٹ کے احساس سے اس کا تک ایک چور چور سا ہو رہا تھا۔ اس نے کرکری کی پشت سے سر نکالا اور تھوڑی دیر کیلئے اپنی محسوس ہوئی آنکھوں کو بند کر لیا۔ اس کے سنے ہوئے اعصاب کچھ پرسکون ہوئے۔ اور اسے غنودگی محسوس ہونے لگی۔

اچانک اس کا شانہ کسی نے زور سے ہلایا۔ ”سجاد! سجاد! دیکھو۔ دیکھو۔ پولیس آگئی ہے۔“ نیلَم کی گھبراہٹ ہوئی آواز سنا دی۔ سجاد تیزی سے ہوشیار ہوا اور اس نے حیران نظروں سے نیلَم کی طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟“

”باہر پولیس آگئی ہے۔ وہ پوچھ گچھ کر رہے ہیں۔ انہوں نے میرا پتہ بھی پوچھا ہے۔ کہیں اس طرف آگئے۔ تو خواہناؤ تمہارا بیان لیتے پھر میں گے۔“ اس نے تفصیل سے بتایا۔

”عجیب ہوتی بھی۔ پریشان کر کے رکھ دیا۔“ سجاد سر جھٹک کر اٹھا اور اس نے اپنے بالوں میں اٹھکیاں بھیر کر اپنے بال برابر کرنے کی کوشش کی۔

اپنی غیر معمولی بوکھلاہٹ پر نیلَم شرمندہ سی ہوئی۔ اور جلدی سے بولی۔ ”میں تمہاری وجہ سے گھبرا گئی تھی سجاد! اور نہ مجھے پتہ ہی پڑا تو نہیں ہے۔“

”وہ ہیں کس طرف؟“ سجاد نے پوچھا۔

نیلَم نے گھڑکی کی چٹرن میں سے باہر جھانکا۔ ”بازار کی طرف ہیں۔“

”یہاں کھینچی طرف باہر نکلے گا کوئی راستہ ہے؟“ سجاد نے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔۔ تو ہو سکتی۔“ نیلَم نے تیزی سے کہا۔

”تم نے خوب یاد کر لیا۔ کھینچی طرف بیڑھیاں ہیں۔ لیکن بہت خستہ ہیں۔ بہت عرصہ ہو جاہندگی ہوئی ہیں۔ تم یہاں سے اترو۔ یہ چھت والی گلی میں ملکتی ہیں۔ دراصل گلی میں بھی نہیں۔ دو مکانوں کے درمیان تھوڑی سی جگہ ہے۔ یہاں کے پرانے رہنے والے ہی اس راستے سے واقف ہیں۔ تم اس طرف سے نکل سکتے ہو۔ بڑی آسانی سے۔“

”تو چلو پھر۔“ سجاد نے کہا۔

”آؤ۔“ نیلَم جلدی جلدی اس کے ہمراہ چلی اور ایک اسٹور نما کمرے سے گزردی

اسے خستہ حال بیڑھیوں تک لے آئی۔

”وہ کچھ شکر سا ہو گیا۔ کہیں ہاس نے تو کوئی پکڑ نہیں چلا یا تھا۔ وہ جرائم کی دنیا کا باسی تھا۔ کیا خبر اس کی وجہ سے بوڑھا اور مضمبو کی معیت میں نہ جھنڈ گئے ہوں۔ اس نے ہاس کو یہاں لا کر غلطی کی تھی نہ جانے ان پر کیا گزری تھی۔“

اس چھوٹی سی کنٹیا کو دیران دیکھ کر اس کا دل الجھ سا گیا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ ایک باہر پھر بے سروسامان اور بے سائبان ہو گیا ہے۔ اس کی زندگی رشتوں سے پھر خالی ہو گئی ہے۔ وہ دلی پر ایک بوجھ سا لے آئے آدھانیا سے باہر نکلا۔ اب اس کے لئے وہاں اور کیا رہ گیا تھا۔ وہ غیر ارادی طور پر قبرستان سے باہر جانے والے راستے پر ہویا۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کی آئندہ منزل کوئی ہوگی۔ وہ کہاں پناہ لے گا اور کس کے پاس جائے گا۔

اجانک اسے ایک آہٹ سنائی دی اور جھاڑیوں میں ایسی سرسراہٹ ہوئی جیسے کسی نے اوٹ لینے کی کوشش کی ہے۔ سجاد کو چکنا ہو گیا۔ اس کا ذہن فوراً اس پر اسرار و جگہ کی طرف گیا۔ جو مجرمانہ سرگرمیوں کا مرکز تھی۔ کہیں یہ ان میں سے ہی کوئی نہ ہو۔ جو اسے دیکھ کر چھپنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس نے قریبی درخت کے تنے کی آڈ لیتے ہوئے ایک تیز نگاہ چاروں طرف ڈالی۔ چاروں طرف تاریکی اور سانے کا راج تھا۔ لیکن ایک جانب جھاڑیوں میں بہت خفیف سی سرسراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ یوں جیسے کوئی دیکھا ہوا بیٹھا ہو۔ یہ کون ہوسکتا تھا؟ دور سے کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بے دریغ اس کے سامنے آ جانا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا۔ نہ جانے وہ دوست تھا یا دشمن۔

یہی سوچ کر سجاد نے جھاڑیوں کی مخالف سمت میں آہستگی اور احتیاط سے قدم قدم چلنا شروع کیا اور نسبتاً لمبا پکڑ کاٹتے ہوئے ان کے عقب میں جا پہنچا۔ اب اسے جھاڑیوں میں ایک دھندلا سا سایہ چھپا ہوا نظر آ رہا تھا۔ سجاد نے ایک ثانیہ ضائع کئے بغیر اچانک جھپٹ کر اسے عقب سے دبوچ لیا۔ اسے ایک مکھی مگنی۔ ڈری ہوئی سی بیچ سنائی دی۔ جو سوائی تھی۔ اس نے حیران ہو کر اسے فوراً ہی چھوڑ دیا۔ لیکن وہ ایک جانب لڑھک گئی۔ یوں مطمئن ہوتا تھا۔ جیسے وہ بے ہوش ہو گئی ہے۔

سجاد کو انی رات گئے۔ اس عورت کی قبرستان میں موجودگی نے پریشان بھی کر دیا۔

پھر اسے خیال آیا کہ شاید وہ کسی جا دو نوٹنے کے خاطر یہاں آئی ہوگی۔ ورنہ اس وقت تو قبرستان میں مرد بھی آتے ہوئے گھبراتے تھے۔ چاند کی بہت ہلکی ہلکی سی روشنی میں سجاد نے دیکھا کہ وہ نسبتاً بھاری جسم کی کوئی عورت تھی۔ جس کے کپڑے میلے اور پٹنے ہوئے تھے۔ سجاد نے دو ایک بار اس کے گال زور زور سے جھپٹائے۔ اس کے ہونٹوں سے بے ہنگم سی آوازیں نکلیں۔ اس کے سارے جسم نے ایک جھرجھری سی لی۔ اور وہ فوراً ہی اٹھ کر یوں بیٹھ گئی۔ جیسے خوفزدہ ہو۔ وہ کبھی کبھی آواز میں ہلکاتے ہوئے بولی۔

”مجھے معاف کر دو۔ مجھے کچھ مت کہنا۔ مجھے معاف کر دو۔“ خوف سے اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا۔

سجاد کو اس پر بہت خرس آیا۔ نہ جانے وہ کس گھر کی عزت تھی اور اس پر کیا گزری تھی۔ سجاد نے تسلی دینے کو اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور ملاحت سے بولا۔ ”حوصلہ کر بہن! میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔ میں تجھے کچھ نہیں کہتا۔ مگر نہ کہ حوصلہ رکھ۔“ وہ حیرت سے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر ڈرتے ڈرتے بولی۔ ”تو کون ہے دیر!“

”ہیں۔ خدا کا بندہ سمجھ لے۔ لیکن تو بتا کہ تو کون ہے۔ اور یہاں اس قبرستان میں اکیلے کیا کر رہی ہے۔ وہ بھی رات کو کہیں کوئی چلے تو نہیں کاٹ رہی۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور چادر سے منہ ڈھانپ کر بے ساختہ رو پڑی۔ سجاد نے خیال کیا کہ شاید اس کا کوئی عزیمت ہو گیا ہے اور وہ اس کی محبت میں اس طرف نکل آئی ہے۔

”کوئی مر گیا ہے تیرا؟“ سجاد نے ہوردی سے پوچھا۔ اس نے جواب نہیں دیا اور اس کی ہچکیوں میں اور شدت آ گئی۔ سجاد نے اسے تسلی دی۔ ”نہ رہن۔“ مجھے بتا بات کیا ہے؟ مجھ سے جو کچھ بن پڑا۔ میں تیرے لئے کروں گا۔ تو بتا تو سہی کہ بات کیا ہے؟

وہ کچھ دیر ایسی طرح ہچکیاں لے لے کر روٹی رہی۔ سجاد نے اسے رونے دیا تاکہ اس کے دل کا غبار ہلکا ہو۔ اور وہ کوئی بات کرنے کے قابل ہو سکے۔ وہ روٹی رہی۔ ہولے ہولے اس کی ہچکیوں کی شدت میں کمی آئی۔ اس نے اپنی چادر سے آنکھیں اور ناک صاف کی اور رندگی ہوئی آواز میں بولی۔

”ویرا! میں تو قسمت کی ماری ہوں۔ مجھے تو موت بھی نہیں آتی۔ موت آ جائے۔ تو ایک بار مجھ کو آ جائے۔“

وہ ایک مرتبہ بھروسہ کر پڑی۔ ”ویرا! جب تقدیر ہی میری ہو جائے۔ تو پھر کون اپنا غنا ہے۔ میں یہاں اپنے باپ کے پاس آئی تھی۔ پر وہ یہ نہیں کہاں چلا گیا ہے۔ میں اسے ہی ڈھونڈتی پھرتی ہوں۔ وہ یہاں گورکن ہے۔ اس کے ساتھ میری بیٹی بھی ہے۔ ہائے میری جھمکو! یہ نہیں وہ کس حال میں ہے۔ باپا کہاں ہے؟“

سجاد کو یہ سمجھنے میں درجنوں گھنٹے کی بوزم کی افواشہ بنی ہے۔ نہ جانے وہ ان کے چنگل سے کیسے بچ کر نکل آئی تھی۔ اس نے اسے تسلی دینے کو کہا۔

”اچھا۔ تو بے جھمکو کی ماں۔ پر تجھے تو کچھ لوگ افواہ کر کے لے گئے تھے۔ تم وہاں سے کیسے نکل ہو۔“

”ہا۔ ہائے۔ تمہیں یہ سب کس نے بتایا؟“ وہ ہونٹوں میں اڑھنی دبا کر بولی۔

”مجھے تیرے باپ نے ہی سارا کچھ بتایا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہی رہتا تھا۔ کام شام کر دیتا تھا۔ جھمکو تو مجھے چاچا کہتی ہے۔ بہت مل گئی ہے میرے ساتھ۔“

”ہائے میں صدقے۔ میں واری۔ وہ ہے کہاں؟ کہاں ہے میری جھمکو! میری بیٹی!“

وہ بے ساختہ کہتی چلی گئی۔

”اس سے بھی مل لیتا۔ لیکن پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم وہاں سے نکل کیسے۔ وہ لوگ تمہارے پیچھے تو نہیں؟ اگر انہوں نے تمہارا پیچھا کیا۔ تو سب سے پہلے یہیں آئیں گے۔“ سجاد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ چاند کی مدھم روشنی میں اس کا چہرہ دیکھا ہوا سا معلوم ہوتا تھا۔

”نہیں۔ نہیں۔ کوئی میرے پیچھے نہیں۔ وہ دونوں بے ہوش پڑے ہیں۔ انہیں اپنا پتہ نہیں۔ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے ان کے۔ نیلے پیلے ہو گئے تھے۔“

”کیوں؟ انہیں ہوا کیا تھا؟“

”روزی نش پانی کرتے تھے۔ پر آج یہ نہیں کیا ہوا۔ بس پتے پتے گئے اور لپٹے گئے۔“

منٹوں میں نیلے کالے ہو گئے۔ میر ڈالا اللہ نے میرا ان پر۔ میری آگ پڑ گئی کالے منہ والوں پر۔“

سجاد کو اس ویران مکان میں قید وہ ہے بس عورت یاد آگئی۔ یقیناً یہ وہی تھی۔ قدرت نے اس مظلوم عورت کی مظلومیت کا انتقام لے لیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”میں تو وہاں سے جان بچا کر نکل گئی تھی کہ جھمکو کو دیکھ کر کچھ بھڑا کر دوں گی۔ پر یہاں تو دل میں اور آگ لگ گئی ہے۔“ وہ اڑھنی سے آنسو پونچھتے ہوئے منت بھرے لہجے میں بولی۔

”ویرا! اگر تجھے میرے باپ اور جھمکو کا کچھ پتہ ہے۔ تو تجھے ان سے ملا دے۔ میں ساری عمر تجھے دعاؤں میں دوں گی۔ میری آنکھیں ترس گئی ہیں انہیں دیکھنے کیلئے۔“

”مجھے کچھ پتہ تو نہیں ہے۔ لیکن میں جلد انہیں تلاش کر لوں گا۔ تیرے باپ نے مجھے بھی بیٹا بتایا ہوا ہے۔ میں بھی ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی وہ بہت پیارے ہیں۔“

”ہائے ویرا! تجھے اللہ کی قسم۔ انہیں کہیں سے ڈھونڈ نکال۔ مجھے میری جھمکو سے ملا دے۔ میرے باپ کا پتہ بتا دے۔ میں ساری عمر تیرے ہیرو دھوکہ کر چکیوں گی۔“ وہ سسکیوں کے درمیان کہنے لگی۔

سجاد کو اس کے آنسوؤں اور سسکیوں نے کچھ اور زنجور کر دیا۔ وہ منہ سے اس کی تسلی کیلئے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس اس کے سر پر اپنا بھاری ہاتھ رکھ دیا۔

وہ دل ہی دل میں بے حد پریشان ہو رہا تھا۔ بار بار روٹی ہوئی بے سہارا عورت قبرستان کی خاموشی اور بے ہول فضا اور بوڑھے کی گمشدگی کا معرکہ کبھی کبھار چکر دینے والا تھا۔ اور بظاہر اس کا کوئی دل ذہن میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ اس عورت کو تنہا اور بے سہارا بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ یہاں غمخیز ناچیں بھی لگاتی تھیں۔ وہ عورت کو کہاں لے جا سکتا تھا۔ بھراس نے اسی سے پوچھ لیا کہ کیا اس کے پاس کوئی ایسا شخص کا نہ ہے۔ جہاں وہ پناہ لے سکے۔

وہ کچھ پریشان ہی ہو کر سوچ میں پڑ گئی۔ پھر جلدی سے بولی۔

”ویرا! مجھے یاد آیا۔ یہاں چک اٹھانے میں میری بھینجی کی سبیلی رسولان عیسیٰ ہوئی ہے۔ اگر تو مجھے وہاں پہنچا دے۔ تو میرا خیال ہے مجھے وہاں پناہ مل جائے گی۔“

سجاد نے اس کی بات پر غور کیا اور پوچھنے لگا۔ ”ابھی طرح سوچ لیا ہے نا۔ یہ نہ ہو۔ وہاں جا کر خوار ہو رہا پڑے۔ مصیبت کے وقت کوئی کسی کا نہیں بنتا۔“

”تو پھر اللہ مالک ہے۔“ وہ اپنی اڑھنی کو درست کرتے ہوئے بولی۔

”تو پھر چل۔ اللہ کا نام لے کر۔“ سجاد نے قدم بڑھایا۔ اور اس کی طرف پلٹ کر دیکھا۔ وہ وہیں پر کی گھڑی تھی۔

”چلو۔ چلتی کیوں نہیں ہو؟“ اس نے پوچھا۔

اس نے ایک سسکاری سی لی اور آنسوؤں میں جھپٹے ہوئے لہجے میں بولی۔ ”اگر میرے پیچھے جھیمو اور بابا واپس آ گئے تو۔“

”تو فکر نہ کر۔ میں تجھے وہاں چھوڑ کر ان کا اپنے ہی معلوم کروں گا۔ مل گئے تو تمہیں آ کر لے جاؤں گا۔“

”اللہ تیرا بھلا کرے۔“ وہ منہ ہی منہ میں دعائیں دیتی اس کے ہمراہ چل پڑی۔ سجاد نے رخ پھیر کر کہا۔ ”اگر راستے میں کوئی پوچھے۔ تو کہہ دینا کہ تم میری بہن ہو اور میں تمہیں تمہارے سسرال چھوڑنے جا رہا ہوں۔ گھبرانا مت۔“

”اچھا دیر!“ اس نے چادر کی بکلیں گھما کر اٹھاتے ہوئے آہستگی سے کہا اور اس کے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔



چمک اٹھا نونے کی طرف رات کے اس بہر میں کوئی بس نہیں جاتی تھی۔ گاؤں تک ابھی بچی سڑک نہیں بنی تھی۔ دن کے وقت بھی بس چمک سے بہت دور رکھتی تھی۔ چمک تک کا راستہ اونچے نیچے غیر ہموار راستوں پر سے پیدل طے کرنا پڑتا تھا۔

سجاد کے لئے یہ صورتحال بہت پریشان کن تھی۔ رات کی تاریکی میں جب زمینداروں کے خوشخوار پالتو کتے سارے علاقے میں پھیلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایک انہنی عورت کے ساتھ پیدل سفر کرنا کارے دار رہتا۔ جھیمو کی ماں بھی رات کی تاریکی اور پیدل سفر کی مشقت سے گھبراتی تھی۔ اس کا سانس بھی چھول رہا تھا۔

اچانک سجاد کو دور سے ایک بھلی سی دھندلی روشنی نظر آئی۔ جو مسلسل حرکت میں تھی۔ سجاد کے دل میں امید کی کرن جاگی۔ اس نے قدموں کو کچھ تیز کر دیا۔ اور جھیمو کی ماں سے بولا۔ ”ذرا تیز چلو۔ شاید کسی سواری کا انتظام ہو جائے۔“

جھیمو کی ماں نے بھی اپنی رفتار بڑھائی۔ لیکن سجاد اس سے کہیں آگے تھا اور اسے ایک تیل گاڑی کا دھندلا سا پہلا بھی نظر آنے لگا تھا۔ اس امید نے ان کے قدموں کو اور تیز کر دیا۔ تھوڑی دیر میں ہی وہ تیل گاڑی کے قریب پہنچ چکے تھے۔

سجاد نے دیکھا کہ اس میں خالی نوکرے اونٹ سے پڑے ہوئے تھے اور گاڑی بان۔ غالباً سو رہا تھا۔ تیل آپ سے آپ ایک سیڑھ میں چلے جا رہے تھے۔ سجاد اس کے برابر آ گیا اور گاڑی بان کو ایک دو آوازیں دی۔

شاید تیل گاڑی والے کے دماغ کا کوئی حصہ بیدار تھا کہ وہ فوراً ہی جاگ اٹھا اور اس نے آنکھیں مل کر سجاد کی طرف دیکھا۔ لیکن نہ ہی گھبرایا۔ نہ بدحواس ہوا۔ اور بڑے مطمئن سے بولا۔ ”کیا بات ہے یار!“

”ہم نے چمک اٹھا نونے تک جانا ہے۔ اگر تم اس طرف جا رہے ہو۔ تو ہمیں بھی

نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کے بوڑھے باپ کو زمیندار نے کسی غلطی کی پاداش میں گاؤں سے نکال دیا تھا۔ وہ اسی غم میں مکمل مکمل کر مر گیا تھا۔ اس کی اپنی نوبت ایسی ہی آج ہو گئی تھی۔ جس کا کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ اس نے بہتر سے عرضی پر پے کیلئے تھانے کے پھر لگائے۔ لیکن بات نہیں بنی۔

وہ عجیب لالہ لالی اور کلنڈری طبیعت کا تھا۔ اس نے دل پر بات نہیں لگائی تھی۔ اپنے مال میں مست اور مطمئن تھا۔ ان واقعات کا تذکرہ اس نے یوں کیا تھا۔ جیسے کسی اور کا حال کہہ رہا ہو۔ سجاد کو اس کی بے نیازی اور لافلتی نے حیران کیا۔ اس نے انہی سے سوال کیا۔

”یارا جھیں اپنی بیوی کا کچھ خیال نہیں۔ پتہ نہیں بھاری کسی حال میں ہوگی۔“
 ”بہتر خیال کر کے دیکھ لیجنا! پر ہم غریب لوگ کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ الٹا اپنی جان ہی گنواں گئے۔ تو پھر کیا فائدہ۔ نہ حاصل نہ وصول۔“

”کمال ہے۔“ سجاد نے حیرت سے بے ساختہ کہا۔ ”جھیں پر وادی نہیں۔“
 کا کے لوہار نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”گل سن میرے بادشاہ۔ اس دنیا میں ساری عمر تو نہیں بیٹھ رہتا۔ کبھی نہ کبھی تو آگے جانا ہے۔ ہم نے بھی اور ان زمینداروں اور چودھریوں نے بھی۔ بس وہیں پے فیصلہ کر لیں گے۔ اپنے رب سوچنے کے سامنے۔ بس میں نے تو اپنے مقدمے کا فیصلہ اس اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔ جو اسے منظور۔ ہمیں بھی منظور۔ جو اس کی رضا۔ ہمارے سر انھوں پر۔ پھر مجھے کیا پڑی ہے کہ میں اپنے فیصلے کرتا پھر دوں۔ جب وہ بڑا فیصلہ کرنے والا موجود ہے۔“

سجاد کو روکنے کوڑے ہو گئے۔ اس کے سارے وجود پر ایک کپکپی سی عاری ہو گئی۔ اسے اپنے مقابل بیٹھا وہ شخص کوئی پہنچا ہوا بزرگ معلوم ہوا۔ جس نے اپنے مالک کو بچان لیا تھا اور انصاف کے لئے اس سے لو لگا رکھی تھی۔ اور ایک وہ تھا۔ سارے ہی اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیتا چاہتا تھا۔ سارے فیصلہ خود ہی کر لیتا چاہتا تھا۔ وہ عداوت سے عرق مرق ہو گیا۔ اسے اپنا پے بڑا ہی حقیر معلوم ہوا۔ وہ تو اب اس قابل بھی نہیں رہا تھا کہ اس بڑے انصاف کرنے والے کی طرف پر امید لگا ہوں سے دیکھ سکے۔

”اوپہ پائی! کن سوچوں میں پڑے ہو۔“ کا کے لوہار نے خوش طبیعت سے کہا تو سجاد کو اس کی آواز جیسے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے چونک کر اس کی طرف

لے چلو۔ کچھ توڑی بہت خدمت بھی کر دیں گے اپنی حیثیت کے مطابق۔“
 ”ہوں۔“ اس نے لمبی سی ہوس کی اور گردن بڑھا کر جمہور کی طرف دیکھا اور کڑے لہجے میں بولا۔ ”یار۔ کوئی اور پکڑ تو نہیں ہے۔“

”دھیان سے بات کر یار! میری بہن میرے ساتھ ہے۔ میں اس کو اس کے سرسراں چھوڑنے جا رہا ہوں۔“ سجاد نے اسے ٹوکا۔

اس نے جواب نہیں دیا۔ اور بیلوں کی باگ کھینچ کر انہیں روک لیا۔ اور بولا۔ ”جمل آ یار! میں جھیں چک اٹھاؤں سے اتار دوں گا۔ میں اسی طرف سے ہو کر جاؤں گا۔“
 ”تیری بڑی مہربانی۔“ سجاد نے گرجوٹی سے کہا اور چٹانک لگا کر تیل گاڑی میں سوار ہو گیا۔ دوسری طرف سے اس نے جمہور کی ماں کو ہاتھ پکڑ کر اوپر چڑھایا۔ وہ کچھل جانب سمت کر بیٹھ گئی۔

تیل گاڑی والے نے بیلوں کو ہانکا اور گاڑی ست رتاری سے رکتے لگی۔ سجاد خاموشی سے بیٹھ گیا اور گزرے ہوئے واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن سے گزرنے لگے۔ اس نے ہانہوار سڑک پر نگاہ ڈالی۔ اور نیچے ہوئے دل کے ساتھ سوچنے لگا کہ وقت کی گردش نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ وہ کیا سوچ کر نکلا تھا اور کس طرف چلا آ رہا تھا۔ تیل خاموش تھے۔ گاڑی کے پھیوں سے نکلنے والی سسل آواز سے ایک تاری بندھ گئی تھی۔ ہانہوار سڑک سے بار بار بچھو لے لگ رہے تھے۔ گاڑی بان نے خاموشی کے وقفہ کو توڑا۔

”کیا نام ہے یار! تیرا۔“
 سجاد یوں چونک سا گیا۔ اور اس نے کھوئے کھوئے سے انداز میں اسے اپنا نام بتایا۔
 ”کہاں کے رہنے والے ہو؟“ اس نے نیچے سے پوچھا۔
 ”بس یار! کوئی مستقل غنا نہ تو ہے نہیں۔ روزی روزگاری کا چکر کبھی کہیں لے رہا ہے۔ کبھی کہیں۔“ سجاد نے گول مول ہی بات کی۔

”ہاں یار! رزق کیلئے تو یہ ساری بھاک دوڑ ہے۔“ وہ بولا اور اس نے بتایا کہ اس کا نام نیاز محمد ہے۔ لیکن سب جگہ وہ کا کا لوہار کے نام سے معروف تھا۔ حالانکہ اس نے خاندانی پیشہ چھوڑ دیا تھا۔ اور تیل گاڑی پر سامان وغیرہ ڈھونے کا کام کرتا تھا۔ وہ خوش مزاج اور باتوئی تھا۔ اس نے سگریٹ سلگایا۔ اور ایک سجاد کو دے دیا۔

دیکھا۔ اس کی اگلیوں میں دبا ہوا سریت تاریکی میں دک رہا تھا۔ اس کے چپٹے ہوئے سفید
دانتوں کی لڑی موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ ”نیند آگئی ہے۔ تو سریت بجاؤ۔“ وہ ہنسا۔
سجاد نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے سریت کی طرف دیکھا۔ اس کے شعلے کی
مدت اس کی اگلیوں تک پہنچنے والی تھی۔ اس نے چٹکی بجا کر رکھ جھاڑی اور اوپر تلے دو تین
کھل لئے۔

”سو مجھے تم پارا“ باتوں کا کالو بارپ نہیں رہا۔

”ہم نے کیا سوتا ہے یا ہمارے بچے کا ہاری تقدیر جو سوتی ہے۔“ سجاد نے
خلف اسانس بھر کر کہا۔

وہ ملاحظہ ہوا۔ ”پارا تقدیر سو کر یہ شکر کرتی ہے۔ جاگ جائے تو پتہ نہیں کیا ہو۔“

سجاد کا دل چٹنے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کے دل میں ابھی تک وہی عداوت کھول
رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ کالو بارپ کتنا آسودہ مطمئن اور سرشار تھا۔ اسی لئے دل کھول کر
نس لیتا تھا۔ اس کی ہنسی اصلی اور جادوئی تھی۔ اور ایک وہ تھا کہ اس کے اپنے دشمنانہ جذبے
اسے دوڑائے لے جاتے تھے۔ اس نے اپنے فیصلے خود ہی کر لیتا چاہے تھے۔ اسی لئے اس
کے پاس بچھتاؤں کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کا جی چاہا کہ اس ستاروں بھرے آسمان تلے سر جھکا کر اپنی ساری کوتاہیوں کا
احتراف کرے۔ اپنی سرکشی پر عداوت کا اظہار کرے اور دامن پھیل کر اپنے لئے کوئی سزا
مانگے۔ تاکہ اس کی عداوت کچھ تو ذائل ہو۔

”شاید تمہیں نیند آ رہی ہے۔“ کا کالو بارپ نے پھر اسے مخاطب کر لیا۔

”نہیں نیند تو نہیں آ رہی۔“ سجاد نے پڑمردی سے کہا۔ ”دراصل میں سوچ رہا تھا۔
میں سوچ رہا تھا یا کہ قسمت نے تمہارے ساتھ بھی سب کچھ کیا۔ مگر تم کہتے مطمئن اور خوش
باش ہو یا! تمہارا دل نہیں چاہتا کہ تم ان لوگوں سے انتقام لو۔ جنہوں نے تمہارے ساتھ
زیادہ جاس کیں۔ تمہیں اکیلا کر دیا۔ تمہارے باپ کو قبر میں اتار دیا۔ کا کالو بارپ تمہارے دل میں
انتقام کی آگ نہیں بجھاتی۔“

”ہاں یا! ہمارے دل میں بھی بڑی آگ لگی تھی۔ بڑے طوفان اٹھے تھے۔ میں تو
اپنی درستی کے لیے نکل کھڑا ہوا تھا۔ پر میرے ابا نے میرا بازو پکڑ لیا۔ میں اس کا ایک ہا
ایک بیٹا تو تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔

”کہ تجھے پتہ ہے کہ جاگیرداروں کا ساتھ دینے والے کتنے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”اس کا ایک گاؤں نہیں۔ اس کے کتنے ہی گاؤں ہیں۔“

پھر اس نے پوچھا۔ ”اور تیرا ساتھ دینے والا کون ہے۔“

میں نے سوچا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ تو میرے منہ سے

آپے آپ ہی نکل گیا۔ ”میرا ساتھ دینے والا تو اللہ ہے۔ صرف اللہ۔“ میرے ابا نے
آسمان کی طرف دیکھا اور بولا۔

”جھلیا۔ اگر تیرا ساتھ دینے والا اللہ ہے۔ تو پھر سب کچھ اسی پر چھوڑ دے۔ تو اس

کی ذمہ داری اپنے سر کیوں لیتا ہے۔“

اس نے جیسے ہی یہ لفظ منہ سے نکالے۔ میرے قدم وہیں جتے کے جتے رہ گئے اور
درستی میرے ہاتھ سے گر گئی۔ اس کی بات میں نے اپنے دل میں آپ اتنی ہوئی دھمکی۔
میرے اندر سے نفرت اور انتقام کا جوش اس طرح بھڑک گیا۔ جیسے ساپ میں سے زہر نکال لیتے
ہیں۔ مجھے اپنے ابا کے لفظوں پر اتنا اعتبار آیا کہ پھر کبھی یہ بات میرے دل سے نکلی ہی نہیں
کہ میرا فیصلہ وہ اوپر والا کرے گا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر خرم
ہوتے ہوئے تعظیم دی اور بے نیازی سے کہنے لگا۔ ”اب مجھے کوئی فکر نہیں۔ وہ مالک ہے۔ وہ
خالق ہے۔ وہ آپ ہماری فکر کرے گا۔ ہم بندے جو جو اس کے۔“

سجاد حیرت سے ساکت ہو گیا۔ وہ جو ایک طویل عرصہ غارداروں میں پانچاؤہ چلتا
رہا تھا۔ اس کے باوجود اس کا دل مطمئن نہیں تھا۔ اور اس کے مقابل بیٹھا وہ ایسا شخص ایک لمحے
میں کتنی ہی منزل میں لے کر گیا تھا۔ اس نے دلکھ آہن نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تم مقدروالے ہو یا! تمہیں اللہ نے روشنی دی ہے۔“

”احسان ہے اس کا۔ کرم ہے اس کا۔“ وہ ایک جذب کے سے عالم میں بولا۔ تو
سجاد کے دل میں یہ تھنا بڑی شدت سے ٹپکی کہ اس کے یقین کا تھوڑا سا حصہ اسے بھی مل
جائے۔ تو اس کی زندگی سنور جائے۔ اس کا جی چاہا کہ اس شخص کو اپنا مرشد مان کر ساری زندگی
اس کے قدموں میں گزاردے۔ شاید اس کی بدولت ہی اسے بھی وہ سکون اور طمانیت میسر آ
جائے جس کی کا کالو بارپ کے پاس فراوانی تھی۔

وہ ان ہی سوچوں میں غفلان تھا کہ کا کالو بارپ نے پکار کر کہا۔ ”لو بھئی۔ آ گیا تمہارا
بٹا اٹھاؤ۔“ اس نے نکل گاڑی ایک اور کچے راستے پر ڈال دیا۔

”بس یار! اب آگے سے ہم چلے جائیں گے۔“ سجاد نے لحاظ میں کہا۔

”آدمی رات آگے۔ آدمی رات پیچھے۔ اس طرح تمہیں راستے میں تو نہیں چھوڑ سکتا

تا۔ پورا پہنچ کر آؤں گا۔ آخر تمہاری بہن ساتھ ہے۔“ وہ بولا۔

”مہربانی تیری یار! تو ہمارے لئے رحمت کا فرشتہ ثابت ہوا ہے۔“ سجاد نے ہنسنے

لیجے میں کہا اور پلٹ کر جمبو کی اس کی طرف دیکھا۔

وہ ٹھنکوں پر سر رکھ کر ٹھنڈی سی ٹی ٹی ٹی چلی تھی۔ شاید سوچی تھی۔ سجاد نے اسے پکارا۔

لیکن وہ متوجہ نہیں ہوئی۔ اس نے آگے ہو کر اس کی چادر کا پلہ کھینچا۔ تو وہ یکدم چونک کر اٹھی

اور حواس باختہ ہو کر ڈری ڈری سی اس کی طرف دیکھنے لگی۔ سجاد نے اسے مخاطب کیا۔

”چمک اٹھانو سے راستے پر چڑھ گئے ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا۔“

جمبو کی ماں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لیکن محسوس ہوتا تھا ابھی نیند میں ہے۔

”گھر کا پتہ یاد ہے نا تمہیں۔“ سجاد نے اس سے پوچھا۔

اس نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

”یار! تم ایسے بھائی ہو۔ بہن کی سرسراہٹ کا پتہ تمہیں معلوم نہیں؟ عورت ذات سے

کہہ رہے ہو۔ کمال ہے۔“ کا کا لوہار دھل دینے بغیر نہیں رہ سکا۔

”ایسی ہی بات ہے یار!۔“ سجاد کو اس بے ضرر انسان کو پوری بات بتا دینے میں

کوئی حرج محسوس نہیں ہوا۔

”یہ میری سب سے بہن نہیں ہے۔ معصیت زدہ ہے۔ پہلے بیوہ ہوئی۔ پھر خالوں کے ہتھے

چڑھ گئی۔ وہاں سے جان بچا کر نکلے تو باپ اور بیٹی کا کچھ پتہ نہیں۔ میں نے اس کو بہن کہا

ہے۔ تو بھلاؤں گا بھی۔ اس کو سنبھالنے کے گھر چھوڑ کر اس کے باپ اور بیٹی کا کچھ پتہ چلاؤں گا۔“

”واہ مولا واہ۔ تیری قدرت کے بھی رنگ بنارے ہیں۔ صدمہ تے جاؤں تیری ہے

نیازی کے۔ سبحان اللہ۔“ وہ خود کلائی کی سی کیفیت میں بولا۔

سجاد نے اس کی یہ خود کلائی سنی۔ تو اس کے دل کی کیفیت عجیب ہو گئی۔ ایک جھمکی

لہر اس کے دہن روئیں میں سراپت کر گئی۔ یہ کا کا لوہار نے بات کو کس انداز میں کہا تھا۔ اس

نے اظہارِ افسوس کیا تھا۔ تو کس طرح راضی پر رضا ہو کر اس کے لفظوں میں کوئی گٹھ کوئی ٹھکڑا

کوئی احتجاج نہیں تھا۔ اس کی یہ بات کتنی عجیب حیرت ناک اور دل میں اتر جانے والی تھی۔

سجاد کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ اور آنسو آپ سے آپ اس کے دل پر گرنے لگے۔ وہ امد

ی اندر پھٹکا رہا۔ ٹھٹکا اور پانی ہو ہو کر بہتا رہا۔

کا کا لوہار دھیمے سروں میں ٹھٹکانے لگا۔ الف اللہ تے چنے دی بوٹی

مرشد من وچ لائی مو!!!

رات کے سانے کو اس کی مدد اور پر سوز نے جیسے رنگ سے لگا دیئے۔ اس کے

ایک ایک لفظ نے سن کو اپنے ہی رنگ میں رنگ لیا۔ سجاد کے دل کی کیفیت عجیب اور ناقابل

فہم ہو گئی۔ اسے ایسا محسوس ہوا۔ جیسے وہ یہاں بیٹھے بیٹھے ہی کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ سبھی کچھ

بدل گیا ہے۔ وہ بھی اور اس کے ارد گرد کی دنیا میں۔ اس کے ذہن سے جیسے سب کچھ مٹا جا

رہا تھا۔ اور کا کا لوہار کی آواز کی گونج نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ نہ جانے کب

اس نے ٹھٹکانا ختم کر دیا۔ مگر وہ اس کی آواز کے سحر سے باہر نہیں آ سکا۔ وہ اسی طرح مسمم بیٹھا

رہا۔ اور اس کا رواں رواں اس کی تال پر جمنا رہا۔

”یار! تو کتنے ہتھے غلوں میں پڑا ہوا ہے۔“ وہ حاسمی دیر تک چپ بیٹھا رہا۔ تو کا کا

لوہار نے اسے مخاطب کیا۔

سجاد نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ غصہ کر بولا۔ ”وہ دیکھ سامنے چمک

اٹھانو سے ہے۔“

سجاد نے نگاہ اٹھائی۔ دور اندر سے میں ڈوبے ہوئے کچے گھروں میں کہیں کہیں

تھپہ گڑھوں نے چراغ روشن کر لیے تھے۔ مرغوں کی اذانیں سنائی دینے لگی تھیں۔ سجاد نے

جمبو کی ماں کو پکارا۔

”کیوں بھی اب تمہیں اس کے گھر کا پتہ چل جائے گا نا۔“

”ہاں۔ ہاں دیرا کیوں نہیں۔ میں ایک بار اپنے گھر والے بھتیجے کے ساتھ یہاں آئی

تھی۔“ وہ تیل گاڑی گاڑی جھنگلا تھام کر اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا توازن بے قرار کر کے کی کوشش کرتے

ہوئے اور گرد دیکھنے لگی۔

کسان مل اور تیل لے کر نکل رہے تھے۔ انہوں نے ایک جگہ گاڑی کھڑی کر کے

اس کے گھر کا پتہ پوچھا اور چل دیئے۔ سجاد کو اس کی بہت فکر تھی کہ معلوم نہیں وہ لوگ کیسے

ہوں اور یوں اکیلی عورت کو اپنے گھر رکھنے پر تیار ہوں گے یا نہیں۔ لیکن یہ دیکھ کر اسے

اطمینان ہوا کہ جمبو کی ماں کی سنبھالی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان دونوں کو بھی ناشتہ کروا کر

روانہ ہونے دیا۔ اس نے چلتے چلتے جمبو کی ماں کو تسلی دے دی کہ اسے جیسے ہی باپے اور جمبو

میں کھڑی رہوں۔“

اس کی آواز نے بھی کاسے کی تیند میں کوئی غلط نہیں ڈالا۔ سجاد کو اٹھنا ہی پڑا اور جوتے پہننا ہوا دروازے تک آیا۔

”ہا۔ ہائے۔!!“ وہ اسے دیکھتے ہی ہونٹوں پر ہاتھ رکھ کر دو تین قدم پیچھے ہٹتی۔

بھینٹ کا ٹھہرا دافراک اور رنگین موتیوں اور سبیلوں کے بہت سے زیور پہنے ہوئے ایک خانہ بدوش لڑکی اس کے دروبرجی۔ شہری بالوں کو اس نے رنگ برنگی پرانندوں کے ساتھ دو چونکیوں میں گوندھ رکھا تھا۔ مٹھکریاے بالوں کے چھلے اس کی پیشانی پر لٹکے ہوئے تھے۔ اس کے رنگ برنگی انگلیوں میں سجے ہوئے ہاتھ نے اس کا آدھا چہرہ چھایا تھا۔ اس کی بے حد خوبصورت سبز آنکھیں اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی تھیں۔ مٹی سے اٹنے ہوئے ننگے پاؤں وہ چلتی زمین پر کبھی اور کبھی اٹھاتی تھی۔

سجاد نے کمرے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”کا کا تو سو ہوا ہے۔“

”اوہ۔ اس کے سر حانے تو ڈھول بھی بجاتی تھی۔ تو اس کی آنکھ نہیں کھلتی۔“ اس نے برا سامنے بنایا۔ صوب میں کھڑا رہنے کے سبب اس کی دلکش سبز آنکھیں بیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

سجاد نے دروازے سے ایک طرف ہوتے ہوئے کہا۔ ”اندرا آ جاؤ۔ صوب میں نہ کھڑی رہوں۔“

”نہیں۔ میں کیوں آؤں۔“ اس نے شانے اچکائے اور جانے کیلئے چلتی۔ تو اس کا پھولدار فراک لہرا کر ایک پھول سا بن گیا۔

”غصہ۔ میں کاسے کو جگا دیتا ہوں۔“ اس نے پلٹ کر جواب دیا اور اپنے زیور چمکانی ہوئی کھن پار کر گئی۔

وہ دروازے سے باہر نکل گئی۔ تو سجاد پلٹا۔ تو کالو ہار بھی تک خواب خرگوش کے مزے لے رہا تھا۔ اس کے بے ہنگم خزانے سارے کمرے میں تیرے پھرتے تھے۔ اس کے چہرے پر آسودگی اور اطمینان تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک ایسی مسکراہٹ تھی۔ جیسے کوئی سہانا خواب دیکھ رہا ہو۔ سجاد کو اس پر رنگ آنے لگا۔ وہ کتنا مطمئن تھا۔ اور وہ کتنا بیکل اور بے یقین۔

وہ وہیں چارپائی پر بیٹھ گیا اور ان گنت سوچوں کی گھیبوں میں راستہ تلاش کرنے کی

کوشش کرتا رہا۔ مگر کچھ کچھ میں نہیں آیا۔ بے چینی نے اسے بیٹھے نہیں دیا اور وہ اٹھ کر بیٹھنے لگا۔ مختصر سے کمرے میں ایک دیوار سے دوسری دیوار تک چلتے ہوئے وہ بے خیالی میں کاسے کو ہار کی چارپائی کے ساتھ زور سے ٹکرایا۔ اس کے کھٹنے پر چوٹ لگی اور وہ مرنے لگا۔ اس کے زور سے چارپائی ساری کی ساری مل گئی۔ کالو ہار پڑا کر کھ پڑ جتا ہوا اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”کیا ہوا؟“ سجاد کو اس کی بوکھلاہٹ پر ہنسی آ گئی۔

”بوجھنا آ گیا تھا شاید۔“

”خواب میں کیا جگ جگ؟“

کاسے کو ہار نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اور اسے ہنسنے ہوئے دیکھ کر اسے اعزاز دے ہو گیا کہ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس نے جمای لیے ہوئے پھر کھٹنے پر سر رکھ دیا اور بولا۔

”کچھ نہ کچھ ہوا ضرور ہے۔ مجھے یونہی تو نہیں لگا کہ بوجھنا آ گیا ہے۔“

”ہاں۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہوا ہے۔“ سجاد نے کہا۔

”کیا؟“

”ایک لڑکی آئی تھی۔ تیرا پوچھ رہی تھی۔“ سجاد نے معنی خیز لہجے میں کہا۔

”لڑکی!!“ اس نے لمبے لمبے کوسو جا اور بھر بولا۔

”اچھا۔ وہی ہو گی جیل لہر۔ خانہ بدوشوں کی لڑکی ہے۔ دودھ، کھن، گھی وغیرہ بیچتی ہے۔ میرا پچہ کرنے آئی ہو گی۔ میں آج دو دن بعد آ ہوں نا۔“

”اچھا۔ تیرا پوچھ رہی تھی ہے وہ۔“ سجاد نے فہم کر کے جھپٹا۔

”اف نہیں یار۔ وہ میرے لئے بہنوں جیسی ہے۔ اسی اعتبار پر تو یہاں گھر آ جاتی ہے۔ ورنہ کسی کے گھر کے اندر قدم نہیں رکھتی۔“ وہ پھر اپنی جگہ اٹھ کر بیٹھ گیا اور پیٹ پر ہاتھ

بھیر کر بولا۔

”یارا چاہے تاج نے جو ناشہ کھلایا تھا۔ وہ تو ہضم ہو گیا۔ اب تو بھوک محسوس ہو رہی

ہے۔“

سجاد نے بھی سر بلایا۔ ”ہاں یار! کچھ کھانے پینے کا بندوبست ہو جائے تو اچھا

ہے۔“

کالو اٹھ کر تندور سے روٹیاں اور دال لے آیا۔ دونوں کھانا کھا کر ایک بار پھر بستر پر

دراز ہو گئے۔ کاکا لوہار کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور تھوڑی ہی دیر میں اس کے خراٹوں نے سارا کمرہ سر پر اٹھالیا۔

سجاد کو کچھ اس کے خراٹوں کے شر اور کچھ اپنی پریشانیوں نے سونے نہیں دیا۔ وہ اپنی ہی لا حاصل سوچوں میں الجھنا نہ جانے کہاں کہاں بھٹکتا بھڑاکہ ایک بار پھر اسی آواز نے اسے چونکا دیا۔

”پانیا! پانیا لوہار!“ سریلی گھٹیوں ایسی آواز سن کر اس نے کاکے کی چارپائی کی طرف دیکھا۔ وہ نیند میں بے سادہ پڑا تھا۔ جب تک پانیا لوہار کی سریلی صداؤں میں غصہ اور تناؤ جھلکے لگا تھا۔ سجاد نے جلدی سے اٹھ کر باہر جھانکا۔

دو پہر وصل مئی تھی اور سفید پتیلی دھوپ پیچھے بقی مئی صبح کی آخری دیوار سے جا گئی تھی۔ لہذا اپنی تمام تر شادیوں کے ساتھ تیسری چڑھا نے کھڑی تھی۔ زمین پر دودھ کا برتن رکھا تھا۔

”جہاں پانیا! تو سو رہا ہے۔“ سجاد نے اسے اطلاع دی۔

”کیا معصیت ہے؟“ وہ غصے سے بڑبڑائی اور اس نے اپنے پاؤں زمین پر زور سے پٹخا۔

”جگا دے اس کو جا کر۔ جب دیکھو سویا ہوا ہے۔“ اس نے پیسے حکم دیا۔

”چل رہے دے۔ اسے کیا جگانا۔ میں دودھ کا برتن لا دیتا ہوں۔ تو دودھ ڈال دے۔“ سجاد نے ادھر ادھر کسی برتن کی تلاش میں دیکھا۔

وہ دودھ کے برتن کے برابر زمین پر بیٹھ گئی۔ اور پینے سے ناپ کر دودھ اس کے برتن میں ڈالنے لگی۔ اس کے ہاتھوں کی جنبش سے اس کی کلائیوں کی چوڑیاں بجنے لگیں۔

”نی لائے!“ دروازے میں سے کاکے لوہار کی آواز سنائی دی۔

لہر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ ”جا۔ دو گھڑی اور سو لے پانیا! تو ابھی سے کیوں اٹھ گیا ہے۔“

”تیری آواز سن کر اٹھا ہوں۔ میں نے کہا تیرا حال چال پوچھ لوں۔ تیرا دادا تو ٹھیک ہے نا۔“ کاکا قریب چلا آیا۔

”ہاں ٹھیک ہے۔ تجھے پوچھ رہا تھا۔ پانیا! تو نے اتنے دن کہاں لگا دیے۔“ وہ ہنسی۔

”تیری سرال گیا تھا۔ وہ آنے ہی نہیں دیتے تھے۔“ کاکے نے شرارت سے کہا۔

اس کے رخساروں پر گھائی رنگ پھوٹا۔ ”جا پانیا! میں نہیں تجھ سے بولتی۔“

”اچھا نہیں بولتی۔ میں تیرے دادے سے شکایت لگاؤں گا۔“ کاکے نے آنکھیں

کھل کر کہا۔ ”وہ وہ ہنس پڑی۔ پھر روزیدہ لگا ہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔“

”یہ کون ہے پانیا؟“

”میرا باپ ہے۔“ کاکے نے جواب دیا۔

”کچھ دن بیٹیں میرے پاس رہے گا۔ تو گھبراہٹ شریف آدی ہے؟“

”اچھا!!!!“ اس نے کچھ تاپسنہ دیکھی سے کہا اور دودھ کا برتن اٹھا کر جانے لگی۔ چند

قدم چلی۔ پھر پلٹ کر ان کی طرف دیکھا اور کاکے سے بولی۔

”پانیا! ذمیرے پر آنا۔ دادا تیرا پوچھتا تھا۔“ اتنا کہہ کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی

طویل صحن پار کر گئی۔

”یارا یہ خاند بدوشوں کی لڑکی ہے۔ اس کے ماں باپ کسی دشمنی میں قتل ہو گئے تھے۔“

اس کو اس کے دادا نے پالا ہے۔ اچھے شریف لوگ ہیں۔ عام خاند بدوشوں کی طرح چورا پکے نہیں۔ کسی روز چنانچہ طحیہ کھاؤں گا ان سے۔ دادا بہت چاہتا ہے اس کو۔ ماں اور باپ دونوں کا پیار دیا اس نے۔“

سجاد نے منہ سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اس کی بات سنتا رہا۔

کاکے نے خالی ڈول اور باقی اٹھائی۔ ”میں ذرا پانی لے آؤں تو منہ ہاتھ دھو لینے ہیں۔ اگر نہانا ہے تو نہر پے چلے چلے ہیں۔ بھرات کو ڈرامہ دیکھنے چلیں گے۔ نا تھیز آ آیا ہے

میاں۔ میرا بچے کا ڈرامہ ہو رہا ہے۔ میری سمجھو اصلی میر لگتی ہے۔ بھی غضب کا کام کرتی ہے۔ بڑی مٹھوں سے ٹکٹ مٹا ہے۔“

”چل یا راسا تیرے ساتھ ہی چلتا ہوں۔ نہاؤں گا۔ سارے دن کی گرد سر پہ پڑی ہے۔“ سجاد بھی اٹھ کر اس کے ساتھ ہی چل پڑا۔

بے چین کر دیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے اسے کہاں دیکھا تھا۔ وہ کون تھی۔ اور وہ اسے کس طرح جانتا تھا۔ کہیں؟ کہیں۔ وہ بھاگ بھری تو نہیں؟؟

اس خیال نے اسے پکڑا دیا۔ اس نے سر جھٹک کر پھر غور سے دیکھا۔ اس نے اس کے دربار چہرے کو دیکھا۔ جو میک اپ سے رنگین تھا۔ اس کی حوالی آنکھوں کو دیکھا۔ جو کاجل سے سجی ہوئی تھیں۔ اس کے لب اسٹیک سے گہرا تر اشدہ لبوں کو دیکھا۔ اس کی ساری یادیں گنڈھسی ہو گئیں۔ بھاگ بھری کا شرمیلا چہرہ جس کا دھندلا سا عکس اس کی یادوں میں کہیں جاتا تھا۔ کبھی تو اس کے چہرے سے ملنے لگتا اور کبھی اس سے بالکل مختلف نظر آتا۔

”ہائے۔ غصہ!“ کا کے لوہار نے ملاحظہ ہو کر سچا دل کو متوجہ کرنے کے لئے اس کا زانو دبایا۔ مگر سچا دل تو نہ اس کی دلکش اداؤں کو دیکھ رہا تھا۔ نہ اس کے دربار لغتوں کو نہ رہا تھا۔ وہ تو اس کے چہرے کو اس کے سراپے کو اس کے پیکر کو شوشن میک اپ اور حوالی اداؤں سے علیحدہ کر کے دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

وہ بار بار اسے اس دھندلے عکس کے ساتھ ملا کر دیکھتا تھا۔ جو اس کی یادداشت میں کہیں محفوظ تھا۔ لیکن کوئی نتیجہ نہیں نکلتا تھا۔ کوئی ایسی مماثلت نہیں ملتی تھی۔ جو خون کا رشیدہ بن کر اسے کارے۔ جو یقین بن کر اسے یقین دلا دے۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں۔ وہ چہرہ دیکھا ہوا سا لگتا تھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک نام پکڑا۔ اس نے پھر غور سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے دماغ سے جیسے ایک پردہ سا ہٹ گیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔ ”جنت آور!!“

اس کے ذہن کی الجھن تو دور ہو گئی تھی۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس بات نے اسے مطمئن کیا ہے یا ایک بار پھر الجھا دیا ہے۔ بار بار یہ خیال اس کے ذہن میں آتا تھا کہ اگر یہ لڑکی جنت آور کے بجائے اس کی بہن بھاگ بھری ہوتی تو وہ کیا کرتا؟ اس کے دل کی کیا حالت ہوتی۔ وہ کیا سمجھ نہ کر گزرتا۔ اس کی یہ حاش اور تک دو دو پایہ تکمیل تک پہنچ جاتی۔ پھر نہ اسے کوئی خوف رہتا۔ نہ وہ اس طرح سرگرداں رہتا۔ وہ اپنے خاندان کی عزت کو دنیا کی دستبرد سے بچا کر ہمیشہ کیلئے آسودہ ہو جاتا۔ خواہ اس کے لئے اسے پھانسی کے پھندے سے کوئی لگے لگنا پڑتا۔

وہ اپنے یہ سنگتے خیالوں میں جکڑ رہا اور ڈرامہ ختم بھی ہو گیا۔ وہ پندال سے نکل کر گھر

گاؤں سے باہر کھلے میدان میں ڈرامے کے لئے پندال لگا ہوا تھا۔ ایک طرف ٹکٹ لینے والوں کا ہجوم تھا۔ کا کے لوہار نے اسے اس طرف متوجہ کیا۔

”دیکھا یا! پہلے دن سے ہی یہاں اتار دیا ہے۔ لوگوں کا تو دیکھ دیکھ کر دل نہیں بھرتا۔ میں نے آپ پانچ دفعہ یہ ڈرامہ دیکھا ہے۔ تم یہاں غمزدگی میں ٹکٹ لے آؤں۔“

اس قدر ہجوم کے باوجود وہ جلد ٹکٹ لے کر آ گیا۔ اس نے بتایا کہ ٹکٹ بیچنے والے سے اس نے جان چیکان بنا رکھی ہے۔ وہ کچھ دیر وہیں کھڑے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر پندال کو ایک جانب سے کھول دیا گیا اور ٹھنکی بیچنے لگی۔ کار کے لوہار نے اس کا بازو پکڑا اور تیز تیز چلا ہوا بولا۔

”جل آ جلدی کر یا نہیں تو سامنے کی سیٹیں بھر جائیں گی۔“

پندال میں داخل ہوتے ہی اسٹینچ پر لٹھ پڑتی تھی۔ جو بڑی میزین جوڑ کر بنایا گیا تھا۔ لوگ دھکم پیل کرتے اندر آ رہے تھے۔ جلدی سارا پندال بھر گیا تو سن پٹے آوازیں لگنے لگے کہ جلد پردہ اٹھایا جائے۔

پردہ ہولے ہولے سرکا اور اسٹینچ پر سکیموں کے جھرمٹ میں پھول کی طرح کھلی ہوئی ہیر نظر آئی۔ کا کے لوہار نے سچا دل کو کتنی ماری۔ ”یہ درمیان نصیب ہے۔ حوالی سوٹ والی۔ دیکھو ڈراما کیا جواب دے بتائی ہے اللہ نے۔“

سچا دل نے حوالی دوپٹے میں گھرے ہوئے دلکش چہرے کو دیکھا۔ وہ سکیموں کے ساتھ لڑکے شوشن کا رنگت گام رہی تھی۔ تماشا کی اس کی ایک ایک ادا پر جیسے دل تمام لیٹے تھے۔ وہ اٹھیلیاں کرتی۔ مورتی کی سی حال چلتی۔ جب گھوم جاتی تو اس کی ٹانگوں کو چھوٹی ہوئی لمبی چوٹی لہرائے لگتی۔ تماشاخیوں کے دل ان کی ہر شوق نگاہوں میں دھڑکنے لگتے۔

وہ لمبے بھر کو کاپ سا گیا۔ اس کا چہرہ دیکھا ہوا سا کیوں لگتا تھا۔ اس خیال نے اسے

آئے۔ تو بھی کالو ہارڈ رائے کی باتیں ہی کرتا رہا۔ سجاد کو اس تذکرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ یونہی بس ہوں ہاں کرتا رہا۔

.....

”پانیا! او پانیا۔!!!“ نئے نئے سر ملی صدائے انہیں صبح ہی صبح آواز دی۔ سجاد نے آنکھ کھول کر کالو ہارڈ کی چار پائی کی طرف دیکھا۔ وہ گہری نیند میں مست پڑا تھا۔ سجاد اپنے بال برابر کرتا ہوا اٹھا۔ تب تک اس نے دو تین مرتبہ اور کیا کیا۔ سجاد نے اٹھ کر باہر کچن میں جھانکا۔ لہر دودھ کا برتن زمین پر رکھے بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا فراک اور داڑھی۔ دونوں ہی خوش رنگ اور صاف تھے۔ اس کا چہرہ کھلا کھلا اور تازہ تھا۔ سجاد کو صبح ہی صبح بہار کا یہ رنگ دیکھنا اچھا معلوم ہوا۔ لہر نے اسے دیکھ کر ہراسا نہ بنایا۔ سجاد دو ہی قدموں میں اس کے قریب آ گیا اور اسے پھینٹنے کو بولا۔ ”تو کیا منہ اٹھائے کمزری ہے۔ صبح سلام کر لے تو تیرا کیا چلا جائے گا۔“

”جانہیں کرتی سلام۔ تو میرا کیا لگتا ہے جو تجھے سلام کروں؟“ وہ تروخ کر بولی۔

سجاد کو بھی آگئی۔ ”تیرا مسلمان بھائی نہیں ہوں میں۔“

اس کی سبز خوبصورت آنکھیں ذرا سا مسکرائیں اور وہ بات بدلنے کو بولی۔

”پانیا لو ہار کدھر ہے۔“

”خراٹے لے رہا ہے۔“ سجاد نے بتایا۔

”آئے ہائے۔“ اس نے ناک میوں چڑھائی۔ ”اتادون چھ آیا ہے اور ابھی اس کے خراٹے ہی فتم نہیں ہوئے۔“

”اے بلا۔ تو یہ صبح کیوں میرے خراٹوں کو نظر کدھ رہی ہے۔“ کالو ہارڈ کی آواز دروازے میں سے سنائی دی۔ وہ جمائیاں لیتا اسی طرف آ رہا تھا۔

”اب نہیں آؤں گی۔ تیرے خراٹے کتنے۔“ تجھے نظر لگانے۔ سمجھا تو۔“ وہ منہ ہلکا کر دودھ کا برتن اٹھائے کیلئے بھگی۔

”جا۔۔۔ جا۔۔۔ جاتی ہے تو چلی جا۔ پھر بعد میں نہ کہنا کہ داد سے بے شکایت کیوں لگائی تھی۔“ کالو ہارڈ فرس کر اسے چھینٹنے لگا۔

وہ بھی ہنس پڑی۔ ”لا برتن دودھ ڈال دوں۔ تیرا کیا بھروسہ۔ تو داد سے شکایت

لگائے ہی چل پڑے۔“

”اب سیدھی ہوئی ہے نا۔“ وہ اندر سے برتن لے آیا۔ لہر نے اس کے برتن میں دودھ ڈالا اور چلنے چلنے کہنے لگی۔ ”پانیا! دادا کہتا تھا۔ جب شہر جائے گا۔ تو حموزا سامان اس کا بھی لے جانا۔“

”جا۔ جا۔ میں تیرے دادے کا نوکر نہیں ہوں۔ جو اس کا سامان ڈھونڈ پھروں۔“ کالو ہارڈ نے منہ بگاڑ کر اسے پھر بتایا۔

وہ ناراض نہیں ہوئی اور مسکراتی ہوئی آٹکھوں کے ساتھ بولی۔ ”اچھا۔ اسی طرح کہہ دوں داد سے جا کر۔“

”جا کہہ دے۔ میں کوئی ڈرتا ہوں تیرے دادے سے۔“ وہ کچھ کچھ روٹھی۔

”او جھپٹے۔ تو کہیں کچ ہی میری شکایت لگانے نہ بیٹھ جاتا۔“ وہ جلدی سے بولا۔ ”دادے سے کہہ دینا۔ میں کل باپروسوں کا سامان لے جاؤ گا۔“

”اچھا!!!“ وہ لہرائی ہوئی مٹی اور دودھ کا برتن ساتھ میں جھلاتی۔ اپنے زیور چھٹکانی باہر نکلتی گئی۔

.....

ناشتہ وغیرہ کر کے کالو ہارڈ نے اس کے اور اپنے کپڑے دھو کر پھیلائے اور اس سے بولا۔

”یار! یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ جب تک دل چاہے یہاں رہ۔“

سجاد نے اس کی اس غیر متوقع بات پر اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ وہ اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ بولا۔

”یار! دل کو پریشانیاں نہ لگا۔ خوش خوش رہ اور اللہ پر سب کچھ چھوڑ دے۔“

کالو ہارڈ کی بات اس کے دل کو لگی۔ ابھی اس کے سامنے کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے کوئی فیصلہ کیا تھا۔ اس لئے اس نے یہی طے کیا کہ اسے کچھ عرصہ کالو ہارڈ کے ساتھ ہی گزار لینا چاہیے۔ یہ اس کے لئے اچھا نکتہ تھا۔ وہ گاؤں گاؤں پھرتا۔ وہ اس کے ساتھ مختلف علاقوں میں محکم پھر کر کھیمو اور بوڑھے کو کرن کو بھی تلاش کر سکتا تھا۔ شاید کہیں اس کا کوہر قصود بھی پا جائے۔

وہ کالو ہارڈ کے پاس رہ کر مفت کی روٹیاں نہیں توڑتا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ

میں تھا اور سینی پر کوئی شوق ہی لے لہائے ہوئے تھا۔ بیل گاڑی کی مخصوص آواز اس کے ساتھ ساتھ تال دے رہی تھی۔ سچا دل لہاتا ہوا بے ہزار اور شہری کھیتوں کو نظر بھر کر دیکھ رہا تھا کہ وہ چونک سا پڑا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک نام پھلا۔
”معمو۔۔۔“

اس نے پھر جیسے اپنے آپ سے کہا۔ ”معمو!!!!“ اور بیلوں کی ری کھینچی لی۔

”یار کاکے۔۔۔“ غمزدہ ذرا روکتا۔

”کیا بات ہے یار؟“ کاکے کے بیلوں کو روکنے کی مخصوص آواز نکالتے ہوئے ان کی ری کھینچی لی۔

جیسے ہی بیلوں کی رفتار سست ہوئی۔ سچا دل چھٹا ملک مار کر اترا اور کھیتوں کے درمیان میں سے گزرتی ہوئی ایک جھڈی پر دوڑتا ہوا پکارا۔
”معمو!! معمو!! معمو!! معمو!!“

کچے راستے پر دوڑتی بھاگتی۔ چھوٹی سی لڑکی اور اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ٹھکی اور اس کی طرف دوڑی۔ سچا دل بے ڈگ بھرتا اسے آدھے راستے میں ملا۔ وہ خوشی سے چاچا! چاچا! کہتی ہوئی اس کے بازوؤں میں جھول گئی۔ سچا دل نے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر اسے ہوا میں اچھالا۔ اور محبت آواز میں گئی سے بولا۔ ”مر جاتی۔ تو کہاں جلی گئی تھی اپنے چاچے کو چھوڑ کر۔“

دھکم بھل پھینے لگی۔ ”چاچا! چاچا! ہمیں لانا تمہارے ساتھ لے آیا تھا۔ وہ کہتا ہے۔ اب بابا بوڑھا ہو گیا ہے۔ وہ آرام کرے۔ اسے کوئی ضرورت نہیں قبریں کھودنے کی۔“
”اچھا۔ تیرا ماما آ گیا ہے۔ کب؟“ سچا دل نے حیرت سے پوچھا۔ اسے اس عجیب اتفاق پر ایک شاندار مسرت ہوئی کہ چھوٹی ماں اور اس کا بھائی دونوں بوڑھے کے پاس لوٹ آئے تھے۔

”چاچا! بھول گیا ہے۔ تیرے ساتھ ہی تو آیا تھا ماما تمہارے۔ تجھے یاد نہیں۔ تو ہی تو اس کو لایا تھا۔“ معمو نے بھولپن سے کہا۔

سچا دل پر حقیقت حال واضح ہو گئی۔ گویا پاس ابھی تک بوڑھے کے گمشدہ بیٹے کا کردار بھار رہا تھا۔ اور انہیں یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا تھا کہ وہی قدر ہے۔
”تیرا بابا تو ٹھیک ہے نا۔“ سچا دل نے پوچھا۔

سامان لانے لے جانے میں اس کا ہاتھ بٹا نکلتا تھا۔ اور سارا دن دونوں نے یہی کچھ کیا۔ وہ مختلف جگہوں سے لوگوں کا سامان اکٹھا کرتے رہے۔ اور اسے اچھی طرح باندھ کر رکھ لیا۔ کاکا سر شام ہی کھانا لے آیا۔ بھر جلدی سوونے کے لئے لیٹ گیا۔

خلاف معمول وہ بہت سویرے اٹھا۔ اس نے سچا دل کو بھی جگہ دیا۔ دونوں نے صبح میں نماز پڑھی۔ دودھ گرم کر کے پیا اور بیل گاڑی پر سامان لاد کر دونوں روانہ ہوئے۔ تو ہلکا ہلکا سا گھٹی نور سورج کی آمد کا اعلان بن کر مشرق کی سمت بکھر رہا تھا۔ ہوا خشک اور خوشبو سے لدی ہوئی تھی۔ بیل تازہ دھتے اور ٹھیکیلیاں کرتے ہوئے معمول سے زیادہ تیز چل رہے تھے۔ دونوں طرف لہلہاتا ہوا سبزہ اور صبح کے طلوع کا منظر اتنا دلکش اور چھا جانے والا تھا کہ سچا دل صبح کے ان جلوؤں میں کھو کر کچھ دیر کیلئے اپنے سارے غم اپنے سارے دکھ وقتی طور پر بھول گیا۔ کاکے کو لہار نے بیل گاڑی کا رخ گاؤں سے باہر جانے والی جھڈی کے بجائے ایک اور خشک سے راستے پر موڑ دیا۔

”یار! اب کس طرف جا رہے ہو؟“ سچا دل نے اسے یاد دلایا۔

”جیسی اس شوقین لہر کے دادے کا سامان بھی تو ڈھونڈتا ہے۔ اور ہر سے اس کا سامان اٹھائیں گے اور دوسری طرف سے نکل کر پھر شہر کے راستے پر۔“

”اچھا۔ وہ لوگ اس طرف رہتے ہیں۔“ سچا دل نے پوچھا۔

”ان خانہ بدوشوں کا کیا ہے۔ انہیں تو جہاں ٹھوڑی سی جگہ نظر آتی ہے۔ یہ گھر بناتے ہیں۔ اس طرف زمین کھلی پڑی تھی۔ انہوں نے ہستی بسائی۔ کسی نے اٹھا دیا۔ تو یہ سامان اٹھائیں گے اور انہیں اور ڈیرے جا لگائیں گے۔“

سچا دل نے سر ہلایا۔ ”ہم سے تو یہی لوگ اچھے ہیں۔ نہ گھر بناتے ہیں۔ نہ اس کے دکھڑے سمجھتے ہیں۔“

”تو بھی بھولا بادشاہ ہے۔“ کاکا ہنسا۔

”جہاں یوریا بستر ڈال دیں وہی گھر بن جاتا ہے اور گھر کے ساتھ اس کے دکھ کھ گئے ہی ہوتے ہیں۔“

”ہوں۔“ سچا دل نے لمبی سی ہوا کی اور دور دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں پر لگے ڈالی۔ سبزے کا رنگ آنکھوں میں غصہ بن کر اتر رہا تھا۔ ہوا میں کسی ہوئی خوشبو پڑمردہ روح کو تازگی کی عطا کر رہی تھی۔ رات کی نسبت سچا دل کا ذہن کچھ ہلکا ہو گیا تھا۔ کاکا کو لہار بھی سونا

”ہاں چاچا! وہ بالکل ٹھیک ہو گیا اور بڑا خوش ہے۔ ماما قدرے جو آ گیا ہے۔“ اس نے خوشی سے اطلاع دی۔

”واہ بھی۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ اچھا تا تو کسی کمرہ لوگ کہاں رہے ہو۔ یہیں کہیں نزدیک ہی۔“

”کیا معاملہ ہے بھی؟“ کا کا بڑا بھی ان کے برابر آ بیٹھا۔

سجاد نے اسے بتایا کہ کبھی وہ لڑکی بھیجو ہے۔ جس کی ماں اس سے چھڑ گئی تھی۔ کا کا مسکرایا۔ اور آسمان کی طرف دیکھ کر بولا۔

”واہ مولہ! تیرے رنگ نیا رہے ہیں۔“

”چل آ جا چاچا۔ بابے کے پاس ملیں۔ وہ تجھے دیکھ کر بہت خوش ہوگا۔ وہ تجھے یاد کرتا ہے۔“ بھیجو نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

”چل آ جاڑے۔ تجھے گڈ کی سیر کریں۔“ کا کے نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے پھول کی طرح اٹھالیا۔ بھیجو لگ لگادی ہوئی کے جب سے مکمل کمرہ بنی چلی گئی۔

تینوں تیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔ تو سجاد نے بھیجو سے پوچھا۔

”تو یہاں اکیلی کی کمرہ رہتی تھی؟“

”چاچا! ہمارا گھر تو قریب ہی ہے۔ میں کھیتی کھیتی اس طرف آ گئی تھی۔ بس ابھی آ جاتا ہے۔“ وہ بولی۔

”اس طرف سے تھوڑا دور پڑے گا۔ ہیں نا۔“ کا کے نے بیلوں کو ہانک بھیجو تیل گاڑی کا جنگلاتام کر کھڑی ہو گئی۔ صبح کی خشک ہوا اس کے بالوں سے اٹھیلیاں کرنے لگی۔ وہ بہت خوش تھی اور اچانک کر گھٹڑی کے قریب سایہ ڈالے ہوئے درختوں کی لگتی ہوئی شاخوں کو چھونے کی کوشش کر رہی تھی۔

سجاد کے دل کا پوجہ بھی کچھ ہلکا ہوا تھا۔ بوڑھے اور بھیجو کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ باس سے ملنے کی توقع بھی تھی۔ وہ پیلے کی نسبت خود کو تازہ دم محسوس کر رہا تھا۔

سورج کی رو پہلی کڑوں نے مشرق کی طرف ایک طلائی حاشیہ باندھ دیا تھا۔ صبح کے شغنے اور دھبے رنگ اب گہرے اور واضح ہو چلے تھے۔ ہوا سے خشکی اور تازگی دھیرے دھیرے الگ ہو رہی تھی۔

بھیجو کسی خوش آواز پرندے کی طرح چبکی اور انگلی سے اشارہ کر کے بولی۔

”آگیا۔۔۔ آگیا۔۔۔ چاچا! وہ دیکھو کمرہ آ گیا۔“

سجاد نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ کا کا لوہار بولا۔ ”یہ تو خانہ بدوشوں کی بستی ہے۔ اوکا کی۔ تو یہاں رہتی ہے۔“

”ہاں چاچا! ہاں۔ یہی ہمارا گھر ہے۔“

”چلو۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ ہمیں بھی یہیں آنا تھا۔“ کا کے نے بیلوں کو ہنگایا تا کہ وہ جلدی قدم اٹھائیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی وہ ان کے پچھلے پرانے خیموں کی بستی کے قریب پہنچ گئے۔ نئے نئے رنگ دھڑنگ سے پچھس لگائے ہوئے ان کی طرف دیکھتے ہوئے تیل گاڑی کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ سجاد نے بھیجو کو اٹھا کر نیچے اتار دیا۔ وہ جوش سے بولی۔

”آ جا چاچا! آ جا۔ بابا تجھے دیکھ کر بڑا خوش ہوگا۔“

کا کے نے بیلوں کی رسی باندھ دی اور ان کے سامنے کچھ دانے اور گھاس کا ڈپر رکھ کر ان کے ساتھ چلا آیا۔

”چل بھی۔ پہلے تیرے بابے سے مل لیں۔ پھر چلتے ہیں اپنے کام پر۔“ اس نے پیار سے بھیجو کے بالوں کو چھوا۔

وہ اپنی جھوٹی اور وضعی سنبھاتی ہوئی ان سے آگے آگے دوڑنے لگی۔ اسے بابے کو یہ اچھی خبر سنانے کی بہت جلدی تھی۔ وہ دونوں لمبے لمبے ڈنگ بھرتے اس کے پیچھے چلتے گئے۔

بھیجو ایک خیمے کے سامنے رکی اور ہلکڑی ہوئی ایک لڑکی کے بازو میں جھول گئی۔

”اؤئے ہوئے۔ یہ تو لہر رہا ہے۔“ کا کے نے قدرے حیرت سے کہا۔ سجاد نے بھی دیکھا۔ چھٹ کے گھر دار فرادک اور سنہری چونوں میں رنگ برنگے پر آندے سے پہنچے لہر ان کے دروبرجی۔ جڑے سورج کی سنہری کرتیں۔ اس کی ہز حسین آنکھوں میں ہیرے کی طرح چمک رہی تھیں۔

بھیجو ابڑے فخر سے بولی۔ ”یہ لہر باجی ہے۔ میری لہر باجی۔“

”تو ان کے پاس رہتی ہے۔“ سجاد نے تصدیق کرنے کو پوچھا۔

”ہاں چاچا! میں یہیں رہتی ہوں۔ ماما قدرے بھیجو۔ بابا بھی اور یہاں آدا بھی ہے۔“

اس نے پوری تفصیل سے آگاہ کرنا ضروری خیال کیا۔

جب لہر بھیجی قریب آ گئی اور کچھ حیرت سے بھیجو کی یہ بے تکلف گفتگو سنے لگی۔ کا کے

کاٹے نے جلدی سے کہا۔ سجاد نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔
 دادا نے ابھی کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ خیمے کے چھوٹنے سے دروازے میں سے آواز آئی۔ ”یہ کیوں آ گیا ہے۔“ جمیمو کا چاچا۔“
 ان سب نے پلٹ کر دیکھا۔ باس مسکراتا ہوا اندر داخل ہو رہا تھا۔ سجاد کو اس سے اسنے دنوں بعد ملنا اچھا معلوم ہوا۔ وہ اٹھ کر یوں اس سے ملا جیسے کسی پھنڈے سے بونے دوست سے ملا جا رہے۔
 ”عجیب ہو یا تم بھی۔ وہاں سے چوروں کی طرح نکل آئے۔ نہ کوئی پتہ۔ نہ تھا۔“
 سجاد نے ہنسنے لگا۔

”کیا کریں۔ آخر ہوئے جو چور۔“ باس نے ہنس کر کہا اور وہیں چٹائی پر بیٹھ گیا۔
 بوڑھا گورکن آنکھوں میں ایک نقار خرا مز چمک لئے اس کی طرف دالہا نہ لگا ہوں سے دیکھ رہا تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس پر بھڑور ہو رہا ہے۔ سجاد کو ایک گونہ اطمینان ہوا۔ باس نے خواہ اپنی غرض کیلئے سکھائی۔ قدریں بن کر بوڑھے کی زندگی کے آخری لمحوں کو مسرت سے سنوا رہا تھا۔

سجاد نے کاٹے سے اس کا تعارف کروایا۔ وہ ابھی ادھر ادھر کی باتیں ہی کر رہے تھے کہ لہر کے زیر نگین کی آواز اس جانب آئی۔ اس نے ایک بڑی سی قلاب میں بہت سا طلوہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ جمیمو پر انھوں کی چنگیر لگائی۔

”واہ۔ واہ۔“ کاٹے نے ہنسنے لگا۔ ”آج تو مزے آ گئے۔“
 ”بڑا تکلف کیا آپ نے۔ ہم تو ناشتہ کر آئے تھے۔“ سجاد نے کہا۔
 ”اب تک تو وہ بہت کم بھی ہو گیا ہوگا۔ پلوتم بسم اللہ کرو۔“ باس نے کہا۔
 کاٹے اور سجاد نے لقمہ توڑا۔ باس نے اچک کر خیمے کے دوسرے سرے پر لہر کو دیکھا۔ اور اسے آواز دی۔

”بات سن لہر۔ رات کا سالن ہے۔ تو مجھے لا دے۔ تجھے پتہ ہے۔ میں ایسی چیزیں نہیں کھاتا۔“

لہر قریب آئی۔ ”تھوڑا کھا کر تو دیکھو۔“ اس کے لہجے میں جیلے ارمان چھپے تھے۔
 ”نہیں۔ مجھے۔ تھوڑا سالن ہو تو لا دے۔“ باس نے بے نیازی سے کہا۔
 لہر نے غصے سے ہونٹ چپائے اور چو لھے کی طرف چلی گئی۔

”یہ رشتہ دار ہے تمہاری؟“
 ”نہیں رشتہ دار تو نہیں۔ ہاں اس کا ماما قدیر دادا کا بیٹا جٹا ہوا ہے۔ دادا اس کو بہت چاہتا ہے۔ اس نے ایک بار دادا کی جان بچائی تھی۔“ لہر نے بتایا۔
 ”قدیر کہاں ہے؟“ سجاد نے لہر سے براہ راست پوچھا۔
 ”وہ میر کر نے گیا ہے۔“ اس نے سر دھری سے جواب دیا۔
 ”اور بابا؟“ سجاد نے استفسار کیا۔
 ”وہ اندر ہے۔“ اس نے اطلاع دی۔

اسی وقت جمیمو اچھلتی پھانڈی خیمے میں سے باہر آئی۔ اس کے پیچھے ایک بھاری بھر کم دروازہ قد بوڑھا تھا۔ جس کی داڑھی بالکل سفید تھی۔ لیکن اس کے باوجود عمر رسیدہ معلوم نہیں ہوتا تھا۔ اس کی کمر میں قم نہیں تھا اور وہ بالکل سیدھا جیسے سینہ تانے ہوئے چل رہا تھا۔ اس نے خاندان بدوشوں کی طرح پیشانی پر پٹنی باندھ رکھی تھی اور اس کے ایک کان میں بالی گئی۔ وہ ہاتھ کا چمبھاسا آنکھوں پر رکھے ان کی طرف دیکھتا ہوا آ رہا تھا۔

جمیمو نے شور مچایا۔ ”چاچا! چاچا! دادا آ گیا۔ دادا آ گیا۔!“
 سجاد نے آگے بڑھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ کاٹے نے بھی اس سے ہاتھ ملایا۔ اور اس کی خبر گیری پر پوچھنے لگا۔
 ”آؤ۔۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔۔ اندر آ جاؤ۔“ وہ تھوڑا سا جھک کر خیمے میں داخل ہوا اور انہیں بھی اندر آنے کے لئے کہا۔

سورج کا روشن اجالا خیمے میں جا کر ٹک گیا سا ہو گیا تھا اور انہیں گرد و پیش اتنا صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ جیسے ہی ان کی نگاہیں تاری گئی سے ہاتھوں سے یوں سجاد نے دیکھا کہ بوڑھا گورکن خیمے کے ایک کونے میں چٹائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ سجاد نے اسے سلام کیا اور جھک کر تعظیماً اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگایا۔

بوڑھے نے گرجبوشی سے اسے پیار کیا اور اس کا بازو پکڑ کر اپنے قریب ہی بٹھالیا اور اس کا شانہ ہلا کر بولا۔ ”بہتر ہے۔ اب تجھے فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب قدیر آ گیا ہے۔ وہ مجھے اور جمیمو کو سنبھالے گا۔ تو اب فکر نہ کرنا۔“

”لہر! کوئی چاہ لانی۔“ بھائیوں کیلئے۔ دادا نے بھاری آواز میں کہا۔
 ”نہیں۔۔۔۔۔ نہیں دادا۔ اس کی ضرورت نہیں۔ ہم ناشتہ کر کے گھر سے نکلے ہیں۔“

”یار اللہ تعالیٰ کی نعمت کو یوں ٹھکرا نہیں چاہیے۔ تم کھاکے دیکھو بڑا مزیدار ہے۔“
کا کے لوہار نے بڑے بڑے لقمے توڑتے ہوئے کہا۔

ہاس نے جواب نہیں دیا۔ بس برا سامنہ بنا کر کھانے سے انکار کر دیا۔

تھوڑی دیر میں لہر ماتھے پر ہل ڈالے ہوئے آئی اور ایک پلیٹ میں تلا ہوا انڈہ اس کے سامنے رکھ گئی۔ ”اتنا غصہ کیوں کرتی ہے۔ اگر میں یہ طلوہ کھا لوں گا۔ تو تجھے کتنے نفلوں کا ثواب ملے گا۔“

”نہیں کھاتا تو نہ کھا۔“ وہ غصے سے کہہ کر پلیٹ مٹی۔

○ ○ ○ ○ ○

سجاد نے کا کے لوہار کو گنجائی شہر روانہ کر دیا۔ مگر وہ اس سے وعدہ لے کر گیا کہ وہ آتی بارے اسے ہمراہ لے جائے گا۔ وہ جب تک یہاں ہے۔ اس کے پاس ہی ٹھہرے گا۔

اس کی تیل گاڑی میں وارا کا سامان رکھ کر وہ اسے دور تک خدا حافظہ کہنے گئے۔ وہاں سے پلٹتے ہوئے وہ سبز لہلہاتے کھیتوں کے ساتھ ساتھ لہلہا کھائی ہوئی۔ گنڈ غڑی پر ہو لئے۔
سجاد نے ہاس سے کہا۔

”آ یا رازرا تھوڑا اٹھو سوتے ہیں۔“

”میں تو ابھی لمبی سیر کر کے لوٹا ہوں۔ کچھ تھکاوٹ ہی محسوس ہونے لگی ہے۔“ اس نے سکلنڈی سے جواب دیا۔

”چلو۔ پھر کہیں بیٹھ جاتے ہیں۔“ سجاد نے کہا۔ اور دونوں برساتی نالے کے ساتھ ساتھ بنی ہوئی کچی مینڈھ پر بیٹھ گئے۔

سجاد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”یار! تو نے خوب قدیم کاروپ بھرا ہے۔
بابے کو تو کپا لیتیں ہو گیا ہے۔“

ہاس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ سجاد نے بات آگے بڑھائی۔ ”مجھے تو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ بچہ بڑھا آدھی۔ بہت خوش ہے۔ اچھا اس کی زندگی کے آخری دن تو کچھ میں گزر جائیں گے۔“

ہاس نے اب بھی کچھ نہیں کہا۔ تو سجاد جو پہلے برساتی نالے میں بہتے ہوئے چند شک جپوں پر لگا ہیں جمائے ہوئے بیٹھا تھا۔ گھوم کر ہاس کی طرف دیکھا۔ کہ وہ کس خیال میں کھو یا ہوا ہے۔ جو اس کی بات ہی نہیں سن رہا۔

وہ یوں چپ بیٹھا تھا۔ جیسے کہیں بہت درد دیکھ رہا ہو۔ سجاد نے اس کا بازو ہلایا۔

”کیا بات ہے یار! کہاں پیچھے ہوئے ہو؟ میری بات سن رہے یا نہیں تم نے؟“

”سن رہے ہیں۔ تمہاری بات۔“ اس نے کئی بار سر کو اٹاٹ میں جھنک دی۔

”یار سن رہے۔ اور تم بھی میری بات سن لو۔ کہ میں قدیم رہا ہوا نہیں ہوں۔ میں واقعی قدیم ہوں۔“

”کیا؟“ سجاد نے ایک خوشگوار استغاب سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں یار! ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں قدیم ہوں۔ بابے کا بیٹا۔ میں سیلاب میں اس سے بچ کر گیا تھا۔ اس وقت میری عمر کوئی چھ سات سال ہوگی۔ سب کچھ مجھے یاد ہے۔ اچھی طرح ہے۔“

”اچھا۔ کیا واقعی؟“ سجاد نے بے یقینی سے کہا۔

”کمال ہے یار! تم نے تو بالکل ظاہر نہیں ہونے دیا۔“

”ہاں!“ وہ ایک طویل سانس لے کر بولا۔ ”یہ سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ خود مجھے بھی یقین کرنے میں وقت لگا تھا۔ دکھوں اور پریشانوں نے بابے کی صورت اتنی بدل دی ہے کہ میں شاید اسے نہ ہی پہچانتا۔ لیکن جب اس نے قدیم کا نام لیا۔ اور سیلاب میں اس سے بچ کر جانے کا ذکر کیا۔ تو مجھے آہستہ آہستہ سب کچھ یاد آ گیا۔“

سجاد کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک مار دینے والے احساس عروسی نے اسے ڈس لیا۔ ہاس کتنے عرصے بعد بھی آن کر اپنے بچے سے باپ سے مل گیا تھا اور ایک وہ تھا کہ اپنے بچے کے رشتوں کی تلاش میں اب تک بھاگ رہا تھا۔ مگر ناکامی اور نامرادی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا تھا۔

”خوش قسمت ہو یار تم۔ بچے بڑے ہوؤں کا مل جانا تو بڑی بات ہے۔“ سجاد نے بڑی حسرت سے کہا۔

”ہاں یار! میں خود حیران ہوتا ہوں کہ یہ سب کس طرح سے ہو گیا۔ میں تو زندگی میں اتنا آگے نکل گیا تھا کہ کبھی خیال بھی نہیں آیا تھا کہ ایک بار بھڑا پچھے آ جاؤں گا۔ جیسے باقی میں رہ رہا ہوں۔“

”کیوں؟ تم خوش نہیں ہو یار؟“ سجاد نے پوچھا۔

”خوش۔“ وہ ایک لفظ کہہ کر کچھ دیر کیلئے خاموش ہو گیا۔ اور کچھ سوچا رہا۔ پھر جیسے

ہے کہ وہ مر چکی ہے۔“

”ہاں۔ وہ پھارپھا بھی کیا کرے۔ اس کے لئے تو کھجور ہی مٹی ہے۔ بوزھا اودی ہے۔ کسی کا مکیا مقابلہ کرے۔ وہ تو اس کا نام لیتے ہوئے بھی زرتہ ہے۔“

”کیا تم پھیلیاں بھجوا رہے ہو یا!“ ہاس نے جی سے کہا اور پھر کچھ سوچ کر متحیر چہرے کے ساتھ بولا۔

”کیا تم پہیلیاں بچھو رہے ہو یاں!“ باس نے سختی سے کہا اور پھر کچھ سوچ کر متغیر چہرے کے ساتھ بولا۔

”کہیں وہ کسی کے ساتھ نکل تو نہیں گئی۔“

”نہیں..... نہیں یار۔ ایسی بات نہیں ہے۔“ سجاوول نے زور دے کر کہا۔

”اس بچاری کو تو کچھ جرائم پیشہ لوگ اغوا کر کے لے گئے تھے۔“

”کون؟ کیا؟ کس کے آدمی تھے وہ۔“ اس نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں کوئی گالی

”یار! کچھ سمجھ چڑ نہیں چل سکا کہ وہ بندے کس کے تھے۔ یہاں قبرستان میں ایک قبر کے اندر انہوں نے اڈا دیکھا تھا۔ بابے نے انہیں دیکھ لیا۔ تو وہ اس کا منہ بند کرنے کیلئے تیری بہن کو اغوا کر کے لے گئے۔“

”قبر..... قبر میں اڈا۔ یار تجھے پتہ ہے کہ وہ کونسی قبر تھی۔“ وہ دانت میں کر بولا۔

”ہاں۔ مجھے پتہ تو تھا۔ لیکن اب دیکھتا ہوں۔ تو اس کا نام نشان نہیں۔ کچی قبر تھی۔

کا تعویذ لگا رکھا تھا انہوں نے۔ دوسرے کچھ پتہ نہیں چلا تھا۔ بالکل اصلی قبر گئی تھی۔

”یہ نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ ایک دم غائب ہو گئے ہیں۔“

”اور۔ اور میری بہن۔“ وہ اٹک اٹک کر بولا۔

”وہ ان کے چنگل سے کھل آئی ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ انہوں نے کوئی نشہ کیا تھا۔ جس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئے۔ یہ مریض دیکھ کر کھل آئی۔“

”کہاں ہے وہ؟“ باس نے پیتابی سے سوال کیا۔

”وہ بھاری بھتیجی چھپائی قبرستان آگئی تھی۔ باپ کو ڈھونڈنے۔ مگر تم باپ کو لے کر نکل چکے تھے۔ میں اتفاق سے اسے مل گیا۔ اسے تلی دلا سروسہ کر میں اس کی ایک سیکی کھانسی کمرچک اٹھانوں میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ میں باپ لے کر آؤں گا۔“

بس بچاری اسی آس میں گھڑیاں گن رہی ہوگی۔“

اس سوچ کے درمیان بولا۔ ”کچھ سمجھ بھی نہیں آتا کہ وہ وقت اچھا تھا۔ یا اچھا ہے۔ میں نے وہ مقام بڑی وجہ کے بعد حاصل کیا تھا۔ ہزاروں غافلوں سے لڑکر میں نے اپنا آپ بھایا تھا۔ لیکن یکدم ایسی موج آئی کہ سب کچھ ختم ہو گیا۔ اور بہت کچھ مل بھی گیا۔ سوچتا ہوں کہ اگر یہ واردات مجھ پر نہ کرتی تو شاید میں باپ سے بھی نہ ملتا۔ اور وہ اس سپہری کے عالم میں دم توڑ دیتا اور معصوم عیسائیوں کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتی۔ مگر اب بھی کچھ نہیں چلتا کہ کیا کروں۔ ان اپنے لوگوں کو کس طرح سکھ دوں۔ اور اپنی زندگی کی سکرستواروں؟“

”کیا مطلب؟ تم کیا کرنا چاہتے ہو۔؟“ سجاد نے پوچھا۔

”میں!“ باس نے اپنا نچلا ہونٹ کاٹتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کوئی ہنر نہیں سیکھا۔ جو

ہنرمیرے پاس ہے۔ میں اس کو آزاد نہیں سکتا۔ وقت نے حالات نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ اب ایک نینکی کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہے۔ بہن کی اولاد بھی تو اپنی اولاد کی طرح ہی ہوتی ہے۔ اپنی عزت اپنا خون ہے۔ اگر میں اپنا وعدہ پھر شروع کرتا ہوں۔ تو اس کا کیا ہوگا؟ اس کی ڈولی کون لے جائے گا۔ اس کو میرے نام کے طعنے ملنے رہیں گے۔“

”پھر!!“ سجاد نے متاثر ہو کر کہا۔

”پھر پھر یہ کہ میں اچلے کر رہ گیا ہوں۔ کہ کیا کروں۔ میں کہیں بھی آزادی سے کام نہیں کر سکتا۔ پولیس نے میرے خلاف کتنے ہی مقدمے بتا رکھے ہوں گے۔ سب کچھ چھوڑنا ہوں۔ مجھے جھمو کی کھر ہے۔ وہ میری مری بہن کی نشانی ہے۔“ ہاس کی اس بات پر حائل چونکا اور اسے جھمو کی ماں کا خیال آیا۔ جو بیٹی کی عدالتی میں تڑپ رہی تھی۔ اس نے ہاس سے پوچھا۔

”یار! تمہیں کس نے بتایا ہے کہ چھپو کی ماں مر گئی ہے۔“

”بابے نے بتایا ہے کہ تمہیں بہت چھوٹی تھی کہ وہ فوت ہو گئی تھی۔ تمہیں کے باپ کا

غم اسے کھا گیا۔“ باس نے بتایا۔

سجاد کو اعزاز دے ہو گیا کہ باپ نے جان و بوجھ کر اسے پیٹھ کی ماں کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ شاید وہ ایک عرصے بعد بیٹے کو پا کر پھر کھونا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اب اس کے بارے میں بتانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ اس نے مختصر سے لیے بیٹھ گیا۔

”یار! میری بات ذرا ادھیان سے سنتا۔ تمہاری بہن مری نہیں وہ زندہ ہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ”بابے نے مجھے خود بتایا

”وہی۔ تیرا بھائی قدر اور کون۔ جو سیلاب میں بہہ گیا تھا۔“ سجاد نے وضاحت کی۔

”ہائے۔ میں مر جاواں۔ بچی کہہ دیرا۔“

باس ایک عجیب حسرت اور دکھ سے اس کے سنولائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں محبت اتنی ہوتی تھی۔

”اور کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔ مجھ پر یقین نہیں۔ تو لے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ یہ بیٹھا ہے تیرے سامنے قدر۔ پوچھ لے اسی سے۔“ سجاد نے باس کی طرف اشارہ کیا۔ نور جاں ساکت سی ہو کر اس کی طرف دیکھتی کی دیکھتی رہ گئی۔

باس نے ہونٹوں سے ایک لفظ نہیں کہا اور جب چاپ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ باس کے صاف سترے لباس اور صمیری وضع قطع کو دیکھ کر وہ کچھ حیرت کچھ اچھے اور بے یقینی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس نے ہونٹوں میں اٹھنی ڈالی اور اس سے پوچھنے لگی۔

”ہائے۔ تو قدر ہے؟ قدر یا! تو بچی بچی قدر ہے۔“

”ہاں آپا۔ میں قدر ہوں۔“ باس نے آہ سی بھر کر کہا۔ ”تیرا بد نصیب بھائی۔“ شدت جذبات سے اس کی آواز رنہ رنہ گئی اور آنکھوں کے گوشے میٹھے گئے۔

”نہ دے نہ۔ بد نصیب ہوں تیرے دشمن۔“ اس نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر ارمان سے کہا اور اٹھ کر اس کے قریب آئی۔ باس نے اسے اٹھنا چاہا۔ لیکن رجاں نے اسے بیٹھے رہنے کو کہا اور اس کی پیشانی پہ ہاتھ ہوئے اور ہانا کر کچھ دیکھنے لگی۔

سجاد دیکھتی سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ اسے قدر تسلیم کرنے سے پہلے اپنا اطمینان کر لینا چاہتی تھی۔ اس بھی کچھ ابھرا ہوا سا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اچانک وہ خوش اور حیرت سے بے قابو ہو کر چلائی۔

”ہائے میرا اور! تو توجہ کی قدر ہی ہے۔“ اس نے باس کی پیشانی کو کٹی بار چوما اور اس کے سر کو اپنے سینے سے لگا کر بولی۔

”وے قدر یا! ہائے میرے در! تیرے پیچھے تو ہمارت گئے۔ ہمارے پاس تو کچھ نہیں رہا۔“ وہ زار و قطار روتے ہوئے کہنے لگی۔ باس کچھ دیر تو جیسے ضبط کئے ہوئے ساکت سا بیٹھا رہا۔ پھر اس نے بھی اپنے بازو رجاں کے گرد لپیٹ دیئے۔

باس نے شدت کرب سے ہونٹ کانٹے۔

”یار! تم نے تو میرے سامنے میری سوچ۔ سب کچھ ہی بدل دیا ہے۔ چل آ اٹھ۔“ مجھے اس کے پاس ابھی لے کر چل۔ پتہ نہیں وہ کس طرح ایک لمحہ گمن کر کاٹ رہی ہو گی۔“

O.....O.....O

دونوں چک اٹھانے سے پہلے۔ نور جاں اپنی آنسو بھری آنکھیں دلیز پر بچھائے بیٹھی تھی۔ اس نے باس کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ اور ستر بازی ہو کر سجاد سے بولی۔

”ویرا۔ کچھ پتہ چلا۔ میرے بابے کا۔ میری جھمکو کا۔“

سجاد نور جاں کو اتنی ساری خبریں انھیں نہیں سنانا چاہتا تھا۔ اسی لئے وہ عام سے لہجے میں بولا۔ ”چل اٹھ رجاں۔ اپنی سبیلی سے مل جل لے۔ میں تجھے لینے آیا ہوں۔“

”کیوں نا۔ خیر ہے نا۔“ اس نے قدر سے حیرت سے کہا اور اس کی روٹی روٹی سی آنکھوں میں امید کی ایک دھندلی سی چمک جا گئی۔

”سب خیر ہے۔ سب خیر ہے۔ تو بتا۔ تو نے جھمکو سے نہیں ملنا؟“

”کیا؟“ وہ اتنی جلدی اس کی بات پانے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ لیکن جھمکو کا نام سن کر اس کے نیچے چہرے پر شادابی کی ایک لہری تڑپنی۔ اور وہ اٹھتے پہ ہاتھ مار کر بولی۔

”ہائے دے۔“ مجھ جھمکیوں جلی کو بھجوا رہی تھی۔ جھمکو۔ اللہ کے واسطے مجھے بتا دے۔ میری جھمکو کھر ہے؟ کہاں ہے میری دھی۔ میری شہزادی۔ میں واری۔ میں صدمے۔“

”اچھا۔ اچھا۔ تم تو امیر تو کر۔“ سجاد نے کہا۔

”کچھ بابے کا بھی پوچھ لے کہ اسے بالکل ہی بھول بیٹھی ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”نہ دیر! اس طرح مت کہہ۔ بھلا بیٹیاں بھی کبھی باپ کو بھولتی ہیں۔“

”ہاں تا۔ میرا بابا کیسا ہے۔ وہ ٹھیک تو ہے نا؟“

”وہ۔ تو وہ بالکل چنگا بھلا ہے۔ کھوڑے کی طرح دوڑتا پھرتا ہے۔ برا خوش ہے وہ۔ اپنی نیاری شادی سب بھول بھال گیا ہے۔ اتنے عرصے بعد اس کا گھڑا ہوا بیٹا جو اس سے آ ملا ہے۔ اس نے خوش نہیں ہوتا۔ تو اور کس نے خوش ہوتا ہے۔“ سجاد آہستہ آہستہ اصل بات کی طرف آ گیا۔

”کون؟ کون؟ کون آ گیا ہے۔“ وہ حیرت اور بے یقینی سے پوچھنے لگی۔

بالکل انوکھے اور نئے ذائقے کا احساس ہوا۔ کچھ دیر خوش گپیاں ہوتی رہیں۔ پھر کاکا چلنے کیلئے اٹھ کھڑا ہوا۔

خانہ بدوش کی ہستی سے گھر کا راستہ کچھ زیادہ دور نہیں تھا۔ لیکن پھر بھی انہیں گھر تک پہنچنے پہنچنے اٹھ رہا ہو گیا۔ کھانا تو وہ کھائی آئے تھے۔ کاکا کے نے بیوں کو کھول کر ان کی ناک پر باغیچہ لائیں پانی رکھا۔ لائیں جلائی اور بسز پر دروازہ ہو گیا۔

سجاد بھی لیٹ گیا۔ کاکا دن بھر کا تھکا ہارا تھا۔ باتیں کرتے کرتے ہی خراٹے لینے لگا۔ سجاد نے رنک سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مطمئن چہرے کے ساتھ آسودگی کی نیند سو رہا تھا۔ اور ایک وہ تھا کہ اس کی قسمت میں رت جگے ہی لکھے ہوئے تھے۔

کاش! وہ کاکا کے لوبار کی طرح اپنے اندر رکھتے ہوئے جوالامی کو ایک پھونک مار کر ٹھنڈا کر سکتا۔ مگر یہ سب اس کے لئے اتنا ہی دشوار تھا۔ جتنا کاکا کے لوبار کے لئے سہل تھا۔ دل میں پڑے ہوئے گھاؤ سے بے خبر ہو جاتا اس کے بس میں نہیں تھا۔ وہ ایسا ہی بے چین سوچوں میں الجھا ہوا بہت دیر تک جاگتا کاکا کے لوبار کے بلند آہنگ خراٹے سننا رہا اور کوشش بدل بدل کر نکلتا رہا۔

نہ جانے کب اسے نیند آئی۔ جو بار بار درمیان سے اچھتی رہی۔ جب صبح گھر نے آ کر آواز دی۔ تو کاکا سے پہلے اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے معلوم تھا کہ کاکا اپنی جلدی کبھی بیدار نہیں ہوگا۔ اسی لئے وہ آنکھیں ملتا اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ دودھ کا برتن لے کر کھن میں آیا۔ تو گلاب ایسے شاداب چہرے والی لہر صبح کے اچلے رنگوں میں نہانی بہت دلکش معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے خلاف عادت اسے دیکھ کر ناک بھون نہیں چڑھائی۔ اور ایک شام سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ”سلام پائی!“

سجاد نے دلچسپی سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے سلام کا جواب دیا۔ دودھ کا برتن اس کے پاس رکھتے ہوئے اس کو پھیرنے کو بولا۔ ”دودھ پورا ڈالنا۔ اچھا۔“ اس نے دودھ ڈالا ہوا تھک رہا لک اور ترخ کر بولی۔

”اللہ کو جان دینی ہے۔ اتنی بے ایمانی کر کے ہم نے کون سا پاتر جاتا ہے۔“

”اچھا تو تم بڑی بے ایمانی کرنا چاہتی ہوں۔“ سجاد نے اسے چڑایا۔

لہر نے خوبصورت سبز آنکھیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی شرارت دیکھ کر وہ جان گئی کہ وہ اسے چڑا رہا ہے۔ کچھ اور کہنے کے

لہر کے خیمے میں خوشی اور رونق اتر آئی تھی۔ ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ ننھی جھیمو تلی کی طرح اڑتی پھرتی تھی۔ بوڑھے کو گر کر کی پیاری اور ناتوانی غائب ہو گئی تھی۔ آج کے دن تو جیسے اس نے اپنے بڑھاپے کو بھی بھٹا دیا تھا۔ وہ لہر کے دادا کے ساتھ بات بات پر قہقہے لگا رہا تھا۔

لہر بھی ہنسنے ہوئے چہرے اور ہنسی آنکھوں کے ساتھ ان سب کی خاطر داریوں میں لگی ہوئی تھی۔ وہ اور رجاں چپکے چپکے باتیں کر کے کسرائے جاتی تھیں۔ ان سب کو خوش اور مطمئن دیکھ کر سجاد خود بھی خوش محسوس کر رہا تھا۔ لیکن وہ رہے اس کے دل میں ایک نہیں سی اٹھتی تھی۔ رجاں کو ہنسنے مسکراتے دیکھ کر اسے بار بار بھاگ بھری کا خیال آتا تھا۔ شاید وہ بھی کہیں اسی دن کی آس میں ایک ایک لمحہ گم رہی ہوں گی۔ جب وہ اپنوں کے درمیان ہوگی۔ ان سے ملے گی اور ان کے سامنے اپنے سارے دودھ کھول کر رکھ دے گی۔

شام گھری ہوئی تو کاکا لوبار دن بھر کے سفر کی گرد چہرے سے چٹائے ہوتا سجاد کو لینے آ موجود ہوا۔ وہ بھی زندہ دلی سے ان سب کی خوشیوں میں شریک ہو گیا۔ اس کے آنے کے ساتھ سے جیسے اس چھوٹے سے خیمے کی رفتوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس نے بوڑھے دادا کے ساتھ حساب کتاب کیا۔ رجاں کی خیر خدمت پر پوچھی۔ جھیمو سے پیار بھری باتیں کیں۔ اور لہر کو ستایا۔ پھر وہ سجاد کے سر ہو گیا کہ وہ اس کے ساتھ گاؤں چلے۔ اس کا کہنا تھا کہ سجاد کے بغیر اس کا دل نہیں لگے گا۔ اس کی اہمیت دیکھ کر سجاد اس کے ساتھ چلنے کیلئے تیار ہو گیا۔ ویسے بھی وہ بوڑھے دادا کی چھوٹی سی جھوپڑی پر بار نہیں جٹا جاتا تھا۔ جہاں پہلے ہی بہت سارے مہمان تھے۔

تب تک لہر اور رجاں نے مل جل کر کھانا تیار کر لیا۔ وہیں زمین پر دسترخوان بچھالیا گیا۔ زم گرم کی گھریلے فضا میں سب کے ساتھ گھر کا کاکا ہوا کھانا کھاتے ہوئے سجاد کو ایک

نہ جانے رات کا کونسا پھر تھا۔ کہ اچانک کچھ کھٹ پٹ سے سجاد کی آنکھ کھلی گئی۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ابھی صبح نہیں ہوئی تھی۔ سجاد نے پھر کچھ کھٹ پھٹ کی آوازیں سنیں۔ لیکن اس نے یہ سوچ کر پھر آنکھیں بند کر لیں کہ شاید مونیٹیوں نے چارے کے برتن کو ادھر ادھر دھکیلا یا گرایا ہے۔ لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد اسے کسی کے سرگوشیاں کرنے اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔ وہ چونکا ہو گیا۔ اور ایک بار پھر آنکھیں کھول کر غور سے سنتے لگا۔ اسے تنگ بھوسے کے رونے جانے کی آواز سنائی دیں۔ ان کے کمرے کے ساتھ ہی بھوسے کی چھوٹی کوٹھری تھی۔ آواز اسی طرف سے سنائی دے رہی تھی۔

سجاد آنکھیں سے اٹھا اور نکلنے کے بیچے سے پستول نکال کر کمرے سے باہر نکل آیا۔ صحن خالی پڑا تھا۔ اندھیرے اور خاموشی کے سوا وہاں کوئی نہیں تھا۔ چھپرے تو مونیٹی خاموش بیٹھے تھے۔ اس نے ایک تیز نظر سارے صحن میں دوڑائی۔ بھوسے کی کوٹھری کی طرف پھر کھٹکھا ہوا۔ سجاد چوسک ہو گیا اور اس نے پستول کے ٹریگر پر انگلی رکھی اور اپنے تلے قدم لیتا۔ کوٹھری کے جمبوئے ہوئے دروازے میں آن کھڑا ہوا۔

”یہاں کون ہے؟“ اس نے دنگ لہجے میں کہا۔

جواب میں ایک دہلی دہلی کی نسوانی چیخ ابھری۔ لیکن فوراً ہی یوں دب گئی۔ جیسے کسی منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔

”کون ہے یہاں۔ باہر نکلو نہیں تو میں گولی مار دوں گا۔“ اس نے نشی سے کہا۔

اب جیسے کسی نے دم سادہ لیا بھوسے کے ڈھیر میں زندگی حرکت ہوئی اور نہ کوئی آواز ہی سنائی دی۔ سجاد نے تھوڑے وقفے کے بعد پھر اپنی بات دہرائی۔ لیکن کچھ اور سخت لہجے میں۔

بھوسے کے ڈھیر میں حرکت ہوئی اور تاریکی میں ایک سایہ سا ابرہا ہوا۔ اور ایک گھبرائی ہوئی مردانہ آواز سنائی دی۔ ”ہم چور نہیں ہیں۔ ہمیں صرف پناہ چاہیے۔“ اس سے پہلے جو چیخ اس نے سنی تھی۔ وہ نسوانی تھی۔ گویا چھپنے والے مرد اور عورت تھے۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے اسی۔ چوڑیوں کی کلک سنائی دی اور اس سائے کے ساتھ ایک اور سایہ آن کھڑا ہوا۔

”ہمیں کچھ دیر یہاں پناہ دے دو۔ صبح ہم چلے جائیں گے۔“ مرد نے التجائی کی۔

سجاد کو سارا محاذ سمجھنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جیسے لہجے میں کہا۔

بھائے وہ بولے سے ہنس کر پھر دودھ ڈالنے لگی۔ اس کی چوڑیوں میں لگی ہوئی چھوٹی چھوٹی ٹھنکھریاں بجنے لگیں۔

دودھ نکالنے ہوئے اس نے دو ایک بار سجاد کی طرف دیکھا اور پھر نگاہ جھکا لی۔ اس کے دلکش چہرے پر ایک تذبذب سا جھلکا اور اس کے ہونٹ یوں کپکپائے۔ جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔ مگر کہہ نہ پاتی ہو۔

دودھ برتن میں نکال کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے سجاد کی طرف پھر ایک بار کچھ کہتی ہوئی سی نظروں سے دیکھا۔ لیکن اس کے ہونٹ اسے افسوسوں میں نہیں ڈھال سکے۔ سجاد نے اس کی مشکل کو سمجھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

”کیا بات ہے لہر؟“

لہر نے گھبرا کر گھا صاف کیا اور جلدی سے کہنے لگی۔ ”پانی! قدر تیرا دوست ہے؟“ اس کے انداز میں کوئی ایسا بات بھی نہ تھی کہ سجاد نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ قدر کا نام لینے ہوئے اس کے منہ میں رخساروں پر گلابی رنگ چھوٹا تھا اور اس کی سبز آنکھوں میں ستارے چمکنے لگے تھے۔ سجاد کو اس کے دلکش چہرے کی اس شرمیلی چمک نے بہت کچھ سمجھا دیا۔ اس نے بڑی گرجوٹی سے کہا۔

”ہاں بھئی۔ اپنا یار ہے قدر۔ جگری یار۔“

لہر کی آنکھوں میں اس کے لئے پندہ می جھلکی۔

”اجھا!!“ اس نے اشتیاق سے کہا اور کچھ دیر یوں کھڑی رہی۔ جیسے کچھ اور کہنا چاہتی ہو۔ کچھ اور پوچھنا چاہتی ہو۔ مگر پھر کچھ جھجک کر اس نے اپنا ڈھلا اٹھایا اور زور جھکاتی ہوئی باہر نکل گئی۔

کا کا لوہار بہت دیر میں سو کر اٹھا۔ تاثیر کرتے کرتے خامس دان چڑھ آیا۔ دونوں نے نہر پر جا کر کپڑے دھوئے اور جی بھر کر کھائے۔ جس نے انہیں تازہ دم کر دیا۔ باقی دن مصروفیت میں ہی گزارا۔ کا کا جن لوگوں کا مال لے کر گیا تھا۔ ان کے ساتھ حساب کتاب کرتا رہا۔ شام کو وہ خانہ بدوش کی ہستی میں سب سے ملنے چلے گئے۔

باس نہ جانے کہاں غائب تھا۔ وہ خامی ویر تک بیٹھے رہے۔ لیکن وہ نہیں لوٹا۔ رجاں اور لہر نے سروسوں کا ساگ بنایا تھا۔ دونوں نے اصرار سے انہیں کھانے پر روک لیا۔ وہ گھر پہنچے۔ تو رات ہو گئی تھی۔ اسی لئے دونوں سونے کیلئے لیٹ گئے۔

ہے اور چلا کر بولا۔

”وہ لوگ اسی طرف آئے ہیں۔ وہ یہیں ہیں۔ وہ اندری ہوں گے۔“
 ”کون؟ کون لوگ؟“ کا کے نے اس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر اسے اندر آنے سے روکا۔

”یہ کیا منہ اٹھا کر اندر چلے آ رہے ہو۔ آخر ہوا کیا ہے؟“
 ”اوئے۔ یہ کیا مصیبت چٹائی ہوئی ہے تم لوگوں نے آدمی رات کو۔“ سجاد بھی کا کے کے شانے کے ساتھ شانہ ملا کر کھڑا ہو گیا۔
 ”یار اتم دیکھو تو کسی۔ تمہیں اندر چھپ نہ گئے ہوں۔ اور تمہیں پتہ نہ چلا ہو۔“ وہ شخص اپنی بات پر زور دیتا ہوا بولا۔

”پوہ وہ ہیں کون؟ کون آیا ہے یہاں۔ پتہ تو چلے۔“ کا کے نے پوچھا۔
 ”یار! وہ تمیز والی نصیب بھگ گئی ہے۔ اپنے یار کے ساتھ۔“ ان میں سے ایک نے دہائی دی۔

”کون تمیز والی۔ جو ہیر ختی ہے؟“ کا کے نے حیرت سے پوچھا۔
 ”ہاں۔ ہاں وہی۔ روشن کے ساتھ کھل گئی ہے۔ جو رانجا بننا تھا۔ یار تم ایک بار اندر دیکھ تو لو۔ کیا یہ کپس جیسے بیٹھے ہوں۔“
 ”او نہیں یار! ہمارے ایسے مقدر کہاں۔ جو نصیب یہاں آتی۔ کا کے نے دل پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

”وہ یہاں آئے تو کسی۔ ہم تو عید سائیں۔“

وہ لوگ کا کے کے سخرے پن سے چڑ کر آگے بڑھ گئے۔ کا کا ان سے ابھی اور سونان جواب کرتا جا رہا تھا۔ لیکن سجاد نے اسے ایک طرف ہٹا کر دروازہ بند کر دیا۔ کا کے نے ایک طویل جمائی لی اور بولا۔

”یار! مزہ ہی آ جانا تھا۔ اگر نصیب بھگ کر یہاں آ جاتی۔“

سجاد کو اس کی اس بات نے بہت محظوظ کیا۔ اس نے سوچا کہ کا کا جانتا نہیں کہ اس کی یہ معصوم آواز پوری ہو چکی ہے۔ اس نے ہنس کر اس سے پوچھا۔

”یار! اگر نصیب بھگ کر یہاں آ جاتی۔ تو تو نے کیا کرنا تھا؟“

”بس ذرا اسے قریب سے دیکھنا تھا۔ آنے آئے۔ ڈراے میں دیکھ کر تو تسلی نہیں

”یہ کس گھر کی عزت نکال لائے ہو؟“

”نہیں۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں تو اس کی عزت بچا کر لایا ہوں۔“ مرد نے فوراً ہی زوردار لہجے میں ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔

”اچھا۔“ سجاد نے خیر یہ کہا۔

”اب کیا ارادے ہیں تمہارے؟“

”بس جی۔ ہم کسی طرح یہاں سے نکل جائیں۔ تو آگے خیر سلا ہے۔“ وہ شخص بڑے اعتماد سے کہنے لگا۔ لڑکی اس کے قریب خاموشی سے کھڑی رہی۔

”اچھا۔ تو تمہارا کوئی پچھا کر رہا ہے؟“ سجاد نے پوچھا۔

”ہاں۔ کچھ لوگ ہمارے پیچھے ہیں۔ شاید وہ یہاں بھی پہنچ جائیں۔ تو تم انہیں ہمارا پتہ نہ دینا۔ ہم ساری زندگی تمہیں دعا میں دیں گے۔“

ابھی اس کی بات مکمل نہیں ہوئی تھی کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ پھر کوئی لگا تا دروازہ پٹینے لگا۔

”ہائے اللہ۔ وہ لوگ آ گئے۔“ لڑکی کے ہونٹوں سے جع کھل گئی۔

”یار۔ تیرا بڑا احسان ہو گا۔ ہماری دید رکھنا۔“ مرد نے التجائی۔

”ٹھیک ہے۔ تم لوگ چھپ جاؤ۔“ سجاد نے کہا۔

تب تک دروازہ دھڑا دھڑا ہٹا رہا۔ شور سن کر کا کا بھی آکھیں مٹا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا اور سجاد کو پکارنے لگا۔ سجاد بھروسے کی کوفڑی کا دروازہ سمجھ کر پیچھے ہٹا اور کا کے نے اس کی طرف دیکھا اور گالی دے کر بولا۔

”یار! یہ کسی کو تکلیف ہوئی ہے رات کے وقت۔“

”پتہ نہیں۔“ سجاد نے جان بوجھ کر لاطعلی کا اظہار کیا۔

”میں بھی یہ شور سن کر ہی اٹھا ہوں۔“

”آتا ہوں سبھی۔ آتا ہوں۔ کیوں دروازہ توڑ رہے ہو۔“ کا کے نے دوری سے

بلند آواز میں کہا اور دروازہ کھولنے کو بڑھا۔

سجاد بھی اس کے پیچھے آ کر کھڑا ہوا۔ دروازے پر چار پانچ آدمی کھڑے تھے۔

”اوئے۔ دروازہ توڑنے لگے ہو مگر۔“ کا کے نے چھوٹی سی کہا۔

ان میں سے ایک شخص یوں آگے بڑھا۔ جیسے دروازے میں سے اندر داخل ہونا چاہتا

ہوئی۔ دل ہی نہیں بھرتا۔ ”وہ مصومیت سے کہنے لگا۔

”اچھا۔“ سجاد نے اچھا کو لہبا کر کے کہا اور بھوسے کی کھڑی کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے کا کے کا بازو تھام کر اسے روک لیا اور بولا۔

”یار! تو نے نصیب کو ہی دیکھا ہے نا۔ یہ کوئی بڑی بات ہے۔ تجھے ابھی دکھا دیتے ہیں۔“

”جانے دے یار!“ کا کا سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔

سجاد نے کھڑی کا دروازہ کھول کر اندر بھاگنا۔

”باہر آ جاؤ بھی۔ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔“ اس نے بلند آواز میں پکارا۔

کا کا ٹھٹکا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو یار؟“

بھوسے کے ڈبیر میں سر اٹھائی ہوئی۔ اور بھوسے میں سے راستہ بناتا ہوا پہلے روشن باہر آیا۔ اس کے پیچھے پیچھے نصیب بھی گئی۔

کا کا ششدر رہ گیا۔ اور وہیں کھڑا کھڑا ان کی طرف حیرت سے دیکھتا رہا۔ وہ دونوں جھجکے اور وہیں رک کر روشن نے پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“

”گھبرا نہیں۔ یہ اپنا ہی آدمی ہے اور نصیب پر سہرا ہے۔ اس سے تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“

کا کا بھی جیسے حیرت کی کیفیت سے نکل آیا تھا۔

”آؤ آؤ۔۔۔۔۔ آؤ۔ بڑی مہربانی آپ کی۔ کوئی کسی پانی۔۔۔۔۔ روٹی نکر۔ جو کہو حاضر کریں۔“ نصیب وہیں سٹ کر کھڑی رہی۔ روشن آگے بڑھا۔

”یار! اگر تم غم غریب فداکاروں کی اتنی قدر کرتے ہو۔ تو ہماری کچھ مدد بھی کرو۔“ تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔

”کیوں نہیں جناب آپ حکم تو کر کے دیکھو۔ ہم تو تمہارے بڑے قدردان ہیں۔“ کا کے نے جوش مسرت سے ہاتھ ہوتے کہا۔

”روشن اس کی اس غیر معمولی گرجبوشی سے کچھ مطمئن تو ہوا۔ لیکن پھر بھی جیسے اپنی تسلی کو بولا۔

”یہاں اور کون لوگ ہیں؟“

”تو گھر نہ کر جن۔ یہاں ہم دونوں کے سوا کوئی اور نہیں۔ چہرے چھانٹ ہیں ہم۔“ کا کے نے بتایا۔

”یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں۔“

روشن نے نصیب کو اشارہ کیا اور وہ بھی کچھ کئی کئی ہوئی ہی اس کے ساتھ کھڑی سے باہر نکل آیا۔ کا کے نے گرجبوشی سے ان کی کمرے کی جانب رہنمائی کی۔

”اے اپنا ہی گھر سمجھو۔ گھر والی کوئی بات نہیں۔ ہم سب کچھ سنہال لیں گے۔“

سجاد نے نصیب کی طرف دیکھا۔ اور حیرت سے سوچنے لگا کہ وہ کتنی بڑی اداکارہ تھی۔ وہ دلشاد کے یہاں اسے ملی تھی۔ تو کتنی مظالم اور ستم رسیدہ نظر آتی تھی۔ مگر نیم کے کوٹھے پر جا کر اس کا سارا بھرم مکمل گیا تھا۔ یہاں وہ ہیر کے روپ میں کس طرح ڈرامے کی جان بنی ہوئی تھی۔ اور اس وقت نصیب کے روپ میں شانے سیکڑے یوں جل رہی تھی۔ جیسے کوئی سیدی مادی گھریلو عورت ہو۔

کا کا انہیں ہاتھوں ہاتھ کمرے میں لے گیا۔ اس نے لائٹیں جلا دی۔ اور انہیں چار پانی پر بیٹھنے کو کہا۔ وہ دونوں کچھ جھجکتے ہوئے سے چار پانی پر بیٹھ گئے۔ کا کے کی زبان تالو سے نہیں لگ رہی تھی۔ وہ اپنے جذبات کے اظہار کیلئے جو اس کے منہ میں آتا تھا۔ کہتا چلا جا رہا تھا۔

اس نے انہیں کھانے کیلئے پوچھا۔ مگر انہوں نے بھوک نہ ہونے کا عذر کر کے انکار کر دیا۔ لیکن کا کے کی تسلی نہیں ہوئی۔ وہ انہیں کچھ نہ کچھ کھانا چاہتا تھا۔ بلا خراس سے مٹی کے مہرجان میں سے تھوڑا سا میوے والا کڑ ٹکالا اور ان کے سامنے رکھا۔

وہ دونوں اس کے طلوس سے متاثر نظر آتے تھے۔ انہوں نے تھوڑا تھوڑا کڑ منہ میں رکھا۔ روشن خوش ہو کر بولا۔

”یار! تم نے منہ دیکھا کر لیا ہے۔ یہ اچھا لگتا ہے۔ اب مجھے امید ہو گئی ہے کہ ہم یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“

”کیوں نہیں میرے بادشاہ۔ میں تمہیں یہاں سے اس طرح نکال دوں گا جیسے کعبہ میں سے ہال نکالتے ہیں۔“ کا کے نے انہیں یقین دلایا۔

نصیب اور روشن نے بیک وقت ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ جیسے کا کے اس یقین نے ان کی ذہان بندھا دی ہو۔ سجاد نے ان کی گفتگو میں حد نہیں لیا اور چپ بیٹھا

ان کی باتیں سنتا رہا۔

روشن یہاں سے جلدی نکلتا چاہتا تھا۔ لیکن کا کے نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ دو ایک روز نہیں ٹھہریں۔ ٹھہر والے ہیروئن کے نہ ہونے کی وجہ سے جلد یہاں سے بھاگنے کی سوجھ بوجھ کے ورنہ عوام انہیں جیسے نہیں دیں گے۔ اس کے بعد وہ جہاں جانا چاہتے ہیں۔ چلے جائیں۔

روشن کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے نصیبہ سے کوئی بات کی۔ اس نے آہستگی سے کچھ کہہ کر اثبات میں سر ہلایا۔ تو روشن بولا۔

”یار! راج ہوئی تو تمہارے کمرادر لوگ بھی تو آ سکتے ہیں۔ کوئی حق ہمسایہ کوئی اور۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“ کا کے نے تائید کی۔

”دن کو تم زیادہ تر اسی کو کھڑی میں رہتا۔ نہیں بلکہ ہم لوگ کام پر گئے۔ تو باہر سے تالا لگا جائیں۔ تم پر فکر ہو کر اندر پڑے رہا۔ کل میں قہقیر کا پتھر بھی لگاؤں گا۔ وہاں کے سب حالات پتہ کر کے تمہیں بتا دوں گا۔ تو پھر تم اپنا پروگرام بنانا۔“

”ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔“ روشن نے منون لہجے میں کہا۔ ”یار! تمہاری بڑی مہربانی۔ تم نے مصیبت کے وقت ہم لوگوں کو سہارا دیا ہے۔“

رات یقینی جا رہی تھی۔ کا کا دل بھر کے باتیں کر چکا۔ تو اسے ان کی فکر ہوئی کہ انہیں کہاں سلا یا جائے۔ اس کے پاس کل دوی چار پائیاں تھیں۔ آخر انہوں نے یہی طے کیا کہ وہ دو دنوں زمین پر سو جائیں اور روشن اور نصیبہ کو چار پائیاں دے دی جائیں۔ لیکن روشن نے بھی اصرار کیا کہ وہ ان کے ساتھ زمین پر ہی سوئے گا۔ نصیبہ کو چار پائی دے دی جائے۔

سجاد نے زمین پر بستر لگنے لگا۔ کا کا روشن کے ساتھ بھوسے کی کوکھڑی میں صبح ان کے چھینے کیلئے جگہ بنانے چلا گیا۔ ان کا خیال تھا کہ بھوسے کو دروازے کے آگے لگا کر پیچھے چھینے کے لئے بہتر گھاس لال لائی جائے۔

روشن اور کا کا کمرے سے باہر چلے گئے اور نصیبہ وہیں چار پائی پر کھٹی ہوئی سی بیٹھی رہی۔ سجاد نے ایک بار اس کی طرف دیکھا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ بھی اسی کی طرف دیکھ رہی ہے۔ سجاد کا تکی چاہا کہ اسے جتانے کہ وہ اسے بچکانہ چکا ہے۔ لیکن پھر وہ یہ سوچ کر خاموش رہا کہ اسے کیا پڑی ہے کہ اس پر یہ سب ظاہر کر کے اسے پریشان یا خرمندہ کرے۔

”میں نے تمہیں بچکانہ لیا ہے۔“ اچانک نصیبہ نے کہا۔

سجاد لو چوک گیا۔ ”کچھ تم نے کہا ہے؟“

”میں نے تمہیں بچکانہ لیا ہے۔“ وہ سنے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ سجاد نے جان بوجھ کر انہماں بنے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب تم خوب سمجھو۔“ وہ دھڑلے لہجے میں کہنے لگی۔

”میں تمہیں ابھی طرح سے جانتی ہوں۔“

سجاد لو کا اعزاز تو وہ ہو گیا کہ وہ اسے بچکانہ مٹی ہے۔ مگر اس نے لائق برقی ہی بہتر سمجھی۔

”بی بی! تجھے شاید کوئی غلط فہمی ہو گئی ہے۔“

”مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی۔“ وہ ایک ایک لفظ چا کر بولی۔

”میں تمہیں خوب پہچانتی ہوں۔ تم وہی ہو جانا جو مجھے ٹیم کے کوشے پر چھوڑ آئے تھے۔ اگر اب تم نے اسی کوئی سازش کرنے کی کوشش کی۔ تو میں روشن کو سب کچھ بتا دوں گی۔ تم نے شاید ہمیں اسی لیے پناہ دی ہے۔“

سجاد اس کی بات سن کر پریشان سا ہو گیا۔ اس کے دہم و دمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اتنا غلط سمجھ رہی ہے۔

”تم تم کیا کہہ رہی ہو۔“

”زادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرو۔ میں تم جیسے لوگوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ پتہ نہیں تم لوگوں کے خدا کو جان دینی ہے یا نہیں۔ پتہ نہیں تمہاری اپنی کوئی ماں بہن ہے کہ تمہیں جو تم اس قسم کا کاروبار کرتے نہیں ڈرتے۔ تم جیسوں کا گھناؤنہ جہنم کی آگ ہے تم۔“

بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی اور اسے خاموش ہو جانا پڑا۔ کا کا اور روشن کمرے میں واپس آ گئے تھے۔ سجاد کا درواں رواں سلگ رہا تھا۔ یہ لڑکی نصیبہ اسے کتنا غلط سمجھ رہی تھی۔ اس نے اس پر کیسا اثرام لگا دیا تھا۔ کا کے نے آج ہی اپنی مخصوص بے تکلفی سے کہا۔

”بابی! ہم نے کوکھڑی کو شیش لگا دیا ہے۔ جیسے ہی کوئی خطرہ ہو تم آرام سے وہاں چھپ جانا۔“

روشن نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔ ”ہاں۔ نصیبہ! فکر نہ کرو۔ یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ میں نے پورا امتحان کر لیا ہے۔“

”تم کہتے ہو۔ تو پھر ٹھیک ہے۔“ وہ اکڑے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

”کیوں باہمی! جیسے کوئی بے اختیاری ہے۔“ کا کہنے اس کے اکھڑے ہوئے لہجے کو محسوس کر کے کہا۔

سجاد کو کچھ جربز سا ہوا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیسا طرز عمل اختیار کرے۔ نصیحت کی اس بات بھی سے وہ خواہ مخواہ چورس بن گیا تھا۔ نصیحت نے پھر ایک کڑی نگاہ اس پر ڈالی اور سرد سے لہجے میں بولی۔

”کیا کریں بھائی ڈرتا ہی پڑتا ہے۔ لوگ اندر سے کچھ ہوتے ہیں اور باہر سے کچھ دہل بدلے دیر تو نہیں لگتی۔ نیت کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔“

”کیسی باتیں کر رہی ہو تم نصیحت! روشن نے اسے ٹوکا اور دونوں سے محضرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگا۔

”یار! اس کی بات کا خیال نہ کرنا۔ یہ کچھ گھبراہٹی ہوئی ہے۔ اس لئے ایسی باتیں کر رہی ہے۔“

”نہیں! نہیں باہمی! گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے ہوتے کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔“ کا کہنے نے پورے خلوص سے کہا۔

سجاد بھی چپ نہ رہ سکا۔ اس نے بھرپور نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور مضبوط لہجے میں بولا۔

”اگر تمہارے دل میں کوئی غلط فہمی ہے۔ تو اس کو نکال دو۔ یہاں تم بالکل محفوظ ہو۔“

”نصیحت! تم حوصلہ رکھو۔ دل نہ چھوڑو۔ شریف آدمیوں کے لیے اعتبار اور بھروسہ ہی

سب کچھ ہوتا ہے۔ اسی پر دنیا کا دار و مدار ہے۔“

”میں نے بڑے دھوکے کھائے ہیں۔ میں اس لئے ڈرتی ہوں۔“ وہ ہونٹ چپاتے ہوئے بولی۔ اس کے چہرے پر کرب اور اذیت تھی۔

کا کہنے نے فوراً اس کی بات پکڑ لی۔ ”باہمی! ناچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ بس اللہ پر بھروسہ رکھو۔ وہی سارے کاج سنوارے گا۔“ اس نے اوپر دیکھ کر کہا۔ اس کے انداز میں کوئی ایسی بات تھی کہ نصیحت لاجواب ہی ہو گئی۔ اس نے یوں سر ہلایا جیسے خود کو حالات کے سپرد کر دیا ہو۔



ابھی صبح پوری طرح سے طلوع نہیں ہوئی تھی کہ سجاد کو نصیحت کی آواز سنائی دی۔

”سجاد! نے آدھے سوئے“ آدھے جاگتے میں سنا کہ نصیحت بار بار روشن کو پکار رہی ہے۔

”روشن! روشن! اٹھو۔ اٹھو۔ دیکھو باہر کوئی ہے۔ پتہ نہیں کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔ روشن دیکھو۔“

کا کا اور روشن بے تک نہیں تھکے۔ البتہ سجاد کی آ آنکھ پوری طرح کھل گئی۔ اس نے غور سے سنا۔ واقعی کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ نصیحت اسے اٹھتے دیکھ کر کچھ بھجک گئی۔ اور یونہی اپنا دھپہ درست کرتے ہوئے آگوار رہی۔ بولی۔

”ان لوگوں کو آٹھاؤ۔ باہر پھر کوئی آ گیا ہے۔“ وہ سخت گھبراہٹی ہوئی تھی۔

سجاد نے اپنے قریب ہی لیٹنے کا کہہ کر روشن کا بازو باری باری ہلایا۔ روشن ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا بات ہے؟ کیا ہو گیا ہے؟“ کا کہنے بھی آنکھ مل کر دیکھا۔

”اوسے۔ کیا ہو گیا ہے۔ صبح ہی صبح۔ کیا مصیبت پڑ گئی ہے۔“ اس نے ہزاری سے کہا۔

”باہر کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے۔“ سجاد نے اطلاع دی۔

دونوں نے غور سے سنا۔ اور کا کا یکدم اٹھ کھڑا ہوا۔

”یار! یہ کون آ گیا ہے منہ اندر نہ رہے۔“ چل کر دیکھتا ہوں۔

”غیر جانا۔ پہلے ہمیں چھپ تو جانے دو۔“ نصیحت گھبرا کر چارپائی سے اٹھی۔

”نہیں! باہمی! ابھی رہنے دو۔ میں یہ دروازہ بند کر جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”نہیں! یارا نصیحت! ٹھیک کہہ رہی ہے۔ ہم چھپ ہی جائیں تو اچھا ہے۔ مفت میں کوئی اور مصیبت نہ کھڑی ہو جائے۔“ روشن بھی اٹھا۔

سجاد نے کہا۔ ”غیر کا کہے۔ میں چل کر دیکھتا ہوں۔ جو کوئی بھی ہوا۔ اسے دروازے پر ہی روک لوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔“

وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے صحن میں پہنچا اور بڑھ کر مرکز کی دروازے کی زنجیر گرائی۔ ہٹ کھولے۔ دروازے پر ہاس جھنکھایا ہوا کھڑا تھا۔ ”اوسے۔ کیسے گھوڑے گدھے بچ کر سوسے ہو تم۔ دروازہ کھٹکھٹا کھٹکھٹا کر میں تو تھک گیا۔“

”تم! اس وقت۔ خیر تو ہے نا۔“ سجاد حیران ہوا۔

”ہاں۔ سب خیر ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ میں جہیں لینے آیا ہوں۔ تم میرے

ساتھ چلو۔ ذرا جلدی۔“ اس نے جھکی بھائی۔

”کہاں..... کدھر؟“ سجاد نے پوچھا۔

”تم چلو تو کسی۔“ وہ غلت میں بولا۔

”یار! کچھ تاؤ تو کسی۔ ایسی کافر اتھری ہے۔“

”کوئی کافر اتھری نہیں۔ تم بس چلنے کی کرو۔“ ہاس کی بات ان سنی کرتے ہوئے

بولا۔

”یار! میں ہاتھ تو دھو لوں۔ ابھی ابھی تو اٹھا ہوں۔“

”زیادہ دیر نہ لگا۔“ وہ رضامند ہو گیا۔

سجاد نے اندازہ لگایا تھا کہ اس کے ان دونوں کو چھپا دیا ہوگا۔ اگر وہ نہیں بھی چھپے تھے تو بھی ہاس کو چل جانے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ وہ اسے اندر لے آیا۔ کاکا انہیں صحن میں بیٹھ گیا۔ اور ہاس کو دیکھتے ہی بڑی محبت سے ہٹکیر ہو گیا۔ واہ بھائی۔ آج تو صبح ہی صبح دیدار کر دیا۔ سب خیر سکھ ہے نا؟“

”ہاں..... ہاں یار! سب خیریت ہے۔“ ہاس نے گرمجوشی سے اس کی پشت چتھپائی۔

”شہر میں کچھ کام ہے۔ سوچا سجاد کو ساتھ لے لوں۔ صبح ہی صبح نکل چلیں تو وقت بچھ جائیں گے۔“

”شہر بھی چلے جانا۔ پہلے کوئی روٹی پانی تو کھالو۔“ کاکے نے کہا۔

”نہیں بھائی۔ مہربانی۔ ناشتہ تو ہم اُپے چاکر کریں گے۔ بس ہمیں اجازت دو۔“

ہاس نے تیزی سے کہا اور ادھر ادھر سجاد کو دیکھا۔

”بھئی یہ سجاد کہاں رہ گیا ہے۔ اس نے عورتوں کی طرح تیار ہونے میں کتنی دیر لگا دی ہے۔“

”آگیا ہوں بھئی۔ آگیا ہوں۔ یہ لے۔“ سجاد کپڑے بدل کر آگیا۔ دونوں نے کاکے کو خدا حافظہ کیا اور دروازے سے باہر نکل آئے۔

دونوں کچھ دیر خاموشی سے ایک ساتھ چلتے رہے۔ سجاد کے دل میں کھد بدی ہو رہی تھی۔ یہ ایک باکس کو صبح سویرے کس کی سوجھی تھی کہ وہ سنا اٹھائے۔ جیسے ناک کی سیدھ میں نکل کھڑا ہوا تھا۔ اس نے صاف سترے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اس کے بال بھی سلپٹے سے جے

ہوئے تھے۔ وہ بڑے اطمینان سے سٹی بجاتا ہوا چل رہا تھا۔

تھوڑی دور چلتے کے بعد سجاد پل پیچھے بغیر نہیں رہ سکا۔

”کیوں یار! کدھر کا ارادہ ہے؟“

وہ سٹی بجاتے بجاتے رک گیا۔ ”بس یار! دعا کرو کہ جس مقصد سے جا رہا ہوں۔ وہ پورا ہو جائے؟“

”آمین! سجاد نے فوراً کہا۔“ مگر یہ تو چلے کہ بات کیا ہے؟“

”یار! ایک بندہ کال کام لگ گیا ہے۔ پراتا یا رہا ہے۔ اس کے ساتھ مل کر ذرا آج کچھ کام کی بات ہو جائے۔ میں نے سوچا۔ تمہیں بھی ملوا دوں۔ شاید میں اتنی جلدی نہ کرتا۔ مگر جمہو اور رجاں کی وجہ سے میں جاہتا ہوں کہ کوئی ایسی بات نہ ہو جائے۔ جو ان پر کوئی آج آج آئے۔ میں اپنا راستہ سیدھا ہی کر لوں۔ تو ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا کوئی کاروبار وغیرہ کرنے کا ارادہ ہے۔“ سجاد نے پوچھا۔

”دیکھتے ہیں اب کیا پروگرام بنتا ہے۔ فی الحال ملاقات تو کریں۔“ وہ لاپاہلی پن سے کہنے لگا۔

تھوڑی دیر میں وہ دھارویں کے اڈے پر تھے۔ دونوں بغیر کچھ کھائے پیئے چلے تھے۔ اس لئے ہموک بھی عموں ہو رہی تھی۔ انہوں نے اڈے پر ہی ایک فٹ ہاتھ ہو کر بیٹھ کر ناشتہ کیا۔ ہاس نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے سجاد سے کہا۔

”یار! تمہیں میرے طے میں کوئی فرق نظر آتا ہے۔“

سجاد نے اب غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس نے بالوں کا انداز بدل لیا تھا۔ اور بڑی بڑی مونچھیں رکھ لی تھیں۔ وہ پہلے کی نسبت کچھ بدلا ہوا تو نظر آتا تھا لیکن غور سے دیکھنے پر پہچانا جاسکتا تھا۔ ”ہاں۔ تمہارا فرق تو ہے مگر زیادہ نہیں۔ تمہیں ذرا خیال رکھنا چاہیے۔“

ہاس نے بے نیازی سے شانے جھٹکے۔ ”چھوڑو یار! جو دن سلاخوں کے اندر چڑھتا ہے۔ وہ تو چڑھتا ہی ہے۔ پھر کیا اپنی جان کو روگ لگا میں۔“

سجاد ہنس پڑا۔ ”واہ۔ تم نے تو فیصلہ ہی کر دیا یار۔ بس اب فکر کس بات کی۔“

انہیں چمکی ہی اس بل لگی۔ لیکن حاصل طویل تھا۔ منزل مقصود تک پہنچنے پہنچنے انہیں دوپہر ہو گئی۔ خاصہ غیر آباد علاقے میں درختوں کے جھنڈ میں گھری ہوئی ایک قدیم طرز کی حویلی نما عمارت میں وہ اترے تو دو لمبا۔ م لپک کر آئے۔ اور انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ یوں معلوم

ہوتا تھا کہ وہ ہاس کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ جیسے وہ پہلے بھی یہاں آتا رہا ہے۔

ملازم انہیں کسی سہائی جینٹک میں لے گیا۔ انہوں نے ملحقہ غسانا نے میں منہ ہاتھ دھویا۔ تب تک وہ لوگ کھانا لے آئے۔ کھانا پر تکلف اور لذیذ تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد انہیں خوب ہموک لگی تھی۔ دونوں رجبت سے کھانے لگے۔ ملازموں میں سے ایک پانی رکھے آیا۔ تو ہاس نے پوچھا۔

”چودھری صاحب کہاں ہیں؟“

”مجھے تھک خانے میں۔ بازی لگی ہوئی ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کوئی اور بھی آیا ہوا ہے؟“

”ہاں جی کچھ مہمان اور بھی آئے ہوئے ہیں۔“ اس نے آنکھ دہائی اور ذمہ داری ہسی

کے ساتھ بولا۔

اسی وقت اچانک تابدقڑ دھماکوں کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے گولیاں چل رہی ہیں۔ ہاس نے ہاتھ سے نوا رکھ دیا۔ سچا دل بھی چونکا ہو گیا۔ ملازم کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ گیا اور وہ باہر بھاگا۔

سچا دل اور ہاس بھی اٹھ کر دروازے کی طرف لپکے۔

باہر ایک نو جوان بدعاشی میں دوڑتا پھرتا تھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور پکڑی کل کر گلے میں آ پڑی تھی۔ وہ ادھر ادھر دیکھا تو متحسب کچھ میں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔

ہاس نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑا۔

”کیا ہوا ہے؟ کیا ہوا ہے؟“

وہ پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور بوکھلایا ہوا بولا۔

”کون ہوتا؟“

”آرام سے آرام سے۔ آرام سے بتاؤ۔ یہ کیا ہوا ہے؟ گولیاں کس نے چلائی

ہیں؟“ ہاس نے اس کا بازو نہیں چھوڑا۔

”خون ہو گیا ہے۔ قتل ہو گیا ہے۔ گولی چل گئی ہے۔ گولی۔“ وہ بے ربط انداز میں

بکلا کر بولا۔

”کون قتل ہو گیا ہے؟ کس نے گولی چلائی ہے؟“ ہاس نے اسے ہلکا سا جھٹکا دے کر

سوال کیا۔

وہ کم عمر جوان تھا اور سخت گھبرا ہوا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔

”چودھری قتل ہو گیا ہے۔ چودھری۔ اور پتہ نہیں کس کس کو گولی لگی ہے۔ اوئے کوئی مجھے بتاؤ کہ اللہ بخش کدھر ہے۔ کدھر ہے اللہ بخش۔ اوئے اللہ بخش۔“ وہ ہاس سے اپنا بازو چھڑاتے ہوئے بدعاشی میں چلا یا۔

ہاس نے پریشانی میں جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”چودھری قتل ہو گیا ہے۔“ اور اس شخص کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر کرسی پر دیکھل دیا

اور درشتی سے بولا۔

”بندہ میں۔ آرام سے بیٹھ۔ ادھر ادھر شور نہ مچاتا پھر۔ صحیح طرح بتا کر کیا ہوا ہے؟“

”مجھے نہیں پتہ۔ مجھے کچھ نہیں پتہ۔ تم خود جا کر دیکھ لو۔ مجھے کیا پتہ۔“ وہ پریشانی میں

جوتھ میں آتا تھا کہتا جا رہا تھا۔

”رنگو۔ دے رنگو۔ تو کدھر مر گیا ہے۔ موت جو گے۔“ دروازے میں سے ایک

کرخت آواز نے پکارا۔

ہاس اور سچا دل نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے میں ایک ہماری بھرم عورت کا سیاہی مائل چہرہ نظر آیا۔ اس کے ساتھ کالے برقعوں میں لپٹی۔ ایک اپ سے سترے سے چہرے لئے دو لڑکیاں بھی تھیں۔ جو گھبرائی ہوئی معلوم ہوئی تھیں۔

”وے گوٹھ پیٹے۔ تو یہاں بیٹھا کیا کر رہا ہے۔ مرن جو گے۔ چل اٹھ۔ جلدی

کر۔“ وہ غصے سے پیشانی پر ٹلی ڈال کر بولی۔

”آپانی بی آ یا۔“ لڑکے نے ستھری سے کہا اور جگت میں اٹھ کھڑا ہوا۔

ہاس نے اسے پھر پکڑ کر بٹھالیا۔ ”کیوں بھیجی۔ تم موقع سے کہاں بھاگے جاتے ہو۔“

”کیوں بھیجی۔ تم نے اسے کیوں بٹھا رکھا ہے۔ اس نے کون سا جرم کر دیا ہے۔“ اس

عورت نے آگے بڑھ کر لڑکے کا بازو تمام کر اسے اٹھایا اور ہاس سے بولی۔

”ہمارا اس سارے معاملے سے کوئی تعلق نہیں۔ سمجھے تم۔ ہم تو یہاں ناچ گانا کرنے

آئے تھے۔ جو ہمارا کام ہے۔ چودھریوں کی چودھریوں کے ساتھ۔ وہ جائیں اور ان کا کام۔“

وہ اتنا کہہ کر لڑکے کو کھرا لے گئی۔

ہاس نے بھی اس کو روکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اسے کیا پڑی تھی کہ اس معاملے میں دخل

دیتا۔ سجاد نے اس کی طرف دیکھا۔

”یارا! کیا یہ پوڈی پڑ گئی ہے۔“

باس نے مسافانہ انداز میں سر جھکا۔

”یہ تو سارا کھیل ہی بگڑ گیا ہے۔ چند فیصلے معاملہ کیا ہے۔ چل کر دیکھتے ہیں۔“

”دیکھنا یارا! لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ پولیس کبھی کا معاملہ ہے۔ میرا خیال ہے کہ غصے غصے سے یہاں سے نکل چلو۔ ہمیں خواہنا وہ دوسروں کے چمڑے میں تا تک اڑانے کی کیا ضرورت ہے۔“ سجاد نے کہا۔

”کہتے تو تم ٹمیک ہو۔ یہاں سے نکل ہی چلیں تو اچھا ہے۔“ باس بھی قائل ہو گیا۔

دونوں نے تیزی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ہماری بھر کم نائیک، دونوں لڑکیوں اور سازندوں کے ساتھ گرتی پڑتی خولی کا مگن پارک گئی تھی۔ ایک آدھ لازم ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ مگر وہ بھی لگتا تھا۔ اپنی جان بچانے کی فکر میں ہیں۔ سجاد نے پھر کہا۔

”چل یارا! ہم بھی چلتے ہیں۔“

باس نے کچھ سوچا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تہہ خانے میں کیا واقعہ ہوا ہے اور کون مارا گیا ہے۔ پھر وہ چند قدم تہہ خانے کے دروازے کی طرف چلا۔ اور بولا۔

”یارا! چودھری بندہ کام کا تھا۔ میرا خیال ہے۔ کچھ اس کا اتہ پتہ لے لیے ہیں۔ پولیس کو آنے میں تھوڑی دیر لگے گی۔“

”مصل سے کام لے یارا!“ سجاد نے اس کا بازو پکڑا۔

”ابھی جو یہ میراثی گئے ہیں۔ کیا خیال ہے تیرا۔ ان کے منہ میں بات وہ چاہے گی۔ یہ کسی نہ کسی طرح بات پولیس تک پہنچائیں گے۔ اب کوئی اعتبار نہیں پولیس کب پہنچ جائے۔ بس۔ تو نکل یہاں سے۔“

بات باس کی سمجھ میں بھی آئی اور وہ واپس پلٹا۔ ابھی وہ چند قدم ہی چلے تھے کہ اچانک تہہ خانے کا دروازہ کھلا اور ایک لڑکی جھپٹیں مارتی ہوئی باہر نکلے۔ اس کے پیچھے پیچھے نئے میں دھت ایک آدمی تھا۔ جس کے ہاتھ میں اس کے دو بچے ایک سرک رہا تھا۔

”چھوڑو مجھے۔ چھوڑو۔“ لڑکی نے لپٹ کر اپنا دوپٹہ زور سے کھینچا۔ لیکن اس شخص نے نہیں چھوڑا۔ اور لڑکھائی ہوئی زبان میں نہ جانے کیا اور نول بکاس کا آجکل کھینچنے لگا۔

باس نے دوڑ کر اسے دھکا دیا اور دوپٹہ اس کے ہاتھ سے جھین کر لڑکی کی طرف پھینک دیا۔ وہ شخص منگھٹا بکنا ہوا۔ باس پر جھپٹا۔ لیکن نشے میں ہونے کی وجہ سے اس کے دو تھن ہاتھ ہی سہہ اور ڈھیر ہو گیا۔

لڑکی نے دوپٹے سے سر ڈھانپ لیا تھا اور سبھی ہوئی سی کھڑی کا نپ رہی تھی۔ سجاد نے اس کی طرف دیکھا اور جو پکڑا سارہ گیا۔ خوف سے جھپٹی ہوئی آنکھوں اور دھلے ہوئے سپید کپڑے کی مانند سفید چہرے کو وہ اچھی طرح پہچانتا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر حیرت اور پریشانی سے کہا۔

”استانی نور! تو یہاں۔“

اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔ باس بھی قریب آ گیا اور قدرے روشنی سے بولا۔

”لڑکی۔ یہ رونا دھونا ختم کر اور سیدھی طرح بتا تو یہاں کیا کر رہی تھی؟“

وہ ایک دم سہم کر خاموش ہو گئی اور سسکیاں روکتے ہوئے بولی۔

”بلینڈ۔ مجھے یہاں سے نکال دو۔“ آنسو اس کے رخساروں پر بہتے چلے جا رہے تھے۔

باس نے سجاد کی طرف دیکھا۔ ”تم جانتے ہو اس کو؟“

”یارا! یہ گاؤں کے سکول میں استانی ہے۔ خواہنا چودھری کی باتوں میں آ کر خواہ

ہوئی ہے۔ میں نے تو اس کو سمجھا تھا مگر اس نے کسی کی نہیں سنی۔“

نور نے ہونٹ کاٹ کر اس کی طرف دیکھا اور غصے سے بولی۔

”تم خواہنا پتہ نہیں کیا بولے جا رہے ہو۔ میں یہاں اپنی مرضی سے نہیں آئی۔ میں اپنے منگھتے کے ساتھ شہر جا رہی تھی۔ کہ چودھری کے بندوں نے مجھے زبردستی اٹھا لیا۔ دلشاد کو بھی گولی لگی تھی۔ پتہ نہیں اس کا کیا بنا۔ انہوں نے تو مجھے یہاں قید کیا ہوا تھا۔“ وہ بات کرتے کرتے ایک بار بھرو پڑی۔

اور اس کی بات ادھری ہی رہ گئی۔ لیکن سجاد کی سمجھ میں دلشاد کے قتل کا معرہ بھی آ گیا۔ اس نے استانی نور سے اس کا تذکرہ کرنا مناسب نہیں سمجھا کر دلشاد کو ہو گیا ہے۔ وہ پہلے ہی بے حد پریشان اور ڈوبی ہوئی تھی۔ یہ خبر سن کر نہ جانے اس پر کیا گزیرے۔ اس نے عام سے لہجے میں بگلت سے کہا۔

”اجھا۔ یہ روٹا دھونا ختم کرو۔ وقت بہت تھوڑا ہے۔ جلدی سے بتاؤ کہ تم کہاں جانا چاہتی ہو۔ ہم تمہیں وہاں پہنچا دیں گے۔“

نور نے دوپٹے سے اپنے آنسو صاف کیے اور بے ساختہ بولی۔

”دلشاد ہاں۔ تم مجھے دلشاد کے پاس ہی پہنچا دو۔“ لیکن پھر اس نے سر جھٹکا اور پریشانی سے بولی۔

”پتہ نہیں۔ پتہ نہیں وہ مجھے قبول بھی کرے گا یا نہیں۔ پتہ نہیں وہ میرے بارے میں کیا سوچے گا۔“

سجاد کو افسوس سا ہوا۔ اب جبکہ اس کے اور دلشاد کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا تھا۔ دلشاد ہی دنیا میں نہیں رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر تھی۔ اس نے بات ختم کرنے کو کہا۔

”اگر وہ تم سے محبت کرتا ہے یا اسے تمہارا ذرا سا بھی خیال ہے۔ تو وہ کچھ نہیں کہے گا۔“

”یارا تم اس قصے کو چھوڑ دو کہ کون کیا کہے گا۔ بس یہاں سے نکلو۔ اب تو یہ لڑکی بھی ساتھ ہے۔ اور مشکل ہو گی۔“ اس نے اسے ٹوکا۔

نور نے باری باری سر اٹھا کر ان دونوں کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے اسے اندیشہ ہو کہ وہ اسے یہاں چھوڑ نہ جائیں۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر پتنگ پرے بستر کی چادر اٹھائی اور نور کی طرف بڑھا کر بولا۔

”یہ چادر اچھی طرح سے اوڑھ لو۔ تمہارے یہ کپڑے وغیرہ نظر نہ آئیں۔ راستے میں کسی نے کچھ پوچھا۔ تو تم جواب نہ دینا۔ یوں ظاہر کرنا۔ جیسے کوئی ہو۔ اچھا۔“

نور نے انہماک میں سر ہلایا اور چادر کھول کر اسے اپنے گرد اچھی طرح سے لپیٹنے لگی۔ اس نے ٹمڑی کھول کر باہر کا جائزہ لیا۔ صحن میں سناٹا چھایا تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے چودھری کے سب نوکر چاکر غائب ہو گئے تھے۔ وہ بچھوڑے کی طرف سے نکلے اور وہ راستہ اختیار کیا جس طرف خورد و بھانجیاں اور کاکا دکا درخت تھے۔

اس پہلے بھی اس جگہ آچکا تھا۔ اس لئے وہ راستوں سے کچھ واقف معلوم ہوتا تھا۔ یہاں سے بس لینے کیلئے انہیں پیدل سفر کرنا تھا۔ گاؤں کی آبادی سے دور چودھری کی زمینوں کا ایک سربز نگرا تھا۔ جس میں اس نے رنگ و نور کی دنیا آباد کر رکھی تھی۔ اس طرف عام لوگوں کی آمد و رفت نہیں تھی۔ اور یہ راستہ دوسرے راستے کی نسبت کچھ لمبا بھی زیادہ تھا۔ مگر اس

طرف یہ اندیشہ نہیں تھا کہ کسی سے سامنا ہو جائے گا۔

وہ دونوں تیز چل رہے تھے۔ نور کو ان کا ساتھ دینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ مگر وہ جیسے ہی ان کے پیچھے پیچھے چلی آتی تھی۔

”یارا چودھری دیے اچھا آدمی تھا۔ کام کا بندہ تھا۔ مجھے اس سے بڑی امیدیں تھیں۔“ اس نے چلتے چلتے کہا۔

سجاد نے اس کی طرف دیکھا۔ ”یارا اگر تجھے اس کی کڑواہٹ کا پتہ چل جائے۔ تو میرا خیال ہے۔ تو ایسا سمجھی نہ کہے۔“

”کیا مطلب؟“ اس بولا۔ ”یارا یہ چودھری زمیندار ایسی حرکتیں نہ کریں۔ تو انہیں چودھری کون کہے؟“

”خدا کی لالچی بے آواز ہے۔ کبھی نہ کبھی وہ آپ ہی ایسا انصاف کر دیتا ہے کہ بس۔“ سجاد نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”گلتا ہے تم اسے اچھی طرح جانتے ہو۔“ اس نے کہا۔

”نہیں اتنا تو نہیں جانتا۔ مگر یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ شخص اپنی بیوی کا بھی مجرم تھا۔ اس کو اس نے سکا سکا کر مارا ہے۔ یہ اس لڑکی کا بھی مجرم ہے۔ اس نے اسے ورغلا یا۔ اور جس دلشاد کو گولی لگنے کا ذکر کر رہی ہے۔ جو اس کا منگیترا تھا۔ وہ موقع پر ہی ہلاک ہو گیا تھا۔ میں نے اسے جان بوجھ کر نہیں بتایا۔ اور یار باس۔ تمہیں شاید پتہ نہیں۔ یہ تمہارا بھی مجرم تھا۔“

”میرا؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں تمہارا۔ رجاں بس کن اس کے آدمیوں نے ہی انوکھا کر کے عقاب بنایا تھا۔“

”اوہ۔“ اس نے اذیت سے ہونٹ چبائے۔ اور کچھ دیر اس کے منہ سے ایک حرف بھی نہیں نکلا۔ وہ خاموشی سے چپ چاپ چلتے چلے گئے۔

سورج شفق کی سرخی چھوڑ کر غروب ہو چکا تھا۔ اندھیرا بکھلنے ہی والا تھا۔ سجاد اس طرف کے راستے سے واقف نہیں تھا۔ نہ ہی اسے اندازہ تھا کہ بس کہاں سے ملے گی۔ اس نے یونہی بات کرنے کی خاطر ہاں سے پوچھا۔

”یارا ابھی اذان سنتی دور ہے؟ کچھ اندازہ ہے؟“

”اگر ہم صحیح سمت میں چل رہے ہیں۔ تو آدھا گھنٹہ اور لگنا چاہیے۔“ اس نے

اکھڑے اکھڑے سے لہجے میں جواب دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔

بیٹھے۔ اس کے ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ خدا خدا کر کے وہ کہیں ٹھیک ہوئی۔ جب وہ اڑے پر پہنچے تو جھج ہوئی تھی۔

انہوں نے وہیں ایک تھوڑا ہوسٹ سے ناشتہ کیا اور گاؤں تک جانے والی ایک وٹیکن میں سوار ہو گئے۔ وٹیکن میں آجی سے زیادہ نشستیں تھیں۔ ڈرائیور اور کنڈیکٹر ان کے بھرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ نو اسپر گد چادر لپیٹے پاس کے برابر والی نشست پر بالکل خاموش بیٹھی تھی۔ اس نے راستہ ہر ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا اور اس وقت بھی بالکل خاموش تھی۔

انچی سیٹ پر بیٹھ کر سہاول نے یونچی اپنے برابر بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف دیکھا۔ اسی وقت اس نے بھی سہاول کی طرف دیکھا اور اسے یوں سلام کیا جیسے اس کا شناسا ہو۔ سہاول نے اس کے سلام کا جواب تو دے دیا۔ لیکن اسے پہچان نہیں پایا۔ اس کو بھی غالباً اس کے چہرے کے تاثرات سے اعزاز ہو گیا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا۔ اور مسکرا کر بولا۔

”آپ نے شاید پہچانائیں۔“

سہاول کچھ خفیف سا ہو گیا۔ ”جی ہاں۔ بس کچھ یاد نہیں آ رہا۔“

”جی ہاں۔ آپ نے تو شاید ہمیں نہ دیکھا ہو۔ پر ہم نے آپ کو نیلم بانی کے پاس آتے جاتے دیکھا۔“ اس نے آواز مدہم کی۔

”آپ تو نیلم جی کے بڑے منظور نظر ہیں۔“

سہاول نے یوں غماہ کر کیا۔ جیسے اس نے اس کی بات سنی نہیں اور یونچی بات بدلنے کو بولا۔

”کیا حال ہیں آپ کے۔ سب ٹھیک ہے نا۔“

”ٹھیک کیا ہونا ہے جی۔ نیلم بانی کے دم سے تو سب بہا رہیں تھیں۔ اسی کی تو رویتیں تھیں۔ پر۔“ اس نے تاسف کے اظہار میں منہ سے جھج جھج کی آواز نکالی۔

سہاول چمک گیا۔ ”کیوں؟ کیا ہوا۔ خیر تہ تو ہے۔“

”کیوں جی۔ آپ کو نہیں معلوم؟“

”کیا؟“ سہاول کے اندر کھد ہوتی نہ گئی۔

”نیلم بانی کے دشمنی ہونے کے بارے میں آپ کو کچھ نہیں معلوم؟“

”چلو۔ پھر تو خیر ہے۔ یہ سترگی کسی نہ کسی طرح ملے ہوئی جائے گا۔“ سہاول بولا۔

”ہاں! ہاں!“ اس نے پیچھے مڑ کر کچھ فاصلے پر چلتی ہوئی نور کی طرف دیکھا۔ ”اس لڑکی کے لئے ذرا مشکل ہوگی اتنا چلنے میں۔“

”چلو آہستہ آہستہ۔ وہ بھی ساتھ دے دی رہی ہے۔“ سہاول نے بھی پیچھے مڑ کر دیکھا۔

”اسے لے کر کہاں جائیں گے۔“ پاس نے پوچھا۔

”ابھی تو کہے کی طرف ہی چلے ہیں۔“

”نہیں! میرا خیال ہے۔ اسے لہر کی طرف لے جائیں۔ وہاں آپ جا رہا بھی ہے۔“ محبو اور دادا ہے۔ کا کا تو چھڑا چھانٹ ہے۔ اس کی طرف جانا ٹھیک نہیں۔“ پاس نے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

سہاول کو بھی اس کی بات معقول معلوم ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ وہاں پہنچ کر اسے وٹیکن کے قتل کے بارے میں بتا دے گا۔ پھر وہ جہاں جانا چاہے گی۔ وہ خود فیصلہ کرے گی۔ اندر ہر اشتیاق میں مل کر شام کو ملنگا رنگ دینے لگا۔ خود رو جھاڑیوں کے سلسلے اب کم ہونے لگے تھے۔ دور سے اندر سے میں ڈھکے ہوئے کھیت سہاول کی طرح نظر آ رہے تھے۔

دیرانہ رفتہ رفتہ آبادی میں تبدیلی ہو رہا تھا۔ دن بھر کی بے آرائی اور پیدل چلنے کی مشقت نے انہیں تھکاؤ سے لاد دیا تھا۔ نور بھی مشکل اپنے پاؤں سمیٹ رہی تھی۔ دور سے انہیں ایک تھوڑی کا تھوڑی روشن نظر آ رہا تھا۔ تازہ پختی ہوئی گرم روٹیوں کی خوشبو نے انہیں بوک کا احساس دلایا۔

دوپہر کو بھی انہوں نے ٹھیک طرح سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ سہاول نے ارادہ کیا کہ دوڑ کر کھانا لے آئے۔ لیکن پاس نے اسے روک کر دوسری طرف متوجہ کیا۔ دور سے آتی ہوئی وٹیکن کی روشنیاں اسی جانب بڑھ رہی تھیں۔

”شاید یہ اس طرف آنے والی آخری وٹیکن ہو۔ اب کھانے کا خیال چھوڑ دو۔“

”ٹھیک ہے! میں نے تو سوچا تھا کہ چلو وقت ہی گزر جائے۔ ویسے بھی پیدل چل چل کر مددہ خالی ہو گیا ہے۔“

تب تک وٹیکن نزدیک آ گئی تھی۔ وہ جلدی جلدی اس میں سوار ہوئے اور منزل تک پہنچنے کی آس میں مطمئن ہو بیٹھے۔ لیکن وٹیکن آدھے راستے میں خراب ہو گئی۔ وہ بھوکے پیٹ

ہوسپتال میں نیلم کے نرم و نازک وجود کو سفید پٹیوں سے ڈھکا ہوا دیکھ کر اسے اس کی حالت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا رواں رواں سنگ اٹھا۔ یہ نیلم پر کیا قیامت گزر گئی تھی۔ زندگی نے اس سے اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔ وہ بیڈ پر بالکل چت لگی ہوئی تھی۔ اس کے پاس کوئی لڑکی بیٹھی تھی۔ جو اسے دیکھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”کون ہے؟“ نیلم نے مدغم سی نگاہت آلود آواز میں کہا۔

”میں ہوں سجاد!،“ سجاد افسردہ افسردہ سا اس کے بیڈ کے قریب جا کر بولا۔

”اوہو!“ اس کے ہونٹوں سے کرب میں ڈوبی ہوئی ایک صدا نکلی۔ اس نے بٹنے کی کوشش کی۔ لیکن زخموں نے اسے بٹنے نہیں دیا۔ وہ ٹوٹے ہوئے سے لہجے میں بے چارگی سے بولی۔

”سجاد! دیکھو میرا کیا حال ہو گیا ہے؟“

”حوصلہ نہ ہارو نیلم! تم ٹھیک ہو جاؤ گی۔ مگر نہ کرو۔“ سجاد نے اس کے پٹیوں سے ڈھکے ہوئے ہاتھ کو چھو کر کہا۔

”نہیں سجاد! اب میں نہیں بچوں گی۔ میں تو کب کی مر چکی ہوئی۔ میں تو صرف تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔“

”اس طرح نہ کوئی تمہیں اہت سے کام لو۔ تمہیں کچھ نہیں ہو گا۔ تم۔۔۔۔۔“

”سجاد!“ اس کی آواز جیسے بہت دور سے ابھری۔ ”تم میری ایک بات سن لو۔ اکاش میں نے یہ سب تم سے پہلے ہی کہہ دیا ہوتا۔ تو تمہیں تمہاری بہن مل جاتی۔ لیکن۔ لیکن سجاد۔ میں ڈرتی تھی۔ کہیں تم کچھ نہ بیٹھو۔“ اتنی ہی بات کہنے میں وہ بری طرح ہانپ گئی۔ اس کے تنفس کی رفتار تیز ہو گئی۔

”زخمی!“ سجاد نے وہ ہرایا۔

”لیکن کیسے؟“

”اوہو!“ اس نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”حالت ٹھیک نہیں اس کی۔ اللہ ہی ہے۔ جو اپنا کرم کرے۔“

”ہوا کیا ہے؟“

”خیراب پھینک دیا جی کسی نے اس پر۔ پتہ ہی نہیں چل رہا کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ پر جی اب پتہ چل بھی جائے تو کیا فائدہ۔ بیماری نیلم ہائی تو کسی کام کی نہ رہی جی۔ بچ بھی گئی۔ تو کیا زندگی گزارے گی۔ ہائے ہائے!“

سجاد کے دل کو جیسے کسی نے ٹکھی میں لے لیا۔ اس کی روح میں کہیں کوئی ٹیس سی اٹھی۔ اسے نیلم کا پھول سا حسین چہرہ اور ستارہ سی آنکھیں یاد آئیں۔ اس کے اندر ایک تڑپ سی جاگی۔ اس نے بھی نیلم کے وجود اس کے جذباتوں اور اس کی باتوں کو اہمیت نہیں دی تھی۔ لیکن اس کے بارے میں یہ بری خبر سن کر اس کا دل بڑی شدت سے چاہنے لگا تھا کہ وہ اس سے ملے۔ اسے دیکھے۔ اسے تسلی دے۔ اس کا حوصلہ بڑھا سکے۔

یہ خیال اس کے سارے وجود میں اس تیزی کے ساتھ اٹھا۔ کہ وہ اسے روٹیں کر سکے۔ اس نے پیچھے گھوم کر اس کی طرف دیکھا۔

”یار! میں ذرا جا رہا ہوں۔ تم مگر پہنچو۔ میں شام تک آ جاؤں گا۔“

”کیوں؟ خیریت۔!“ اس نے سوال کیا۔

”ہاں۔ بس خیریت ہی سمجھو۔“ سجاد نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس جو غائب اس شخص سے ہونے والی منتکون رہا تھا۔ جیسے سب کچھ سمجھ گیا۔ اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”میری طرف سے بھی پوچھنا۔“ سجاد نے اثبات میں سر ہلایا اور دیکھن سے نیچے اتر گیا۔

سجاد جیسے تنگ ہے کی طرح طوقان کی زد میں آ گیا۔ نلیم کے ان لفظوں نے اسے انگڑوں پر کھڑا کر دیا۔ اسے اپنی ساعت پر دھوکا ہوا کہ شاید اس نے صحیح طور پر نہیں سنا۔ یا وہ بیماری کی شدت میں بھیجی بجلی باتیں کر رہی ہے۔ مگر وہ اس کی بہن کا نام کیوں لے رہی تھی۔ وہ اس کا تذکرہ کیوں کر رہی ہے۔

وہ خود پر قابو پا کر اس پر جھکا۔ ”نلیم! نلیم! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ کیسی باتیں کر رہی ہو؟“

نلیم کی حقیقت ہوئی آنکھیں نیم دہی ہو گئیں۔ اور بچے پر رکھا ہوا اس کا سر ایک جانب ڈھلک سا گیا۔ سجاد نے گھبراہٹ میں اسے ہاتھوں سے چھوا۔ لیکن وہ بے سدھ ہو گئی۔

سجاد نے بے چینی سے اسے دو تین مرتبہ پکارا۔ لیکن وہ اسی طرح بے دم سی پڑی رہی۔ سجاد کے ایک انگ میں بیتابی جاگ اٹھیں۔ وہ نہ جانے اس کی بہن کے بارے میں کیا کہنے والی تھی کہ نہایت نے اس کی زبان پر قفل ڈال دیئے تھے۔ کچھ کچھ میں نہیں آتا تھا کیا کرے۔ اس کا ذہنی چہرہ ہنسنے سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور سانس رک رک چل رہا تھا۔

سجاد دروازہ کھول کر کمرے سے باہر آیا۔ وہی لڑکی جو نلیم کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ ایک عورت سے کھڑی باتیں کر رہی تھی۔ سجاد کو دیکھ کر وہ کچھ کہہ نہ سکی کہ شاید وہ جا رہا ہے۔ اس عورت سے کچھ کہہ کر وہ کمرے کی طرف چلی۔

سجاد نے اسے راستے میں ہی روک لیا۔

”چل کر دیکھو دروازہ۔ نلیم شاید بے ہوش ہو گئی ہے۔“ کسی نس پاؤا کمرے کو۔

”ہا۔ ہا۔“ اس نے بے ساختہ کہا اور اس کے برابر چلتی ہوئی ہوئی۔

”وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ نے اس سے زیادہ باتیں کی ہوں گی۔ تو وہ تھک گئی ہے۔ اللہ تم کو بھاری پر بہت برداشت پڑا ہے۔“

سجاد کچھ بھی نہیں بولا۔ تجسس اور بے چینی سے جیسے اسے آدھ سوا سا کر دیا تھا۔ وہ جیسے جیتے ہوئے صحرا میں برہنہ باسا ہوا تھا۔ نلیم کی اس احموری بات نے اسے سولی پر لٹکا دیا تھا۔ کاش وہ چند لفظ اور کہہ گئی ہوئی۔

اس لڑکی نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ وہ اس کے ساتھ ہی اندر داخل ہوا۔ نلیم ابھی تک بے سدھ ہی پڑی تھی۔ لڑکی نے جب کہ اسے پکارا۔

”آپ آ! آپ! نلیم! آپ!“

لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لڑکی نے میز پر سے کوئی شیشی اٹھا کر اسے سگھائی۔ تو اس کے وجود میں تھوڑی سی حرکت ہوئی۔ اس نے جیسے کے ساتھ کوئی جوس اس کے منہ میں ڈالا۔ سجاد کچھ دور کھڑا بے چینی سے اس کی طرف دیکھ رہا۔

اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور اس کے ہونٹوں میں حرکت ہوئی۔

”سجاد کہاں ہے؟ سجاد! وہ کہیں چلا تو نہیں گیا۔“ اس کی نگاہت آلود آواز ڈوبے ابھرے سنائی دی۔

لڑکی نے پلٹ کر سجاد کی طرف دیکھا۔

”شاید آپ کو پوچھ رہی ہے۔“ سجاد ایک قدم آگے بڑھا۔ تو وہ بولی۔

”بھائی جان! اذرا باتیں کم ہی کریں۔ یہ اس کے لئے اچانک نہیں۔“

سجاد نے اسے اشارے سے یقین دلایا کہ وہ کوشش کرے گا۔ وہ بھر کمرے سے نکل گئی۔ سجاد تیزی سے اس کے پلنگ کے نزدیک پہنچا اور اپنی بیتابی کو چھپاتے ہوئے بولا۔

”کیا بات ہے نلیم!؟ میں آ گیا ہوں۔“

”سجاد! مجھے معاف کر دینا۔ میں یہ سب جہیں اس وقت نہیں بتا سکی۔ جب مجھے بتانا چاہیے تھا۔ اس کے لیے میں دکھ کھلے ہوئے تھے۔“

”پتہ نہیں اس وقت میری زبان پر تالے کیوں پڑ گئے تھے۔ جب تم۔ جب تم!“ اس نے اک آہ سی بھری۔

”اسے خود کوٹھے پر چھوڑ گئے تھے۔ جس کی تلاش میں تم مارے مارے بھرتے تھے۔“

”کون.....؟؟ کون؟؟؟“ سجاد نے سر جھجک کر یوں کہا۔ جیسے سمجھ آ جانے والی بات کو سمجھتا نہ جانتا ہو۔

”وہی انیسویں مئی بخت آدر۔ سجاد وہ تمہاری بہن بھاگ بھری ہے۔“ یہ لفظ نہیں تھے۔ کھلے ہوا سیسہ تھا۔ جو اس کی ساعت میں اتر گیا تھا۔

”او خدا یا!“ وہ شدید کرب کے عالم میں نکلا۔ اور اپنے بال نوچتا ہوا بولا۔

”یہ سب کیا ہو گیا ہے؟ یہ سب کیسے ہو گیا؟ یہ کیوں ہو گیا؟“ وہ ہچکچاتا دے اور طلال کے عذاب میں گھرا اپنی انگلیاں چپانے لگا۔

”سجاد! سجاد! مجھے معاف کر دینا۔ میں جنہیں یہ پہلے نہیں بتا سکی۔“ وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بار بار کہہ رہی تھی۔

لیکن سجاد کو گردو جوش کی کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ جیسے جیسے بخت آور کے بارے میں سوچتا تھا۔ اسے اس کے خود حال میں بھاگ بھری کا چہرہ نظر آتا تھا۔ محاسن یاد آیا کہ بخت آور نے تو روشن کے ساتھ کا کے گھر پناہ لے رکھی تھی۔

اس خیال نے اسے جیسے نئی زندگی دے دی۔ اس کی بہن ابھی اس کی محسوس میں تھی۔ وہ اسے پناہ میں لے سکتا تھا۔ وہ اس کے دکھوں کا ہادوا کر سکتا تھا۔ وہ اسے زمانے کی جبرہ دیتوں سے بچا سکتا تھا۔ اس کے اندر جیسے ایک نیا جوش اور نیا دلولہ اٹھنے لگا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے اس کی زندگی آج اور اسی لمحے سے شروع ہو رہی ہے۔

اس نے پلٹ کر نیکم کی طرف دیکھا۔ وہ رو رہی تھی۔ وہ اس کے بیٹے کے نزدیک آیا۔ تو وہ بولی۔ ”سجاد! مجھے معاف کر دو۔ میں تمہاری قصور وار ہوں۔“

”تمہیں کیسے پتہ ہے کہ بخت آور ہی بھاگ بھری ہے؟“ سجاد نے یقین کرنے کو پوچھا۔

”اس نے مجھے خود بتایا تھا۔ اس نے مجھے اپنی ساری کہانی سنائی تھی۔ اسے یہاں وہ لڑکی زینب بھی مل گئی تھی۔ جسے تمہارے بھائی نے اس کے منگھیر کے ساتھ فرار ہونے میں مدد دی تھی۔ جس کی وجہ سے زمیندار تمہارے دشمن بنے تھے اور انہوں نے بھاگ بھری کو اغوا کر دیا تھا۔“

”بس۔ بس۔ میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا ہے۔“ سجاد نے جوش سے کہا اور چلنے کے لئے مڑا۔

”سجاد! تم اسے کہاں تلاش کرو گے؟“ نیکم نے پریشانی سے کہا۔

”مجھے پتہ ہے کہ وہ کہاں ہے؟ میں اسی کے پاس جا رہا ہوں۔ مجھے بہت جلدی ہے۔ میں فوراً وہاں پہنچنا چاہتا ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ پھر ایک بار قریب آ کر دور نہ ہو جائے۔“

نیکم نے شاید اسے پکارا۔ یا نہ جانے کیا کیا۔ لیکن سجاد کو کچھ بھی سننے کی فرصت کہاں تھی۔ وہ پلک جھپکتے میں بخت آور کے پاس پہنچ جاتا جاتا تھا۔ وہ نیکم کو خدا حافظ کہتا ہوا۔ تیزی کے ساتھ وہ پھل کے اس کمرے سے نکلا اور بسوں کے اڈے کی طرف روانہ ہو گیا۔

کا کے کے گھر تک کا سفر بے چینی اور بترکاری کا سفر تھا۔ ایک ایک لمحہ جیسے پوری صدی بن کر اس پر سے گزر رہا تھا۔ قافلے تھے کہ سننے میں نہیں آتے تھے۔ اس کا بس نہیں چلتا

تھا کہ پلک جھپکتے میں کا کے کے یہاں پہنچ جائے۔ جہاں اس کی دکھیا بہن نے زمانے کی جبرہ دیتوں سے بھاگ کر پناہ لے رکھی تھی۔ جس طرح وہ اس کی تلاش میں جگہ جگہ بھٹکتا بھرتا تھا۔ اسی طرح وہ بھی عزت کی زندگی کی بھمک لینے کو دروازے کی شوکرین کھاتی رہی تھی۔ خیتوں کے دن بیٹے والے تھے۔ تقدیر کی گردشیں ختم ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں دشوار گزار راستوں پر سے ہوتے ہوئے بلا خرابک چھت تھیں آئے مع ہوئے تھے۔ وہ زندگی میں پہلی بار بچی مسرت سے ہنستا ہونے والا تھا۔ اپنے لہو کا ڈانٹنا اپنے نئے رشتوں کی حلاوت والے پہلی بار محسوس کرنے والا تھا۔

اس نے کا کے کے دروازے پر دستک دی۔ تو اس کا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اس دروازے کے پار اس کی عمر بھری تلاش کا نقطہ اختتام اس کے خون کا رنگ اور اس کے رشتوں کی پاس تھی۔ وہ اپنی آنکھوں میں آنے والے لمحوں کی آس بیگائے۔ کا کے کے دروازے پر دستک دیتا چلا گیا۔

کا کے کے دروازہ کھولا۔ تو وہ یوں اندر داخل ہوا۔ جیسے کا کے کو دیکھا ہی نہ ہو۔

”اوئے اوئے پارا! کہیں پولیس تو تیرے پیچھے نہیں لگی ہوئی۔“ اس نے ہستے ہستے اسے گلے سے لگانے کی کوشش کی۔

سجاد بس یونہی سا اس کے گلے سے لگا اور چھوٹنے ہی بولا۔

”پارا! وہ بخت آور۔ میرا مطلب ہے۔ وہ نصیب اور روشن دونوں سیکم ہیں؟“

”یہ تمہیں آتے ہی ان دونوں کی کیا پڑ گئی ہے۔ خبر تو ہے۔“ کا کا اپنی مخصوص خوش مزاجی سے پوچھنے لگا۔

”ہاں۔ سب خبر ہے یا راتم تازہ تو سکی۔ وہ دونوں یہیں ہیں نا۔“

”نہیں۔ وہ تو چلے گئے ہیں۔ اسی دن رات کے وقت انہیں بڑی مشکل سے نکالا۔ تم تو صبح صبح ہی چلے گئے تھے۔ بعد میں حمیرا والوں نے تو بھنگہ مچا لیا۔ وہ چودھری اور نمبردار کو ساتھ لے کر گھر گھر تلاش کرنا لگے۔ خیرہ وقت تو کسی نہ کسی طرح نکالا۔ لیکن نصیب بہت گھبرا گئی۔ اس نے روشن کو بھی پریشان کر دیا۔ بس رات میں نے انہیں اپنی گلو پر بٹھایا۔ اوپر ڈالا بھوسہ اور انہیں اگلے آدے تک چھوڑ آیا۔“

”تمہیں کچھ پتہ ہے کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ وہ کہاں جانا چاہتے تھے؟“ سجاد نے اس کی بات کاٹ کر چیتا بی سے سوال کیا۔

”نہیں۔ انہوں نے کچھ بتایا نہیں۔“ کا کے نے کہا۔

”مگر یار! خرانسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے جنہیں۔ جوان کا اس طرح پوچھ رہے ہو؟“
 سجاد کا مٹی چاکر اپنے ہاتھوں اپنا کھانکھونٹ لے۔ سب کچھ خاک میں مل گیا تھا۔
 کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ سب جل کر خاکستر ہو گیا۔ بھاگ بھری اس قدر قریب سے گزر کر نہ
 جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اس کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ وقت
 کس طرح سے اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔
 ”سجاد! یار! آرام سے بیٹھ جاؤ۔ مجھے ٹھیک طرح سے بتاؤ کہ تم انہیں کیوں ڈھونڈنا
 چاہتے ہو۔ پھر مل بیٹھ کر سوچتے ہیں کچھ۔“ کا کے نے اس کی بے چینی دیکھ کر ملاحظیت سے
 کہا۔

سجاد نے سر جھکا اور نا امیدی سے بولا۔

”یار! مل بیٹھ کر کیا سوچتا ہے۔ جنہیں پتہ تو نہیں کہ وہ کہاں گئے ہیں؟“
 ”یار! ڈھونڈنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ آج نہیں تو کل۔ کچھ نہیں تو پرسوں۔ کبھی
 نہ کبھی تو مل جائیں گے۔ ہم کوشش کرتے رہیں گے۔ دیکھتے رہیں گے۔“ تو اتنا پریشان کیوں
 ہوتا ہے۔ اس نے بڑے عزم سے کہا۔
 لیکن سجاد کی پریشانی کم نہیں ہوئی۔ وہ ابھی اور اسی لمحے اس کی تلاش میں نکل جانا
 چاہتا تھا۔ اس نے پھر کا کے سے کہا۔ ”یار کا! کچھ تو ڈرا بہت اعزاز ہو۔ تو میں ابھی ان
 کے پیچھے نکل جاؤں۔“

”یار یہ بھٹکل پر سرسوں جھانے والا کام تو نہیں ہے۔ تھوڑا مبروحہ سے کام لینا پڑے
 گا۔ تم کچھ کھانی نو۔ پھر دیکھتے ہیں کیا کرنا ہے۔ میں تو جگہ جگہ بھرتا ہوں۔ کہیں سے کوئی سن
 گن مل ہی جائے گی۔“

”پائیا! او پائیا۔“ محسن کی جانب سے لہری آواز سنائی دی۔

”آگہی مرقانی۔“ کا کا دودھ کا برتن اٹھا کر باہر نکلا۔

سجاد بھی اس کے ساتھ محسن میں آ گیا کہ پاس اور نور کے بارے میں اس سے کچھ
 معلوم کرے۔ وہ بہار کے نوگفتہ پھول کی طرح آگہن میں ٹکڑی تھی۔ سجاد کو دیکھ کر اس کا
 چہرہ کل اٹھا۔ اس نے سلام کیا اور جلدی سے پوچھنے لگی۔

”پائیا! تیرا دوست کدھر ہے؟“

”کون دوست؟“ سجاد نے پوچھا۔

”قدر اور کون۔ بھائی کا کے نے بتایا تھا کہ وہ تہارے ساتھ گیا تھا۔ وہ بھی آیا
 ہے؟“ اس کے اعزاز میں سوران جھٹکتے تھے۔

سجاد کچھ حیران سا ہوا۔ اس تو اسی وقت گاؤں روانہ ہو گیا تھا۔ جب وہ غلیم کو
 دیکھنے کیلئے وہیں رک گیا تھا۔ اب تک تو اسے گاؤں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ سجاد کے دل میں
 ٹک سا بیٹھ گیا کہ نہ جانے کیا بات تھی کہ وہ اب تک نہیں پہنچا تھا۔ وہ ٹھٹھک آ رہا تھا اور اس
 کے ساتھ نور بھی تھی۔ کہیں وہ کسی پریشانی میں نہ الجھ گیا ہو۔ یہی سوچ کر اس نے بات بتائی
 تاکہ جب تک وہ خود کوئی تھقیق نہ کرے۔ وہ لوگ کسی پریشانی میں جکڑا نہ ہوں۔
 ”وہ کسی کام سے شہر کر گیا ہے۔ کچھ دن لگ جائیں گے اسے۔“

لہر کا پھول سا چہرہ مچھا گیا۔ اس نے برا سامنہ بتایا۔ اور پاؤں زمین پر مار کر ناراضگی
 سے بولی۔

”اوندھ۔ اس کے تو کام ہی ختم نہیں ہوتے۔ بڑا آیا کا کہیں گا۔“

کا کا اس کے چڑ جانے پر پھٹوٹا ہو کر اسے چھیڑنے لگا۔ لیکن سجاد کا دل اندیشوں
 سے لرز گیا۔ اس کے اندر بھی دوسرا بار کسی سانپ کی طرح چھیلانے لگا کہ اس کے
 ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ نہ پیش آ گیا ہو۔ لہر کے چہرے سے اے بھی مغفوم
 سا کر دیا۔ اس نے پھر اس کی تسلی کیلئے کہا۔

”مگر جا کر بے اور در جاں کو بھی بتا دینا کہ وہ کسی کام سے شہر کر گیا ہے۔ اسے کچھ
 دیر لگ جائے گی۔ فکر نہ کریں۔“

”اوندھ۔ فکر نہ کریں۔“ لہر نے جل کر قہر دودھرایا۔

”ہں کا کیا جاتا ہے۔ چاہے کوئی مرے یا جیے۔ اسے تو بس اپنی پڑی ہے۔“ کا کا
 اسے پھر چھیڑنے اور چڑانے لگا۔ لیکن سجاد ایک نئی چکرا دینے والی سوچ میں گھرا اندر چلا
 آیا۔

o o o o o

ابھی وہ بھاگ بھری کے ایک بار پھر کھو جانے کی قیامت کو نہیں سہہ پایا تھا کہ یہ ایک
 اور عذاب اس پر ٹوٹ پڑا تھا۔ بھاگ بھری اپنی ایک جھٹک دکھا کر اس کے اندر چیتائیوں کے
 الاؤ روشن کر گئی تھی۔ اس پر پاس کی گھراس کی جان کا روگ بن گئی تھی۔ بھاگ بھری کی تلاش
 میں کسی جانب نکلنے سے پہلے وہ پاس کو ڈھونڈتا پھرا۔ وہ استانی نور کے اسکول بھی گیا اور دلشاد

کی حویلی بھی۔ اس کو خدمت تھا کہ شاید نور سے ادھر ادھر نہ لے گئی ہو۔ لیکن کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہ اندیشہ بھی اسے پریشان کر رہا تھا کہ راستے میں اسے کوئی حادثہ نہ پیش آیا ہو۔ یہی شہر دور کرنے کیلئے وہ دینگن کے اڈے بھی گیا۔ یہ سن کر اس کے جیروں تلے سے زمین نکل گئی کہ پچھلے دنوں ایک ویکن حادثے میں اس بری طرح جاہوئی تھی کہ مسافروں کی لاشیں بھی شناخت کے قابل نہیں رہی تھیں۔

کچھ لاشوں کے وارث تو انہیں کسی نہ کسی طرح شناخت کر کے لے گئے تھے۔ مگر ایک عورت اور مرد کی لاش لاوارث قرار دے کر دفن کر دی گئی تھیں۔ انہوں نے سجاد کو مسافروں کی کچھ چیزیں بھی دکھائی۔ جن میں سجاد نے باس کی دھات کی انگوٹھی پہچان لی۔

اس کا دماغ ماؤف ہو گیا۔ اسے یقین کرنا محال ہو گیا کہ ہشتا کلیتا "بھی زندگی گزارنے کے منصوبے بناتا باس یوں ایک دم پیچھا خاک ہو گیا تھا۔ شاید وہ اس لئے اس ویکن سے اترا آیا تھا کہ بوڑھے کو رکن اور رجاں کو یہ منحوس خبر شانے کے لئے زعمہ رہے۔

اسے لہر کا خیال بھی آیا۔ جس نے اپنے معصوم جذبوں کے سارے حسن کو باس کے نام کر رکھا تھا۔ لیکن وہ ان جذبوں کے حسن سے بے خبر ہی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ وہ لہر کی خوبصورت آنکھوں کے چناب سوالوں کا کیا جواب دے گا۔

وہ لڑ کر رہ گیا۔ اس کا جی چاہا کہ اس دنیا سے ناطہ توڑ کر کسی اور دنیا میں جاوے۔ جہاں اس دنیا کی الجھنیں، ٹھکرات اور غم نہ ہوں۔ وہ حالات کی ستم خیزی سے تیراں کھڑا اندر ہی اندر ریزہ ریزہ ہو رہا تھا۔

اس نے رجاں کو بہن کہا تھا۔ بھیمو نے اسے رشتوں کے نرم گرم ڈانٹوں سے آشنا کیا تھا۔ زندگی کے دامن پر سے محبت سے محرومی کا داغ اس کے معصوم پیارے دھو دیا تھا۔ بوڑھے گورکن نے اسے اس وقت پناہ دی تھی۔ جب وہ موسموں کی سختی میں بے سناں کھڑا تھا۔ وہ ان سب کو کس طرح بے سہارا ہو جانے کی اندوہناک خبر سنانے لگا۔ انہوں نے جو کھویا ہوا رشتہ برسوں کی ریاضت کے بعد پایا تھا۔ کس طرح اس کے پیچھے کیلئے کھوجا جانے کی منحوس خبر انہیں دے گا۔

اس پریشانی نے اسے کچھ دیر کیلئے بھاگ بھری کا خیال بھلا دیا تھا۔ وہ گھر آیا۔ تو کا کا اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ محبت سے اس کا بازو تھام کر اسے چارپائی پر بٹھا دیا اور اس سے روٹی پانی کا پوچھنے لگا۔

سجاد نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ بجلی کی سی سرعت سے ایک عجیب خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اور اسے بھر کو اسے سنبھلا دے گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسے ٹھکرات کا بوجھ اس کے ذہن سے ہٹ گیا ہے۔ اس نے پھر کا کے کی طرف دیکھا اور ایک جگہ دیکھا ہی رہا۔

”کیا بات ہے سجاد! اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟“

سجاد نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”یار۔ تم نے مجھے اپنا بھائی کہا ہے؟“

”کیوں؟ تمہیں کوئی شک ہے۔“ کا کے نے اپنے شانے پر رکھے ہوئے اس کے

ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”یار! میری ایک بات مانو گے۔“ سجاد نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ایک کیا۔ یار تو سوتا بہن تھی۔ تو جان مانگ کر دیکھ۔“ وہ یقین سے بولا۔

سجاد چند لمبے لفظوں کو اپنے من میں ہی توڑ رہا۔ پھر اچانک کہنے لگا۔

”یار! اگر میں کہوں کہ تو بیاہ کر لے تو؟“

”شادی۔“ وہ ہنس پڑا۔

”یار یہ بیاہ شادی کا کونسا موقع ہے۔“

”بس ہے یا یار۔ اگر تو ہاں کر دے۔ تو میں ساری عمر تیرا احسان مند رہوں گا۔“

سجاد نے رساں سے کہا۔

”احسان کیا یا راتو تھر کر حکم! وہ بولا

سجاد کی نگلیں بیگم نکلیں۔ اس نے کا کے کا ہاتھ تھام لیا۔

”یار کا کے۔ میں بھائی ہو کر اپنی بہن کیلئے تیرے سامنے بھولی پھیلا رہا ہوں۔“

”تیری بہن!“ وہ سوچنے لگا۔

”یار! میں نے رجاں کو بہن کہا ہے۔ میں چاہتا ہوں۔ اس کو کوئی سہارا مل جائے۔

کوئی اس کا ہاتھ پکڑ لے۔ بچاری نے بڑے دکھ سے ہیں۔ بڑے غم اٹھاتے ہیں۔ کچھ دن سکھ

کے وہ بھی دیکھ لے۔ اگر تجھے منظور ہو۔ تو میں.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر امید بھری

نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”لیکن یارا اس کا بھائی؟“ وہ بولا۔

سجاد کو بوڑھے گورکن سے بات کرتے ہوئے بڑی ہوشیاری سے کام لیتا پڑا۔ اس نے بوڑھے سے بھی یہی کہا کہ یہ تجویز باس کی ہے۔ وہ اچانک کوئی کام پڑ جانے کی وجہ سے ملک سے باہر چلا یا ہے۔ لیکن اس نے تاکید کی تھی کہ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس فرض سے سبکدوش ہو جائے۔

بوڑھے کے لئے باس کی ایک بار بھر جدائی کی شدید دھچکے سے کم نہیں تھی۔ وہ بار بار مشکوک لہجے میں پوچھتا تھا کہ قدر کہاں ہے؟ اے کیا کام پڑ گیا تھا؟ وہ کدھر چلا گیا؟ وہ بتا کر کیوں نہیں گیا؟ وہ کب آئے گا؟

سجاد کیلئے اسے مطمئن کرنا خاصا مشکل تھا۔ لیکن اس نے کسی نہ کسی طرح اسے قائل کر ہی لیا۔ لہر کے دادا نے بھی اسے سمجھایا۔ کہ یہ تجویز بہت ہی معقول ہے۔ اگر اس کی زندگی میں ہی رجاں کو سہارا مل جائے۔ تو اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔

وہ رضامند ہو گیا۔ لیکن کبھی ہنستا۔ اور کبھی روتا۔ اور بار بار یہی کہتا کہ قدر خود آ کر اپنی بہن کو ڈولی میں ڈالتا۔ تو اچھا تھا۔ سجاد نے اس وقت زیادہ زور دینا مناسب خیال نہیں کیا۔ لیکن اس تجویز کی معقولیت سے اسے انکار نہیں تھا۔

اس گفتگو میں اسے کافی دیر ہو گئی۔ لیکن وہاں سے اٹھتے ہوئے اسے اطمینان تھا کہ اس نے بوڑھے کو اس عمر میں صدمے سے بچا لیا تھا۔ رجاں کا گھر بس جانے کی امید ہو چلی تھی۔ وہ بوڑھے سے رخصت ہو کر باہر آیا تو شام ڈھل رہی تھی۔ سورج کی تپتی ہوئی کرنیں دن بھر کی مسافت طے کر کے درختوں کی چوٹیوں پر ٹکی ہوئی آسودگی کا سانس لے رہی تھیں۔

مغرب کی سمت شفق کے آتش رنگ طلوع ہو رہے تھے۔ سجاد اپنی ہی سوچ میں گم آہستگی سے قدم دھرتا چلا جاتا تھا کہ درختوں کے جھنڈ میں سے کسی نے پکارا۔ سجاد نے پلٹ کر آواز کی سمت دیکھا اور ٹھٹک گیا۔

”اسی نے تو مجھ سے بات کہی ہے۔ اس پر ایک مقدمہ بن گیا تھا۔ پکڑے جانے کا خطرہ ہے۔ وہ جلدی میں ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ وہ اپنی بہن اور باپے کو میرے حوالے کر گیا ہے۔ پتہ نہیں اس کی دایہی کب ہو۔ اس لئے اس لئے ہم نے سوچا کہ تم ان کا سہارا بن سکتے ہو۔ یارا تمہارا بھی گھر بس جانے گا۔ اور وہ لوگ بھی تمہارے آسرے ہی لیں گے۔“

سجاد نے رک رک کر کہا۔

”ٹھیک ہے یار۔ جیسا تو کہے۔ تجھے سب اختیار ہے۔ میں تیرے ہاتھ میں ہوں۔“

سجاد نے بے ساختہ کانٹے کو گلے سے لگا لیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”یار کانٹے! تو نے میرا مان رکھ لیا ہے۔“

ایک سوکے درخت کے خشک تنے سے ٹپک لگے لہر کھڑی تھی۔ وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جاری تھی۔ اس کی دلکش آنکھوں کی سبز جھلیوں میں گہری اداسی کنول کی طرح تیر رہی تھی۔ جو روح میں اضطراب چمکتی تھی۔

سجاد کو اعزازہ ہو رہا تھا کہ وہ پاس کے بارے میں پوچھتا چاہتی ہے۔ وہ دل ہی دل میں اس کی تسلی کیلئے الفاظ ڈھونڈتا۔ پگھلڈی سے اتر کر نیچے آیا۔ اور اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

”کیا بات ہے لہر۔ یہاں اکیلی کیوں کھڑی ہو۔ جاؤ گھر شام ہو رہی ہے۔“
لہر کی خوبصورت آنکھوں میں ایک دم سی سوئے موئے آنسو بھر آئے۔ لیکن اس نے انہیں گالوں پر نہیں بہنے دیا اور آنسوؤں کا ایک گولہ ساقط سے نیچے اتارتے ہوئے بولی۔
”پاپائیا! تم کیوں ہمارے ممبر کا امتحان لینے ہو۔ بتاتے کیوں نہیں ہو کہ تمہارا دوست کدھر گیا ہے۔“

”مجھے بتایا تو ہے۔ وہ ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ یہاں اس کی جان کو خطرہ تھا۔ اسی لئے تو وہ چپ چپا کر نکل گیا۔ تم تو گھر میں رہتی ہو۔ تمہیں کیا پتہ کہ باہر کیا بکھیرے ہوتے ہیں۔“ سجاد نے بردباری سے کہا۔

”پر..... پر..... پتہ نہیں کیوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ اصل بات کچھ اور ہے۔ تم اصل بات نہیں بتا رہے۔“ اس نے ہونٹ کاٹنے ہوئے کہا۔

سجاد اندر ہی اندر پریشان تو ہوا۔ مگر اس نے اپنے چہرے کے تاثرات سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور بظاہر عام سے لہجے میں بولا۔

”بھئی۔ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔ اس میں میرا کیا فائدہ؟ جو اصل بات ہے۔ وہ میں نے تمہیں بتا دی ہے۔ جب وہ کبھی خط لکھے گا۔ یا حالات اچھے ہوئے تو واپس آئے گا۔ تو تم خود اس سے پوچھ لیتا۔ کہ اصل بات کیا ہے؟“

”اس وقت تک کون جیسے گا؟ کیا خبر۔“ وہ رخساروں پہ بہہ جانے والا ایک آنسو صاف کرتے ہوئی بولی۔

”لہر۔ ایک بات بتاؤ گی۔“ سجاد نے موضوع بدلنے کو کہا۔

”کیا؟“ وہ قدرے حیران ہوئی۔

”برا تو نہیں مانے گی؟“ اس نے پوچھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

”لہر تو نے کبھی تقدیر سے بھی کوئی بات کی تھی۔ اسے بھی اپنے دل کا حال بتایا تھا؟“

اس نے ہونٹ داغوں سے دبا لیا۔ اس کے دلکش چہرے پر ایک رنگ آتا تھا۔ ایک جاتا تھا۔ اس کا سر جھک سا گیا اور اس نے آہستہ آہستہ سر کو یوں نفی میں جھنسن دی۔ جیسے پچھتاؤں میں گہری ہوئی ہو۔

”تو کبھی اس سے کچھ کہتی تو سکتا۔ اسے کچھ بتا تو دیتی۔ اسے کچھ تو سمجھاتی۔“ سجاد نے زور دے کر کہا۔

”میں کس طرح کہتی؟“ وہ دوہرنے کا ایک سرا انگلی پر لپیٹتے ہوئے بولی۔

”میں کیا کہتی؟ میں کس طرح اسے سمجھاتی؟ وہ تو۔ وہ تو شاید کچھ بھی نہیں سمجھتا چاہتا تھا۔ وہ تو سب کچھ جان کر بھی کچھ نہیں جانتا تھا۔ کچھ نہیں۔ وہ جانتا ہی نہیں چاہتا تھا۔ پتہ نہیں اس کے من میں کیا تھا؟“ اس کے لفظ آنسوؤں میں جھپکنے لگے۔ تو وہ آپ سے آپ چپ ہو گئی۔

سجاد بھی چپ رہا اور اندر ہی اندر غم سے جھپکتا رہا۔ اس کے پاس کوئی آس کوئی امید نہیں تھی۔ جو وہ لہر کے حوالے کر دیتا۔ اس کے پاس ایسی کوئی آرزو۔ کوئی خوشی نہیں تھی۔ جو وہ لہر کو پاس کی نشانی بنا کر سوچ دیتا۔

لہر نے ایک بار پھر آنکھوں میں آئے ہوئے آنسوؤں کو پانی کر اس کی طرف دیکھا اور امید و ہم کی کینکیتوں میں ڈوبتی ابھرتی ہوئی بولی۔

”پاپائیا! اوہ..... وہ تجھے مل کر گیا ہے؟“

سجاد نے لمبے لمبے بھر کو سوجا اور نفی میں سر کو جھنسن دی۔

”نہیں۔ مجھے تو اس کے کسی دوست نے پیغام دیا ہے کہ وہ چلا گیا ہے۔“

”اوہ.....!“ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک آہ سی پھل گئی۔ پھر کچھ جھپکتے ہوئے بولی۔

”پاپائیا! اس نے بھی۔ کبھی میرے بارے میں بھی کچھ کہا تھا۔ کبھی۔“ اس نے جھجک کر سر جھکا لیا۔

”میں جھوٹ کیوں بولوں لہر۔ وہ بندہ ہی کسی اور ٹاپ کا ہے۔ وہ اس قسم کے

بکھیروں میں نہیں پڑتا۔ تو بہت سادہ اور معصوم ہے۔ تجھے کیا پتہ کہ وہ کس دنیا میں رہتا ہے۔

اسے کہاں فرصت ہے کہ اس قسم کی باتیں کرے یا سوچے۔
 ”اوپر.....“ اس نے غصے سے سر جھکا اور بھرے ہوئے گلے سے بولی۔

”وہ ہے ہی ایسا۔ بے ایمان۔ بے وقار۔ بے فیض۔ ہم تو اس کے پیچھے۔“ اس کے گلے میں جیسے بھر کوئی پسندا سا آہڑا اور وہ چپ ہو کر۔ ہونٹ چپاتے ہوئے آگے بڑھ گئی۔

.....

لہر کے دادا کے اصرار اور سجاد کی کوششوں سے بوڑھا گورنر بلا خر رضامند ہو گیا کہ وہ باس کے آنے کا انتظار کیے بغیر ہی رجاں کو ڈولی میں ڈال دے گا۔ تھوڑے ہی دنوں میں کا کا لوہار رجاں کو عیاہ لایا۔ معصوم بھیمو۔ یہ انوکھی جبت یہ پناہ رشتہ پا کر کچھ حیران ہی تو ہوئی۔ لیکن جلد ہی اسے اس تبدیلی کی خوشگوار سانس کا احساس ہو گیا۔ کا کے کے چھوٹے سے گھر میں اس کی چکار وروش کی سن کر ٹھٹھکی۔ وہ بوڑھے گورنر کو بھی اپنے ہمراہ لے آیا۔ اور رجاں کو اس نے تسکون اور خوشیوں سے لاد دیا۔

سجاد کو اب رجاں کی طرف سے کوئی ٹھکر نہیں رہی تھی۔ کا کے کا پاس زندگی اس کے لئے ایک نئے اور خوبصورت رنگ میں تھی۔ جس نے اسے نہال کر دیا تھا۔ سجاد کو باس سے دوستی سمجھانے کے فرض نے باغداد لایا تھا۔ لیکن اس کا دل اسے بخورے نہیں ہٹا تھا۔ اسے جب بھی موقع ملا۔ وہ اس کی تلاش میں چپے چپے کھنگالنے کو نکل گیا تھا۔ اب تو وہ بھاگ بھری کو ایک نظر دیکھ کر پہچان سکتا تھا۔

وہ شہر گیا۔ تو اسے نیلم کا خیال آیا۔ وہ اس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ بھاگ بھری نیلم کی سبیلی بھی تو تھی۔ کیا خبر اسے کسی ایسے ٹھکانے کی خبر ہو جہاں وہ چاہ لے سکتی ہو۔ یہی سوچ کر وہ کہیں اور جانے کے بجائے ہسپتال چلا گیا۔ وہ اس کے کمرے میں پہنچا۔ تو اس کا بستر خالی تھا۔

سجاد کچھ گھبراہٹا۔ اس نے اسے ادھر ادھر دیکھنے کی کوشش کی۔ تو اسے ایک نرس نے بتایا کہ نیلم کے زخم تو ٹھیک ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کا دیش چہرہ دار ہو گیا ہے۔ اس کی ایک آنکھ بھی ضائع ہو گئی ہے۔ وہ بے دھلہ داشتہ ہے اور لوگوں سے ملنے سے گریز کرتی ہے۔ چند دنوں میں اسے ہسپتال سے فارغ کر دیا جائے گا۔ نرس نے بتایا کہ وہ پچھلے برآمدے میں بیٹھی ہے۔

وہ اس طرف آیا۔ تو اس نے نیلم کو دور ہی سے دیکھ لیا۔ وہ ملل کا بڑا سا دوپٹہ اوڑھے

کری پر درخ بھیرے بیٹھی تھی۔ اس کا چہرہ سامنے نہیں تھا۔ لیکن وہ کرسی کے پیچھے پر رکھا ہوا اس کا جھلسا ہوا تھک دیکھ سکتا تھا۔ اس نے چاند کو گن میں دیکھنے کیلئے خود کو کوئی طور پر تیار کر لیا۔ اور اپنے تلتے قدموں میں قریب آ کر اس نے اس کا نام لے کر پکارا۔

وہ چمک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اوه سجاد! تم۔“ اس نے کچھ کہا چا جائین اپنی بات مکمل نہیں کر سکی۔ آؤ اس کے دادا درخاؤں کو بھگوانے لگے۔

چاند کو گن گنگ گیا تھا۔ چول سر ہمایا تھا۔ نیلم اس کے مقابل تھی۔ لیکن پہچانی نہیں جاتی تھی۔ سجاد بھی چپ کا چپ رہ گیا۔ وہ بھی کچھ نہیں کہا۔ چند لمبے دنوں ہی باطل چپ کھڑے جیسے ایک دوسرے کے پہل کر کرنے کا انتظار کرتے رہے۔ پھر نیلم نے اپنے آنسو صاف کیے اور قدرے دم لمبے میں بولی۔

”سجاد! میں تمہارا انتظار کر رہی تھی۔ میں روز تمہاری راہ دیکھتی تھی۔ شکر ہے تم آ گئے ہو۔ مجھے جلدی تاؤ۔ تمہیں تمہاری بہن تو مل گئی ہے نا۔“

سجاد کو اس کے سوال نے ڈس لیا۔ وہ کرب سے ہونٹ چپاتے ہوئے بولا۔
 ”بس نیلم! قسمت میں تو جیسے ناکامی ہی کبھی ہوئی ہے۔ کچھ پڑ نہیں کہ وہ کہاں چلی گئی ہے؟“

”اوه.....! نیلم نے دکھ اور آنسو سے ہاتھ ملے۔“ مجھے معاف کر دو سجاد۔ یہ ساری غلطی میری ہی ہے۔ سب قصور میرا ہے۔ اگر میں تمہیں اسی وقت بتا دیتی تو۔“
 ”چھوڑو نیلم! جانے دو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”ہماری تو قسمت میں ہی بھٹکانا لکھا ہے۔ وہ کی بار میرے قریب آ کر دور چلی گئی۔ کسی کا کیا کھڑا تمہارا کیا قصور!!! کبھی زندگی تو تقدیر کو کچھ پر دم آئے گا۔ تمہیں اگر اس کے کچھ ملے ملے والوں کا پتہ معلوم ہو۔ تو مجھے بتا دو۔ یا کوئی ایسی جگہ جہاں تمہارا خیال ہے کہ وہ پناہ لے سکتی ہے۔“

نیلم نے ایک ششدری آہ بھری۔ ”اس کا میرا اتنا سا تو کبھی نہیں رہا۔ ہم کبھی کبھی تھوڑی دیر کیلئے تھے۔ تو اپنے اپنے دکھ ایک دوسرے کو سنا کر اپنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے تھے۔ اور بس۔“

”ہوں۔“ سجاد نے پر خیال لہجے میں کہا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تم بھی مجھے کچھ نہیں بتا سکتیں۔“

”کوئی تمہارا پیچھا تو نہیں کرے گا؟“
 ”نہیں۔ انہیں اب مجھ سے کیا لینا؟“
 ”تو پھر ابھی چلتی ہو میرے ساتھ؟“
 ”ہاں..... ہاں..... کیوں نہیں۔“ وہ تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

.....

وہ نیکو کو ہسپتال سے لے کر نکلا۔ تو اس کا خیال تھا کہ وہ اس کے کسی طرف چلا جائے۔ لیکن اچانک ہی اس کا ذہن بدل گیا اور اس کا رخ آپ ہی آپ اس چھوٹے سے کمرے کی طرف ہو گیا۔ جہاں گل کی بہک تھی۔ وہ ایک عرصہ بعد اس دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ لیکن اسے یقین تھا کہ گل کے پاس پہنچ کر سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔ ساری پریشانیوں دور ہو جائیں گی۔

اس کی دستک کے جواب میں دروازہ ہلکا۔ جیسے روح میں کوئی درپہل چلا جائے۔
 جیسے ریمان میں کوئی شاداب گلستان مل جائے۔ گل کا پھول ایسا شگفتہ چہرہ اسنے دونوں ہند
 دیکھا بہت اچھا معلوم ہوا۔ وہ ایک ایسی عورت کے ساتھ دروازے پہ کھڑا دیکھ کر کچھ
 حیران ہوئی۔ لیکن پھر یوں سرکائی۔ جیسے کوئی غمی میں کلی چنک گئی ہو۔

”اوو! جہاں۔۔۔ یہ آج تم کہاں بھول پڑے۔ اسنے دلوں سے کہاں غائب تھے؟ آ جاؤ۔ اندر آ جاؤ۔“ اس نے خوش اخلاقی سے کہا اور دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔

نیلیم کچھ ہچکچاتی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔ اس نے چہرے کا ایک حصہ چادر سے ڈھانپ رکھا تھا اور آنکھوں پر گہرے شیشوں کا چشمہ تھا۔ گل نے اسے جیسے کیلئے کہا اور جہاں سہولت سے بولی۔

”سجاول یہ کون ہے؟ تعارف تو کراؤ۔“

”اس کی کہانی بہت لمبی ہے۔ میں اسے تمہارے پاس لے کر آیا ہوں۔ اگر تم اسے چناؤ دو تو۔“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور گل کے فیصلے کے انتظار میں خاموش ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

گل نے نیم کی طرف دیکھا۔ پھر ایک نظر سجاد پر ڈالی اور اپنے مخصوص بیٹھے لہجے میں بولی۔

”اسے تم میرے گھر لے آئے ہو۔ تو سمجھو کہ یہ اب اس گھر کا فرد ہے۔“

نیلم نے نفی میں سر کو جنبش دی اور تھک کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور جیسے خود کھای کی سی کیفیت میں ہوئی۔

”سچا دل! میں نے سوچا تھا کہ تم بخت آدرس مل جاؤ گے۔ تو شاید تمہاری محبت سے مجھے بھی پتا دل جائے۔ میں تم دونوں کی خدمت کر کے زندگی گزار لوں گی۔ لیکن اب۔۔۔ لیکن اب کچھ میں نہیں آتا کہ کدھر جاؤں؟ کیا کروں؟“

”سب نے منہ موڑ لیا ہے۔ سب نے آنکھیں پھیر لی ہیں۔ میرے پاس رہا ہی کیا ہے۔ جو حج جتھہ تھا۔ وہ سب علان پراٹھ گیا ہے۔ اب تو میرے پاس اس افسانہ وار چہرے کے سوا کچھ نہیں رہا۔“ اس کی آنکھوں سے ایک پھر آنسو بہنے لگے۔

جہاد کا دل دکھ گیا۔ اس نے آہستگی سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
 ”فکر نہ کر نیلم! جس کا کوئی نہیں ہوتا۔ اس کا خدا ہوتا ہے۔ دل چھوٹا مت کرو۔
 ہمت سے کام لو۔“

اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور کرب و آفات سے بے خوف کاٹ کر بولی۔
 ”آ جا کھتی ہے۔ وہ چار لڑکیاں آگے رکھ کر بعداً شروع کر دوں۔ لیکن سجاد! میں
 ساری عمر جس چال سے نکلنے کیلئے ترقی پتی ہوں۔ میں دوسروں کو کس طرح.....“ آنسوؤں
 نے اسے بات مکمل نہیں کرنے دی۔ دوسرے جگہ کا ایک باغیچہ رو پڑی۔

سجاد کا پتہ لگا۔ اس کی بات سن کر اسے جبر جبری ہی آگئی۔ اس نے تیزی سے کہا۔

”میری بات سنو نیلیم! اگر تمہیں کسی شریف گھر میں پناہ مل جائے۔ تو تم۔ میرا مطلب ہے تم؟“ وہ انکا۔

نیلیم نے کچھ حیرت۔ کچھ حسرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”سجاول! میں تو پھر سے جی اٹھوں گی۔“

”تمہیں کب ہسپتال سے ڈسچارج کریں گے؟“ سجاد نے پوچھا۔

”میں کہوں تو آج ہی کر دیں گے۔ میں تو خود ہی رکی ہوئی ہوں۔ یہاں سے نکل کر جاؤں گی کہاں۔ بس اسی سوچ نے پریشان کر رکھا تھا۔ پھر مجھے تمہارا بھی انتظار تھا۔ پتہ نہیں کیوں مجھے امید تھی کہ تم میری ضرورت مدد کرو گے۔“

نیلیم نے ایک خوشگوار حیرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔ سیاہ چٹنے کے بچے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھینٹے لگیں۔ سجاد نے ایک شکرگاہ اس پر ڈالی اور کچھ کہتا چلا۔ لیکن اس کے ذہن میں ایک لفظ بھی نہیں آیا۔ اسے کچھ نہیں سمجھا کہ وہ اپنا مفہوم اس تک کس طرح پہنچائے۔ اکھڑ اور درشت لوگوں کے درمیان رہے ہوئے وہ نرم و نازک زندگی کے قرینے بھول گیا تھا۔ اسے ایسے اور خوبصورت لفظ نہیں مل رہے تھے۔ جو اس کے مطلب کو واضح کر سکیں۔ وہ کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔

اسی وقت ماسی جادو کے پلے سے ہاتھ صاف کرتی ہوئی اندر آئی اور اس کے سر پر ہاتھ بھرتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”کیوں پترا خیر تھی نا؟ بڑے دنوں بعد مشکل دکھائی ہے۔ تم تو بھول ہی گئے ہو۔“ ماسی کے مشفق ہاتھوں کے لپس کو اپنے بالوں میں محسوس کر کے اسے ایک انوکھی سی تازگی کا احساس ہوا۔ اس نے ہنسنے ہوئے سر کے ساتھ عاجزی سے کہا۔

”بس ماسی! یہ دنیا کے تکبیرے ہی کہیں سانس نہیں لینے دیتے۔“

”یہ تو زندگی کے ساتھ ساتھ ہی ہے پترا۔ پر بھی انسان عزیزوں رشتہ داروں کی بھی تو خبر لیتا ہے۔“ ماسی نے کہا اور نیلیم کے قریب جا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

اس کے پوچھنے سے پہلے ہی گل آپ سے آپ بول اٹھی۔

”ماسی! یہ بچاری بے سہارا ہے۔ سجاد اس کو لے کر آیا ہے کہ ہمارے پاس رہے۔“

ماسی نے سر سے پاؤں تک ایک تنہدی پر ڈالی۔ اس کے جھنسنے ہوئے ہاتھ اور چہرے نے شاید اسے کچھ سمجھا دیا۔ اس نے نیلیم کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

”جل اچھی بات ہے دھینے۔ ہم لوگ تو یہاں اکیلے پڑے ہیں۔ نہ کوئی عزیز نہ رشتہ دار۔ تیرے آنے سے ہمارے گھر میں بھی رونق ہو جائے گی۔“ نیلیم نے ماسی کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور مخاطب سے لہجے میں بولی۔

”میں بھی آپ کو ماسی کہہ سکتی ہوں۔“

ماسی ہنس پڑی۔ ”میں تو حجت ماسی ہوں۔ چھوٹے بڑے سب کی ماسی ہوں۔ تو بھی یہی کہہ لے۔“

”ماسی! میں کرکش کروں گی کہ میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف نہ ہو۔“ نیلیم نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”نہیں دھینے۔ تکلیف کیا ہوئی ہے۔ انسان تو انسان کے دکھوں کا علاج ہے۔“ ماسی نے محبت سے کہا اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے بولی۔

”اچھا۔ میں تمہارے لئے کچھ روٹی پانی کا بندوبست کروں۔“

نیلیم بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر ماسی کے پیچھے لگیا۔

”ماسی! میں بھی تمہاری کچھ مدد کروں۔“

”نہ دھینے۔ تو ابھی آئی ہے۔ منہ ہاتھ دجو۔ کچھ آرام کر۔“

ماسی نے پلٹ کر کہا۔

”بھئی یہاں رہو گی۔ تو مدد کرنی ہی رہو گی۔ فی الحال تو تم منہ ہاتھ وغیرہ دجو۔“ گل نے بھی ہانک لگائی۔

”نہیں آپا! مجھے یہ گھر۔ اس کے لوگ۔ یہ سب کچھ بہت اچھا لگ رہا ہے۔ مجھے اس سے نہ روکو۔“ نیلیم نے کچھ اس انداز میں کہا کہ گل خاموش ہو گئی اور ماسی نے بھی اسے اپنے پیچھے پیچھے آنے دیا۔ وہ دونوں صحن میں ایک طرف بنے ہوئے سنی کے چولہے میں آگ روشن کرنے لگیں۔

گل وہیں تنہا بیٹھی رہ گئی۔ سجاد کو اس کی موجودگی اس کا معصوم خوبصورت چہرہ اس کی خاموشی۔ سب کچھ بے حد بھلا لگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گل سے کیا بات کرے۔ کیا کہے۔ کوئے موضوع کا انتخاب کرے۔

گل نے خود ہی اسے مخاطب کر لیا۔

”غدا سجاد! آج گل کیا کچھ کر رہے ہو۔ تم تو بڑے مصروف رہے ہو۔“

”کیا کرتا ہے میں نے۔ بس درپردہ کی خاک چھاتا پھرتا ہوں۔ لیکن حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔“ وہ آہی بھر کر بولا۔ ”میں آج بھی وہیں ٹکرا ہوں۔ جہاں سے چلا تھا۔“

”کیوں؟ اتنا عرصہ تم نے کچھ بھی نہیں کیا؟ کچھ تو کیا ہو گا۔“ گل نے کہا۔

”جی تو ساری پریشانی ہے کہ کچھ بھی نہیں کر سکا۔“ وہ پشیمانی سے بولا اور اپنے بھرے ہوئے الفردہ درجہ درول کا سارا حال کہنے لگا۔ وہ چپ بیٹھی سنتی رہی۔ بڑی بھردئی بڑے لگاؤ کے ساتھ۔ وہ کہتا رہا۔ جو اس کے دل میں آیا۔ کہتا رہا۔ وہ شاید خاموش نہ ہوتا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آ جانے والے آنسوؤں نے اس کے حلق میں پھندہ سا ڈال دیا۔

”بس سجاد! شاید اللہ کو ابھی تمہاری اور زماش کرنی ہے۔ مگر دیکھو تم اتنا تو آگے

”اور ایک ہم ہیں کہ۔“ وہ پھر خاموش ہو کر ہونٹ کانٹے لگا۔

گل نے مدغم سے لہجے میں کہا۔ ”سجاد! دنیا کی طرف نہ دیکھو۔ یہاں تو بڑی بڑی شہدہ بازیاں ہوتی ہیں۔ تم اپنا واسطہ اپنے ضمیر کے ساتھ رکھو۔ اچھا کام اس لئے نہ کرو کہ تمہاری واہ واہ ہو۔ برے کام سے اس لئے نہ کرو۔ کہ دنیا دیکھ رہی ہے۔ اچھائی تو اچھائی ہے اور برائی برائی۔ کسی صلے یا لالچ کے بغیر۔ کسی سزا کے خوف سے بے نیاز ہو کر۔“

سجاد کے شکر چہرے پر تازگی کی ایک شاداب پھوار سی پڑی۔ اسے جیسے زندگی کی ایک نئی راہ نظر آنے لگی۔ وہ گہری سوچ میں کھوسا گیا۔ سر جھکائے چپ بیٹھا رہا۔ اسی وقت ماسی کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے دسترخوان پر رکھنے لگی۔ پتہ بچھا دیا۔ نلیم بڑے میں کھانا لے ہوئے اندر آئی اور دسترخوان پر رکھنے لگی۔ آؤ سجاد! کھانا کھاؤ۔“ گل نے کہا۔

تو وہ چونک کر اٹھا اور ہاتھ دھوئے کیلئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

○.....○.....○

بڑے ہونا کہ اب تم اپنی بہن کو پچھانتے ہو۔ اس کا نام تمہیں معلوم ہے۔ تم اسے ضرور ڈھونڈو گے۔“

سجاد نے جھنجکی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور شدت کرب سے ہونٹ کاٹا ہوا بولا۔

”گل! گل! مجھے ایک بار بھاگ بھری مل جائے۔ تو میں پھانسی چڑنے کو بھی تیار ہو جاؤں گا۔ خدا کی قسم۔ جب مجھے اس کا خیال آتا ہے۔ تو میں کہہ ہوں کہ ساری دنیا کو جس نہیں کر دوں۔“

”ادھو ہو ہو۔!!! یہ کیا کہہ رہے ہو؟ پاگل! اپنی بہن کو تلاش کر کے تم پھانسی چڑھ گئے۔ تو اس کا جینے کو دل چاہے گا؟ وہ تو پھر سہارا رہ جائے گی۔ تمہارے بغیر وہ اس دنیا کا مقابلہ کس طرح کرے گی۔“

گل کی یہ بات سجاد کے دل پر جا گئی۔ وہ بھاگ بھری کو تلاش کر کے اپنے خاندان کی عزت کو پناہ میں لینا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہی نہ ہو۔ تو بھاگ بھری۔ ایک بار پھر اس بھری دنیا میں تمہارا رہ جائے گی۔ اس نے الجھ کر گل کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس سے نگاہ ہلتے ہی وہ بولی۔

”سجاد! دیکھو۔ زندگی اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ یہ صرف ایک ہی بار ملتی ہے۔ اسے ضائع نہ کرو۔ اسے اپنے لئے اپنی بہن کیلئے وبال نہ بناؤ۔ تم اپنی بہن کو ضرور تلاش کرو۔ لیکن ایک اچھی زندگی گزارتے ہوئے۔ حلال کی روزی کسائے اور کھاتے ہوئے۔ سجاد! تم اپنی بہن کو جس محفوظ جھٹ تلے لانا چاہتے ہو۔ پہلے اس کو بنا تو لو۔ وہ جہیں مل گئی۔ تو تم اسے کیا بتاؤ گے؟ کہ تم کیا کرتے ہو؟ اسے کہاں رکھو گے؟ اسے کون سے گھر میں لے کر آؤ گے؟“

گل کے ان سوالوں نے اسے ہلا کر رکھ دیا۔ وہ ٹھیک ہی تو تھیک ہی وہ بھاگ بھری کو کیا بتائے گا؟ اس کے سوالوں کا کیا جواب دے گا؟

اس نے پریشانی سے گل کی طرف دیکھا۔ اور ہٹایا ہوا سا پوچھنے لگا۔

”تم ہی بتا دو گل کہ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مجھے کچھ نہیں سوجھتا کہ میں کیا کروں؟ میں نے اس دنیا میں بہت کچھ دیکھا ہے۔ جن لوگوں کو دنیا اچھا لگتی ہے۔ جو بڑے پیچھے ہوئے لوگ ہیں۔ ان میں میں نے ایسی ایسی باتیں دیکھی ہیں کہ.....“ اس نے بات ادھوری چھوڑ کر سر جھکا۔

فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ اور بڑے غور سے دیکھنے لگا۔

”تم کہتے ایسے پھول بنا لیتی ہوں۔“ اس نے سناٹھی لہجے میں کہا۔

گل نے فریم اس کے ہاتھ سے لے لیا اور ہونٹوں میں سے سوئی نکال کر بولی۔ ”یہ ذرا مکمل ہو جائے۔ تو تمہارے کرتے پر بھی کڑھائی کروں گی۔“

سجاد لے کر بھر کو ششدر سا رہ گیا۔ جیسے جیسے اس پر اس بات کی خوبصورتی کھلتی گئی۔ وہ خوشگوار حیرت میں ڈوبا چلا گیا۔ گل اس کے لئے کڑھائی کرے گی۔ اس تصور نے اسے سرشار سا کر دیا۔ جس سے وہ کبھی آشنا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کے جواب میں کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ بس اس کی جانب بھیگی ہوئی نمون نگاہوں سے دیکھتا رہا۔

گل نے کچھ الجھا ہوا دھاگہ اسے دیتے ہوئے کہا۔

”سجاد! ذرا اس دھاگے کو سلجھا دو۔ سارے رنگ الگ الگ کر دو۔ بہت الجھ گیا ہے۔ دیکھنا کہ نہ پڑ جائے۔“

سجاد کچھ دیر بڑے انتہاک سے دھاگہ سلجھتا رہا۔ رنگوں کو علیحدہ علیحدہ کر کے رکھتا رہا۔ پھر اس نے گل کی طرف دیکھا۔ جو اپنے کام میں لگی ہوئی تھی اور قدرے محتاط لہجے میں بولا۔

”گل! مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“

”فرمائیے جواب!“ اس نے خشکی سے کہا اور اپنے کام سے نگاہ ہٹا کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

سجاد بولکھل گیا۔ ”کہیں برا۔ تو نہیں مان جاؤ گی؟“

”برائے مانے والی بات ہوئی۔ تو ضرور برامانوں گی۔“ وہ برو باروشنی سے بولی۔

”پھر تو میں نہیں کہتا۔“ وہ اور ہلکا ہلکا۔

”نہیں..... نہیں..... کبھی..... آخر ثابت کیا ہے؟“ وہ اس کی بولکھل ہٹ سے محفوظ ہوئی۔

سجاد نے گہرا سانس لیا۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔“

”لو اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟“ گل مسکرائی۔

”میں تمہیں خائف نہیں کر سکتا۔ میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔“ وہ سادگی سے بولا۔

”نہیں جی۔ میں خائف نہیں ہوتی۔ تم مجھ سے ہر بات کہہ سکتے ہو۔ تمہیں مکمل چھٹی

نیلیم جلد ہی ماسی اور گل کے ساتھ گھل مل گئی تھی۔ اس کی دکھ بھری داستان نے ماسی اور گل کے دل میں اس کے لئے ہمدردی جنکا دی تھی۔ وہ جوا اپنے چہرے کے مجز جانے کی وجہ سے بہت دل برداشتہ ہو گئی تھی۔ اس گھر کی چار دیواری نے اس کا اعتماد بحال کر دیا تھا۔ اسے حالات سے کبھی نہ کرنا سکھا دیا تھا۔ وہ اس گھر کی ماحول میں رچ بس گئی تھی۔

وہ کچھ پڑھی لکھی بھی تھی۔ گل نے اسے اس پر بھی رضامند کر لیا تھا کہ وہ اسکول میں بچوں کو پڑھا دیا کرے گی۔ سجاد کو اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا تھا۔ اس کا خیر اس خیال سے مطمئن تھا کہ اس نے اپنی کھوئی ہوئی بہن جیسی ایک بے بس لڑکی کو گناہ کی دلدل میں ڈوب جانے سے بچا لیا تھا۔ وہ گل کے سامنے آئی تھی۔ جو غدا بھجی زندگیوں کو سنوار کر آسودہ بنا دیتی تھی۔

وہ اسے یہاں چھوڑ کر پھر اس جہوم میں نکل سکتا تھا۔ جس میں بھاگ بھری اس سے چھڑ گئی تھی۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ اسے پہچان سکتا تھا۔ گل نے اسے ایک نرالی راہ بھائی تھی۔ وہ اس پر چلنا چاہتا تھا۔ لیکن اس طرح کہ اس کی وجہ سے گل پر کوئی آج نہ آئے۔ اسے یہاں رہتے ہوئے کچھ دن ہو گئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ گل سے اجازت لے لے۔

ایک دو چہر۔ کب سنا کھا کچھ۔ تو نیلم جھوٹے برتن دھوئے بیٹھ گئی۔ ماسی کسی بھائی سے ملنے چلی گئی۔ گل اپنی نامکمل کشیدہ کار میں ایڑی الجھ گئی۔ سجاد خاموشی سے اس کے پاس آ بیٹھا اور اسے کڑھائی کرتے ہوئے دیکھنے لگا۔

وہ بڑی نفاست سے نازک نازک سے رنگ برنگے پھول کا ڈھہری تھی۔ اس کی انگلیوں میں دبی ہوئی سوئی بڑی مہارت سے چل رہی تھی۔ دھاگہ ختم ہو گیا۔ تو اس نے کڑھائی کا فریم چھوڑا۔ اور سوئی میں پروئے کیلے رنگ کا انتخاب کرنے لگی۔ سجاد نے کڑھائی والا

ہے۔ وہ فراخ دلی سے کہنے لگی۔ اور اسے سوچنے کا موقع دینے کو پھر اپنی کڑھائی میں الٹی گئی۔
سجاد کو کچھ چٹکیا۔ پھر جیسے انھوں کو توڑا ہوا بولا۔ ”گل! میں یہاں سے چلا جانا چاہتا ہوں۔“

”کیوں بھئی؟“ وہ اس کی طرف غور سے دیکھنے لگی۔
”دراصل میرا یہاں رہنا مناسب نہیں۔“ وہ جیسے صفائی پیش کرنے کے انداز میں بولا۔

”..... میں ایک مشکوک بندہ ہوں۔ میں تمہیں کیا بتاؤں کہ میں کن کن سے بچتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے تم پر کوئی حرف آئے۔ یا تمہیں کوئی پریشانی ہو۔“
”ہوں۔“ گل نے سوچ میں ڈوبی ڈوبی سی لمبی ہوں کی۔ پھر جیسے اپنے آپ سے بولی۔

”نہیں۔ مجھے پریشانی کیا ہونی ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ تم ایک اچھی اور باوقار زندگی گزارو۔“ پھر اس نے سر اٹھایا اور اس کی طرف دیکھ کر زور دے کر بولی۔
”سجاد! اب تم یہ خانہ بدوشوں کی سی زندگی ختم کر دو۔ اپنا گھر بساؤ اور شرطانہ زندگی گزارو۔“

سجاد نے ابھی ہوئی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور سمجھنے ہوئے سے لہجہ میں بولا۔ ”تم بھی کیسی باتیں کرتی ہو گل۔ میں گھر بسا کر کیا کروں گا؟ مگر اندیشوں سے بے نیاز ہو کر بسائے جاتے ہیں۔ تم مجھے بتاؤ کہ کوئی لڑکی ہے تمہاری نظر میں۔ یا میں ہی کوئی انتظام کروں۔“

سجاد کو رانی کی بادامی آنکھیں بڑی شدت سے یاد آئیں۔ اسے گلابی کی گلابی ڈوروں والی لٹکی آنکھیں یاد آئیں۔ اسے شہزادی کی شوخ اور متحرک آنکھیں یاد آئیں۔ اور اس نے گل کی جھیل ایسی گہری شفاف آنکھوں کی طرف دیکھا۔ جو سوائے انداز میں اس کی جانب تک رہی نہیں۔ وہ کیا کہے۔ کس طرح کہے۔ وہ کیسے سمجھائے۔ وہ صرف ان آنکھوں کی پناہ میں رہتا چاہتا تھا۔ وہ ان کی گہرائی میں۔ ان کی موجودگی میں رہتا چاہتا تھا۔ وہ انکے آس پاس بس تھوڑی سی جگہ چاہتا تھا۔

”بھئی۔ کچھ بولو تو سہی۔“ گل نے اسے چپ دیکھ کر کہا۔
سجاد نے سر جھٹکا۔ ”میں نے بھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔“

”اچھا۔“ گل نے معنوی حیرت سے کہا اور ہلکی سی شرارت کے ساتھ اسے مشورہ دیا۔ ”تو اب سوچ لو۔“

سجاد کا جی نہ جانے کیوں چاہا کہ اس سے روٹھ جائے۔ اس سے خفا ہو جائے۔ وہ اس سے کیسے سوال کر رہی تھی۔ عجیب خوفزدہ اور لا جواب کر دینے والے۔ وہ کیا سوچے اور اپنی سوچوں کو آگے بڑھنے اور بھٹکنے سے کیسے روکے۔ وہ اپنی سوچوں کو زبان کیسے دے؟ وہ یوں اپنی چپ بیٹھا رہا۔ جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور تاثرات سے خالی تھا۔ گل نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور فس کر بولی۔

”سجاد! ارے بھئی تم نے تو ابھی سے سوچنا شروع کر دیا۔ ابھی تو تمہارے پاس وقت ہے۔“

سجاد نے سر سمجھا کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ایسا دکھ اور ایسی محرومی تھی۔ جیسے رونا چاہتا ہو۔ لیکن آؤ نہ نکلے ہوں۔ اس نے زمین پر انگلی سے لکیریں کھینچتے ہوئے تجھے سے لہجہ میں کہا۔

”میں نے کیا سوچا ہے۔ میں نے سوچ کر کہا بھی کیا ہے؟“
”تو چلو۔ ہم سوچ لیں گے تمہارے لئے۔ ہیں۔ کیا خیال ہے؟“ گل نے مسکرا کر کہا۔

سجاد نے کوئی جواب نہیں دیا۔
نیلم دروازے میں داخل ہوئی اور گل کو بتایا کہ ہمایوں کی لڑکی اسے بلا رہی ہے۔

”اچھا۔“ گل اپنی چیزیں سیٹ کر اٹھی اور چلے چلے سجاد سے بولی۔
”اتنی جلدی نہیں ہے۔ تم بھی سوچ لو۔ اور تم تو سوچیں گے ہی۔“
سجاد اب بھی خاموش رہا۔ گل کمرے سے باہر نکل گئی۔ نیلم چھوٹے چھوٹے قدم چمکتی اندر آئی۔ لیکن سجاد کو اس کی موجودگی کا احساس نہیں ہوا۔ وہ قریب آ کر بولی۔ ”بیٹھ جاؤ۔“

”ہوں!! ہار!!“ سجاد نے جیسے بے خیالی میں کہا۔
وہ چٹائی پر بیٹھ گیا۔ اور بولی۔ ”سجاد! یہ بہت اچھے لوگ ہیں۔ اب مجھے اطمینان ہے کہ میں یہاں عزت سے ساری عمر گزار سکتی ہوں۔ سجاد میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں

بولوں گی۔

”ہوں۔“ سجاد نے پھر بے خیالی میں ہنگامہ بھرا اور خاموش ہو گیا۔ نایم نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”شاید تم کچھ سوچ رہے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے جیسے کسی سوچ سے ابھر کر کہا۔

”کیا سوچ رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔ ”ایسی گل بھی تو تم سے کہہ گئی ہے کہ تم سوئی

لو۔ ایسی کیا بات ہے۔“ مجھے نہیں بتاؤ گے؟“

”سجاد کو نہ جانے کیوں ہنسی آ گئی۔“ بتاؤں تمہیں۔“

”ہاں۔ اگر بتانا چاہتے ہو۔ تو ضرور بتاؤ۔“ وہ بولی۔

سجاد ایک مرتبہ پھر زور سے ہنس پڑا۔ ”بھئی گل مجھ سے کہہ رہی ہے کہ میں گھبرا

لوں۔ شادی کروں۔“

”اچھا؟“ نایم نے اس کی ہنسی میں شریک ہوئے بغیر قدرے حیرت سے کہا۔ اور

شجیدگی سے بولی۔

”پھر کیا خیال ہے تمہارا؟“

”مجھے خیال کیا ہوتا ہے۔ میں اس بیکار کے مجنھٹ میں پڑ کر کیا کروں گا۔“ سجاد

نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”تم اسے بیکار مجنھٹ کیوں کہتے ہو۔ مگر تو خوشی دیتا ہے۔ تحفظ دیتا ہے۔ نئی امید

دیتا ہے۔ کل نمیک کہتی ہے۔ تم بہت آوارہ گردی کر لی۔ اب پاؤں میں ذخیرہ رکھ لو۔“ وہ

ہنس کر بولی۔

سجاد نے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے ہوئے زخموں نے اس کے خوبصورت چہرے

کی ساری دکھائی چاٹ لی تھی۔ اپنی آنکھوں کے زخم چھپانے کو وہ گہرے شیشوں کا چشمہ لگانے

لگتی تھی۔ جس سے وہ اپنی عمر سے بڑی اور شجیدہ لگتی تھی۔

سجاد کو وہ چنگی دکتی شوخ غیلم یاد آئی۔ جس کا میک اپ سے چمکتا انیشن چہرہ اور

ستارہ سی جگمگاتی آنکھیں دنوں کو مودہ لیتی تھیں۔ اس نے اس وقت اسے دل میں جگہ دی تھی۔

جب لوگ اس کے قدموں میں دل رکھتے تھے۔

وہ جب بمبئی میں اس کے یہاں بھولے ہوئے جھکے سے جا نکلتا تھا۔ تو وہ اپنے سارے

دلکاویز جذلوں سے اسے خرابور کر دیتی تھی۔

لیکن اب اس ناگفتہ بہ حالت میں اس نے کبھی محبت کا نام بھی نہیں لیا تھا۔ اس نے

جیسے اپنے سارے جذلوں کو مار لیا تھا۔ وہ اب بھی اس کے سامنے یوں لاطعلقی سی بیٹھی تھی۔

جیسے اس کی لطیف جذبے سے کوئی واسطہ ہی نہ رہا ہو۔

سجاد نے یونہی اسے جھپڑنے کو کہہ دیا۔

”تو بھلا مجھے آوارہ گرد سے کون لڑی شادی کرے گی۔“

اس نے ٹھٹھا ہونٹ دانتوں تلے دیا۔ اس کے واندار چہرے پر کئی رنگ آئے اور

گزر گئے۔ اس نے کچھ کہنا چاہا۔ لیکن پھر خاموش ہو گئی۔ کچھ سوچا اور بولی۔

”نہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔ تم تو۔“ وہ پھر کچھ کہتے کہتے رک گئی اور اس کے

چہرے پر غمزدگیوں کے کتنے ہی سائے جگمگ آئے۔

سجاد چند لمحوں کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

”ہاں کہو تم کیا کہنے والی تھی؟“

وہ کچھ گڑبڑا ہی گئی۔ پھر شپٹا کر بولی۔ ”نہیں کچھ بھی نہیں میں تو کچھ نہیں کہہ رہی

تھی۔“

”اچھا! کچھ نہیں کہہ رہی تھیں؟“ سجاد نے اس کی بات دوہرائی۔ اور بولا۔

”تو پھر اب کہو کہ تم شادی کرو گی۔ مجھ جیسے بے ٹھکانہ۔ آوارہ گرد کے ساتھ۔“

”کیا؟“ وہ بھونچکی رہ گئی۔

”شادی کرو گی مجھ سے؟“ سجاد نے صاف لہجے میں دوہرایا۔

اس کا چہرہ خنجر سا ہو گیا اور وہ بے بسی سے بولی۔ ”سجاد! میرا مذاق نہ اڑاؤ۔ میں

جس حال میں ہوں۔ مجھے اسی میں رہنے دو۔“

”مجھے غلط نہ سمجھو۔“ وہ رد ہانسی ہو گئی۔

”سجاد! یہ تو وہ بات ہے۔ جسے تمہارے ہونٹوں سے سننے کیلئے میرا رازاں رواں

ترستا رہا ہے۔ مگر اب۔ اب تو میرے پاس تمہیں دینے کیلئے کچھ بھی نہیں۔ میں اپنے اس

بیمیاک چہرے کے ساتھ خود کو تم پر مسلط نہیں کرنا چاہتی۔“

”نیل! تمہارا صرف چہرہ ہی پہلے جیسا نہیں رہا۔ لیکن تمہارا دل تو وہی ہے نا۔“ سجاد

نے رمان سے کہا۔

”گمراہ“

”اگر مگر کو چھوڑ دو۔ تم مجھے صاف صاف بتاؤ کہ تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو یا نہیں؟“ وہ دونوں کچلے کچلے میں بولا۔

نیلیم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور چند لمحے دیکھتی ہی رہی۔ آنسوؤں کے دو شفاف قطرے اس کے وانداور رخساروں پر بہہ گئے۔ اس نے سر جھکا لیا اور ہولے ہولے رونے لگی۔

○ ○ ○

سجاد ملے فروش پر سلاخوں کے پیچھے بیٹھا۔ بدلے ہوئے وقت کو سنے کی ہی کیفیت میں دیکھ رہا تھا۔ لوہے کی ان سلاخوں نے اس پر حیات کے سارے در بند کر دیئے تھے۔ زندگی کا کوئی در پیچ اس طرف نہیں نکلتا تھا۔ سلاخوں سے باہر کی دنیا بہت دور اور دسڑن سے باہر ہو گئی تھی۔ اس کا اپنا وجود ایک تار تک سائے کی طرح اس نیم تار تک کوٹھری کا ایک حصہ بن گیا تھا۔ وہ جیسے کسی بے مصرف شے کی طرح گندے فرش پر پڑا تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا۔ اس کے حواس خفل تھے۔ چاروں طرف اندھیرے کے سوا کچھ نہیں تھا۔

اس کے دہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ دن اس طرح سے رات بن جائیں گے۔ چمکتا دمکتا اجالے تکسیر تا سورج سیاہ ہو جائے گا۔ زندگی میں بہت تھوڑی سی خوشی کے بعد غم کے بادل گھرا آئیں گے۔ باہر کی دنیا سے اس کا ہر رابطہ کٹ گیا تھا۔

وہ دن بھی اس کے چھوٹے سے آنگن میں اچلی خوشی بن کر طلوع ہوا تھا۔ نیلیم اس کے سر ہانے کھڑی اسے محبت سے بیدار ہونے کے لئے کہہ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں کھولی تھیں۔ تو نیلیم اسے صبح کی دیوی کی طرح پر جمال اور نکھری نکھری سی معلوم ہوئی تھی۔ اس کے دل کی خوبصورتی نے اس کے وانداور چہرے کو بھی کاشی عطا کر دی تھی۔ اس کے پاس محبت کے اتنے خزانے تھے کہ اس کی ظاہری ہی کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس نے اس کی زندگی میں ایک گھر کا سکھ شامل کر دیا تھا۔

وہ دن بھر اس کے لئے اپنے چھوٹے سے گھر کو سنواری رہتی تھی اور جب وہ شام کو تھا کا بار دہلیز پر قدم رکھتا۔ تو اس کی مسکراہٹیں اسے اپنی ہنسی میں لے کر نکیز طور پر لے جاتی تھیں۔ اسے ایک دکان پر معمولی ملازمت مل گئی تھی۔ وہ دن بھر کی محنت سے جو تھوڑے سے پیسے لے کر آتا۔ انہیں نیلیم کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے اسے ایک ایسی خوشی کا احساس ہوتا۔ جو

لاکھوں کا مال لوٹ کر بھی اس کے جیسے میں نہیں آتی تھی۔

وہ روز کی طرح اس دن بھی گھر سے نکلا تھا۔ تو نیلیم دروازے تک اس کے ساتھ آئی تھی۔ وہ بڑے چاؤ سے کہہ رہی تھی۔ کہ وہ کھانے پر ضرور آ جائے۔ وہ اس کی پسند کی چیزیں بنائے گی۔ اس کے اعزاز میں لگاؤ تھا۔ اس کی پیہ پیات اس کے جیسے ہوئے وانداور چہرے کی دلکشی بن گئی تھی۔ اس کے لبوں پر ایک ناز آمیز نیم تھا۔ وہ اس کی جانب یوں دیکھ رہی تھی۔ جیسے اس کے سوال سے کسی کی ضرورت نہیں تھی۔

دروازے سے باہر قدم نکالتے ہوئے اس نے پھر پلٹ کر نیلیم کی طرف دیکھا اور چلتے چلتے بولا۔

”فکر نہ کرنا۔ میں جلدی آ جاؤں گا۔“

لیکن اب تو ایسا لگتا تھا۔ جیسے وہ کبھی اس دروازے تک نہیں جاسکے گا جس کی دہلیز پر وہ نیلیم کو جلدی گھر آ جانے کا کہہ آ رہا تھا۔

وہ دکان کے مالک سے آدھے دن کی چمپنی لے کر ایک مٹھی تھمیز گیا تھا۔ جس کے متعلق اس نے سنا تھا کہ وہاں بھیرا ناچنے کا ڈرامہ سچ ہوتا ہے۔

وہ بھاگ بھری کی تلاش سے غافل نہیں ہوا تھا۔ وہ اس امید پر ہر تھمیز میں ضرور جاتا تھا کہ شاید بھاگ بھری اسے وہاں مل جائے۔ لیکن ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا۔ اس روز بھی وہ تھمیز کی لمبے چھوڑا یوں میں جھانکتا بھرتا تھا کہ اچانک ایک بٹے کے سیاہ فام آدمی نے اس کا کار پلڑا کر اسے پیچھے کھینٹ لیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی بھی تھا۔ دونوں اسے دھکیلتے دھکے دیتے۔ ایک اور خیمہ نما چھوڑا رہی میں ملے گئے۔

”کیوں اوڑھے۔ تو کیا سمجھتا تھا کہ تو پولیس کو جا کر رپورٹیں دیتا رہے گا اور ہمیں پتہ نہیں چلے گا۔“ ایک شخص نے اچانک ایک زور دار ہاتھ اس کی ٹانگی پر اس طرح دیا کہ وہ چکرا اٹھا۔

دوسرے نے اسے غمو کر لگا لی۔ ”ہم تو کب سے تیری تاک میں بیٹے تھے۔“

سجاد کو اس غیر متوقع صورتحال نے حواس باختہ کر دیا۔ انہوں نے اسے سننے کے موقع نہیں دیا۔ نہ ہی اس کی کوئی بات سنی۔ وہ دونوں بٹے کٹے تھے۔ وہ ان کا مقابلہ بھی نہیں کر سکا۔ انہوں نے اسے مار مار کر آدھ مورا کر دیا۔

پھر ایک لمبا توڑ کا شخص ہاتھ میں پتول لیے ہوئے اعدا آ گیا۔ اور اس نے سجاد کے

بال منہی میں بکڑ کر اس کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ اور بھاری آواز میں غلیظ گالی دے کر بولا۔

”یہ ہے کون الکا بٹلا۔ ذرا میں بھی تو اس کا دیہار کروں۔ پولیس میں خبری کر کر کے اس نے ناک میں دم کر دیا ہے۔

نڈھال ہوئے سجاد کے لئے آنکھیں کھولنا بھی تھا۔ اسے اپنے منہ میں اپنے ہی خون کا ذائقہ محسوس ہونے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

اچانک چاروں طرف بھگدڑی مچ گئی۔ کسی نے خبیثہ کا پردہ ہٹا کر کہا۔ ”پولیس آگئی ہے۔“ وہ لوگ اسے چھوڑ کر بدحواسی میں باہر نکل گئے۔ سجاد نے سر جھٹک کر خود کو ہوشیار کرنے کی کوشش کی۔ وہ بمشکل اپنے جیروں پر کھڑا ہوا۔ اگلی وہ باہر نکلنے کی فکر میں ہی تھا کہ پولیس اندر گھس آئی۔ سب کے ساتھ اسے بھی جھڑپیں لگا گئی تھیں۔ یہ سب کچھ اس طرح ہلک جھپٹنے میں ہو گیا کہ وہ نہ احتجاج کر سکا۔ نہ کسی نے اس کی کئی۔

وہ سب کے ساتھ بے قصور بندھا ہوا تھا۔ پینچا دیا گیا۔ کسی نے اس سے نہیں پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس کا تین فیئر والوں سے کیا تعلق ہے۔ اس نے کوئی جرم کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے خود جب بھی کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اسے گالیوں کے سوا کچھ نہیں ملا۔

نہ پیغام رسانی کا کوئی ذریعہ تھا۔ نہ اس کی کوئی ضمانت۔ وہ گل کو اس کی خبر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ پولیس کی حراست میں ہے۔ اور فیئر والوں کے سارے جرم اس کے نام بھی لکھے جا چکے ہیں۔ وہ ایک شریف لڑکی تھی۔ وہ اسے قاتلے پتھروں کے پتھر میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنی بے گناہی ثابت کرنے کی کوشش کرے گا۔ لیکن اس کا کوئی موقع نہیں تھا۔ وہ دوسرے ملازموں کے ساتھ وہیں تھا۔ اسے کچھ فرش پر بیٹھا۔ گالیاں اور مصلواتیں سنتا رہا۔

اس وقت ایک لاغر اور کمزور بوڑھا چلکی ہوئی کر کے ساتھ لڑکھاتا ہوا تھا۔ دار کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پریشان چہرے پر بیٹے ہوئے لکھنوں کا دکھ لکھا ہوا تھا۔ سجاد لکھنے کی کیفیت میں اس کی طرف دیکھتا دیکھتا رہ گیا۔

”لو آگئی ممیبت۔“ ایک سپاہی نے تھانیدار کو اس طرف متوجہ کیا۔ تھانیدار نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہانپتا ہوا ہاتھ پیشانی پر رے گیا۔ اور سلام کر کے بولا۔

”تھانیدار جی۔ میری دلی بہانگ بھری کا کچھ پتہ چلا۔ کوئی خبر گئی اس کی۔ وہ غالم

میری مصوم بچی کو کہاں لے گئے ہیں۔“

”بابائی۔ او بزرگو۔ تمہیں کہا ہے۔ جب بھی تمہاری بیٹی کا کچھ پتہ چلا۔ تو ہم تمہیں اطلاع کر دیں گے۔ تم آرام سے گھر میں بیٹھو۔ یہ روز روز پتھر سے نہ ڈالا کرو۔“ تھانیدار نے نالے کے انداز میں کہا۔

بوڑھے کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے ہاتھ ملتے ہوئے جیسے اپنے آپ سے کہا۔

”رب جانے۔ اس کا پتہ کب ملے گا۔ پتہ نہیں وہ غربتی کس حال میں ہے۔“ وہ ہونٹوں ہی ہونٹوں میں بیڑا بنا۔ وہ مکمل قدم کھینچتا روزانے کی سمت چلا گیا۔

تھانیدار نے سر کے قریب انگلی کھائی۔ ”داغ بھی جمع ہے باپے کا۔ پتہ نہیں لڑکی کس کے ساتھ نکل گئی ہے اور یہ روز اس کا پتہ کرنے میں آ جاتا ہے۔“

سجاد نے اندر باہر جیسے ہونچال سا آگیا۔ وہ نجد سدا ہو کر وہیں پیٹھا کا بیٹھا رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں بے بسی کے آنسو تیرنے لگے اور وہ آنسوؤں کی اس دھند سے پار ہانپے کو تھانیدار کے کمرے سے باہر جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

یہ بابا اس کے سجدہ آن ملا تھا۔ جب اس کے ہاتھوں میں جھڑپیاں اور گلے میں ناکرہ جراثیم کا طوق تھا۔ جب وہ اس کے ساتھ کسی رشتے کے ہونے کا اقرار نہیں کر سکتا تھا جب وہ اسے اپنے دکھوں کی کہانی نہیں سناسکتا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں تھا۔ کیا کرتا تھا اور کس طرح سے زندگی گزارتا تھا۔

اسے اپنی آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہوئے دیکھ کر سجاد کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے دنیا سے اس کا ہر رشتہ ٹوٹ گیا ہے۔ کسی انسان نے کسی ذی روح سے اس کا کوئی تعلق کوئی ناطہ کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اس کا دل ہر آرزو پر ختم سے کسمر خالی ہو گیا۔ اس کا من ہر شے سے اچاٹ ہو گیا۔ اس کا اعتبار ہر چیز سے اٹھ گیا۔ اسے دنیا والوں سے کراہت ہی آنے لگی۔ اسے ہر شے پر زہر لگنے لگی۔

نہ جانے اس دوران عدالت کی کیا کارروائی ہوئی۔ کس کس کے جرائم اس کے نام لکھ دیے گئے۔ اس نے نہ جانے کیا کیا اعتراف کر لیا۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی۔ اسے نہ دن یاد ہے۔ نہ تاریخ۔ نہ مہینہ۔ اسے نہ وقت کا احساس رہا۔ نہ مسموموں کی خبر۔ نہ اسے رتوں کے آنے جانے کی آہٹ سنائی دیتی تھی۔ نہ چاند اور سورج کے طلوع و غروب کی خبر ہوتی تھی۔ ہنسی سلاخوں سے باہر کی دنیا اس سے لمحہ بہ لمحہ اس طرح دور ہو گئی تھی۔ جیسے کسی نئے پتے کی

”ہیلو! کیا میں میڈم خوش بخت سے بات کر سکتا ہوں؟“
 ”جی۔ فرمائیے۔ آپ کون صاحب ہیں؟“
 ”میں احمد مراد ہوں مفت روزہ ”حقیقت“ کا ایڈیٹر۔ مجھے ملاقات کا وقت چاہیے۔“
 ”میں معذرت چاہتی ہوں۔ میں اخباری نمائندوں سے نہیں ملتی۔ مجھے کسی طرح کی پبلسٹی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“

”مگر یہاں پبلسٹی کا معاملہ نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی سنسنی خیز سیکڑلڑ کا سلسلہ ہے۔ میں تو آپ سے بحیثیت ایک انسان کے بات کرنا چاہتا ہوں۔ ویسے میں آپ کی آواز کا بے حد پرستار ہوں۔“

”عذر۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے نہیں مل سکتی۔“ فرما دیا گیا۔
 احمد مراد نے سر ہچکاکا تو گہا تاکا می مقداری۔ گلوکار خوش بخت چند ہی برسوں میں دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی۔ اس کی دھڑاواز نے سب کو مہو لیا تھا۔ اس کی پرسوز لے نے دلوں میں گھر کر لیا تھا۔ لیکن وہ کسی سے ملنا پسند نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی وہ انٹرویو یا تصویریں چھپوانے میں دلچسپی رکھتی تھی۔ اس کا سیکرٹری لوگوں کو بڑی صفائی سے ٹال دیتا تھا۔ اس کا چوکیدار بڑی حقیقت کے بعد کی اجازت دیتا تھا۔

نوجوان احمد مراد نے اس تک رسائی حاصل کرنے کی بھڑی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے ہر بار تاکا کی کامند دیکھنا پڑا تھا۔ اس کا پرچہ ”حقیقت“ ہمیشہ نئے موضوعات کی وجہ سے پسند کیا جاتا تھا۔ اسے خوش بخت کی پراسراریت میں کوئی انوکھی کہانی چھپی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ جو معاشرے کے کسی ایسے گوشے کی نظارہ کی کشتی تھی۔ جواب تک لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ تھا۔

اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ خوش بخت کو بار بار فون کرتا رہا۔ کئی بار اس کے گھر کے

مٹھی سے بجو جھوٹ کر اڑتا ہوا۔ دور بہت دور۔ فضا کی پہتاہٹوں میں ہمیشہ کیلئے کہیں کم ہو جاتا ہے۔

اس نے سب کچھ فراموش کر دیا وہ سب کچھ بھول گیا وہ خود کو بھی بھول گیا کہ وہ کون تھا۔ کہاں سے آیا تھا؟ جیل کی اس سنگین چار دیواری میں کیوں قید تھا؟ وہ ماضی کی تکلیفوں، حال کی تنگی اور مستقبل کے خوف سے بے نیاز ہو گیا تھا۔ جس طرح اس نے خود کو فراموش کر دیا تھا۔ شاید اسی طرح اسے گرفتار کرنے والے بھی اس کو بھول گئے تھے۔ اس کے لئے اب کوئی بات اہم، مشکل یا تکلیف دہ نہیں رہی تھی۔ اسے کچھ خبر نہیں تھی کہ زندگی اس کے ارد گرد کس انداز میں بہہ رہی ہے۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ اس نے انھوں کا احسان لینا چھوڑ دیا تھا۔ وہ بہت کم کسی سے بات کرتا تھا۔ شاید ضرورت ہی اسے کوئی لفظ بولنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس کے ساتھ رہنے والے قیدی اس سے طرح طرح کے سوالات کرتے، کریڈ کرید کر اس کے بارے میں پوچھتے۔ لیکن وہ سب کے جواب میں خاموش رہتا۔ چپ چاپ۔ خود میں اس طرح مگن چھپے قوت کو پائی سے محروم ہو۔

کتنے ہی قیدی آئے اور کتنے ہی سزا کاٹ کر چلے گئے۔ لیکن آگے پیچھے بھٹلے بے شمار دنوں میں اس کی رہائی کا کوئی دن نہیں آیا۔ اسے کسی ایسے دن کی آس بھی نہیں رہی تھی۔ نہ اس نے کبھی کسی ایسے دن کا انتظار ہی کیا تھا۔ اس کے سارے دن ایک جیسے تھے۔ سلاخوں میں متعین سنگین دیواروں میں گھرے ہوئے۔ بے رنگ، بے مصرف۔ بے نور۔ وہ اپنی ذات کے جزیرے میں قید کسی کی طرف نہیں دیکھتا تھا۔ اسے کے سر کے بال بچھڑی ہو گئے تھے۔ اس کی داڑھی بے ترتیبی سے بڑھ گئی تھی۔ اس کی خاموشی گہری اور گھبر ہو گئی تھی۔

دوسرے قیدی اسے کوئی مہذب یا پچھڑا ہوا بزرگ سمجھتے تھے۔ وہ اکثر اس کی خدمت کر کے۔ اس کے پاؤں دبا کر۔ اسے دعا کیلئے کہہ کر خوش محسوس کرتے تھے۔ لیکن سچا دل کو کسی کی پروا نہیں تھی۔

بلاتی رہیں کبھی کوئی پیغام اس کے نام نہیں لائی تھیں۔ کبھی کوئی اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ بغیر کچھ محسوس کیے۔ بغیر کچھ سوچے بغیر کوئی احتجاج کے زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

پکار لگائے۔ کونسی کے چوکیدار سے کئی بار اس کی تو میں میں ہوئی۔ آخر ایک روز اس نے ٹیلیفون پر میڈم خوش بخت سے کہہ دی۔

”میڈم۔ اگر آپ مجھے شرف ملاقات عطا نہیں کریں گی۔ تو میں دیوار پھلانگ کر آپ کے کمر میں گھس آؤں گا۔“

”چھا۔ آپ ایسے کام بھی کرتے ہیں۔“ وہ اب اس سے کچھ بے تکلف ہو چلی تھی۔

”کیا کریں گی۔ مجبوری بہت کچھ کرتی ہے۔“ وہ مسکھار کر بولا۔

”آپ نے گیٹ کے باہر جو بورڈ لگا ہوا ہے۔ وہ نہیں پڑھا؟“ اس کا انداز ہلکا پھلکا تھا۔

”جی ہاں۔ بالکل پڑھا ہے اور میں چودہ انجشن گلوٹانے کیلئے پوری طرح سے تیار ہوں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

اس کی ہنسی کی آواز آئی۔ ”بڑے ثابت قدم ہیں آپ۔“

”شکر ہے عزت افزائی کا۔ تو میں کس وقت حاضر ہو جاؤں؟“

اس نے موقع غنیمت جان کر جلدی سے پوچھ لیا۔

دوسری جانب یوں خاموشی چھا گئی۔ جیسے وہ کچھ سوچ رہی ہو۔ مراد بھی خاموش رہا۔

پھر دوسری طرف سے گہرا سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ اور وہ بولی۔ ”دیکھئے۔ مجھے انٹرویو وغیرہ دینا بالکل پسند نہیں۔“

”تو بے نتیجہ نتائج۔ میں انٹرویو بالکل نہیں لوں گا۔ میں تو صرف آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ مراد نے بڑے اشتیاق سے کہا۔

”اچھا!“ اس نے ٹھوڑا وقفہ کیا اور بولی۔ ”آپ شام کو کبسی وقت آ جائیں۔“

اودہ میڈم۔ شکر ہے۔ بہت شکر ہے۔ نوازش۔ کرم۔ مہربانی۔“ وہ بہت کچھ کہتا رہا۔ مگر

دوسری طرف سے فون بند ہو گیا۔



جب احمد مراد کو چوکیدار نے اندر لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ تو بھی اس کو یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ وہ واقعی میڈم خوش بخت کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے اور عقرب اس سے ملاقات کرنے والا ہے۔ وہ بڑے اہتمام سے تیار ہوا تھا اور دل ہی دل میں خوبصورت جملے موزوں لفظ اور پراثر مکالمے سوچ رہا تھا۔ جو اسے میڈم خوش بخت کو متاثر

کرنے میں مدد دے سکیں۔

قدموں کی آہٹ سنائی دی اور پردہ ہلا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گیا۔ وہ پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئی۔ مراد احتراماً کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازہ قدر اور خوبصورت تھی۔ اس کے حسین چہرے کی دلکشی کو سوکھاری نے اور دلچسپی بنا دیا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں سے جھانکتی ہوئی اداسی نے اس کی آنکھوں میں بہت سی ایسی کہانوں کے رنگ بھر دیئے تھے۔ اس نے ایک تنقیدی نگاہ اس پر ڈالی اور مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے بولی۔

”احمد مراد آپ تو بہت چھوٹے ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ شاید آپ کوئی کھانگ قسم کے صفائی ہیں۔“ اس نے قریب آ کر پردہ زنا زشتی سے اس کے بالوں پر ہاتھ بھیرا۔ تو احمد مراد کو بہت اچھا لگا۔

”تعریف رکھیے۔“ اس نے ایک نفست کی طرف اشارہ کیا اور خود بھی باوقار چال چلتی ایک صوفے پر اس کے مقابل بیٹھ گئی۔

احمد مراد کو اپنے دل میں ایک انوکھی نقارہ میر سمرت کی قدرتی جنتی کی طرح پھپکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اسے میڈم خوش بخت کے متواضع انداز سے معلوم ہو گیا تھا کہ اس نے اسے ناپسند نہیں کیا۔ یہ امید کی جا سکتی تھی کہ یہ ملاقات مزید کچھ اور ملاقاتوں کا پیش خیمہ بن سکتی تھی۔ اس نے ایک محتاط سی نگاہ اس پر ڈالی۔ وہ بھی اسی کی جانب دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نگاہوں کا مفہوم کچھ میں نہیں آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ابھرنے والے سوال پڑے نہیں جاتے تھے۔ وہ اداسی میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

احمد مراد نے ٹھکانا کر گھلا صاف کیا اور بڑی شائستگی سے بولا۔

”میڈم! میں بہت شکرگزار ہوں۔ کہ آپ نے مجھے شرف ملاقات بخشا ہے۔“

ملازم چائے رکھ گیا۔ وہ اس کے لئے چائے بنانے لگی۔ مراد نے قدرے بے تکلف لہجے میں کہا۔

”میرے لئے کم دودھ کم میٹھی کی خالص چائے بنائیے گا۔“

وہ چینی ڈالتے ہوئے رک گئی۔ ”تم ایسی چائے پیئے ہو۔“ اس کا انداز گھریلو تھا۔

مراد نے اثبات میں سر ہلایا۔

”نہیں۔ ایسی چائے نہ پینا کرو۔ نقصان کرتی ہے۔ ابھی تمہاری عمری کیا ہے۔“

میڈم خوش بخت نے پیالی اس کی طرف بڑھائی۔ ”یہ لو۔ آج سے ایسی چائے پینا

کرو۔ دودھ اور ٹھٹھے کے ساتھ۔ اس کے انگوٹوں میں ایک شفا نڈی تھک چکی۔

مراد نے پیالی اس کے ہاتھ سے لی۔ اور بولا۔ ”میڈم! مجھے آپ کا اس طرح کہنا بہت اچھا لگا ہے۔ آپ کے ”تم“ کہنے میں بڑی اپنائیت ہے۔ مجھے آپ کی یہ شفقت بہت اپنی اپنی سی لگ رہی ہے۔“

”تم ہی تم۔ تم بھی۔ نہ جانے کیوں۔“ اس نے بے ساختہ کچھ کہنا چاہا۔ لیکن بھر خاموش ہو گئی اور اس نے چائے کی پیالی ہونٹوں سے لگا لی۔

احمد مراد نے پیالی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے گھونٹ گھونٹ چائے پیتی رہی۔ پھر چند لمحوں بعد اس نے مراد کی طرف دیکھا۔ وہ اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اس سے نگاہ ملتے ہی بولا۔ ”میں انتظار کر رہا ہوں۔ آپ اپنا خیرہ تو مکمل کیجئے۔“

”کون سا خیرہ؟“ وہ غائب دماغی سے بولی۔

”ابھی جو آپ کہنے والی تھیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے۔ جو آپ کہتے کہتے رک گئی تھیں۔ وہ کبہ ڈالینے کا۔“ مراد نے اصرار کیا۔

اس نے تراشیدہ لبوں کا ایک گوشہ اٹھاتوں تلے دیا۔ اور جیسے موضوع بدلنے کو بولی۔

”چائے پیتے نام۔ فضا کی ہوری ہے۔“

مراد نے چائے کا ایک گھونٹ بھرا۔ ”آپ نے مجھے ٹال دیا ہے۔ پلئے پھر بھی کہیں۔“

اس نے جواب نہیں دیا۔ اور چائے کے ساتھ مختلف لوازمات اسے اصرار سے پیش کرنے لگی۔ کچھ دیر خاموش رہی۔ پھر مراد نے کچھ تھپتھپ سے اعزاز میں تمجید باندھی۔

”میڈم! آپ زندگی کے اس موڑ پر ہیں۔ جہاں آپ کے پاس بہت سے تجربات۔ بہت سے مشاہدات ہیں۔ آپ اسے آئندہ لوگوں تک منتقل نہیں کرنا چاہتیں؟“

وہ بے ساختہ مسکرائی۔ ”تم نے لفظ تو ابھی استعمال کئے ہیں۔ لیکن مطلب وہی ہے۔ تم صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم اپنے پرچے کیلئے کسی دلچسپ موضوع کی تلاش میں ہوں۔“

”پلیز۔ میرا یہ مطلب نہیں۔“ مراد نے کھپا کر جلدی سے کہا۔

”میں تو میں تو صرف یہ چاہ رہا تھا کہ آپ کے بارے میں کچھ جانوں۔ آپ سے کچھ باتیں کروں۔ میں۔ اور سب آپ کے پرستار۔ آپ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ آپ کو پسند کرتے ہیں۔ آپ کے فن کی قدر کرتے ہیں۔“

اس نے گہرا سانس لے کر ہمواری سے سر جھکا۔ اور بڑاری سے کہنے لگی۔ ”میں لوگوں کی محبت کی قدر کرتی ہوں۔ انہیں میرے فن سے ہی سرگرا ہونا چاہیے۔ وہ میری ذات میں تو دل نہ دیں۔ یہ تو کسی کو بھی اچھا نہیں لگتا کہ اس کی ذاتی باتیں موضوع گفتگو بنیں۔ دوسروں کے سامنے آئیں۔“

احمد مراد اس کے اعزاز کی ہلکی دھڑکتی سے گھبرایا۔ اور اپنے لہجے کو موثر بناتے ہوئے بولا۔ ”میڈم! آپ درست کہہ رہی ہیں کہ کوئی بھی یہ پسند نہیں کرتا کہ اس کی ذاتی باتیں دوسروں کے سامنے آئیں۔ لیکن کوئی تو ایسا ہوتا ہے۔ نا جس کے ساتھ انسان اپنے دکھ بانٹتا ہے۔ جس کو وہ اپنے دُغم دکھاتا ہے۔ مجھے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی زندگی میں کوئی شدید المیہ ہے۔ جس نے آپ کو الگ تھلک کر دیا ہے۔ آپ انسانوں سے خوفزدہ ہی ہیں۔ مجھے لگتا ہے۔ جیسے آپ تنہائی اور اکیلے پن کے جزیرے میں گھٹ رہی ہیں۔“

میڈم خوش بخت جو پہلے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔ اس نے آنکھیں زور سے میچ کر اپنا سرموٹے کی پٹ پر ڈال دیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ دھبے دھبے سلگ رہی ہے۔ اندر ہی اندر کچل رہی ہے۔ وہ دانستہ خاموش ہو گیا۔ تو خوش بخت نے آنکھیں کھول کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں۔ لیکن ان میں اداسی و تاسف اور غم غمی بن کر تیر رہے تھے۔

”زندگی تو ہم ہی البیوں کا ہے۔ ہر ایک کی زندگی میں کوئی نہ کوئی المیہ ہوتا ہی ہے۔“ وہ جیسے ہونے سے لہجے میں بولی۔

”لیکن ہر ایک کی زندگی میں۔ کوئی دوست، کوئی اھردار ایسا بھی تو ہوتا ہے جس کے ساتھ بات کر کے اس الیے کا دُغم کو جاتا ہے۔ جو اس الیے کے دکھ کو بانٹ لیتا ہے۔ میڈم! مجھے لگتا ہے۔ جیسے آپ کے پاس تنہائی کے سوا کوئی اور نہیں۔ آپ کے پاس کوئی اھردار۔ کوئی غمگنا نہیں۔“

خوش بخت نچلے ہونٹ کا ایک گوشہ اٹھاتوں تلے دیا۔ اس کی بات سنی رہی۔ نہ جانے کوئی بات اس کے دل پر جا گئی کہ وہ شفاف آنسو اس کی خوبصورت اداس آنکھوں سے بہہ کر اس کے رخساروں پر آ گئے۔ مگر اسے ان کی خبر نہیں ہوئی۔ وہ جیسے کسی سوچ میں ڈوبی ڈوبی سی بولی۔

”میں نے بھی کسی کے سامنے اپنے دکھ کھول کر نہیں رکھے۔ کبھی کسی کو اپنے دُغم نہیں

عورت بتا دیا۔ صرف عورت!! اس نے سر جھکا لیا اور ہونٹ کاٹ کر جیسے اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

احمد مراد کے دل کی دنیا میں دیرانی سی جھاگھی۔ خوش بخت کے وہ سہکتے ہوئے آنسو جنہیں اس نے اپنے رخساروں پر نہیں بہنے دیا تھا۔ احمد مراد کے دل پر گرنے لگے۔ وہ اس کی تسلی کیلئے کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ اس نے لمبے لمبر کا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

وہ آنسوؤں سے سہکتی ہوئی آواز میں بولی: ”میں سگلے سگلے ٹکڑوں میں ڈوبی ہوں۔ انسانوں سے دور رہ رہ کر۔ خود کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش میں مجھ پر کیا کچھ نہیں گزری۔ میرے ماں باپ نے تو بڑے چاؤ سے میرا نام بھاگ بھری رکھا تھا۔ لیکن انہیں۔ کیا خبر تھی۔“

وہ لکھ لکھ اپنی یادوں کو سینے لگی۔ ایک ایک کر کے بھٹکے ہوئے ٹکڑوں کو قریب بلانے لگی۔ وہ پل پل کو ڈھونڈنے لگی۔ وہ لکھ لکھ پھٹنے لگی۔ اس کے دلش چہرے پر قراردادیں براری کی دھوپ چھاؤں ٹھکنے لگی۔ کبھی شفاف آنسو اس کے رخساروں کو بھگو دیتے۔ کبھی وہ سکیوں میں ڈوب جاتی اور کبھی آہوں میں پہننے لگتی۔

احمد مراد کو یوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ کبھی اس ملکوتی مسکراہٹ میں ڈھل جاتا ہے۔ جو بھاگ بھری کے کنارے لیوں پر کھلتی تھی۔ کبھی وہ آنسو بن جاتا ہے۔ جو بخت آور کا مقدر تھے۔ کبھی وہ تعبد کے لیوں کی آہ بن جاتا ہے اور کبھی میڈم خوش بخت کے پرسوز نغمے میں ڈھل جاتا ہے۔

وہ ایک تک اس کی طرف دیکھتا۔ ان سارے مرحلوں میں اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس کا دل احرام سے بھر گیا۔ اس کی آنکھیں عقیدت سے نم ہو گئیں۔ اس نے بہت کچھ کہنا چاہا۔ لیکن ایک لفظ بھی نہیں بولا پایا۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھا اور پوری سچائی سے بولا۔

”میڈم! میں آپ کی بہت کو۔ آپ کے جذبوں کو سلام کرتا ہوں۔ آپ نے ہر قالب میں بھاگ بھری کی روح کو زندہ رکھا ہے۔ اسے مرنے نہیں دیا۔“

وہ ایک آہ سی بھر کر کہنے ہی والی تھی کہ کسی نے دروازے پر دستک دی۔

”آ جاؤ۔“ وہ وہیں بیٹھے قدم سے بیزاری سے بولی۔

اس کا سیکڑی کرے میں داخل ہوا۔ اور اسے کسی ریکارڈنگ کے ہارے میں بتانے لگا۔ احمد مراد بھی اچھی کھڑ ہوا۔

دکھائے۔ لیکن نہ جانے کیوں جی چاہتا ہے کہ تم سے کچھ باتیں کر لوں۔ تم سے کچھ کہہ دوں تو کوئی حرج نہیں ہوگا۔ نہ جانے کیوں؟ پتہ نہیں کیوں؟“

اس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی۔ اس مدہم مدہم سی خودکامی نے مراد کے حساس دل میں غلوں اور بھردی کے سرچشمے کا رخ اس کی جانب پھیر دیا۔ وہ اپنی جگہ پر بیٹھا نہیں رہ سکا۔ اٹھ کر اس کے قریب چلا آیا۔ اور قدرے غم ہو کر بولا۔ ”میڈم! میں اس عزت افزائی کے لئے ممنون ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے اعتماد کو بھی نہیں ٹھکنے دوں گا۔ میں صرف ایک انسان! ایک دوست! ایک بھردی کی طرح آپ کی ہر بات سنوں گا۔ اور یہ باتیں نہ کبھی میری زبان تک نہیں گئیں۔ نہ میرے قلم کی نوک تک۔ مجھ پر اعتبار کریں پلیز۔“

اس کا لہجہ اس کے اندر کی سچائی اور غلوں میں بیگیا ہوا تھا۔

خوش بخت نے نگاہ اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”کمزے کیوں ہو۔ بیٹھا جاؤ نا۔“

مراد اپنی جگہ پر دابھی نہیں بیٹھا۔ بلکہ اس کے صوفے کے نزدیک ہی تائین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔

”اس طرح فرش پر نہ بیٹھو!“ وہ بولی۔

”نہیں جتا! بادلت سہیلی پر غمگین ہیں۔“ وہ بے تکلفی سے کہنے لگا۔ میڈم خوش بخت چند لمحوں کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک دھم خورہ سی مسکراہٹ آئی۔

”تمہاری عمر بہت کم ہے۔ تم میری پری دنیا میں سب کے درمیان رہتے ہو۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ جو تمہارا جاتا ہے۔ اس پر کیا گزرتی ہے۔ جس سے سارے رشتے پلک جھپکتے ہیں جھین لے جاتیں۔ وہ کیسے کیسے عذاب جھیلتا ہے۔“

مراد نے اسے ٹوکا نہیں۔ اس کی باتوں میں کوئی دخل نہیں دیا۔ کوئی سوال نہیں کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے کہہ دے۔ جس طرح کہنا چاہتی ہے۔ اسی طرح کہے۔ وہ خود کچھ بول کر اس کی سوچ کا رخ اس کے کہنے کا انداز اس کے لفظوں کا مفہوم اور سمت نہیں بدلنا چاہتا تھا۔ وہ اس کے مقابل بیٹھی تھی۔ لیکن کہیں بہت دور درک رہی تھی۔

وہ اذیت سے کراہتی ہوئی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”مجھ سے تو دنیا نے سارے ہی رشتے چھین لئے۔ خون کے رشتے! محبت کے رشتے! عزت کے ٹاپے۔ جینے کے ڈھنگ! مرنے کے اختیار۔ انہوں نے میرے پاس کچھ بھی نہیں رہنے دیا۔ انہوں نے مجھے صرف

ریکارڈ کس طرح ضائع ہوا۔ ہمیں اس کی خبر نہیں۔ نہ ہی ہم اس کے ذمہ دار ہیں۔ لیکن بدنامی ہماری مفت میں ہوگی۔“

احمد مراد نے سگرا کر اس کی طرف دیکھا۔ ”جناب آپ کا یہ نیا منہ۔ اگر کچھ لکھے گا بھی۔ تو ان ہی لوگوں کے بارے میں۔ جو اس کے ذمہ دار ہیں۔ آپ پر انشاء اللہ۔ کوئی حرف نہیں آئے گا۔“

جنبلر نے ناگواری سے چیخا پی ریل ڈالے۔ ”مراد صاحب لوگ تو پہلے ہی پولیس کی جان نہیں چھوڑتے۔ اور نگہوں میں بھی بددیوباری ہے قاعدہ گمیاں ہیں۔ لیکن لوگوں کی زبانوں پر بس پولیس کا نام ہی چڑھ گیا ہے۔“

مجاہد کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کی توجہ بٹ گئی۔ احمد مراد نے بھی دروازے کی طرف دیکھا۔ کچھوڑی بالوں اور بے ترتیب داڑھی والا ایک لاغر سا بوڑھا ایک پولیس اہلکار کے ہمراہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا۔

قریب ہی بیٹھا ہوا ایک اور پولیس اہلکار بولا۔ ”یہ جناب بڑی بچی ہوئی چیز ہے۔ سارے قیدی اسے جراتے ہیں۔“

”بہت خوب!“ مجاہد نے دنگی سے کہا۔

”اور یہ خود کیا کہتا ہے۔ کہ واقعی یہ جبر ہے۔“ احمد مراد نے پوچھا۔

”آپ خود بات کر دیکھ لیں کہ جبر ہے یا دبیے کی کوئی چکر چلا رہا ہے۔“ اس نے آکھ سے اس کی طرف اشارہ کیا۔

تب تک وہ قریب آچکا تھا۔ مجاہد نے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

”آؤ۔ آؤ۔ باا بیٹھو۔“

اس نے حجت سے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں پر نگاہ ڈالی۔ پھر کرسی کی طرف دیکھا۔ کچھ حذب ہوا۔ لیکن پھر وہ زین پر بیٹھنے کیلئے جھکا۔

”نہیں۔ نہیں بابا۔ کرسی پر بیٹھو۔“ احمد مراد نے بے ساختہ کہا۔ اسے اس پریشان حال بوڑھے کو دیکھ کر انفسوس سا ہو رہا تھا جس کی شاید ساری عمر جیل کی ان سنگین دیواروں کی نذر ہو گئی تھی۔

اس نے سوالیہ نگاہ سے یوں اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کی بات سمجھ میں نہ آئی ہو یا جیسے اس کی بات پر یقین نہ کرنا چاہتا ہو۔

”اچھا میڈم۔ مجھے بھی اجازت دیجئے۔“ سیکرٹری باہر نکل گیا تو اس نے کہا۔ وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے پھر بڑی اہانت سے اس کے سر پر یوں ہاتھ پھیرا۔ جیسے اس کی کوئی بزرگ ہو۔ اور مشتاق سے لہجے میں بولی۔

”تم بہت اپنے اپنے سے لگتے ہو۔ تمہاری صورت۔“ اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر چپ ہو کر اپنی بات کو احوال ہی رہنے دیا۔

”مٹی کھسے! کیا ہے میری صورت کو؟“ احمد مراد نے مزاحیہ لہجے میں کہا۔

”بہت اچھی ہے۔“ وہ محبت سے اس کا رخسار چمکھڑی بولی۔

”شکریہ۔۔۔ شکریہ!“ مراد نے شرارت سے آداب کیا اور چلتے چلتے بولا۔

”اگر آپ اجازت دیں۔ تو میں کبھی بھی حاضر ہو جایا کروں۔“

”ہاں۔ ہاں۔ ضرور۔ کیوں نہیں۔“ وہ خوش دلی سے بولی۔ مراد اسے خدا حافظ کہتے ہوئے باہر نکل آیا۔

○ ○ ○ ○ ○

احمد مراد اپنے وکیل دوست کے ساتھ جیل آیا تھا۔ اس کا یہ دوست انسانی حقوق کی ایک تنظیم کا بانی تھا۔ وہ ایسے قیدیوں کی تلاش میں رہتا تھا۔ جو کسی وجہ سے بے قصور۔ بے جرم کسی مقدمے میں پھنس گئے تھے اور وکالت نہ ہونے کی وجہ سے جیل کی سلاخوں کے پیچھے تارکدہ گناہوں کی سزا بھگت رہے تھے۔

احمد مراد بھی اپنے پرچے میں ایسے لوگوں کے بارے میں لکھتا رہتا تھا۔ جو اس کے دوست کی کوششوں سے آزادی کی فضا میں سانس لینے کے قابل ہوئے تھے۔ جنبلر شاید ان کے ساتھ کچھ زیادہ اچھی طرح سے پیش نہ آتا۔ لیکن اس کا دوست اوپر سے کوئی پیغام لایا تھا۔ اسی لئے وہ ان کے ساتھ بڑے اخلاق سے پیش آ رہا تھا۔ اس نے انہیں چاہنے بھی پلائی۔ اپنے عملے سے معلوم کر کے اس نے بتایا کہ اس جیل میں بھی ایک ایسا قیدی تھا۔ جو ایک عرصے سے سزا کاٹ رہا تھا۔ لیکن اس کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں تھا کہ وہ کس جرم میں گرفتار ہوا تھا۔ اس سے کبھی کوئی نہیں نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کسی نے اس کے بارے میں جاننے کی کوشش کی تھی۔

”آپ اس سے ملاقات کرو تو راجح ہے۔“ اس کے وکیل دوست مجاہد نے کہا۔

”لیکن مجاہد صاحب یہ خیال رہے کہ آپ کے پیچھے احمد مراد اپنے پرچے میں انسانی ہمدردی کا ڈھونڈورا پیٹ کر خواہواہ پولیس کو بدنام نہ کریں۔ یہ مجرم پہنچ نہیں کون ہے۔ اس کا

بہت سارے قیدیوں کے مقدمے لڑ چکے ہیں۔ جو بے گناہ جیلوں میں بند ہیں اور ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ ”احمد مراد نے اس کی حوصلہ افزائی کیلئے کہا۔ اس نے ایک نگاہ سارے چہرہ پر ڈالی۔ جو کمرے میں موجود تھے اور زبردستی بولا۔

”بیٹا! کیا رہائی اور کیا قید؟!! اب تو سب کچھ برابر ہے تم تکلیف نہ کرو۔ میں یہاں آرام سے ہوں۔ خوش ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں ہے یہاں مجھے۔ میں یہاں دنیا والوں سے بچا ہوا ہوں۔ میں باہر جا کر کیا کرونگا۔ میں نے باہر جا کر کیا کرتا ہے۔“

احمد مراد افسوس سا ہوا۔ یوں عاقل جیل کی چار دیواری کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اب اس سے نکلنا اسے عذاب سا لگ رہا تھا۔ اس نے جلدی سے اس کی تسلی کیلئے کہا۔

”نہیں باباجی! آزادی آپ کا حق ہے۔ آپ کو ہم یہاں سے باہر نکالیں گے۔ آپ باہر آئیں گے تو دنیا آپ کو کچھ بھی لگے گی۔“

”نہ بیٹا! نہ تم تکلیف نہ کرو۔ میں یہاں بالکل ٹھیک ہوں۔ بڑا آرام ہے مجھے۔ زیادہ مگر مٹی۔ تمہاری رہ گئی ہے۔ باہر جا کر کیا کرتا ہے۔ تمہاری بڑی مہربانی۔“ وہ اپنی جگہ سے پھر ایک مرتبہ اٹھ کھڑا ہوا۔ دور کمرے سے ہونے پولیس اہلکار نے اپنے سر کے قریب انگلی تھما کر اشارہ کیا کہ اس کا داغ خراب ہے۔ جیلر نے اپنی ہات دار آواز میں کہا۔

”کیوں کیا تم رہا نہیں ہوتا چاہے۔“ اس نے پھر کچھ بہم سے اشارے کئے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا۔ اور پاؤں گھسیٹتا ہوا دروازے کی طرف چل پڑا۔

”او باباجی! بات سنو ان کی بندہ کہ۔“ پولیس اہلکار نے دشتی سے اسے رک جانے کو کہا۔

لیکن مجاہد نے اشارے سے منع کر دیا۔ اور جیلر سے بولا۔

”بابا! کچھ پریشان ہے۔ تمہارے دنوں بعد اس سے پھر کپ شپ کریں گے۔ تب تک آپ ذرا اور اس کے ریکارڈ کو تلاش کروالیں گے۔ میں بھی کوشش کروں گا۔“

”بس جی ملک کے سیاسی حالات خراب رہتے ہیں۔ اور ادھر کی اکھاڑ بچھاڑ۔ فرانسفر ہیں۔ چالوے۔ بس اس سارے جکڑوں میں کوئی نہ کوئی گھملا بھی ہو جاتا ہے۔ ویسے آپ اطمینان رکھیں۔ ہم آپ کے ساتھ تعاون کریں گے۔“ وہ پیشہ ورانہ خوش اخلاقی سے کہنے لگا۔

”ہاں۔ ہاں بابا۔ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ۔“ جیلر نے بھی کہا۔
”او بیٹھو بزرگو۔ بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔ دیکھتے کیا ہو؟“ ایک دوسرا پولیس والا بولا۔
وہ کچھ ہچکچا۔ اور ذرا اکھڑے ہوئے سے انداز میں کرسی پر یوں بیٹھ گیا۔ جیسے ابھی اٹھ کر چل دے گا۔

”کیا نام ہے باباجی آپ کا۔“ مجاہد نے پوچھا۔
اس نے سر کو ایک بے معنی سی جنبش دی۔ اور یوں خاموش رہا۔ جیسے اس کی بات ہی نہ سمجھا ہو۔ مجاہد نے کچھ دیر اس کے جواب کا انتظار کیا۔ پھر اس نے اپنا سوال دوبارہ کیا۔
”باباجی۔ آپ کا نام پوچھا ہے۔“

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور پولیس والوں کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ان سے ہی پوچھ لو۔ انہیں سب کچھ پتہ ہے۔“

مجاہد نے احمد مراد کی طرف دیکھا۔ احمد مراد نے اسے مخاطب کیا۔ ”باباجی! آپ کے ریکارڈ کی فائل کم ہو گئی ہے۔ کچھ آپ کو یاد ہے کہ آپ کو کس جرم کی سزا ہوئی تھی اور کتنی؟“
بوڑھے نے لاپٹی کا اشارہ کیا اور ہارے ہوئے سے لہجے میں بولا۔

”بیٹا! سب کچھ انہیں ہی پتہ ہے۔ جنہوں نے مجھے سلاخوں میں بند کر رکھا ہے۔ مجھ سے کیا پوچھتا ہے۔ ان سے ہی پوچھ لے۔ مجھے کیا پتہ ہے۔ میں تو کچھ نہیں جانتا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”باباجی! آپ کا کوئی گھریبا۔ کوئی عزیز رشتہ دار۔ کسی کا کوئی پتہ“ مجاہد نے موضوع بدلا۔

اس کا چہرہ خنجر سا ہو گیا۔ اس نے مایوسی سے سر ہلایا اور اٹھتے ہوئے بولا۔
”کیا گھریبا؟ کیا عزیز رشتہ دار؟ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔ کوئی کسی کا نہیں۔“ وہ بے خیالی میں کہتا ہوا۔ چلنے لگا۔

”باباجی۔ غم نہ تو سہی نا۔“ مجاہد نے اس کو روکا۔
”او بابا۔ بیٹھ جا۔ بیٹھ جا۔“ پولیس اہلکار نے اپنے مخصوص اکھڑ لہجے میں اسے بیٹھنے کیلئے کہا۔ ”یہ تیرے بھلے کی بات ہی کر رہے ہیں۔“

”میرا بھلا ہی بھلا ہے۔“ وہ بیزار سی کہہ کر پھر اکتایا ہوا سا بیٹھ رہا۔
”باباجی! یہ بہت بڑے وکیل ہیں۔ یہ آپ کو رہائی دلوائیں گے۔ یہ پہلے ہی ایسے

عجائب اور احمد مراد دونوں اسے خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئے۔ دونوں برآمدے کی سڑکیاں اتر رہے تھے کہ ایک پولیس والے سے سامنا ہو گیا۔ وہ ان کی طرف دیکھ کر سسکا یا اور بولا۔

”سربئی! آپ جس بابے کے پیچھے لگے ہوئے ہیں نا۔ وہ بڑا پہنچا ہوا ہے۔“

عجائب ہنسا۔ ”اتنا پہنچا ہوا ہے کہ جیل ہی پہنچ گیا ہے۔“

”نہیں جی! بڑا اثر ہے اس کی بات میں۔ جو کہہ دے وہ ہو جاتا ہے۔ بڑی دعائیں قبول ہوتی ہیں اس کی۔“

”تو پھر اپنی رہائی کی دعا کیوں نہیں کرتا۔ پتہ نہیں کب سے جیل میں پڑا سڑ رہا ہے۔“ عجائب نے اس مذاق اڑایا۔

”آپ بھی بھولے بادشاہ ہیں۔“ اس نے سر جھکا تھوڑا قریب ہو کر بڑی رازداری سے بولا۔ ”آپ کو کیا پتہ۔ ایسے اللہ والے تو آپ خلقت سے دور بھاگتے ہیں۔ بابا جی نے بھی یہاں جیل میں ڈیرہ بنالیا ہے۔ بس اپنی دنیا میں مست رہتے ہیں۔“

”کبھی تمہاری کوئی آرزو بھی پوری ہوئی ہے۔“ احمد مراد نے پوچھا۔

”ہاں۔ ہاں جی۔ چار بیٹیوں کے بعد اللہ نے بیٹا دیا ہے۔ بابا جی کی دعا سے۔“ وہ بڑی عقیدت سے بولا۔

عجائب پھر کوئی شرات آمیز فقرہ کہنے لگا تھا کہ احمد مراد نے اسے روک دیا۔ اس پولیس اہلکار سے پھر آنے کا کہہ کر وہ عجائب کے ہمراہ باہر نکل آیا۔

دونوں باہر سڑک پہ آئے تو اس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ دونوں نے تجویز کر لیا تھا کہ وہ ضرور اس بوڑھے کو رہائی دلوا دیں گے۔ وہ کچھ دیر چلے گئے۔ گاڑی جھلکے لیتے لگی۔

”اوئے۔ بابا جی نے تو ابھی سے کارروائی ڈال دی۔“ عجائب ہنستے ہوئے بولا۔ مراد کو بھی ہنسی آگئی۔ ”اس کا مطلب ہے۔ پڑوں میں کچرا بھائی ہی ڈالتے ہیں۔“

”بھئی۔ ہم نے جوان کی شان میں گستاخیاں کی ہیں۔ کیا پتہ وہ ہماری خبر لینے کے موڈ میں ہی آگئے ہوں۔“ عجائب گاڑی کوٹ پاتھ کے ساتھ لگا ہوا بولا۔

دونوں گاڑی سے باہر آئے۔ عجائب اس کی ٹھوکا ٹھاکیں لگ رہے تھے۔

”یار! ہمارے حال پر دم کیا کرو۔ اس شاہی سواری میں ہمیں نہ بٹھایا کرو۔“ مراد نے

اسے جھجرا۔

”ابھی ٹھیک ہو جاتی ہے۔ بلکہ دیکھتا ہوں کہ ٹھیک کیسے نہیں ہوتی۔“ عجائب اس کے پڑوں میں جھانکتا ہوا بولا۔ لیکن اس کی درنگی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔

مراد بھی اسکا قریب آ گیا۔ اور اپنی جانب سے بھی کچھ شور مچا دینے لگا۔

اچانک ان کے قریب گاڑی کا پارن بجنا۔ دونوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پڑوں والی ایک لمبی کلا گاڑی دو درری کھڑی تھی۔ تھوڑا سا درہا اور ایک پتھر سے بھرا عجائب۔ احمد مراد تیزی سے اس جانب بڑھا اور اس نے خوشی کے لیے کھینچا۔

”میڈم خوش بخت آپ؟“ تب تک عجائب بھی ہاتھ جھٹا تو ہوا قریب آ گیا۔

”یار! یہ میڈم خوش بخت ہیں۔“ عجائب نے اشتیاق سے کہا۔ اور پھر احمد مراد سے بولا۔ ”یار! ہمارا بھی تعارف کروادو۔“

”میڈم! یہ میرا بہت اچھا دوستوڑا سا خبیث دوست عجائب ہے۔“

”خبیث کیوں؟“ خوش بخت نے ہنس کر پوچھا۔

”اس لئے کہ اس کا دوست ہوں۔“ مراد کے بولنے سے پہلے عجائب بول اٹھا۔

”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“

”اس کا چھٹکا۔ خراب ہو گیا ہے اور اب ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہا۔“ احمد مراد نے برا سامنا بنا کر کہا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ۔ میں چھوڑ دیتی ہوں۔“ اس نے خوش اخلاقی سے کہا۔

”اسے یہیں بند کرو۔“

احمد مراد نے عجائب کی طرف دیکھا۔ ”کیا خیال ہے؟“

”بہت نیک خیال ہے۔ ایسی حسین چٹیکیں کو کون کافر ٹھہرا سکتا ہے۔“ عجائب نے فوراً کہا۔

”تو پھر اس کو بند کرو۔“ احمد مراد نے فوراً کہا۔

عجائب جب تک گاڑی بند کر کے آئے۔ احمد مراد گاڑی میں بیٹھ چکا تھا۔ وہ بھی پچھلا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا۔ تو خوش بخت نے استفسار کیا۔ ”کہاں جا رہے ہیں آپ لوگ؟“

”یہیں دفتر تک چھوڑ دیں۔“ احمد مراد نے بتایا۔

”اوست کہاں سے آرہے تھے؟“ اس نے شاید یونہی بات کرنے کو پوچھ لیا۔

”جیل سے۔“ احمد مراد نے بتایا۔

”جیل سے؟“ میڈم خوش بخت نے تعجب سے دوہرایا۔ ”کیوں خیریت تو تھی۔“ یہ

آج کل کوئی سرگرمیاں شروع کر دی ہیں تم نے۔“

”کیا تباؤں میڈم! یہ تو بالکل بائیسوں سے نکل گیا ہے۔ ابھی ابھی اس کی ضمانت کروا

کر لیا ہوں۔“ مجاہد نے شرارت سے کہا۔

”ارے کیا واقعی؟“ میڈم خوش بخت نے ہنس کر پوچھا۔

مراد جہا۔ ”میڈم! میں نے تو آپ کو شروع میں ہی بتا دیا تھا کہ یہ میرا دوست تھوڑا

سا خبیث بھی ہے۔“

”مجھ اب چاہے۔“ خبیث کو کیا کچھ اور ہم نے تو تمہاری ضمانت کرا دی ہے۔“ مجاہد

بدستور شرارت کے موڑ میں تھا۔

احمد مراد نے موضوع بدلا۔ ”دراصل میڈم! یہ مجاہد انسانی حقوق کی ایک تنظیم کا کرتا

دھرتا ہے۔ یہ لوگ ایسے بے سہارا اور لاوارث قیدیوں کو قانونی امداد فراہم کرتے ہیں جو کسی

غلط فہمی کی وجہ سے جیل گئے اور اس کے بعد کسی نے ان کی خبر ہی نہیں لی۔ اور وہ پچارے مفت

کی قید بھگتتے رہے۔“

”اوہو!“ میڈم خوش بخت نے حیرت آمیز تا مسف سے کہا۔ ”یہ تو بڑی زیادتی والی

بات ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتی کہ اس طرح بھی ہوتا ہے۔“

”اس طرح ہوتا ہی نہیں۔ اس طرح ہو رہا ہے۔ ابھی ابھی ہم جس قیدی سے مل کر آ

رہے ہیں۔ اس کی تو شاید ساری عمری جیل میں گزر گئی ہے اور تمہانے میں نہ اس کا ریکارڈ

ہے۔ نہ کوئی اور خاص تفصیل۔“ مجاہد نے بتایا۔

”اچھا۔ کمال ہے۔“ میڈم نے حیرت سے کہا۔ ”اور وہ قیدی خود کیا بتاتا ہے۔“

”اس پچارے کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں رہا۔ کچھ بولتا ہی نہیں۔“ اور مزے کی بات یہ

ہے کہ وہاں قیدیوں نے اسے پتہ مشہور کر دیا ہے۔“

”اور وہ بھی بڑا پہنچا ہوا ہے۔ کہتے ہیں۔ اس کی سب دعائیں قبول ہوتی ہیں۔“

”یہ تو تم لوگ مجھے بہت عجیب عجیب باتیں سنارہے ہو۔“ میڈم نے کہا۔

”ذرا اس کی رہائی ہو جائے تا۔ تو ہم آپ کو اس سے ملوانیں گے۔“

”نہ بابا! میں کسی سے نہیں ملتی دیتی۔ ہاں کوئی مالی امداد وغیرہ چاہے ہوگی تو مجھے

بتائیے گا۔“

”نہیں۔ نہیں میڈم! آپ گھبرا کیس نہیں۔“ مجاہد نے ہنس کر کہا۔

”میں نے تو اس لئے کہا تھا کہ آپ نے کوئی منت وغیرہ پوری کر دانی ہو۔

تو اس بابے سے کہہ دیجئے گا۔“

”نہیں بھئی۔ مجھے تو معاف ہی رکھو۔“

تب تک ان کا دفتر نزدیک آ گیا تھا۔ احمد مراد نے اسے رکنے کیلئے کہا اور دروازہ

کھولتے ہوئے بولا۔

میڈم آئیے نا۔ کچھ چائے وغیرہ پیجئے بلایز۔“

”شکریہ۔“ وہ مسکرا کر بولی۔

”تم کسی میرے یہاں آنا۔ تو مل کر چائے پئیں گے۔“

”مجھے بھی اجازت ہے میڈم۔“ مجاہد چپ نہیں رہ سکا۔

”پہلے آپ بھی تشریف لے آئیے گا۔“ احمد مراد نے اپنا کار چھوٹے ہوئے بن کر

کہا۔

اچھا بھئی۔ میں چلتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”فدا حافظ میڈم۔“ دونوں نے ایک ساتھ کہا اور وہ آگے بڑھ گئی۔

چند روز میں گزرے تھے کہ وہ میڈم خوش بخت کے یہاں جا دھکے۔ چوکیدار مراد کو

پچاننے لگا تھا۔ اس لئے اس نے کوئی تعرض نہیں کیا۔ بلکہ دو باشت زبان باہر نکالے ہوئے

کبرے جتنے مونے نازے خوشخوار کئے کو بھی اس نے ایک طرف بھگا دیا اور ان دونوں کو

ڈرائنگ روم میں لا بٹھایا۔

مجاہد نے چاروں طرف ایک سناٹکی نگاہ ڈالی۔ ”واہ بھئی۔ میڈم کا ذوق تو کافی عمدہ

معلوم ہوتا ہے۔“

”وہ خود کوئی کم عمدہ ہیں۔ جیسی اچھی شخصیت کی مالک ہیں۔ دیکھا اچھا ان کا ذوق

ہے۔“ احمد مراد یادوں پر لگی ہوئی پینٹنگز کو دیکھتے ہوئے بولا۔

پردہ ہٹا اور میڈم خوش بخت کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہمراہ ایک دلا دیز مہک

بھی چلی آئی۔ سادہ سے رنگی جوتے میں وہ بے حد پردہ کار اور پرکشش معلوم ہو رہی تھی۔ وہ

دووں جلدی سے ٹھک کر تھکنا اس کے سامنے غم ہوئے۔ وہ خوش دلی سے بولی۔
”آپ لوگ کیسے ہیں؟“

”خدا کا شکر ہے۔“ دووں نے ایک ساتھ بڑی قیصر سے کہا۔

”چنیئے۔“ وہ ایک نفست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ مجاہد نے فوراً ہی سلسلہ کلام جوڑا۔ ”میڈم! آپ یقین کریں کہ میں آپ کی آواز کا زبردست پرستار ہوں۔ میری کار میں ہر وقت آپ کی کیست رہتی ہے۔ میں اپنے دفتر میں بھی جب کبھی کام کرتے کرتے بہت تھک جاتا ہوں۔ تو دم دم آواز میں آپ کا غور سنتا ہوں۔ تو بڑی تسکین ہوتی ہے۔ میں تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ سے یوں آسانی سے ملاقات ہو جائے گی اور اس طرح آپ کو رو رو دیکھوں گا۔“

”شکریہ!“ اس نے اتنی لمبی تقریر کے جواب میں بس ایک لفظ ہی کہا اور احمد مراد سے بولی۔

”تم بہت دنوں بعد آئے ہو۔ خیریت تو تھی؟“

”آج بھی میں اس کو کمپیٹ کر لایا ہوں۔ ورنہ یہ تو اپنی معروفیت کا روٹا ہوتا ہی رہتا ہے۔“ اس کے بجائے مجاہد نے بات بکڑ لی۔

”کیوں مراد! ایسی ہی بات ہے؟“ وہ بزرگ نہ نرمش کے اعزاز میں بولی۔

”اب تو اقرار کرنا ہی پڑے گا میڈم کہ ایسی ہی بات ہے۔“ مراد نے ہنسنے ہوئے کہا۔

”لیکن اصل میں بات یہ ہے کہ میں آپ کے پاس کسی کام سے نہیں آتا جاتا تھا۔ میں تو جب بھی آتا۔ بس آپ سے ملنے۔ آپ کی اچھی اچھی باتیں سننے۔ اور آپ کے ہاتھ کی بہت اچھی سی چائے پینے۔ مگر یہ شخص۔ جب تک اسے کام نہ ہو۔ کہیں جاتا ہی نہیں۔“

”ایسا کیا کام آ پڑا ہے مجاہد صاحب!“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔
”مجاہد بڑ بڑایا۔“ ”اوہو ہو۔ میڈم۔ اس نے تو میری ساری ساکھ ہی خراب کر کے رکھ دی ہے۔ اب میں کیا کہوں؟“

”آپ اپنا سامنے لے کر رہ جائیں۔“ مراد نے لقمہ دیا۔

”نہیں۔ میں غلطیں جھانکوں گا۔“ مجاہد بے ساختہ بولا۔ تو میڈم خوش بخت کے مونوں پر بھی مسکراہٹ آگئی۔

ملازم چائے لے آیا۔ تو میڈم خوش بخت چائے پانے لگی۔ وہ پیاپی مجاہد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”ہاں۔ مجاہد صاحب فرمائیے۔ کیا کام ہے آپ کو؟“

”اف! اس نے مراد سامنے بتایا۔“ اس نامعقول شخص نے مجھے کس قدر بدنام کر دیا ہے۔ تو یہ! تو یہ!“

”اب چاہے تم تو یہ کر دیا کچھ۔ میڈم کو اصل بات تو یہ چل ہی گئی ہے۔ اس لئے زیادہ بونٹیں اور اصل مطلب کی طرف آ جاؤ۔“ مراد نے کہا۔

”میڈم بات یہ ہے۔“ وہ سیدھا ہوا بیٹھا اور بیچیدگی سے بولا۔ ”کہ اس روز میں نے اس قیدی کی آپ سے بات کی تھی نا۔ جس کی ساری عمر تھیں میں گزر گئی ہے۔ ہماری تنظیم کی کوششوں سے وہ عفریہ رہا ہونے والا ہے۔“

”بہت خوب! یہ تو آپ بڑی نیکی کا کام کر رہے ہیں۔“ میڈم خوش بخت نے ستائشی اعزاز میں کہا۔

”شکریہ میڈم!“ وہ بولا۔

”ہم اس طرح کے لوگوں کیلئے دوبارہ معاشرے میں باعزت زندگی گزارنے کا انتظام بھی کرتے ہیں تاکہ وہ خود کو گھمرائے ہوئے نہ سمجھیں اور ایک نارمل زندگی گزارنے کے قابل ہو سکیں۔ وہ شخص کافی عمر بیدہ ہے۔ کہیں کوئی مزدوری یا سخت کام تو نہیں کر سکتا۔ ہمیں آپ سے معلوم کرنا تھا کہ آپ کے یہاں اسے کوئی کام مل سکتا ہے؟ ماشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دیا ہے۔ آپ اسے کسی طرح اپنے یہاں ایڈجسٹ کر سکتی ہیں؟“

خوش بخت کچھ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر قدرے ہنس دیش کے اعزاز میں بولی۔

”مجاہد صاحب! میں یہاں ایکی رشتی ہوں۔ میرے تمام ملازم اعتبار کے لوگ ہیں۔ میں کسی انجینی کو اپنے یہاں رکھ نہیں سکتی ہوں۔ میں نے اس روز بھی آپ سے کہا تھا کہ میں آپ کے ساتھ مالی تعاون کر سکتی ہوں۔ اس شخص کو بھی مالی امداد کی ضرورت ہے تو میں کرنے کو تیار ہوں۔“

احمد مراد نے بھی سر ہلایا۔ ”ہاں! یار! میڈم کتنی تو ٹھیک ہیں۔ ابھی ہمیں اس شخص کے بارے میں کچھ زیادہ معلومات تو ہیں نہیں۔“

”جیل والے بتاتے ہیں کہ اس کا چال چلن بہت اچھا ہے۔“ مجاہد نے کہا۔
”لیکن میڈم بھی ٹھیک کہتی ہیں۔ میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا۔“

”میں آپ کو ایک چپک دے دوں گی۔ آپ اس کو کوئی چھوٹا موٹا کاروبار کروادیتے گا۔ کہیں کوئی دکان یا کھوکھا لے دیجئے گا۔“ وہ اٹھتے ہوئی بولی اور پردہ اٹھا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

”چلو یار! ان کی طرف سے یہ تعاون بھی بہت ہے۔“ مجاہد نے پر خیال لہجے میں کہا۔
”میں اس بابے کا کچھ اور انتظام کرتا ہوں۔“

میرا خیال ہے کہ کچھ روز اسے سے سہارا پوڑھوں کے اداروں میں رکھا جائے۔ کوئی اور انتظام ہو گیا تو بہتر ہے۔ ورنہ اس کے لئے جیل سے تو بہتر ہی ماحول ہوگا۔“ مراد بولا۔
”یہ خوش بخت کمرے میں آئی اور ایک چپک مجاہد کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔
”یہ لیجئے مجاہد صاحب! یہ میری طرف سے تموزی سی امداد ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس سے زیادہ آپ کے لئے نہیں کر سکتی۔ آپ میری مجبوریوں کو سمجھتے ہیں نا۔“
مجاہد غلبت میں بیٹائی رکھ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور چپک لے کر بڑے ادب سے خم ہوا۔
”نہیں۔ نہیں۔ میڈم۔ یہ جو کچھ آپ کر رہی ہیں۔ ہماری تحظیم کے لئے بڑی حوصلہ افزائی کا باعث ہے۔ وہ میری غلطی تھی کہ میں نے آپ سے اس طرح کی درخواست کر دی۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ آپ قانون ہیں اور تمہارا دہی ہیں۔“
”چھوٹا کوئی بات نہیں۔ آپ بیٹھئے۔“ وہ خوش اخلاقی سے کہنے لگی۔

کچھ دیر اور ادھر کی باتیں ہوئیں۔ پھر دونوں چلے کیلئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ میڈم خوش بخت نے مراد کی طرف دیکھا اور اپنا نیت سے بولی۔

”تم بھی کبھی آ جا کر دو۔ اور آپ بھی مجاہد صاحب!“

مجاہد ہنسا۔ ”اصل دعوت تو اسی کو مل رہی ہے نا میڈم!“

”نہیں۔ آپ بھی جب چاہیں تعریف لائیں۔“ وہ واضح لہجے میں بولی۔

”میڈم! میں کسی روز آپ کو اپنے گھر لے جاؤں گا۔ اپنی اسی سے ملوانے۔ آپ ان سے مل کر خوش ہوں گی۔ وہ بھی آپ کی پرستار ہیں۔ آپ کے بہت سے نفعے ان کے پاس ہیں۔“ اُمر مراد نے اشتیاق سے کہا۔ میڈم خوش بخت نے بڑی شفقت سے اس کے بال چھوئے۔ ”اچھا۔ کسی روز دیکھیں گے۔“

جتنی ہوئی طویل شاہراہ تھی اور وہ تنہا۔ لوگوں کا ہجوم تھا اور وہ اکیلا۔ اجنبی نگاہوں سے گرو ویش کو دیکھتا ہوا۔ منجیل سنسٹل کر سانس لیتا۔ اکھڑے ہوئے قدم رکھتا۔ ڈر ڈر کر آگے بڑھ رہا تھا۔ نہ کوئی منزل تھی۔ نہ نشان منزل۔ نہ راستے کی خبر تھی۔ نہ چلنے کی سکت۔ زمین پر اس کے پاؤں نہیں جمتے تھے۔ نگاہ کہیں نہیں ٹھہرتی تھی۔ ہر شے دھندلی اور بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔

جیل کی سنگین دیواروں کے درمیان رچے ہوئے اس نے باہر کی دنیا کو یکسر فراموش کر دیا تھا۔ اس نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اسے یہیں مرکب جانا ہے۔ باہر کی آزاد دنیا سے اس کا کوئی تعلق یا واسطہ نہیں رہا۔ اسے باہر کی دنیا میں جانے کی آرزو بھی نہیں رہی تھی۔ جس میں سانس لیتا۔ جیل میں سانس لینے سے زیادہ اذیت تاک تھا۔

لیکن آج چاٹک سی اسے رہائی کا پیغام مل گیا تھا۔ اس نے ان دونوں جوانوں کو جیل میں آتا جاتا اور اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تھا مگر اس کو اس کی توقع نہیں تھی کہ واقعی جیل کا یہ مضبوط دروازہ کھل جائے گا۔ اسے وہ کہہ کر مگنے تھے کہ وہ دونوں خدا سے لینے آئیں گے۔ مگر نہ جانے کیوں وہ خود نہیں آئے تھے اور جیل والوں نے اسے ایک روز پہلے ہی رہا کر دیا تھا۔ حالانکہ اب اسے رہائی کی کوئی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو مگن گن کر زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

وہ ہمیری جوانی کے سارے رنگین دن جیل کی سنگین دیواروں کے درمیان گزرا آیا تھا۔ جوانی کے سب دلوں کے شباہ کے تمام رنگین خواب اور زندگی کے دھنک رنگ دن اس متعفن ماحول کی نذر کر آیا تھا۔ اب تو اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ زندگی کے دامن میں اس کے لئے کوئی سوغات نہیں رہی تھی۔ وقت کے چمن میں کھلنے والے پھولوں میں سے کوئی پھول اس کے لئے نہیں تھا۔

ہر طرف اجنبیت تھی۔ کوئی شناسا چہرہ نظر نہیں آتا تھا۔ نہ اسے کوئی جانتا تھا۔ نہ وہ کسی کو جانتا تھا۔ وہ یکہ دہن ہے ارادہ چلا جاتا تھا۔ اس نے کچھ بھی نہیں سوچا تھا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا۔ کہ اسے زندگی کا آغاز کہاں سے کرتا ہے۔ اسے کس سمت چلنا ہے۔ اور کس طرف جانا ہے۔

سب کچھ بدل گیا تھا۔ سننے راستے، سننے چہرے، سننے لباس۔ فرائے بھرتی کاڑیاں، ٹریفک کا جھجھم۔ لوگوں کی آبادی، شور و غوغا۔ سب کچھ نیا نیا اور آسما دینے والا تھا۔ جیل کی فصاحتیں وہ مخصوص آوازیں سننے کا عادی ہو چکا تھا۔ یہ شور یہ ہنگامہ اسے بہت اوپر اوپر اڑا رہا تھا۔

اچانک وہ ٹھٹک گیا۔ اسے گرد و پیش کچھ جانتا پہچانتا سا لگا۔ جلی بھی کچھ مانوس تھی۔ لیکن مکانوں کے دروازے بدلے بدلے سے تھے۔ اس نے پھر غور سے چاروں طرف دیکھا کہ یہ کہیں اس کی نظر کا ہوکا تو نہیں۔ ہر طرف کچھ تبدیلی تو تھی۔ لیکن پھر بھی ماضی کے کچھ لمحے کہیں نہیں سے جھانک رہے تھے۔ وہ بھی یہاں سے گزرا تھا۔ شاید یہاں غمرا بھی تھا۔ اس جگہ اس کی کوئی نہ کوئی وابستگی ضرور رہی تھی۔ کہ وہ سب کچھ فراموش کر کے بھی اس جگہ کو نہیں بھولا تھا۔ اور بلا ارادہ ہی اس طرف نکل آیا تھا۔

اس کے پاؤں آپ سے آپ ایک دروازے کی جانب اٹھ رہے تھے۔ اس دروازے کی دلیز اس کی پہچانی ہوئی تھی۔ وہ تھذیب سا دوہیں رک گیا۔ کچھ گھبرایا ہوا سا۔ خوفزدہ خوفزدہ ڈر ڈر کر یہ سوچتا ہوا کہ وہ ماضی کے ان درجوں پر دستک دے یا نہ دے؟

نہ جانے کیا جواب ملے؟
نہ معلوم دروازہ کھلے۔ نہ کھلے؟
نہ جانے دروازے کے پیچھے کیا ہو؟

وہ کچھ دیر یوںی تھذیب سا کھڑا رہا۔ پھر اس نے اپنی ہمتوں کو سنبھال لیا اور دروازے پر ایک دہلی دلی کی محتاط دستک دی۔ اس کا رواں رواں انتظار کی کیفیت میں سنگ اٹھا۔ کہ نہ جانے اسے دستک کا کیا جواب آئے گا۔

تھوڑے انتظار کے بعد اس نے پھر ایک بار دروازہ کھٹکھٹایا۔
جواب میں کوئی پکارا۔ کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ وہ صاف طور پر نہیں سن سکا۔ لیکن اس شیریں آواز کی ٹھٹک نے اسے زندہ کر دیا۔ چٹائی کی ایک اچھائی کیفیت میں وہ یہ بھی بھول

گیا۔ کہ یہاں تک آنے میں وہ کتنا کچھ کھو آ یا ہے۔

دروازہ کھلا۔ اس نے مشتاق آنکھوں سے دیکھا۔ بھول ایسا ہفتہ چہرہ اس کی بنیادی آنکھوں کو یکبارگی سیراب کر گیا۔

وہ بڑی نرمی سے پوچھنے لگی۔ ”کیا بات ہے بابا؟“

وہ چونک گیا۔ اسے بدل جانے والے وقت کا احساس ہوا۔ اسے اپنی بدلی ہوئی صورت، اپنی کھوئی ہوئی پہچان اور چمن جانے والی شناخت یاد آئی۔ اس کا دل بھرا آیا۔ اس نے متاسف ہو کر سوچا کہ وہ گزرے ہوئے ماہ و سال لوٹا نہیں سکتا۔ تو پھر اس دلیز پر کیوں چلا آیا ہے۔

اس نے پھر سوال کیا۔ ”کیا بات ہے بابا؟“

اس نے سر جھٹایا۔ اور ٹھٹکوں سے چہرہ وار من بولا۔

”گل! اچھے پہچانو۔ میں سجاد ہوں۔“

”تم؟ سجاد؟“ اس نے بے یقینی سے دوہرایا۔

سجاد کچھ بھی نہیں کہہ سکا۔ صرف دو آنسو اس کی منبلی آنکھوں سے نکلے اور اس کی ابھی ہوئی داڑھی میں جذب ہو گئے۔

گل نے پھر اس کی طرف دیکھا اور کچھ حیرت اور پریشانی سے بولی۔ ”اندرا جاؤ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنالی ہے۔ کہاں چلے گئے تھے۔ جو آج خبر لی ہے۔“

وہ دروازے سے ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ اپنے دکھوں کے بوجھ سے جھکا جھکا۔ اس آگہن میں داخل ہو گیا۔ جو کبھی اس کے لئے عافیت کا گوارہ تھا۔ گل نے ایک نشست کی طرف اشارہ کیا اور بولی۔ ”بیٹھ جاؤ آرام سے۔ تم مجھے بہت پریشان لگ رہے ہو۔ کچھ پانی چائے وغیرہ پیو گے؟“

وہ ایک کرسی پر ڈھچے سا گیا۔ اس میں سر اٹھانے کی تاب بھی نہیں رہی تھی۔ گل پانی کا گلاس لے کر آئی اور اس کی طرف بڑھائی ہوئی بولی۔ ”یہ پانی پیو۔ امینان سے پیو۔“

سجاد کو خواہش تو نہیں تھی۔ لیکن اس نے اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر دو تین گھونٹ بھرے۔ وہ بھی سامنے ایک نشست پر بیٹھ گئی اور دم سے لہجے میں بولی۔

”سجاد! تم نے تو وعدہ ہی کر دی۔ نہ کوئی انتہہ نہ۔ اطلاع آ کر تم چلے کہاں گئے تھے؟ ہم تو یہی سمجھ رہے تھے کہ تمہیں کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے۔“

”ہاں۔ حادثہ ہی تھا۔“ سجاد نے اذیت سے ہونٹ کاٹ کر کہا۔

”حادثہ ہی کچھ۔ جب میں بہت کچھ کرتا تھا۔ تو آزاد پڑتا تھا۔ لیکن جب میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ تو میرے ہاتھوں میں جھڑپاں تھیں۔“

”کیا مطلب؟ یہ تم کیا کہہ رہے؟“ وہ جو پچھلی سی رہ گئی۔

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں گل۔ وہ اذیت سے بچتے ہوئے لیجے میں بولا۔

”اوہ!“ گل کا چہرہ خستہ ہو گیا۔ اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ وہ چند لمحوں بالکل

چپ رہی۔ جیسے سمجھ نہ پاتی ہو کہ کیا کہے۔ پھر سرد آہی بھر کر بولی۔

”خدا کی مصلحتوں کی کس کو خبر ہے سجاد۔ کیا پتہ یہ تمہاری گزشتہ کوتاہیوں کا کفارہ

ہو۔“

سجاد نے ایک مفہوم نگاہ اس کے منہ بیان وجود پر ڈالی۔ وہ آج بھی ویسی ہی دکھ اور پاکیزہ سی معلوم ہوتی تھی۔ وقت کی گردش نے اسے کچھ اور زیادہ بردبار اور باوقار بنا دیا

تھا۔ اسے اپنی جانب دیکھتے ہوئے دیکھ کر وہ بولی۔

”سجاد۔ تمہیں نیلم بھی یاد ہے یا اسے بالکل بھول گئے۔ تم نے اس کے بارے میں

کچھ نہیں پوچھا۔“

”نیلم!“ سجاد نے دوہرایا اور اس کے دل کو جیسے ایک ٹپس سی لگی۔ اسے گہری دلنیز

پہ کھڑی نیلم یاد آئی۔ جس سے اس نے جلدی لوٹ کر آنے کا کہا تھا۔ مگر پھر پلٹ کر نہیں دیکھ

سکا تھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھ کر کہا۔

”ہاں۔ اس کے بارے میں بتاؤ۔ ویسے مجھے اس کی طرف سے اطمینان تھا کہ وہ

تمہارے پاس ہی آئے گی اور تم اسے سنبھال لو گی گل! اس وقت کہاں ہے وہ؟ نظر نہیں آ

رہی؟“

”وہ تمہیں اب نظر نہیں آئے گی سجاد!“ گل نے نیچے ہوئے لیجے میں کہا۔

”کیوں؟“

”تقدیر نے اس کی زندگی میں خوشیاں صرف ایک ہل کیلئے ہی لکھی تھیں۔ سجاد وہ

تمہیں بہت چاہتی تھی۔ تمہارے بعد اس نے ایک لمحہ بھی چین سے نہیں گزارا۔ وہ تمہارے

لئے تھکتی رہی۔ تمہارے لئے لٹکتی رہی۔ بستر سے ایسی لگی کہ پھر ابھی نہیں۔ تمہارے بعد تو شاید

وہ ایک سال بھی زندہ نہیں رہی۔“ وہ منہ مسموم سے لیجے میں کہنے لگی۔

سجاد مل سکتا سا ہو گیا۔ اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹتے ہوئے سر جھکا دیا۔ اس

کے اندر درد کی ایک ٹپس سی جاگی۔ سکتے ہوئے سے آنسو اس کے دل میں کہیں گرنے لگے۔

اسے اپنی تپتی دامن کا احساس ہوا۔ اس نے اذیت سے ہونٹ کاٹے اور کرب آلود لیجے میں

بولا۔

”میرے نصیبوں میں تو نہ محبت ہے۔ نہ کوئی رشتہ۔“ وہ بے چینی کے ساتھ اپنی جگہ

سے اٹھ گیا۔ اور جیسے اپنے آپ سے بولا۔ ”ان اللہ کے بندوں سے کہا بھی تھا کہ میں رہا نہیں

ہوتا چاہتا۔ میں جیل سے باہر نہیں جانا چاہتا۔ مگر انہوں نے میری ایک نہیں سی۔“ اس نے گل

کی طرف دیکھا اور پڑمزوہ سے لیجے میں بولا۔

”اچھا۔ میں چلتا ہوں۔“

”کہاں..... کہاں جا رہے ہو۔“ گل بھی اپنی جگہ سے اٹھی۔

”ذرا غم نہ تو سہی۔“

”بس تمہیں دیکھ لیا۔ یہ بہت ہے گل!“ اس نے دروازے کے طرف قدم

بڑھائے۔ لیکن اچانک ٹھک کر رک گیا اور پلٹ کر گل سے بولا۔

”یہ کس کی تصویر ہے؟“

”میرے بیٹے کی۔“ وہ تھوڑے وقفے کے بعد بولی۔

”تمہارا بیٹا؟“ وہ سرت آ کر حیرت سے بولا۔ ”یہ تو۔“ یہ تو مراد ہے۔ اس نے تو

مجھے رہا کروایا ہے۔ یہ..... یہ جیل میں مجھ سے ملے آیا تھا۔ اس نے آج بھی آنا تھا مگر یہ

نہیں کیوں نہیں آیا اور پولیس والوں نے مجھے رہا کر دیا۔“ وہ دو قدم گل کی طرف بڑھا اور خوشی

کے لیجے میں کہنے لگا۔ ”گل! گل! اوہ تو بالکل تم پر کیا ہے۔ بہت تمہارا لڑکا ہے۔ بہت اچھی

باتیں کرتا ہے وہ۔“

گل ایک عجیب سی حسرت کے ساتھ اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر اس کے بازو پر

ہاتھ رکھ کر بولی۔

”سجاد! تھوڑی دیر بیٹھ جاؤ۔“

”ہاں..... ہاں۔ اب تو میں ضرور بیٹھوں گا۔“ وہ بد لے ہوئے خوش کن لیجے میں

بولا۔ ”گل! میں بہت خوش ہوں کہ تمہارا اس جیلا لائق اور تمہارا بیٹا ہے۔ وہ کب آئے گا۔

میں اس سے مل کر جاؤں گا۔“

”ہاں۔ بیٹھ جاؤ۔“ وہ کچھ سوچے ہوئے سے لہجے میں بولی۔ ”مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔ تم بیٹھ جاؤ سجاد!“

سجاد ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مگر گل اسی طرح کھڑی رہی۔ اس کے دلکش چہرے پر کسی سوچ کا گہرا عکس تھا۔ وہ کچھ شذذب کی نظر آتی تھی۔ سجاد چند لمبے اسی انتظار میں رہا کہ وہ کچھ کہے گی۔ لیکن جب وہ اسی طرح خاموشی میں ڈوبی کچھ سوچتی رہی تو سجاد نے اسے متوجہ کیا۔

”گل کیا بات ہے؟ کیا سوچ رہی ہو۔“

وہ چونک سی گئی۔ مگر چھوٹے چھوٹے قدم لیتی قریب آئی اور اس کے شانے کو چھپتا کر بولی۔ ”سجاد! ایک بات ہے۔ سوچ رہی ہوں کہ تم سے کس طرح کیوں؟“

”کیوں؟“

”تم اگر میری بات خوشے سے سنو تو کہوں۔ اگر تم میری بات سہارو تو جھیں متاؤں کہ تمہارے جانے کے بعد نلیم نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ بیچے کی ولادت وقت سے پہلے ہی ہوگئی تھی۔ نلیم کو بچایا نہیں جاسکا تھا۔“

سجاد نے بے یقینی اور یقین کی ملی جلی کیفیت میں اس کی طرف دیکھا۔ اور اٹکتے ہوئے بولا۔ ”اور بچہ؟“

”بیچے کے بچنے کی بھی کوئی امید نہیں تھی۔ وہ بہت کمزور تھا۔ میں نے بڑے جتن کئے۔ بڑی دعائیں مانگیں۔ اللہ نے اسے زندگی دے دی۔“

سجاد کی جیسے جان میں جان آئی۔ اور اس کی بیقرار روی سوال بن گئی۔ ”کہاں ہے وہ؟ میرا بیٹا کہاں ہے؟“

”مراد تمہارا بیٹا ہے سجاد۔ میں نے تو صرف اسے پالا ہے۔“

گل کا ایک ایک لفظ جیسے اس کے دل میں سے ہو کر نرارا۔ اس کی روح میں پھول کھل گئے۔ اس کے دوسریوں روئیں میں سرخوشی بن کر اتر گئے۔ اس نے حیرت و مسرت سے کاپٹے ہوئے لہجے میں جیسے یقین کر لینے کو پوچھا۔

”گل! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ مراد میرا بیٹا؟“

”ہاں سجاد! مراد تمہارا بیٹا ہے۔ نلیم کی آخری نشانی۔“

سجاد کو محسوس ہوا۔ جیسے وہ زندہ ہو گیا۔ اسے یہ سب کچھ جیسے ایک خواب سا معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے ایک بار جیسے بھر خود کو یقین دلانے کو دہرایا۔

”مراد۔ میرا بیٹا۔“

”ہاں۔ مراد تمہارا بیٹا ہے سجاد۔ میں نے اسے ہاں بن کر پالا ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ سمجھدار ہوا۔ میں نے اس کو بتا دیا کہ میں اس کی سگی ماں نہیں ہوں۔ مگر وہ یقین ہی نہیں کرتا۔ وہ کہتا ہے۔ میں ہی اس کی سگی ماں ہوں۔ وہ بھی مجھے بہت پیارا ہے۔ جیسے میرا اپنا بیٹا ہو۔“

”وہ تمہارا ہی بیٹا ہے گل! تم نے اسے پالا ہے۔ اسے اپنا جیسا دیا ہے۔ اس کی باتیں سن کر مجھے لگتا تھا۔ وہ کسی بہت اچھی ماں کا بیٹا ہے۔“ وہ شادماں شادماں سے لہجے میں کہتا گیا۔ پھر یکدم خاموش ہو گیا۔ اور کچھ شیشانی سے جھپٹکا ہوا سا بولا۔

”گل! گل! اتم نے اسے میرے بارے میں کیا بتایا ہے؟“

”تمہارے بارے میں۔“ وہ کچھ متحسسی ہوگئی۔ تمہارے بارے میں۔ میں اسے کیا بتا سکتی تھی سجاد! تمہارا کچھ پتہ ہوتا تو بتاتی تا۔ تم تو یوں گئے تھے کہ پلٹ کر نہیں دیکھا تھا۔“

”پھر؟“ وہ سانس روک کر بولا۔

گل نے ایک گہرا سانس لیا اور غم پر غم کر بولی۔ ”جب مراد چھوٹا سا تھا تو مجھے تمہارے آنے کی آس تھی۔ میرا خیال تھا کہ جلد یا بدیر تم آ جاؤ گے یا اپنے بارے میں کوئی اطلاع ہی دے دو گے۔ لیکن تمہارا کچھ پتہ نہیں تھا۔ اور مراد۔ مراد کو ہمیشہ بچہ تو نہیں رہنا تھا تا۔ وہ جیسے جیسے بڑا ہوا تھا۔ اپنے باپ کے بارے میں سوال کرنے لگا تھا۔ کچھ عرصہ تو وہ میری وقتی باتوں سے بہل جاتا تھا۔ لیکن پھر وہ زیادہ شدت سے تمہارے بارے میں پوچھنے لگا۔“

”میں اسے ٹالنے کی کوشش کرتی تو وہ ناراض ہو جاتا۔ مگر کے ایک کونے میں روٹھا ہوا سا بیٹھا رہتا۔ ٹھیک طرح کھانا بھی نہ کھاتا۔ اسکول سے اس کی رپورٹ بھی خراب آنے لگی۔ وہ اپنے ہم جماعتوں سے لڑنے لگا۔ میں تو بہت پریشان ہوگئی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ اسے کیا بتاؤں۔ اسے کس طرح سمجھاؤں؟“

”پھر؟“ سجاد نے یوں پوچھا۔ جیسے اس کی موت اور زندگی کا سوال ہو۔

”سجاد! بیٹا ہمیشہ اپنے باپ کے نقش قدم تلاش کرتا ہے۔ وہ اس جیسا بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ایک مثال کی طرح اسے اپنے سامنے رکھتا ہے اور اپنے ساتھیوں میں اپنے باپ کا ذکر فخر سے کرتا ہے۔“

گل جیسے سانس لینے کو کی پھر تھکے ہوئے سے لہجے میں بولی۔

”تم اب خود ہی سوچ کر بھلا میں اس کو کیا جواب دینی کہ اس کا باپ کون ہے؟ کہاں ہے؟ میں اس سے یہ کسی طرح کتنی کہ اس کا باپ۔ اس کی ماں کو۔ اپنے بچے لئے گھر کو چھوڑ کر اچانک کہیں چلا گیا ہے۔ میں نے اس مسئلے پر بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ میری راتوں کی نیند اور دن کا صحن حرام ہو گیا۔“

”میرے سامنے صرف مراد تھا۔ میرے لئے وہی سراہی تھا۔ میں اسے کسی احساس کسری میں مبتلا نہیں کرتا چاہتی تھی۔ میں اس میں کوئی کمزوری یا خالی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ آخر میں نے فیصلہ کر لیا اور اسے باپ کا ایک خیالی تصور دیا۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ اس کا باپ ایک بہادر سپاہی تھا۔ جو مشرقی پاکستان کے محاذ پر گیا تھا۔ مگر پھر نہیں لوٹا۔ میں نے اسے اس کی بہادری کی فرضی داستانیں سنیں۔ اور ہر اچھائی اور ہر خوبی کو اس کے باپ کے روپ میں جسم کر دیا۔ تم یقین کر دو سجاد! کہ اس کے بعد مراد ایک دم سدھر گیا۔ وہ ایک اچھا اور بہادر بچہ بن گیا۔ اس کے اسکول سے بھی اچھی رپورٹ آنے لگی۔“

”وہ اب تک یہی بھٹتا ہے؟“ سجاد نے ہونٹ کاٹ کر پوچھا۔

”ہاں سجاد! وہ اپنے ان دیکھے باپ کے تصور میں ہی زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اس کی قربانی کو سامنے رکھ کر ہی زندگی کے سفر پر نکلا ہے۔ وہ بڑے فخر سے کہتا ہے کہ اس کا باپ ایک معمولی سپاہی تھا۔ لیکن اس کے پاس شہادت کا رتبہ ہے۔ جس سے بڑا رتبہ شاید انسان کے لئے کوئی اور نہیں۔“

”اوہ!“ سجاد نے بیقراری سے اپنے بالوں نوچے۔ اور پیشانی پر ہاتھ مار کر بولا۔

”اوہو۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔ یہ کیا ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے سجاد۔“ گل نے پریشان ہو کر پوچھا۔

”وہ مجھے جیل میں دیکھ چکا ہے۔ اسی نے تو مجھے ہر دیا ہے۔ گل! وہ مجھے دیکھ کر کہا کہ گاہ۔ وہ کیا سوچے گا؟ وہ سمجھے گا کہ تم نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔“ وہ تاسف سے کہنے لگا۔

”ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ گل بھی قدرے پریشان ہوئی۔ سجاد سر جھکانے پر پیشانی سے کچھ سوچتا رہا۔ پھر اٹھا کر ٹھکرتے سے لہجے میں بولا۔

”گل! اس زندگی میں کبھی کوئی رشتہ میرا اپنا نہیں ہوا۔ جو حاصل ہوا۔ وہ چھین گیا۔ وہ لٹ گیا۔ میں اب اس رشتے کو اپنا کر گیا کروں گا۔ یہ رشتہ میری زندگی ہے۔ میرا اطمینان ہے۔ میرا آسرا ہے۔ لیکن میں اسے اپنا کر کھوٹا نہیں کرتا چاہتا۔“

”میں اپنے بچے کی زندگی میں زہر نہیں گھولتا چاہتا۔ میں اس کے خواب توڑنا نہیں چاہتا۔ گل میں تمہیں اس کے سامنے بھونٹا نہیں دیتا چاہتا۔ میں باپ ہو کر اسے کچھ دے نہیں سکتا۔ تو اس سے کچھ چینیوں کا بھی نہیں۔ میں اس سے باپ کا تصور نہیں چینیوں کا۔ جو تم نے اسے دے رکھا ہے۔“ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور ضبط کی اذیت سے چہرہ چور کر بولا۔

”گل! میری تو زیادہ گزرتی ہے۔ تھوڑی دیر گئی ہے۔ وہ بھی گزر جائے گی۔ مراد کے سامنے تو ابھی پوری زندگی ہے۔ میں اس پر اپنا منوس سایہ نہیں ڈالنا چاہتا۔ وہ جس تصور کو لے کر چل رہا ہے۔ اسے اسی کے سہارے چلنے دو۔ اسے میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔“

گل نے ہکا بکا ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ دو قدم چل کر اس کے قریب آیا اور اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

”گل! مجھے سے وعدہ کرو کہ تم مراد کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتاؤ گی۔“

”تم کچھ سوچتے ہو تو سجاد!“ گل نے بے طرح الجھ کر کہا۔

”نہیں بس۔ اب کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔“ وہ کرب سے چپے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میں جا رہا ہوں۔ تم میری طرف سے مراد کا کا تھا چھوڑنا۔“

”اوہو سجاد۔ تم بات تو سنو۔“ گل نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا صحن پارک کے دہلیز تک پہنچ گیا۔ گل اس کے پیچھے لگی۔

”سجاد! بات سنو۔ ٹھہرو۔“ اس نے پھر پکارا۔

اسی وقت دروازہ کھلا۔ اور مراد کا مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا۔

”ای۔ ای۔۔۔۔۔ ای جان۔“ وہ خوشدلی سے پکارتا ہوا اندر آیا۔

سجاد اس کے عین سامنے تھا۔ وہ ٹھٹک کر رہا اور حیرت سے بولا۔

احمد مراد نے سجاد کی طرف دیکھا۔ جو ایک تک خوش بخت کی طرف دھنسا ہوا جا رہا تھا۔ اور بولا۔ ”میڈم لگتا ہے۔ بابائی بھی آپ کے پرستار ہیں۔“ اس نے ہنس کر اس کی نوعیت کی جانب اشارہ کیا اور خوش بخت سے بولا۔

”میڈم! یہ وہی بابائی ہیں۔ جن کی رہائی کے لئے مجاہد اور میں کوشش کر رہے تھے۔ اور مزے کی بات یہ کہ پولیس نے ہمیں تو یہ بتایا تھا کہ انہیں کل رہا کیا جائے گا۔ لیکن چھوڑ دیا انہیں آج ہی۔“ عجیب لوگ ہیں۔ میرا خیال ہے۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں بابا۔ زیادہ ہی چلتی نہ لے جائے۔“

”مراد! انہیں نہیں کھڑا رکھو گے یا اندر بھی آؤ گے۔“ گل نے اسے ٹوکا۔

”اوہ۔ آئی، اے، سوئی میڈم۔“ مراد جلدی سے بولا اور بڑے آداب کے ساتھ اسے چلنے کا اشارہ کیا۔ اور سجاد سے بولا۔ ”بابائی آپ بھی آ جائیں۔ ذرا تھیں تو کسی کہ آپ یہاں کس طرح پہنچے گئے تھے۔ میرا بچہ آپ کو کس نے دیا۔“

سجاد نے جیسے سنا ہی نہیں۔ اور اب بھی حیران آکھوں کے ساتھ میڈم خوش بخت کی طرف دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ کچھ الجھ کر آگے بڑھی۔ مراد نے بھی اپنی سکراہٹ ہونٹوں میں دبا لی اور سجاد کا شانہ ہلا کر بولا۔

”آ جاؤ۔ بابائی آ جاؤ۔ چلو اندر چلو۔“

سجاد نے چونک کر سر ہٹا دیا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک آوی بھسل گئی۔

”آپا بھگام بھری!“

میڈم خوش بخت یوں چونک کر بٹلی جیسے کرنٹ لگ گیا اور بھونکی سی ہو کر سجاد کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر دو قدم آگے بڑھی اور اس کے بازو ہلکا سا جھجھوڑ کر بولی۔

”کون ہو تم؟ یہ ابھی تم نے کیا کیا تھا۔“

”کچھ نہیں۔ کچھ نہیں۔“ سجاد اس کا ہاتھ ہٹا کر جانے کیلئے مڑا۔

”اوہ میڈم! یہ شخص آپ کو جانتا ہے۔ مجھے یاد آ گیا اس نے ابھی آپ کا اصلی نام لیا ہے۔“ مراد نے قدرے جوش سے کہا۔

خوش بخت نے پھر سجاد کو روک لیا۔

”تم بتاتے کیوں نہیں ہو کہ مجھے کس طرح جانتے ہو۔ کون ہو تم؟“

”ارے بابا..... آپ..... آپ یہاں.....!“

سجاد بھی چند لمحوں کو غصا۔ اس کا مٹی چاکہ کھلی اور آخری بار اپنے دل کے کتلے کو سینے سے لگا کر اپنے دل میں بھرتی آگ کو غصا کر لے۔ شاید پھر کبھی یہ کبہ ہاتھ نہ آئے۔ شاید پھر کبھی یہ موقع نہ ملے۔ شاید پھر کبھی یہ جاس نہ بھیجے۔ مگر پھر اس نے خود کو سمجھایا۔ خود کو روک لیا۔ اسٹوے جڈوں کو سینے میں گھومت کر اس نے نظر بچا کر گزر جانا چاہا۔ لیکن احمد مراد نے اس کا بازو پکڑ کر روک لیا۔

”بابا! ٹھہر تو کسی۔ ایک منٹ۔ مجھ سے بات کر کے جانا۔“

گل بھی جب تک دروازے تک آگئی تھی۔ مراد کو اس کا بازو پکڑے دیکھ کر وہ کچھ متذبذب ہو گئی اور کچھ کہنے نہ کہنے کی کیفیت میں گرفتار۔ چپ کی چپ رہ گئی۔ مراد اسے دیکھ کر بولا۔

”امی۔ دیکھئے۔ کون آیا ہے؟“

گل ہکا بکا سی رہ گئی۔ مراد سجاد کے بارے میں اس طرح کیوں کہہ رہا تھا۔ وہ اس کے بارے میں کیا جانتا تھا۔ اس نے حیرت سے سوچا۔ مراد نے پلٹ کر دروازے میں سے جھانکا۔

”آ جائیے نا بیٹرز۔ ہمارا غریب خاندان تو بس ایسا ہی ہے۔“

سجاد اور گل دونوں نے دروازے کی طرف دیکھا۔ ایک فیشن ایبل دروازہ خاتون بڑے وقار سے اندر داخل ہوئی۔ اس نے سیاہ چشمہ اتار کر ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس نے سکرا کر سلام کیا۔

”میڈم..... یہ ہیں میری امی۔ بہت ہی پیاری امی اور دنیا کی سب سے اچھی امی۔“

احمد مراد خوشدلی سے تعارف کرانے لگا۔

”امی جان! اب آپ جلدی سے حیران ہونے کے لئے تیار ہو جائیے۔ کیونکہ یہ ہیں میڈم خوش بخت!“

گل جو پہلے ہی اس کے دکھ دکھاؤ اور حیثیت سے قدرے مرعوب سی ہو رہی تھی۔ یہ سن کر واقعی ایک خوفناک جھرکت سے اس کی نگاہیں طرف دیکھنے کی دہشتی رہ گئی کہ وہ اس کی پسندیدہ گلوکارہ خوش بخت تھی۔

”بابائی! یہ امی جان کیا شوش چھوڑ گئی ہیں۔ آئیں ذرا۔ اندر چل کر ان سے پوچھتے ہیں۔“

سجاد کے روئیں روئیں میں ایک توپ سی جاگی۔ وہ ضبط نہیں کر سکا۔ اس نے آگے بڑھ کر مراد کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں قلم لیا۔ اور اس کی فراخ چیشائی کو چم کر بولا۔ ”مراد! تم میرے بیٹے ہو۔ میرے..... میرے اپنے.....!!“

(ختم شد)

”بابا! تاؤ تا میڈم کو۔ تم اس کا دم کس طرح جانتے ہو؟“ مراد نے بھی زور دیا۔ گل بھی قریب آئی۔ اور نرمی سے بولی۔

”سجاد! آپا بھاگ بھری کو تاؤ تا کر تم اس کے چھوٹے بھائی ہو۔ اور تم نے ساری زندگی اسے ہی تلاش کرنے میں گزار دی ہے۔“

سجاد کے ہونٹ کانپے۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔ دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکلے اور اس کی کچھڑی واڑھی میں جذب ہو گئے۔ خوش بخت بھونچکی سی رہی اور آگے بڑھ کر اسے دونوں شانوں سے تمام کر بولی۔ ”تو سجاد ہے۔ سجاد!“

غیر ارادی طور پر سجاد کا سر اثبات میں مل گیا۔ لیکن وہ دونوں سے ایک لفظ نہیں کہہ سکا۔

”ہائے۔۔۔ دے میرے دیر۔ ہم تو لٹ گئے۔ لٹ گئے۔“ وہ اپنے گاؤں کی مخصوص زبان میں کہتی ہوئی بے ساختہ اس کے گلے سے لگ گئی۔

”میں تو ساری زندگی۔ تیری آکر۔ میں بھتی رہی ہوں دیر! کہ کبھی تو تو مجھے ملے گا۔ کبھی تو تو مجھے نجات دلانے آئے گا۔ میں تو تیری راہ کھتے کھتے تھک گئی تھی۔“ وہ سکیوں کے درمیان نہ جانے کیا کچھ کہتی جا رہی تھی۔ سجاد اس کے ہال سہلا تا ہوا دکھ سے کھل رہا تھا۔

احمد مراد متاثر سا ہو کر دونوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ گل کی چٹکیں بھی ہلک گئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں کو غلط نہ کیا۔

”چلے اندر چل کر اطمینان سے باتیں کیجئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے ہمارے یہاں آپ دونوں بہن بھائیوں کو ملایا ہے۔ یہ بہت خوشی کا دن ہے۔“

اس نے خوش بخت کا بازو تھما اور اسے اندر لے جاتے ہوئے مراد سے بولی۔

”مراد! بابا کو اندر لے آؤ۔ اور ذرا بڑے احترام سے۔ یہ تمہارے بابا ہیں۔ سمجھو کچھ؟“

احمد مراد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے گل کی طرف دیکھا۔ جو خوش بخت کے ساتھ محن پار کر کے کمرے میں داخل ہو گئی تھی۔ پھر سجاد کی طرف دیکھ کر کچھ تذبذب کچھ پشیمان سا کھڑا یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ اندر چلا جائے یا دروازہ کھول کر صحت سے باہر نکل جائے۔ اور بس کر بولا۔